ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے مورّخین

محبّ الحسن

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

Marfat.com

Marfat.com

ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے مؤرخین

ترتیب و تدوین

محبّ الحسن

مترجم

مسرور ہاشمی

ذخیرہ محمد اقبال مجددی

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

Marfat.com

HINDUSTANI DAUR - E - WASTA KE MAWARKHIN
By MUHIBUL HASAN

136635

سنہ اشاعت : جنوری تا مارچ 1985 شک 1906
© ترقی اردو بیورو، نئی دہلی
پہلا اڈیشن : 1000
قیمت : -/45
سلسلۂ مطبوعات ترقی اردو بیورو 461

اس کتاب کی طباعت کے لیے حکومتِ ہند نے رعایتی قیمت پر کاغذ فراہم کیا

ناشر : ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک 8 آر کے پورم نئی دہلی 110066
طابع : سپر پرنٹرز دہلی ۵۱

Marfat.com

پیش لفظ

کوئی بھی زبان یا معاشرہ اپنے ارتقاء کی کس منزل میں ہے، اس کا اندازہ اس کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ کتابیں علم کا سرچشمہ ہیں، اور انسانی تہذیب کی ترقی کا کوئی تصور ان کے بغیر ممکن نہیں۔ کتابیں دراصل وہ صحیفے ہیں جن میں علوم کے مختلف شعبوں کے ارتقاء کی داستان رقم ہے اور آئندہ کے امکانات کی بشارت بھی ہے۔ ترقی پذیر معاشروں اور زبانوں میں کتابوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ سماجی ترقی کے عمل میں کتابیں نہایت موثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اُردو میں اس مقصد کے حصول کے لیے حکومتِ ہند کی جانب سے ترقی اُردو بیورو کا قیام عمل میں آیا جسے ملک کے عالموں، ماہروں اور فن کاروں کا بھرپور تعاون حاصل ہے

ترقی اُردو بیورو معاشرہ کی موجودہ ضرورتوں کے پیش نظر اب تک اُردو کے کئی ادبی شاہکار، سائنسی علوم کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شائع کر چکا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مختصر عرصے میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ بیورو سے شائع ہونے والی کتابوں کی قیمت نسبتاً کم رکھی جاتی ہے تاکہ اُردو والے ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔

زیرِ نظر کتاب بیورو کے اشاعتی پروگرام کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ امید کہ اُردو حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

ڈائریکٹر ترقی اُردو بیورو

Marfat.com

Marfat.com

فہرستِ مضامین

مقالہ نگاروں کی فہرست		9
دیباچہ	محمد مجیب	11
تعارف	مجیب الحسن	17
تاریخ کے بارے میں کلہن کے وہ خیالات جو راج ترنگی میں بیان کیے گئے ہیں	رومیلا تھاپر	27
فضل اللہ رشید الدین ابوالخیر	بدھ پرکاش	43
امیر خسرو بحیثیت مورخ	سید حسن عسکری	59
ضیاالدین برنی	خلیق احمد نظامی	82
دورِ وسطیٰ کے کشمیر میں تاریخ نگاری	محب الحسن	107
شیخ سکندر کی مرات سکندری اور اس سے پہلے کی کتابیں	ایس۔سی۔مسرا	117
مرزا ناتھن ــــــ سترھویں صدی کا ایک توزک نگار	قیام الدین احمد	133
گولکنڈہ کے قطب شاہی دور کی عصری تاریخیں	ایچ۔کے۔شیروانی	155
بابر	پُشپا سوری	176
بدایونی	محمد مجیب	189
تاریخ الفی	ایس۔اے۔اے۔رضوی	201
شیخ ابوالفضل	نعمان احمد صدیقی	217

Marfat.com

اٹھارھویں صدی کے دوران ہندوستان میں فارسی فنِ تاریخ نگاری	ظہیر الدین ملک	247
محمد قاسم اور خفی خان کے تاریخی اندازِ نظر کا ایک تقابلی مطالعہ	محمد عمر	269
دورِ وسطیٰ کے کچھ مورخین کی نجی تاریخ اور ان کی تحریریں	جگدیش نرائن سرکار	28?
گجرات اور راجستھان کے حوالے سے علاقائی زبانوں کے تاریخی ماخذوں کی اہمیت کا ایک عام تخمینہ اور جائزہ	پی۔سرن	336
دورِ وسطیٰ کے دوران تاریخ پنجاب کے بعض غیر مسلم مآخذ	گنڈا سنگھ	353
دورِ وسطیٰ کے ہندوستان پر ابتدائی برطانوی تاریخی تحریر کی خصوصیات	جے۔ایس۔گریوال	377
سر سید اور مولانا شبلی	زیڈ۔ایچ۔فاروقی	393
مغل ہندوستان کے بعض سویت مورخین	سریندر گوپال	407
آنند کمار سوامی راجپوت مصوری کے مورخ کی حیثیت سے	بی۔این۔گوسوامی	434
ہنری جارج کین	کے۔کے۔شرما	460
مغلوں کے محصولِ زمین کے انتظام کی بابت سرکار اور مورلینڈ کے خیالات	بی۔آر۔گروور	465

Marfat.com

مقالہ نگاروں کی فہرست

قیام الدین احمد	لیکچرر تاریخ، پٹنہ یونیورسٹی
سید حسن عسکری	ڈائرکٹر کے۔پی۔ جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ
زیڈ۔ ایچ۔ فاروقی	ڈین فیکلٹی آف ہیومینیٹیز اینڈ سوشل سائنس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
سریندر گوپال	لیکچرر تاریخ، پٹنہ یونیورسٹی
بی۔ این۔ گوسوامی	ریڈر، شعبۂ فنون لطیفہ، پنجاب یونیورسٹی
جے۔ ایس۔ گریوال	لیکچرر تاریخ، پنجاب یونیورسٹی
بی۔ آر۔ گروور	ریڈر، شعبۂ تاریخ و تہذیب ہندوستان، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
محب الحسن	پروفیسر، شعبۂ تاریخ و تہذیب ہندوستان، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
ظہیر الدین ملک	ریڈر تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
ایس۔ سی۔ مسرا	پروفیسر تاریخ، یونیورسٹی آف بڑودہ
محمد مجیب	شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ
کے۔ اے۔ نظامی	پروفیسر تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
بدھ پرکاش	پروفیسر تاریخ اور ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف انڈک اسٹڈیز کرکشیتر یونیورسٹی
ایس۔ اے۔ اے۔ رضوی	ریڈر تاریخ، جموں و کشمیر یونیورسٹی
پی۔ سرن	ایسوسی ایٹ پروفیسر تاریخ، عثمانیہ یونیورسٹی

Marfat.com

جگدیش نرائن سرکار	پروفیسر، دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ، جادو پور یونیورسٹی
کے۔کے۔شرما	صدر شعبۂ تاریخ نے۔اے۔ایس۔کالج، میرٹھ
ایچ۔کے۔شیروانی	سابق پروفیسر تاریخ، عثمانیہ یونیورسٹی
نعمان احمد صدیقی	ریڈر تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
گنڈا سنگھ	ڈائرکٹر پنجاب ہسٹوریکل انسٹی ٹیوٹ، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ
پُشپا سوری	لیکچرر تاریخ، زنانہ گورنمنٹ کالج، یونیورسٹی آف دہلی
رومیلا تھاپر	ریڈر تاریخ، یونیورسٹی آف دہلی
محمد عُمر	لیکچرر تاریخ، رورل انسٹی ٹیوٹ، جامعہ ملیہ اسلامیہ

Marfat.com

دیباچہ

1965ء کی ابتدا میں جامعہ ملیہ کے شعبۂ تاریخ نے لیکچروں کا ایک سلسلہ قایم کیا۔ جن کے بعد بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ ایک بات جس پر سب متفق نظر آتے تھے یہ تھی کہ جامعہ کے ماحول میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جس کے باعث کُھل کر بات کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اِسی باعث 1966ء کی ابتدا میں شعبۂ تاریخ ایک سہ روزہ سیمینار کا انتظام کرنے پر آمادہ ہوگیا۔

ایسا لگتا ہے کہ گول میز مباحثہ جس میں ذہنی محفوظات اور ذہنی رُکاوٹوں کے بغیر نظریات کا اظہار کیا جاسکتا ہے، وہ طریقہ ہے جس کی مدد سے ہمیں یہ سمجھنے میں جو دُشواریاں پیش آئیں ان پر قابو پاسکیں کہ دَورِ وسطیٰ پر لکھنے والے وہ کون سے مورّخین تھے جنھوں نے واقعتاً تاریخی ادب تخلیق کیا۔ ہمیں اپنے ذہن کو ان کے اس بُنیادی تصوّرِ تاریخ کا پابند نہیں بنانا چاہیے کہ تاریخ سیاسی قوّت کے حصول کی جدوجہد کا نام ہے، اور ہمیں اِن حالات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے جنھوں نے ان کی تحریروں کو متاثر کیا۔ درباری مورخ کو درباری شاعروں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا، نثر نگار کے ذہن پر یہ خیال طاری رہتا تھا کہ اسے اس وقت لایق مطالعہ نہ سمجھا جائے گا۔ جب تک وہ ساری تشبیہیں اور استعارے اور شاعروں کی ساری مبالغہ آمیزی صَرف نہ کر دے گا۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہمیں مورخ کو اس کی قوم کا نمایندہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس کا تعلق اس چھوٹی سی اقلیت سے ہوتا تھا جس کے پاس قوت ہوتی تھی، جو چاہتی تھی کہ یہ فطرت برابر بڑھتی رہے، اور ان سارے واقعات سے ہوتا تھا جو اس خواہش کے

Marfat.com

نتیجے میں رونما ہوتے تھے۔ اس کا تعلق کچھ مخصوص قسم کے حقایق سے ہوتا تھا۔ سچائی اور انصاف سے یقیناً اس کا کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ اسے یہ دکھانا ہوتا تھا کہ وہ ایک اخلاقی نظام میں یقین رکھتا ہے، اور اس لیے حالات کے تقاضوں یا امکانات پر نظر رکھتے ہوئے وہ سیاسی اقتدار اور سیاسی اُمنگوں پر مذہب کی بھرپور رنگ آمیزی کرتا تھا۔

موّرخوں پر بحث کرتے وقت، جن میں سے بہت سے مسلمان تھے، ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں ان قوتوں کے بارے میں صحیح تحقیق کی ضرورت ہے۔ جو قوتیں ان لوگوں کے اندر جنہیں ایک قوم کہا جاتا ہے، کام کر رہی تھیں۔ اگر ہم نے یہ کام کر لیا تو مجھے یقین ہے کہ ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ بہت سی باتوں کو سہل سمجھنے کے باعث ہم گُم کردہ راہ ہو گئے تھے اور چونکہ ہم نے اندرونی تناؤ کو نظر انداز کر دیا تھا، اس لیے مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق ایک دعوے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ جن حکومتوں نے خود کو مُسلم کہا ان کی کوئی اخلاقی یا مذہبی بُنیاد نہیں تھی، اور وہ محض قانونی افسانوں کے بل بُوتے پر اپنی یہ وضع قایم کیے ہوئے تھیں۔ مُسلم شریعت پر قانون کی حیثیت سے کبھی عمل نہ ہوا، حالانکہ بعض اوقات جزیہ نافذ کرتے وقت یہی جواز پیش کیا گیا ہے۔ سرکاری علما خاص طور سے تقلید کے حساسی تھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلامی عقیدے اور عمل کے سُنّی منفی مفہوم کی حمایت کرتے تھے، اور بدعت اور اختلاف کو دبانے کے لیے اتنے فکر مند رہتے تھے کہ مذہبی اتحاد میں وہ خود ہی خاص رُکاوٹ بنے رہتے تھے۔ مذہبی معنوں میں صوفی سب سے زیادہ سرگرم عمل تھے۔ اور ان میں ہمیں ایسے حضرات نظر آتے ہیں جنہوں نے مسلمان حکومتوں اور فرمانرواؤں سے اس لیے ناتہ توڑ لیا کہ وہ بُنیادی طور پر غیر مذہبی اور غیر منصف مزاج ہوتے تھے اور ان میں ایسے حضرات نظر آتے تھے جنہوں نے راسخ العقیدگی کو اس لیے مسترد کر دیا کہ اس میں دوسروں سے علاحدگی پر زور دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی عمومیت آپس کے ان ناگوار اثرات کا شکار تھی اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے جذبات ایک خاص سمت ہی میں رواں تھے۔ سماجی اعتبار سے مُسلم قوم کبھی بھی

Marfat.com

ایک ہم آہنگ جماعت نہیں رہی ہے۔ ان میں نسل، طبقے اور پیشے کی بُنیادوں پر اختلافات رہے ہیں۔ اور مذہبی اہمیت کی باتوں کے مقابلے میں نسلی اختلافات خصوصاً ان لوگوں کے معاملے میں بڑے فیصلہ کن ثابت ہوتے رہے ہیں۔ جو لوگ حصولِ قوّت کی جدوجہد میں مصروف رہتے تھے۔

لیکن ضرورت صرف یہی نہیں ہے کہ ہندوستان کے مُسلم سماج کا مطالعہ کیا جائے "مُسلم" کی طرح لفظ "ہندو" کو بھی سہل بنالیا گیا ہے۔ میں غلطی کر سکتا ہوں، لیکن میرے خیال میں اس سہل مفہوم کا خود دھرم سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ ان لوگوں کے درمیان جنہیں ہم ہندو اور مُسلمان کہتے رہے ہیں تصادم ہوتے رہے ہیں۔ اور اب بھی ہوتے رہتے ہیں لیکن ان تصادموں کی قسمیں جُدا ہوتی ہیں، اور انھیں ایک دوسرے میں ملانا نہیں چاہیے۔ دھرم نے ایک سماجی نظام بنایا تھا اور یہی نظام اس کی ظاہری صورت ہے۔ ہمیں اس نظام کو اس شکل میں دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے جس شکل میں وہ تاریخ میں نظر آتا ہے، اور یہ جانچ کرنی چاہیے کہ ہر سطح پر حصولِ قوت کے واسطے جو جدوجہد ہوئی اس پر اور سماجی نیز اقتصادی زندگی پر اس نظام نے کیا اثر ڈالا۔ تب شاید ہمیں یہ نظر آئے گا کہ وہ لوگ جن کو دھرم نے یہ حق دیا تھا کہ وہ اپنا سیاسی اختیار استعمال کریں ان لوگوں کے خلاف لڑتے رہے جو انھیں اس حق سے محروم کر دینا چاہتے تھے، جب کہ وہ لوگ جن کو دھرم نے کاروبار کرنے اور دولت کمانے پر مامور کیا تھا اپنے اسی مخصوص کام میں مصروف رہے اور اس بات کی فکر نہ کی کہ جس سیاسی قوّت کے تحت وہ یہ کام کر رہے ہیں وہ سیاسی قوت کیسی ہے۔ دہلی اور شمالی ہند کے دوسرے بڑے شہروں کے سرمایہ دار ترکوں کی کامیابی پر خوف زدہ ہو سکتے تھے، اور دہلی سلطنت کے قیام کے بعد اپنی ذات کے اصولوں پر زیادہ سختی سے کار بند ہو سکتے تھے، لیکن اسی سب کے باوجود وہ اپنی تجارت کرتے رہے، اور نئے حالات کی بُنیاد پر انھیں جو مواقع ملے ہوں گے ان سے انھوں نے ضرور فائدہ اُٹھایا ہوگا۔ دیہاتی سردار اور

Marfat.com

کسان ہر بیرونی حاکم سے آزاد رہنا چاہتے تھے، اوران کے تصورِ دھرم نے انھیں اس خیال کی جانب مائل نہ کیا ہوگا کہ چھتری اور مسلمان حملہ آوروں میں فرق کریں۔ اہلِ حرفہ کو بحیثیت مجموعی ان سیاسی تبدیلیوں سے فائدہ ہوا ہوگا، کیونکہ بنا حکمراں طبقہ خرچیلی زندگی بسر کرنے کا قائل تھا۔ اور اسے اپنی نازک مزاجی کی تسکین کے واسطے انواع و اقسام کے سامان کی ضرورت تھی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مسائل کا پورے طور سے مطالعہ کیا جائے اور انھیں مفصّل طور سے لکھا جائے۔ میں نے ان کا ذکر محض اس مشورے کے طور پر کیا ہے کہ اگر ہم اپنی تاریخ کے صرف چند ہی حصّوں پر نظر ڈالنا نہیں چاہتے اور پوری تاریخ کی بابت تناظر واقعی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس طرح دیکھنے پر ہماری تاریخ کا منظر بالکل ہی مختلف نظر آسکتا ہے۔ ہمیں اس میں وہ چیزیں نظر آسکتی ہیں۔ جو ہم اپنی آج کی زندگی کے منظر میں دیکھتے ہیں۔

مجھے ایک احساس اکثر بے چین کرتا رہتا ہے ـــــ پتہ نہیں اور کتنے لوگ اس بے چینی کا شکار ہیں ـــــ کہ ہماری تاریخ ہمارے زمانے کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی، وہ ابھی تک ہم سے جُدا کوئی علاحدہ شے ہے۔ علمی معنی میں وہ ایک تاریخ ہے ایسی ہی جیسے یونان، روم یا دورِ وسطیٰ کے یورپ کی تاریخ، جس سے ہم تخیلی طور پر محض اس لیے خود کو وابستہ کر سکتے ہیں کہ وہ پورے انسانی تجربے کا ایک جزو لاینفک ہے لیکن وہ ہماری تاریخ نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے سیاسی مدبرین ہمارے مسائل حل کرنے کے واسطے فکرمند نہیں تھے، ان کی کوشش اور ان کے کارنامے انہی کے واسطے تھے، اور انہی کے ساتھ ختم ہو گئے۔ سنت اور صوفی زیادہ خوش قسمت ہیں، لیکن وہ بھی اب تک ان لوگوں میں بٹے ہوئے ہیں جو ان سے عقیدت رکھتے ہیں، اور بعض خاص موقعوں پر ہی انھیں قومی حیثیت دی جاتی ہے۔ اگر ہم کسی ایک رُوحانی یا سماجی اثر کا سُراغ لگانا چاہیں تو یہ کوشش کسی ایک اندرونی ہم آہنگی کی تلاش نہ ہوگی جو ہم آہنگی بُنیادی اختلافات کے نیچے موجود ہو، بلکہ یہ کوشش کچھ

Marfat.com

اس انداز کی ہوگی کہ خطوطِ تقسیم کو کبھی اِدھر سے ہٹادیا کبھی اُدھر سے ہٹا دیا۔ ہم میں سے کچھ لوگ جب عہدِ وسطیٰ کے اشخاص اور واقعات سے رشتہ قایم کرنے میں ناکام رہتے ہیں تو اس حد پر جا پہنچتے ہیں کہ ماضی بعید میں ان چیزوں کے خواب دیکھنے لگتے ہیں جنھیں آج کے دور میں لائق تعریف سمجھا جاتا ہے۔ ان چیزوں میں اگر نہایت جدید سائنسی دریافتیں اور صنعتی ایجادیں شامل نہیں کی جاتی ہیں تو جذبہ قومیت، جمہوریت، مقامی حکومت، خود اختیاری ضرور شامل کر لی جاتی ہیں اور ان لوگوں کو یقین سا ہو جاتا ہے کہ انھوں نے ایسے عناصر پا لیے ہیں جو ہماری تاریخ میں ہمیشہ موجود رہے ہیں۔

اپنے ملک کی وسعت، خود کفیل سیاسی اکائیوں اور ان تہذیبوں کو اگر نظر میں رکھا جائے جو تہذیبی پانچ ہزار برسوں میں پیدا ہوئی، پھلی پھولیں اور مرجھا گئیں، تو پھر یہ الزام شاید ہی دیا جا سکے کہ ہمارے رویّے میں اتنا انتشار کیوں ہے۔ یہاں متحد کرنے والی ایسی قوتیں بھی رہی ہیں جیسے دھرم کا تصور، لیکن ایک اعلا قسم کا تخیّل ہی الہامی لمحے میں ہندوستانی زندگی کی اس بیش قیمت گونا گونی کو روشنی کے ایک ہی دائرے میں لا سکتا تھا، اور اگر ایسا ہو بھی جاتا تو اس تقریباً رُوحانی تجربے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی تھی جب تک اس میں تجریدی اور تعمیماتی باتیں شامل نہ کی جاتیں۔ مزید یہ کہ اپنی تاریخ لکھتے وقت ہم اس نوع کے دوسرے بیانات سے گریز نہیں کر سکتے، جن میں سے بعض ایسے انحرافِ بیان بھی ہو سکتے ہیں جیسے کہانی کہنا، یا موضوعات میں سے موضوعات نکالنا، لیکن اس بیانِ تاریخ کا پورا ڈھانچہ کم و بیش اس انداز کا ہو سکتا ہے جیسے کتھا سرت ساگر، جو پیچ در پیچ کہانیوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں ہر کہانی دوسری کہانی سے قاری کی دلچسپی کے باعث جُڑی ہوئی ہے۔ ہماری تاریخ یونانی مفہوم تاریخ کے مطابق تحقیق اور تفتیش بھی ہو سکتی ہے، لیکن کیا وہ کبھی "نہایت عُمدہ انداز میں کہی جانے والی عظیم کہانی" بن سکے گی؟

ہم اس سوال کا جواب اس وقت تک نہیں دے سکتے جب تک کوشش نہ کر لیں،

Marfat.com

اور میں نہیں سمجھتا کہ ہم نے یہ کوشش واقعی کر لی ہے۔ اگر ہندوستان کی محبّت، جو مذہب، علاقے اور زبان کی مخالفانہ اور عیارانہ اطاعت سے متاثر نہ ہوئی ہو، کبھی کسی مورّخ کو اس کام کے لیے آمادہ کر سکی، اور فیصلے کرتے وقت عالمی انسانی قدروں نے اس مورّخ کی رہنمائی کی، تو ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان کی تاریخ "نہایت عمدہ انداز میں کہی جانے والی عظیم کہانی" بن جائے گی۔ لیکن اس دوران میں جب ایک مثالی مورّخ کا انتظار کیا جا رہا ہے، ہم خود دیانت داری کے ساتھ تاریخ کو سمجھنے اور اس کی ترجمانی کرنے کی کوشش کریں تاکہ اس کے لیے زمین ہموار ہو جائے۔ اس مشق کے لیے ہندوستانی دَورِ وسطیٰ کے مورّخین نہایت عمدہ مواد فراہم کرتے ہیں۔ ہمیں ہر رُخ سے انھیں جاننا چاہیے، ان کی کتابیں ہی نہیں ان کے ذہن پڑھنا چاہییں، اور اسی کے ساتھ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ کی بابت ہمارا اندازِ نظر بھی اتنا ہی محدود ہو سکتا ہے جتنا ان کا تھا، ہمارے فیصلوں پر ہمارے مقاصد اسی طرح اثر انداز ہو سکتے ہیں جیسے ان کے ہوئے تھے۔ ایسی جانچ اور خود اپنی جانچ صرف تاریخ کے مطالعے میں مفید ثابت ہوگی بلکہ خود ہماری نظر کو صاف کرے گی۔ ہم واقعات بعینہٖ اس طرح دیکھ سکیں گے جیسے وہ رونما ہوئے تھے، اور ہمیں لیاقت حاصل ہو جائے گی جس کی مدد سے معقول قسم کے قیاس قایم کیے جا سکیں، کیونکہ بغیر معقول قیاس کے تاریخ بعض اوقات غیر متعلق حقایق کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ تاریخ مردہ ماخذی اشیا سے دوبارہ زندگی حاصل نہیں کرتی، وہ مورّخ کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔

م۔ مُجیب

Marfat.com

تعارف

تاریخ کا احساس مسلمانوں میں ہمیشہ سے بہت زیادہ رہا ہے، اور اس احساس کی ابتدا خود حضرت محمدؐ سے ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانے ہی سے حضرت محمدؐ، خلفاء، سلاطین اور اُمرا کی زندگیوں پر کتابیں لکھی جانے لگی تھیں۔ پہلے یہ صرف عربی میں لکھی گئیں، جو قرآن اور دانشور طبقوں کی زبان تھی۔ لیکن دسویں صدی کے دوسرے نصف سے، جب ایران میں جذبۂ قومیت کی تجدید ہوئی اور ترک حکومتوں نے فارسی زبان اور تہذیب اپنائی، تو تاریخی کتابیں فارسی میں بھی لکھی جانے لگیں۔ جب مسلمان ہندوستان آئے تو تاریخ نگاری کی فارسی روایت بھی اپنے ساتھ لائے، اور اس روایت کو ایران اور وسطِ ایشیا سے ہجرت کرنے والوں نے قائم رکھا۔ اس لیے گیارھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک ایسے تاریخی ادب کا انبار لگ گیا جس میں عام تاریخیں، حکومتوں کی تاریخیں اور علاقائی تاریخیں نیز سوانحیں اور توزکیں شامل تھیں۔

فارسی میں لکھی ہوئی یہی وہ تاریخیں ہیں جو ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی تاریخ کے خاص ماخذوں کی طرح استعمال کی جاتی ہیں۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ انھیں ان کے مصنّفوں کے سماجی، ثقافتی اور مذہبی پسِ منظر نیز ان کے طریقوں، اظہارِ بیان کی شکلوں اور ان کے تصورِ تاریخ کے حوالے سے اچھی طرح جانچا اور پڑھا نہیں گیا ہے۔ جس کا نتیجہ ماضی کی ایک نامکمل اور مسلم شدہ تصویر کی شکل میں نکلا ہے۔

اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، یونیورسٹی آف لندن نے ایک کانفرنس کا اہتمام کیا جس میں ہندوستانی مورخین پر تحقیق کی پہلی کوشش کی گئی لیکن ہندوستانی

Marfat.com

دَورِ وسطیٰ اس کانفرنس کا ایک چھوٹا سا حصّہ تھا۔ اس موضوع پر پہلی بڑی اور باقاعدہ کتاب پیٹر ہارڈی نے ہسٹورینس آف میڈیول انڈیا کے نام سے لکھی تھی۔ گو اس کتاب نے دَورِ وسطیٰ کے مورّخوں کی بابت تحقیق کا راستہ کھول دیا، لیکن اس کا دائرہ مضامین بہت محدود ہے ـــــ اس میں دَورِ وسطیٰ کے صرف پانچ مورّخوں کا ذکر ہے ـــــ اور اس میں وہ ساری خامیاں موجود ہیں جو پہلی کتاب میں ہو سکتی ہیں۔ اس لیے جامعہ ملیہ کے شعبۂ تاریخ و تہذیب ہندوستان نے ایک سیمینار منعقد کرنے کی تجویز پیش کی تاکہ دَورِ وسطیٰ کے فنِ تاریخ نگاری کے بعض مسائل پر مزید بحث و مباحثہ ہو سکے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے بڑی فیاضی سے مالی امداد دی جس کے باعث سیمینار کا انتظام اور اس کتاب کی اشاعت ہو سکی۔ اس سیمینار میں موضوعات ذیل کے عنوانات کے تحت مجتمع کیے گئے تھے۔

(1) قبلِ سلطنت دَور کے مورّخین

(2) دہلی سلطنت کے مورّخین

(3) صوبائی حکومتوں کے مورّخین

(4) مُغل مورّخین

(5) فارسی کے علاوہ دوسری زبانوں کے مورّخین

(6) ہندوستان دَورِ وسطیٰ کے جدید مورّخین

حالانکہ زیرِ مطالعہ کتاب، جیسا کہ عنوانوں سے ظاہر ہے، خاصے وسیع علاقے اور لمبی مدت کا احاطہ کر لیتی ہے، پھر بھی اس میں بعض ایسے خلا رہ گئے ہیں جو اہم ہیں۔ بہرحال، مجھے توقع ہے کہ ہندوستانی دَورِ وسطیٰ پر لکھنے والے جدید اور وسطیٰ دَور کے کچھ ممتاز مورّخوں کے رُجحانوں اور طریقوں کو سامنے لانے کی وجہ سے، یہ کتاب ہندوستانی دَورِ وسطیٰ کو سمجھنے میں اور اس کی بابت ایک بہتر بصیرت پیدا کرنے میں طلبہ کی معاون ثابت ہوگی، اور وہ ان لغزشوں سے بچ سکیں گے جو اسی موضوع پر لکھتے وقت سابق طلبہ سے سرزد ہوتی ہوں گی۔

Marfat.com

اس بارے میں پہلے ہی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کو ماضی کا احساس ہمیشہ رہا ہے۔ لیکن یہ بات ہندوؤں پر صادق نہیں آتی۔ ہندوستان کا وہ واحد حصّہ جہاں قبلِ سلطنت دَور میں تاریخ نگاری کی روایت ملتی ہے کشمیر ہے۔ اس کا سبب وادیٔ کشمیر میں بُدھ دھرم کا قیام تھا، جس میں برہمن دھرم کے مقابلے میں تاریخ کا احساس کہیں زیادہ تھا، اور یونانی، چینی نیز اسلامی تہذیبوں کا اثر بھی اس کا سبب تھا۔ اسی سے اس بات کی تشریح ہو جاتی ہے کہ کلہن کی راج ترنگن کے بارے میں یہ کیوں سمجھا جاتا ہے کہ وہ "سنسکرت کے بچے کھچے سارے ادب میں صحیح تاریخ پیش کرنے کی واحد کوشش کے لحاظ سے ایک بے مثال کتاب ہے"۔ یہ صحیح ہے کہ کلہن بہت سے محدودات کا شکار رہا۔ وہ روایتوں اور پرانے قصّوں کی بنیاد پر تحریر کرتا ہے، اور واقعات کی تشریح کرتے وقت کرم، مقدر اور جادو ٹونا جیسے مافوق الفطرت اسباب کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن وہ تحریری اندراجوں اور کتبوں کا استعمال بھی کرتا ہے، اور اپنی آخری دو کتابوں میں کچھ اور سببی تشریحات بھی دیتا ہے۔ کلہن کا ذہن تجرباتی تھا، اور اس کی تحریر سے تاریخی ادراک کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن اس کے جانشین جو تاراج، شری ور، پراجیہ بھٹ اور شُکا، جنھوں نے اس کی ہمسری کی کوشش کی، تاریخی عمل کو کلہن کی گہرائی تک نہیں سمجھتے تھے۔

دہلی سلطانوں اور مقامی حکومتوں کا دور تاریخی تحریروں کے اعتبار سے نہایت مالامال ہے۔ لیکن ان تحریروں کو صحیح طور سے استعمال کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ ان اشخاص کی ذہنیت صاف طور سے سمجھی جائے جنھوں نے یہ تحریریں چھوڑی ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ انھوں نے لکھا ہی کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے مختلف اسباب کی بنا پر لکھا، شہرت کے واسطے، انعام کے لالچ میں اپنے سرپرست کو خوش کرنے کے لیے، اپنے ہمعصروں اور آیندہ نسلوں کے اخلاق کی اصلاح کے واسطے، مسلمان فرمانرواؤں کے کارناموں کی یاد محفوظ رکھنے کی خاطر اور انسان کے تئیں خُدا کے طریقوں کو جائز ثابت کرنے کے لیے۔

دورِ وسطیٰ کے مورّخوں نے اپنے فن پر سنجیدگی سے کام کیا اور تاریخ کی بابت نہایت اعلا

Marfat.com

نظریہ قایم رکھا۔ مثال کے طور پر برنی نے تاریخ اور علم الحدیث کو جُزواں تصوّر کیا، اور اس پر یقین رکھا کہ مورّخ کو سچائی کے لیے وقف ہو جانا چاہیے اور مُبالغہ آمیزی اور طول گوئی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ لیکن بد قسمتی سے چونکہ دَورِ وسطیٰ کے بیشتر مورّخین دربار سے وابستہ رہے اس لیے وہ نہ لکھ سکتے تھے جو سچ سمجھتے تھے اور اپنے سرپرستوں کی مدح سرائی کرنے لگتے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں سے بہت سے، جیسے مِنہاجِ سراج، حسن نظامی، امیر خُسرو اور برنی امرا کی اولاد تھے، جس کی وجہ سے وہ اپنی کہانیوں کا تانا بانا بادشاہوں اور امیروں کے گرد بُنتے تھے اور عام آدمیوں کی زندگی اور حالات کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ مزید برآں، چونکہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور ایسے زمانے میں رہتے تھے جس زمانے میں انسانوں کے ذہن پر مذہب کا غلبہ رہتا تھا، اس لیے انھوں نے ایسی زبان اور ایسا طریقہ اختیار کیا جس کی مدد سے ان کا بیان ان کے قاریوں کی سمجھ میں آسکے اور پسند کیا جائے۔ اس سے اس بات کی بھی وضاحت ہو جائے گی کہ انھوں نے دَورِ وسطیٰ کے فرمانرواؤں کو مذہب کا حامی کیوں ظاہر کیا، اور یہ ثابت کرنے کے لیے انتہائی مبالغے اور خطابت سے کام لیا۔ اسی لیے ضروری ہے کہ ان کے بیانات کو جُوں کے تُوں تسلیم نہ کیا جائے۔ اور ضروری ہے کہ ان کی طول گوئی اور مبالغہ آمیزی کی سطح سے نیچے جا کر سچائی دیکھی جائے۔ جیسا کہ پیٹر ہارڈی کا خیال ہے کہ وہ تاریخ کے لیے خام اشیا فراہم کرتے ہیں، لیکن اصلی مال تیار کرنا اسے بنانا سنوارنا اور صاف کرنا بہت ضروری ہے۔

دَورِ وسطیٰ کے مورّخ بار بار خُدا کا حوالہ دیتے ہیں کہ ہر واقعے کا اصل سبب وہی ہے لیکن ایک سماج میں، جس سماج پر عشری علم دین کا غلبہ ہو، ایسا کرنا ناگریز تھا۔ بہر کیف، اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے مادّی اسباب یکسر نظر انداز کر دیے تھے۔ یہ دکھانے کے لیے بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ دَورِ وسطیٰ کے مصنّفوں نے واقعات کی تشریح انسانی افعال کے ذریعے کی ــــ درباری سازشیں، انتظامی اقدامات، خارجی حکمتِ عملی یا بادشاہوں اور امیروں کی اُمنگیں۔ کیونکہ اپنی ساری مذہبی ظاہرداری کے باوجود وہ دُنیادار لوگ تھے جو دُنیاوی چیزوں کے بارے میں دُنیادار لوگوں کے واسطے دُنیاوی مقاصد کے حصول کی خاطر لکھ رہے تھے۔

Marfat.com

دَورِ وسطیٰ کے مؤرخوں میں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ انھیں ان سماجی اور اقتصادی قوتوں کا اِدراک نہیں تھا جو سماج میں زبردشت تبدیلیوں کا اور حکومتوں کے زوال کا سبب بنتی ہیں۔ بہرحال یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ "تاریخ کو ایک ایسا سلسلۂ واقعات سمجھتے ہیں، جس کے واقعات اکثر اوقات ایک دوسرے سے جُدا اور تعلّقات اور ظاہری سے بیسترا ہوتے ہیں"۔ اس عہد کی تاریخی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دَورِ وسطیٰ کے مورّخ ـــــ اور اس میں مُغل مورّخ بھی شامل ہیں ـــــ ایک دَورِ حکومت اور دوسرے دَورِ حکومت کے درمیان خیالات، واقعات اور اداروں کے رشتوں اور تبدیلیوں سے باخبر تھے۔ صرف یہی حقیقت، کہ ان میں سے بہتوں نے صرف ایک دَورِ حکومت کی تاریخ لکھنے پر قناعت نہ کی بلکہ حکومتوں کے سِلسلوں کا حال لکھا، اس بات کی مظہر ہے کہ وہ سماجی، سیاسی اور مذہبی تبدیلیوں سے اور واقعات کے درمیان تعلّقات سے واقف تھے۔

جب ہم مُغل دَور میں داخل ہوتے ہیں تو تاریخی تحریروں میں معیاد کے اعتبار سے ایک تبدیلی نظر آتی ہے۔ ابوالفضل، اکبر کا دوست اور مُشیر، وہ شخص تھا جو اس تبدیلی کا ذِمّہ دار تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ابوالفضل کی بہت سی محدودات ہیں۔ اس کی زبان مرصع اور طولانی ہے۔ وہ اکبر کی خوبیوں کو اُبھارتا اور اس کی غلطیوں پر پردہ ڈالتا ہے۔ وہ اپنے آقا کے کارنامے بیان کرنے میں اتنا غرق رہتا ہے کہ عام انسانوں کی زندگی اور حالات نظرانداز کر دیتا ہے۔ برنی اور بدایونی کی طرح اس کا بیان بھی نہایت داخلی ہے، لیکن ان کے برخلاف اس کی تحریر میں اس کے زمانے کا عکس نظر نہیں آتا۔ لیکن اس سب کے باوجود ابوالفضل ہی وہ شخص تھا جس نے پہلی بار تاریخ نگاری کے تسلیم شدہ رُجحان اور طریقے کے خلاف بغاوت کی اور ایک نئی راہ نکالی۔ وہ پہلا ہندوستانی مورّخ تھا جس نے تاریخ کے بارے میں عقلی اور غیرمذہبی اندازِ نظر اپنایا۔ وہ تاریخ کو علمِ دین کا شریک نہیں سمجھتا، بلکہ تاریخ اور فلسفے کے درمیان قریبی رشتہ قایم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ہندوستانی تاریخ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تصادم پر نہیں بلکہ استحکام اور انتشار کی قوتوں کے تصادم پر مشتمل تھی ـــــ اوّل الذکر قوتوں کی نمایندگی مُغل حکومت اور آخرالذکر قوتوں کی

Marfat.com

نمایندگی زمیندار کرتے تھے۔ وہ اپنے سابقہ مصنفوں کے اس روایتی نظریے کو تسلیم نہیں کرتا کہ ہندوستانی تاریخ کا تعلق صرف مسلمان فرمانرواؤں کے کارناموں سے رہنا چاہیے، بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ اس میں ہندوؤں کی تاریخ، فلسفے اور مذہب کا ذکر بھی ہونا چاہیے۔ اس نے اپنی کتابوں کی شہادتی بنیاد کو وسعت دی اور محافظ خانے کے پرانے کاغذات اور دوسرے ایسے بیانوں سے استفادہ کیا جو تحریری اور زبانی دونوں طرح کے تھے، لیکن انھیں ایسی صورت میں تسلیم کیا جب چھان بین کے بعد ان کی اچھی طرح تصدیق ہوگئی۔ عبدالحمید لاہوری، خفی خاں اور سترھویں نیز اٹھارھویں صدیوں کے دوسرے دیگر مورخوں نے اس کے طریقے کی تقلید کی، لیکن انھوں نے فنِ تاریخ نگاری میں کوئی اہم اضافہ نہیں کیا۔

جدید خطوط پر دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کے مطالعے کی ابتدا برطانوی محققوں نے اٹھارھویں صدی کے اواخر میں کی، اور مطالعے کی اس قسم کا پہلا دور انیسویں صدی کے وسط تک چلتا رہا۔ ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے برطانوی مورخین اس زمانے کے برطانیہ کی تاریخی تحریروں کے طریقے، رجحانوں اور خیالوں سے متاثر تھے۔ حالانکہ وہ مغرب کے سماجی، سیاسی اور ثقافتی اداروں کو برتر سمجھتے تھے لیکن ان کا اندازِ نظر ــــ یہ بات خصوصاً ڈاؤ۔ ڈف۔ ارسکائن اور الفنسٹن پر صادق آتی ہے ــــ بحیثیتِ مجموعی ہمدردانہ تھا۔ ان میں سے بعض جیسے جون مرگس ازعانی فیصلوں کے خلاف تھے، اور اس نظریے کے حامی تھے کہ ہندوستان کے ماضی کی بابت اخلاقی فیصلے صادر کرنے کے لیے کافی ثبوت موجود نہیں ہیں۔ وہ نہ صرف جنگوں اور فتوحات میں دلچسپی لیتے تھے بلکہ انتظامِ حکومت، سماجی رواجوں، مذہبی عقیدوں اور ہندو دھرم پر اسلام کے اثرات جیسی باتوں میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور انھوں نے دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ لکھتے وقت نہ صرف فارسی کی تاریخی کتابوں اور یورپی سیاحوں کے سفرناموں پر زور دیا، بلکہ فرمانوں ادبی ماخذوں اور آثارِ قدیمہ کی شہادتوں پر بھی زور دیا۔

136635

ہندوستانی دورِ وسطیٰ پر برطانوی تاریخ نگاری کی تاریخ کا دورِ آزاد خیالی الفنسٹن سے

Marfat.com

ساتھ ختم ہوگیا۔ ایلٹ، جس نے دوسرے دَور کا آغاز کیا، دَورِ وسطیٰ کے موّرخوں کے بارے میں بڑی خراب رائے رکھتا تھا۔ اسے نہ صرف یہ کہ دَورِ وسطیٰ کے ہندوستانی ماضی سے نہ کوئی ہمدردی تھی نہ اس کا ادراک تھا، بلکہ اس نے اس دور کے بارے میں پر تعصّب اور قدرے حقارت آمیز رویّہ اختیار کرلیا تھا۔ بعد کے برطانوی موّرخین نے اس کی تقلید کی، اور اس زمانے کی یورپی فنِ تاریخ نگاری کے زیادہ صحت مند رُجحانوں اور طریقوں کو نظر انداز کر دیا۔ چونکہ ان میں سے زیادہ تر خود منتظم رہ چکے تھے، اس لیے انھوں نے زندگی کے دوسرے پہلو نظر انداز کرکے تاریخ کو سیاست اور انتظام تک محدود کردیا، اور یہ نہ سمجھ سکے کہ انسانی سماج کس طرح کام کرتا ہے۔ انھوں نے خصوصاً فارسی کی تاریخی کتابوں پر تکیہ کیا اور تجزیے، ترجمانی نیز ادراک کی کوشش کیے بغیر انھیں تسلیم کرلیا۔

جہاں تک سوویت موّرخوں کا معاملہ ہے، انھوں نے ہندوستانی دَورِ وسطیٰ اور خصوصاً مُغل دَور میں ابھی حال ہی میں دِلچسپی لینا شروع کی ہے۔ لیکن اس دَور میں ان کی دِلچسپی محض ضمنی ہے، اور ان کی اس خواہش کا نتیجہ ہے کہ جدید ہندوستانی تاریخ کے ان پہلوؤں کو بہتر طور سے سمجھیں جن کی جڑیں ماضی میں ہیں۔ حالانکہ وہ بڑا مفید کام کررہے ہیں، لیکن ان کی تحقیقات میں تین خامیاں ہیں۔ پہلی یہ کہ ہندوستانی حالات پر انھوں نے مارکسی خیالات کا جو اطلاق کیا ہے وہ خاصہ بے لچک ہے۔ دوسری یہ کہ مغل تاریخ سے وہ صرف ایسی ہی مثالوں کا انتخاب کرتے ہیں جن سے ان کے نظریوں کی تائید ہو سکے۔ تیسری یہ کہ وہ زیادہ تر یورپی سیاحوں کے سفرناموں اور مطبوعہ فارسی مَتنوں اور ان کے انگریزی ترجموں پر تکیہ کرتے ہیں، غیر مطبوعہ مسوّدوں اور تحریروں کی اس بڑی تعداد سے استفادہ نہیں کرتے جو مُغل دَور کی اقتصادی تاریخ پر خاصی روشنی ڈالتے ہیں۔

ہندوستانی دَورِ وسطیٰ کی تاریخ نگاری کا آغاز انیسویں صدی کے ابتدائی حصّے میں ہوا تھا۔ لیکن پہلا تخلیقی کام سر سیّد احمد خاں کی آثار الصنادید تھی جو 1849ء میں لکھی

Marfat.com

گئی تھی۔ دَورِ وسطیٰ کے مورّخوں کی کتابیں سر سیّد کے لیے مثالی نمونے تھیں، اور تاریخ نگاری کے مغربی طریقوں سے وہ کافی بعد میں آشنا ہوئے تھے۔ فارسی کے مختلف تاریخی متنوں کی تدوین کرتے وقت انھوں نے غالباً انہی طریقوں سے کام لیا تھا۔ بہرحال، یہ بدقسمتی ہی تھی کہ علی گڑھ تحریک میں مصروف رہنے کی وجہ سے بحیثیت مورّخ ان کی ترقی رُک گئی۔

دو اور مصنّف جو لایقِ ذکر ہیں، ذکاءاللہ اور شبلی ہیں۔ ذکاءاللہ نے بہت کچھ لکھا لیکن ان میں تنقیدی طور سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت کم تھی، اور وہ دَورِ وسطیٰ کے مورّخوں کا محض مفہوم ادا کر دیتے تھے۔ شبلی نے بیرونِ ہند کے اسلامی ماضی کی بابت جتنا کچھ لکھا اُتنا اندرونِ ہند کی بابت نہیں لکھا۔ بہرحال، انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ایک حمایتی کی طرح لکھا۔ حالانکہ وہ اپنے اس تعلّق کا اعلان کرتے تھے کہ ایک مورّخ کو حق اور معروضیت کے لیے وقف ہو جانا چاہیے، اور انھوں نے مورّخوں کی رہنمائی کے لیے کچھ اصول بھی وضع کیے تھے، لیکن خود انھوں نے سائنٹفک انداز کے اصولِ تاریخ نگاری پر عمل نہیں کیا۔

اُنیسویں صدی کے ابتدائی حصّے میں جن ہندوستانی محقّقوں نے مغربی خطوط پر انگریزی زبان میں دَورِ وسطیٰ کے ہندوستان پر تحقیق شروع کی وہ ہندوستانی دَورِ وسطیٰ کے برطانوی مورّخوں کے نقشِ قدم پر گامزن ہوئے۔ بیسویں صدی کا تیسرا عشرہ وہ زمانہ تھا جب قومی خیالات سے متاثر ہو کر اور یورپی فنِ تاریخ نگاری کے جدید ترین رُجحانات قبول کر کے ان میں سے بعض محقّقوں نے تحقیق کے جدید طریقے اپنانے شروع کیے اور تفتیش کے واسطے نئے میدان ڈھونڈ نکالے۔ حالیہ برسوں میں ہندوستانی تاریخ نگاری نے سر لیوس نیمئر، مارک بلوخ اور لیفیرے جیسے مورّخوں سے اثر لے کر مزید ترقّی کی ہے۔ لیکن یہ بات ابھی پورے طور سے نہیں سمجھی گئی ہے کہ ہندوستانی دَورِ وسطیٰ کی تاریخ اس وقت تک ازسرِنو نہیں لکھی جا سکتی ہے تک دَورِ وسطیٰ کی تاریخی کتابیں، دَورِ وسطیٰ کی رُوح اور اُس دَور کے مورّخوں کے

Marfat.com

سماجی اور مذہبی پس منظر، ان کی نفسیات، ان کے خیالات، عادات اور طریقوں کو سمجھ کر نہیں پڑھی جائیں گی۔ اگر زیرِ نظر کتاب فکر و خیال کو ان خطوط پر تحریک دِلا سکی، تو اِس سیمینار کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

ایم۔حسن

Marfat.com

Marfat.com

تاریخ کے بارے میں کلہن کے وہ خیالات
جو راج ترنگنی میں بیان کیے گئے ہیں

رومیلا تھاپر

کلہن نے لوکیکا دور کے 4224 ویں برس میں جس کا سنِ عیسوی 49-1148ء بنتا ہے کشمیر کی تاریخ کے بارے میں اپنا روزنامچہ لکھا، جس کا نام اس نے راج ترنگنی رکھا۔ کتاب کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ وہ کشمیر کے ایک عظیم منتری اور مشہور و معروف حاکم کمپاکا کا بیٹا تھا۔ یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ کمپاکا کشمیر کے راجہ ہرش (1101-1089ء) کا منتری تھا[1]۔ یہ بات بڑی حد تک دُرست معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہی صورت ایسی ہو سکتی ہے جس سے کلہن کی رسائی اِن سیاسی اور سرکاری معاملات تک ہوئی ہوگی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ان ہی کی بُنیاد پر اس نے دَورِ وسطیٰ کے کشمیر کی تاریخ کا تجزیہ کیا ہے۔ اگر وہ محض ایک معمولی مصنّف ہوتا، جیسا کہ اکثر اس کے قریبی دَور کے دوسرے ہمعصروں کی تحریروں میں کیا گیا ہے، تو یہ تجزیہ یا تو سارے بیان کا ایک چھوٹا سا جُز ہوتا یا پھر سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ روزنامچے کی ادبی شکل وہ ہے جسے کاوے (نظم) کہا جاتا ہے۔

راج ترنگنی ایک لمبی بیانیہ نظم ہے جس میں ابتدائی زمانے سے لے کر بارھویں صدی عیسوی تک کشمیر کی تاریخ کے واقعات قلم بند کیے گئے ہیں[2]۔ یہ روایتوں، قصّوں، تحریری دستاویزوں اور کُتبوں پر مبنی ہے۔ کلہن کا بیان ہے کہ اس نے بڑی کاوش سے ایسی مقبول عام روایتیں اِکٹھا کی ہیں جن کا تعلق ان مقامات سے ہے جو تاریخی اعتبار سے دلچسپ رہے ہیں۔ اس نے ایسی

Marfat.com

بڑی تصنیفات سے بھی رجوع کیا ہے جو کسی علاقے کے بارے میں لکھی گئی ہیں جیسے نیل ماتا پران کسیندر کی تصنیف ترپاولی، ہیل راجہ کی تصنیف پرتھوی داولی، چوویلاکار وغیرہ۔ ان سارے ماخذوں میں نیل ماتا پران کشمیر کی ابتدائی تاریخ پر سب سے اہم روایتی ماخذ ہے، گو دُرست تاریخی ماخذوں کی حیثیت سے اس میں بھی وہ ساری کمزوریاں موجود ہیں جو اور دوسرے پرانوں میں ہیں۔ ماخذوں کی ایک اور قسم مہتمے اس بنا پر باعثِ دلچسپی ہے کہ یہ خاندانوں سے تعلق رکھنے والے ان پروہتوں کی دستی کتابیں ہیں جو مختلف تیرتھ استھانوں میں رہتے تھے۔ مثال کے طور پر وتست مہتمے میں وتست یا دریائے جہلم کے کنارے کشمیر کے اہم تیرتھ استھانوں کا ذکر ملتا ہے، اور ان تاریخی واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ (جو روایت کے طور پر نسلوں میں منتقل ہوتے رہے) جن کا تعلق ان مقامات سے ہے۔

ماخذی اشیا کے طور پر کتبات کا استعمال کرکے کلہن نے اپنی تاریخی تحریر میں ایک نہایت جدید عنصر شامل کر دیا ہے۔ وہ ان کتبوں کا حوالہ دیتا ہے جو مندروں میں ملے، گذرے ہوئے راجاؤں پر لکھی جانے والی پرشاستیوں (قصیدوں) کا حوالہ دیتا ہے۔ اور ان کتبوں کا حوالہ دیتا ہے جن میں پُرانے راجاؤں کے عطیوں، خصوصاً زمین یا لگان سے متعلق عطیوں کا ذکر ہے۔ کتبوں کا حوالہ بذات خود اتنا اہم نہیں ہے جتنی یہ حقیقت کہ ان میں دی ہوئی معلومات کو وہ تاریخ کے ایک جائز ماخذ کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔

کلہن تاریخ نگاری کے مقاصد سے واقف تھا، اور اپنے روزنامچے کے یہ مقاصد واضح طور سے بیان کرتا ہے: کشمیر کے راجاؤں کا سلسلۂ حکومت اور صحیح تاریخ وار تسلسل قایم کرنے کی کوشش، گذرے ہوئے زمانے کا ایک ایسا بیان جو پڑھنے کے لائق ہو، اور گذرے ہوئے زمانے کی ایک ایسی شرح جس کی بنا پر پڑھنے والے زندگی کے مزاج اور اس کی ثباتی پر غور کرسکیں۔ سب سے آخری مقصد سے ہمیں اس کے فلسفۂ تاریخ کے بارے میں ثبوت ملتا ہے۔

دھرم کا خیال کلہن کی رگ و پے میں سرائت کیے ہوئے تھا۔ اس کے بموجب تاریخی واقعات کا بُنیادی کام دھرم کے نظام کے سارے پہلوؤں یعنی مذہبی، سماجی نیز قانونی پہلوؤں

Marfat.com

کو کھول کر سامنے لے آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نہ صرف مذہب کی روایتوں سے وابستہ رہا جائے بلکہ سماجی اداروں کو بھی اسی طرح برقرار رکھا جائے جیسے شاستروں میں لکھا ہوا ہے۔ لیکن، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ کلہن اس معاملے میں غیر استدلالی نہیں تھا۔ پھر بھی اس کی تاریخ میں نظریۂ کرم کا کوئی نہ کوئی مقام ہونا ہی چاہیے تھا۔ چنانچہ کسی بھی حکمراں کے بارے میں مشکل تشریحات سے بچنے کا یہی راستہ نظر آیا کہ اس حکمراں کی موجودہ زندگی پر سابقہ پیدائشوں کا اثر دکھا دیا جائے۔ اس کے دوسرے ہمعصروں نے بھی اکثر یہی راستہ اختیار کیا ہے کہ راجاؤں اور سیاست دانوں کے افعال کی اسی طرح توجیہہ کر دی ہے[3]۔ جو انسانی واقعات کی توجیہہ کے سلسلے میں کرم کے تصور سے وابستہ کر کے قسمت کے رول کو بھی خاصی اہمیت دی جاتی تھی۔ کلہن قسمت کی دخل اندازی کے بارے میں تو اتنا زیادہ لکھتا، پھر بھی یہ تصور کہیں کہیں کارفرما نظر آجاتا ہے۔ مثال کے طور پر، اس بات کی توجیہہ ہیں، کہ کشمیر کا راجہ ہرش کیوں کمزور ہو گیا اور بالآخر اپنے دشمنوں سے ہار گیا، جو مختلف اسباب بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک قسمت کی طاقت بھی ہے[4]۔ مندرجہ بالا تصور سے متعلق ایک تصور خدائی انتقام کا ہے جو بُرے راجاؤں کے سلسلے میں خصوصیت سے کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ رُویہ جزوی طور سے اس ناکامی کے باعث بنتا ہے۔ جو خراب راجاؤں کو نکال پھینکنے میں لوگوں کو ہوتی ہے۔ لیکن خدائی انتقام کے ساتھ ہی خوشنودئ بھگوان کا عقیدہ بھی ملتا ہے، جو دینداری کے نیک کام کر کے حاصل کی جا سکتی ہے، جیسے برہمنوں کو معقول قسم کے تحائف دے کر جادو ٹونے کا استعمال بھی، خصوصاً انتقامی حربے کی حیثیت سے، ان بہت سے ممکنہ تاریخی اسباب میں شامل رکھا گیا ہے جو واقعات کا جواز بنانے کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔

یہ بات خلاف توقع نہیں ہے کہ کلہن بغیر کسی جھجک کے ماضی کے واقعات سے اخلاقی سبق اخذ کر لیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ یاد رکھنا بھی بےحد ضروری ہے کہ وہ ایک ایسے دور میں لکھ رہا تھا جو کشمکش، خانہ جنگی اور سیاسی انتشار کا دور تھا۔ اور مصنفین کے لیے یہ تقریباً لازمی تھا کہ وہ ان خطرات سے واقف کرائیں جو اسی قسم کے حالات کی بنا پر پیدا ہوئے، اور خواہ انہیں

Marfat.com

اخلاق پرست اور ناصح ہی کیوں نہ کہا جائے، مگر وہ لوگوں کو ان خطرات کے نتائج سے ضرور آگاہ کردیں۔ غالباً یہ خوف، کہ اگر خانہ جنگی ہوتی رہی تو کشمیر کا کیا بنے گا، اس بات کا سبب بنا کہ کسی مافوق الفطرت ہستی پر بھروسہ کیا جائے۔

تاریخ نویس کے بارے میں کلہن کے خیالات پر ہندوستانی روایت کے ان دونوں دھاروں نے براہِ راست اثر ڈالا جو ماضی کا حال درج کرنے سے تعلق رکھتے تھے، یعنی برہمن اور بدھ روایتوں نے۔ برہمنی روایت سے تعلق رکھنے والے خیالات رامائن و مہابھارت، پران اور گپتا دور کے بعد کی ان تاریخی سوانحوں، جیسے بان کی ہرش چرتر وغیرہ، سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے کسی بھی کتاب سے وقت کا صحیح شعور نمایاں طور بر ظاہر نہیں ہوتا۔ ان کتابوں میں ماضی ایسے کائناتی سلسلوں کی شکل میں پھیلا ہوا ایک دور ہے جس میں اہلِ باطن نظر آتے ہیں۔ شجرے بڑی احتیاط سے تیار کیے گئے ہیں لیکن اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے کہ افراد اور واقعات کو ماضی میں صحیح مقام دیا جائے، خصوصاً وقت کے تسلسل کے اعتبار سے ان کے مقام کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔ پرانوں میں تاریخی حصّوں کو دیو مالا کی کہانیوں کا تقریباً جزو بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کی بنا پر کہ، گذرے ہوئے اصلی واقعات کے صریحی حوالے دینے کے باوجود انھیں پیشن گوئی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، قاری کی توجہ واقعات سے ہٹ جاتی ہے اور وہ یہ نہیں سمجھ پاتا کہ یہ دراصل تاریخی واقعات بیان کیے جارہے ہیں۔ ان کا فلسفہ اور سماجی ڈھانچہ دھرم کے تصوّر نے فراہم کیا ہے۔ اگر ان میں ورن، آشرم، دھرم کے نظام ہی کو پیشِ نظر رکھا جاتا تو سارے واقعات کی تشریح اس نظام کے تحت ہوسکتی تھی۔ لیکن اس روایت میں سارا زور گروہوں پر یعنی کنبہ ذات قبیلے پر تھا، فرد پر نہ تھا۔

بدھ روایت نمایاں طور پر مختلف تھی۔ اس میں وقت کا احساس بڑا نمایاں ہے، اور ہر واقعے کا تعلق بدھوں کے ماضی کے مرکزی واقعے یعنی مہاپر نروان سے ہے جو تاریخی اعتبار سے گوتم بدھ کی تاریخِ وفات ہے۔ لنکا کے دو روزنامچوں دیپاوامس اور مہاوامس میں تاریخوں کا حساب اسی

Marfat.com

واقعے کی بُنیاد پر کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس روایت میں کرم کے تصوّر کو مانا گیا ہے۔ لیکن ہر فرد کے کرم کو سماجی اعتبار سے بھی دیکھا گیا ہے۔ اس روایت بموجب ماضی اخلاقی اور سماجی دونوں طرح کے سبق سکھا سکتا ہے۔ چونکہ بُدھ مذہب عملی طور پر تبلیغی مذہب تھا اور اس کے مُبلغ ایشیا کے مختلف حِصّوں میں بھیجے گئے تھے، اس لیے یہ ضروری تھا کہ اُستادوں اور مُبلغوں کے بارے میں صحیح اندراجات رکھے جائیں اور انھیں محفوظ رکھا جائے۔ یہی ریکارڈ بعد میں تاریخ لکھنے اور اس پر بہت کچھ غور و فکر کرنے کی بُنیاد ثابت ہوا۔

غور و فکر کی انھی دو روایتوں کا اثر کلہن کی تحریر کی اس بتدریج تبدیلی میں دیکھا جا سکتا ہے جو راج ترنگنی میں نظر آتی ہے۔ روز نامچے کا ابتدائی حِصّہ نہ صرف یہ کہ برہمنی مواد پر مبنی ہے بلکہ تاثیر بھی دیتا ہے کہ اس کا تاریخی ڈھانچہ بھی برہمنی ہے۔ پہلی تین کتابیں صاف طور سے نیم تاریخی مواد پر مبنی ہیں، جن میں ایسی کتابوں پر بہت کچھ بھروسہ کیا گیا ہے جیسے نیل ماتا پران۔ چوتھی کتاب کرکوٹ عہدِ حکومت کے بارے میں ہے اور اس میں تقریباً آٹھویں صدی تک کا بیان ہے تحریر سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس میں بُدھوں کی شمالی ہند کی روایت استعمال کی گئی ہے، کیونکہ یہ بات بڑی واضح ہے کہ بیان کسی تاریخی بُنیاد پر کیا جا رہا ہے۔ کشمیر کی تاریخ کے اس دَور کے بارے میں کچھ ثبوت چین کے تانگ دَورِ حکومت کے وقایع میں مِلتے ہیں (مثال کے طور پر ہمیں بتایا گیا ہے کہ تقریباً میں جب غالباً عربوں نے سِندھ پر حملہ کیا اور سِندھ کے اُوپری علاقوں کو ان سے خطرہ پیدا ہوا تو چین۔ تو۔ لو۔ پی۔ لی۔ نے، جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ راجا کاندراپد تھا، عربوں کے خلاف مدد مانگی تھی) اگر اس وقت چین سے رسل و رسائل اس درجہ آسان تھے (اور اس بات پر شبہ کرنے کا کوئی سبب نظر نہیں آتا) تو عین ممکن ہے کہ چین میں اندراجات رکھنے پر اور شاہی وقایع نگار پر جو زور دیا جاتا تھا اس کا اثر کشمیر کی تاریخ نویسی کی روایتوں پر پڑا ہو۔ اگلی تین کتابوں (پانچویں سے ساتویں تک) میں تاریخی واقعات کو ان کے سیاق و سباق میں سمجھنے اور ایسی تشریحات کے علاوہ جو عام طور پر دھرم و کرم کی بُنیاد پر کی جاتی تھیں دوسری قسم کی تشریحات کی جانب ایک

Marfat.com

نمایاں رُجحان ملتا ہے۔ بہت سے نئے سببی عناصر ملتے ہیں (جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا) جن سے یہ پتہ لگتا ہے کہ مصنّف تاریخی ماضی میں اور زیادہ تلاش و تحقیق کرنا چاہتا تھا اور خود کو محض معلومات دینے تک محدود کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تاریخ کے بارے میں کلہن کے غور و فکر کی پختگی کا ثبوت راج ترنگنی کی آخری جلد (آٹھویں کتاب) میں ملتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ طویل کتاب ہے اور اس عہد کے بارے میں ہے جو کلہن سے فوراً پہلے کا عہد تھا۔ ظاہر ہے کہ اس عہد سے اس کی واقفیت سب عہدوں سے زیادہ رہی ہوگی۔ توقع کے مطابق اس کتاب میں تجربے کا معیار پہلی ساری جلدوں کے مقابلے میں واضح طور سے مختلف ہے۔

یہ روزنامچہ قاری کو ارضِ کشمیر کی ابتدا کی طرف لے جاتا ہے جب وادیٔ کشمیر اندرونِ ملک قسم کی ایک جھیل تھی۔ بالآخر اس کا پانی ایک گھاٹی کے راستے باہر نکالا گیا جو بادہ مولا سے اوپر کی طرف واقع تھی، اور روایتی ماخذوں میں بڑے فطری طور پر اس کام کو کسی مافوق الفطرت ہستی کا کرشمہ بتایا جاتا ہے۔ کشمیر کے قدیم ترین راجاؤں، جیسے گناڈ اول، کا تعلق رامائن اور مہا بھارت کے بہادروں اور روایتی تاریخ سے اسی انداز سے قایم کیا گیا ہے جیسے پرانوں میں کیا جاتا ہے۔ چنانچہ گناڈ اول کا تعلق جارا سندھ سے قایم کیا گیا ہے، اور وہ مہا بھارت کی مختلف لڑائیوں میں حصّہ لیتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ بیان نیل ماتا پران پر مبنی ہے جس میں یقیناً اس بات کی کوشش کی گئی ہوگی کہ کشمیر کے قدیم راجاؤں کا تعلق اسی روایتی تاریخ سے قایم کیا جائے جو بڑے پرانوں میں ملتی ہے۔ مزید یہ کہ، بحیثیت فرمانروائے کشمیر، موریہ راجہ اشوک کے دورِ حکومت کے حوالے دے کر کشمیر ہندوستان کی تاریخ کے دائرے میں لایا گیا ہے۔ استوپ بنوانے اور سری نگر کا شہر آباد کرانے کے سلسلے میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ بیانات صاف طور سے بُدھ ماخذوں پر مبنی ہیں، کیونکہ پرانوں میں اشوک کا محض یہ تذکرہ ہے کہ وہ ایک موریہ راجہ تھا۔ اس کے علاوہ اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔

اس سے پہلے کی کتابوں میں فوق الفطرت اسباب کو ایک اہم درجہ دیا گیا ہے۔ چنانچہ

Marfat.com

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ قحط دیوتاؤں کی ناراضگی کی وجہ سے آتے ہیں۔[5] جب رانی دیوتاؤں کی پوجا کرتی ہے تو غذا کی یہ کمی رفتہ رفتہ دور ہونے لگتی ہے۔ اس سے ہمیں کہیں زیادہ عجیب کہانی سندھی ماتا[6] کے دوبارہ زندہ ہونے کی ہے۔ اسے پہلے جلاوطن کہا جاتا ہے، پھر قید کہا جاتا ہے، اور پھر راجہ اسے مار ڈالتا ہے۔ بھتینا آتی ہیں اور اس کی ہڈیوں کو جوڑ کر ڈھانچہ بنا دیتی ہیں اور دوبارہ زندہ کر دیتی ہیں۔ اس کے بعد وہ راجہ جتیندر کا جانشین بن جاتا ہے۔ یہاں نہ صرف ایک مافوق الفطرت ہستی شامل بیان ہے بلکہ قسمت بھی بیان میں شامل ہے، کیونکہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ سندھی ماتا کی قسمت میں یہ لکھا تھا کہ وہ کشمیر کا راجہ بنے گا، اور اس دیش کو بہت سی بری رسموں اور رواجوں سے چھٹکارا دلائے گا۔ قسمت کی دخل اندازی کی ایک اور مثال[7] راجہ وجے مل کا عین اس وقت برف کے تودوں میں دب کر مرجاتا ہے جب وہ اور بہت سے دوسرے جاگیردار راجہ ہرش پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ بدھ دھرم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت برہمنوں اور ناگاؤں (مقامی دیویاں اور دیوتا) دونوں کو برہم کر دیتی ہے۔ اس مقبولیت کو روکنے کے لیے ناگا ایک خاص وقت پر برف کے بڑے بڑے تودے لٹکا دیتے ہیں، جنھیں برہمن بڑی چالاکی سے بدھوں[8] کے خلاف استعمال کر لیتے ہیں۔ ایک اور انوکھا واقعہ چوتھی کتاب میں دیا گیا ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ راجہ للت دت اس بنا پر بہت مشہور ہوا ہے کہ اس نے اپنے اِردگرد بہت سے عقل مند آدمی جمع کر لیے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام تخارا (وسطِ ایشیا) تھا جسے کنکونا کہا جاتا تھا۔ کسی خاص موقعے پر اس نے پنجاب کی ایک ندی کے آبِ سرکش پر جادو کیا جس سے پانی بیچ سے جدا ہو گیا اور فوج کو ندی پار کرنے کے لیے راستہ مل گیا۔[9] یہ واقعہ پڑھنے کے بعد خیال ہوتا ہے کہ کہیں موسا اور بحرِ احمر کی کہانی کی بازگشت کشمیر نہ پہنچ چکی ہو۔

اس جنم اور پچھلے جنموں کے افعال، کرم اور ثواب یعنی پن کو بھی عملی تاریخ کا حصہ سمجھا گیا ہے۔ خواہ راجہ کی نیت کتنی ہی اچھی ہو اس کے کاموں میں اس لیے بھی رکاوٹ پڑ سکتی تھی کہ اس نے یا اس کی رعایا نے کم پن کیے ہوں۔[10] اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اسی بنا پر راجہ کوئی کام نہیں کر پاتا تھا بلکہ

Marfat.com

شاید یہ ان رکاوٹوں کی تشریح کرنے کی کوشش ہے جو ایک اچھے ارادے کی تکمیل کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔

ساتویں آٹھویں جلدیں کلہن کے بعد کے دور کے تاریخی غور و فکر کی نمایندگی کرتی ہیں۔ ان میں بھی فوق الفطرت عناصر اور قسمت کے رول پر زور دینے سے گریز نہیں کیا گیا ہے' لیکن اور دوسری سببی تشریحات کی موجوگی کی بنا پر ایسا لگتا ہے جیسے انھیں پس پشت ڈال دیا گیا ہو' تاریخی واقعات پر مختلف زاویوں سے بحث کی گئی ہے' جیسے واقعات میں ملوث ہونے والے افراد اور ان کی امنگوں پر' ان کی کمزوریوں اور طاقت پر' جاگیرداروں کے ظہور اور راجہ سے ان کے تعلقات پر' کشمیر کی سیاست میں دماروں اور برہمنوں کے حصے پر' کشمیر کی معاشی حالت پر۔ کلہن جب گیارھویں اور بارھویں صدیوں پر لکھ رہا تھا تو گویا وہ خود اپنے دور کے بارے میں لکھ رہا تھا' اور ان مختلف پہلوؤں سے واقف تھا جو تاریخی صورتِ حال بنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ ان سارے اسباب کو سمجھ لیتا ہے۔

راجہ ہرش کے زوال کی بابت غور کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ پیدائش کے وقت سیارے اس کے حق میں نہ تھے' اور اسی وجہ سے قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا" لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ہرش کمزور تھا کیونکہ اس نے جنگوں سے گریز کیا' اور اس زمانے کے حالات میں بہت سے مسائل محض جنگوں کے ذریعے ہی حل کیے جاسکتے تھے۔ اس کے علاوہ ہرش میں قوتِ فیصلہ کم تھی' خصوصاً اشخاص کے بارے میں۔ اس نے غلط قسم کے لوگوں کو منتری بنایا اور ان کے مشوروں پر عمل کیا۔ کسی بھی راجہ کی کمزوری کی ایک قابلِ مذمت وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ چال باز عورتوں کے اثر میں آجاتا ہے[12]۔

قرونِ وسطیٰ کے کشمیر کی سیاست پر درباری فرقے حاوی تھے۔ دونوں فوجی قسم کے تھے۔ ایک تانترین تھا اور دوسرا الکانگا۔ دسویں صدی کے پہلے نصف میں یہ فرقے حاکموں کو اُتارتے بٹھلاتے رہے۔ درباری سیاست میں ان کے بڑی ہوشیاری کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں[13]۔ اس

Marfat.com

کے بعد کی صدی میں طاقت کے مرکز صرف راجہ اور منتری ہی نہیں بہت سے دمارے بھی بن گئے تھے۔ دمارا مخصوص کشمیری لفظ ہے اور لگتا ہے یہ دراصل کوئی قبائلی نام ہے۔ راج ترنگنی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ بہت کم مدت میں زمینوں کی ملکیت کے باعث جاگیر دار بن گئے تھے[4]۔ ایسا لگتا ہے کہ اپنے زمانۂ ملازمت میں انھوں نے زمینیں حاصل کرلی تھیں اور وادی کے زرخیز خطوں میں رفتہ رفتہ نہایت طاقتور ہوگئے تھے۔ ان کا سماجی مرتبہ اسی بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے راجپوت عورتوں سے اور اکثر شاہی خاندان میں شادیاں کی تھیں۔ یہ لوگ راجہ کی مخالفت کا ایک بڑا ذریعہ تھے اور اس دور کے کشمیر کی تاریخ ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات سے پٹی پڑی ہے جن کا تعلق دماروں سے ہے۔

انتظامیہ پر بحث کرتے وقت کلہن کائستھوں کی سرگرمیوں کو بالکل پسند نہیں کرتا اور ریاست کی بدنصیبی کی بہت کچھ ذمہ داری انہی لوگوں پر ڈالتا ہے۔ کائستھ اندراجات رکھتے تھے، اور منشیوں کا کام کرتے تھے، اور اسی وجہ سے ریاست کی انتظامیہ کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ کلہن لکھتا ہے کہ کائستھ نہ صرف سیاسی سازشوں[5] کے لیے بہت کچھ ذمہ دار ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بری بات یہ ہے کہ وہ راجاؤں کو رعایا پر ظلم کرنے کے لیے اُکساتے ہیں اور اسی طرح سارے دیش میں سیاسی بے چینی اور مخالفت پھیلاتے ہیں[6]۔ راجہ سنکر اور من (نویں صدی) کے بارے میں لکھا ہے کہ "غلاموں کے بیٹوں اور احمقوں کا سردار تھا" کیونکہ اس نے کائستھوں کے رائے مشورے پر توجہ دی[7]۔ انھوں نے اسے مشورہ دیا کہ مندروں کو لوٹے اور اپنی رعایا پر دباؤ ڈال کر زیادہ دولت حاصل کرے۔ دمارے اور کائستھ مل کر لوگوں کا خون چوس رہے تھے۔

کائستھوں کے خلاف کلہن کی زہر افشانی غالباً کسی حد تک پیشہ ورانہ رقابت کا نتیجہ تھی۔ انتظامیہ میں بہت سے اونچے عہدے برہمنوں کا روایتی حق سمجھے جاتے تھے اور غالباً ان عہدوں (مثلاً محکمہ مال کے افسران اور خزانچی) پر کائستھوں کے دخل کی وجہ سے ناراضگی پیدا ہوئی۔ کلہن کی

Marfat.com

تعریف کرنا چاہیے کہ اس نے برہمنوں کی سرکاری تنظیموں، جیسے پروہت، پرشیدوں، کو بھی ہدفِ تنقید بنایا (گو اتنا نہیں جتنا اور دوسری تنظیموں کو)۔ پروہت پریشد پروہتوں کی بنائی ہوئی منظم جماعتیں تھیں جو بعض مندروں اور تیرتھ استھانوں سے وابستہ کردی گئی تھیں جماعت کے افراد اس ساری جائداد اور املاک کے مشترکہ مالک ہوتے تھے جو مندر کے لیے وقف کی جاتی تھی اور اس ساری آمدنی کے بھی مالک ہوتے تھے جو عطیات کی شکل میں حاصل ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے پریشد کے افراد مادی اعتبار سے بڑی اچھی حالت میں ہوتے تھے اور سیاسی اعتبار سے بڑے طاقتور ہوتے تھے۔[18] کلہن کے خیال میں یہ لوگ ایک اور ایسا عنصر تھے جو ریاست کے کام میں دخل انداز ہوتا تھا۔ لیکن پروہت پریشدوں کے خلاف اس کا غصّہ اس نظریے کو بے چون وچرا مان لینے کی وجہ سے کسی حد تک نرم پڑ گیا تھا کہ اچھے راجہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے دیش کی برہمن برادری کو فیاضی کے ساتھ مراعات دے۔[19]

برہمن کے رول کو جس طرح ہر سطح پر روایتی سیاسی نظریے میں پیش کیا گیا ہے کلہن نے اس کی تصدیق کی ہے۔ وہ تانتریوں، اکانگوں، دماروں اور ان شاہی راج کماروں کو جن کی مدد منتری اور برہمن کرتے تھے، بغاوت کے کارکن کہتا ہے۔ وہ ان بغاوتوں کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ جو شروع کی تین قسموں کے لوگ کرتے تھے، کیونکہ یہ طاقتیں تفرقہ انگیز تھیں، لیکن جب برہمنوں کا ذکر آتا ہے کہ انھوں نے کسی سیاسی قوت یعنی کسی مخصوص راجہ یا منتری[20] کے خلاف اپنا روایتی حربہ 'برت' استعمال کیا، تو اس بات کو وہ محض اس مفروضے پر چپ چاپ مان لیتا ہے کہ برت ضرور کسی نہ کسی منصفانہ سبب کی بنا پر رکھا جاتا ہے جیسے کسی ظالم راجہ یا منتری کو گدی سے اُتارنے کے لیے۔

کلہن نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا کہ ان گروہوں کی سیاسی قوت اور معاشی حالت میں ایک تعلق ہے۔ ایک عبارت جو روزنامچے کے دوسرے نصف میں ٹیپ کے بند کی طرح دُہرائی جاتی ہے یہ ہے کہ کسی گاؤں کو ایک سال کے خرچ سے زیادہ اناج جمع کرنے کی اجازت نہیں

Marfat.com

دینی چاہیے۔ یہ اس سے زیادہ مویشی رکھنے کی اجازت نہ ہونی چاہیے جو کھیت جوتنے کے لیے کافی ہوں، کیونکہ سرمائے کی فراوانی سے دماروں کو عروج ملتا ہے اور وہ فطری طور پر راجہ کی نافرمانبرداری کرتے ہیں[21]۔ اسی کے ساتھ راجہ کی پریشانی کا سبب بننے والی چیزوں کی فہرست میں وہ گاؤں کی اس حالت کو بھی شامل کرلیتا ہے جب وہاں شہروں کی سی سہولتیں مہیا ہوجائیں، جب گڑھیوں اور حصاروں کی ٹھیک طرح نگہبانی نہ ہو، جب افسران آپس میں شادی بیاہ کرنے لگیں۔ اسی طرح کے اور دوسرے اسباب بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔

کلہن ایسی باتوں کو بڑی نفرت سے دیکھتا ہے جیسے راجہ کا عوام پر ظلم کرنا اور مندروں کو لوٹنا۔ شاستروں میں کہا گیا ہے کہ ظالم راجہ کو برداشت نہیں کرنا چاہیے۔ سنکرا ورمن کے ظالمانہ افعال کی ایک لمبی فہرست تیار کی گئی ہے جس میں مندروں کو لوٹنے سے لے کر ہبوں کی بحالی اور بے گار تک درج ہیں[22]۔ ہرش کے زوال کے اسباب میں ایک سبب یہ دیا گیا ہے کہ اس نے نہ صرف مندروں کو لوٹا بلکہ ایسے افسروں کا تقرر کیا جن کا کام مقدس مورتیوں کی بیخ کنی کرنا تھا[23]۔ ان افسروں کو دیوت پٹنا لک کہا جاتا تھا۔ شاستروں کے بموجب راجہ کی اوّلین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے عوام کی نگہداشت کرے اور ان کی فلاح وبہبود کا خیال رکھے۔ اسی لیے اگر ظالم راجہ کو مصیبتیں گھیر لیں تو وہ اس کا مستحق ہے۔

روزنامچے کے بعد کے حصے میں جو تاریخی ذکر ملتا ہے اس سے اس بارے میں کہ' تاریخی عمل کن باتوں پر مبنی ہوتا ہے، کلہن کے غیر معمولی جدید ادراک کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کلہن کی تاریخی تحریر سنسکرت کی روایتی انداز کی تاریخی تحریروں سے مختلف سمجھی جاتی ہے۔ اسی دور میں دوسرے علاقوں کی تاریخیں لکھی گئی تھیں، اور گپتا دور کے بعد سے تاریخی سوانح ادبی اظہار کے لیے اکثر استعمال ہونے لگی تھی۔ نسب ناموں کی شکل میں مختلف حکومتوں کا تذکرہ اور وم شاولی اور زیادہ عام ہوگئے تھے۔ جدید محققوں کو ان میں سے بہتوں پر ابھی تحقیق کرنا باقی ہے۔ اب تک جو مواد حاصل ہوا ہے اس سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اس طرح کے ادب میں راج ترنگنی کو ایک

Marfat.com

نہایت ممتاز مقام حاصل ہے۔

اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے کشمیر میں اس انداز کی تاریخی تحریر کیوں لکھی گئی۔ اس کے بہت سے اسباب پہلے ہی دیے جا چکے ہیں۔[24] کشمیر کی جغرافیائی علاحدگی نے —— ایک ایسی وادی جو چاروں طرف اونچے پہاڑوں سے گھری ہے —— یہاں کے لوگوں میں قوم پروری کا ایک قومی احساس پیدا کر دیا تھا۔ ایک اور عنصر یہ بھی تھا کہ بُدھ دھرم کشمیر میں ثابت قدمی سے جما رہا۔ بُدھ دھرم میں تاریخ کا احساس برہمن دھرم کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ کشمیر بہت سی غیر ہندوستانی تہذیبوں جیسے یونانی، چینی اور غالباً ترکستانی کے زیرِ اثر بھی رہا، اور ان میں ہر تہذیب کی اپنی ٹھوس تاریخی روایتیں تھیں۔

کشمیر کی جغرافیائی علاحدگی یقیناً ایک مثبت عنصر تھی لیکن کشمیر ملک سے پورے طور پر کبھی علاحدہ نہ رہا۔ کشمیر کی تہذیب کے آثارِ باقیہ سے پتہ لگتا ہے کہ گندھارا اور شمالی ہندوستان، وسطِ ایشیا اور چین سے اس کے قریبی تعلّقات تھے۔[25] جغرافیائی علاحدگی میں اس ضمنی نتیجے کا اور اضافہ کر لیا جائے کہ وہ دَور جب کلہن لکھ رہا تھا پورے شمالی ہندوستان میں شدید علاقائی وفاداریوں کا دَور تھا۔ چھوٹے چھوٹے رجواڑوں کے درباروں میں، جو تعداد میں برابر بڑھ رہے تھے، لوگوں کو خاصی سرکاری سرپرستی حاصل تھی، اور مقامی تہذیب، مقامی مسائل اور مقامی واقعات سے لگاؤ پیدا ہو جانا ناگزیر تھا۔ ہر رجواڑہ اس خوش فہمی میں مُبتلا تھا کہ وہ کوئی بہت بڑا راج ہے، لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہر رجواڑے کے لوگوں کے تجربات کا دائرہ علاقائی تھا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ اس زمانے کے اہلِ فکر و نظر کو ایک چھوٹی سی تصویر پر اپنی ساری توجّہ مرکوز کرنے اور بڑی گہرائی تک اس پر غور کرنے کا موقعہ ملا۔ دھارے سارے ہندوستان کا نہیں صرف کشمیر کے راجاؤں کا مسئلہ تھے، اور کلہن نے ان کو بس اتنی ہی اہمیت دی۔

بُدھ دھرم نے کلہن پر غالباً غیر شعوری طور سے اثر ڈالا۔ متن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بُدھ دھرم کا حامی نہیں تھا، بلکہ اسے بڑے شبہے کی نظر سے دیکھتا تھا؛[26] لیکن کشمیر کی تاریخ کے بعض حصّوں

Marfat.com

کے بارے میں اسے بدھ تحریروں سے رجوع کرنا پڑا ہوگا۔ اس کے اندر ماضی کا زیادہ حقیقی احساس پیدا کرانے میں ان چند تحریری روایتوں کا حصہ بھی رہا ہوگا جو خود کشمیر میں (بدھ راہبوں کے مرکزوں میں) درج کی گئی تھیں۔ اسی طرح، ضروری نہیں کہ یونانی، چینی اور اسلامی (جو وسط ایشیا کے ترکوں سے حاصل ہوئی تھی) تاریخی روایتوں کا اثر یونانیوں، چینیوں اور ترکوں کی تاریخی تحریروں کے علم کی بنا پر براہِ راست پڑا ہو، بلکہ اس تہذیبی نظام سے واقفیت کی بنا پر پڑا ہو جس کے تحت تاریخی تحریریں وجود میں آئی تھیں۔ یہ واقفیت دونوں زمانوں کے ذریعے ہو سکتی ہے، یعنی زمانۂ ماضی (یونانی) کے ذریعے اور زمانۂ حال (چینی و ترکی) کے ذریعے۔ کلہن کسی بھی مقام پر یہ اظہار نہیں کرتا ہے کہ وہ ان زبانوں سے یا ان زبانوں کے ادب سے واقف ہے، اس لیے یہ اثر نفوذِ تہذیب کے عمل کا نتیجہ ہوگا۔

وہ ذاتی تعریف کا مستحق ہے کیونکہ اس نے ایک خاص زمانے میں ایسی تحریر پیش کی۔ راج ترنگنی میں تاریخ کی بابت جو احساس ملتا اور ادراک ملتا ہے وہ نہ ان پہلے کی تحریروں میں ملتا ہے جنہیں کلہن نے ماخذوں کی طرح استعمال کیا اور نہ ان روزنامچوں میں ملتا ہے جو اس کے بعد لکھے گئے۔ بعد کے مورخوں اور روزنامچہ نگاروں، جیسے جوناراج، سری ور، پراجیہ بھٹ اور شکار، میں وہ تاریخی بصیرت نہیں ملتی ہے جو کلہن میں تھی حالانکہ ان پر بھی وہی اثرات پڑے تھے جو اس پر پڑے تھے۔ کلہن یقیناً تجزیاتی ذہن کا مالک تھا۔ بعد کے مورخین میں یہ خوبی نہیں تھی۔ وہ ایک ایسی ریاست کی تاریخ لکھ رہا تھا جو زوال کے دور سے گزر رہی تھی۔ خود ان حالات نے بھی اس حساس اور غور و فکر کے عادی شخص کو سوالوں کے جواب ڈھونڈنے اور مطالعہ باطن کرنے پر آمادہ کیا ہوگا۔ کلہن ایک ایسے منتری خاندان کا چشم و چراغ تھا جو کبھی بڑا طاقتور تھا، لیکن رفتہ رفتہ اپنی طاقت کھو چکا تھا۔ اس لیے، گو وہ کسی قوت کا مالک نہ تھا، لیکن ان قوتوں سے خوب واقف تھا جو تاریخ اور سیاست کو جنم دیتی ہیں۔ وہ ساری صورتِ حال کو ایک غیر جانبدار شخص کی نظر سے دیکھ سکتا تھا، لیکن ساتھ ہی اس بصیرت کو بھی برقرار رکھ سکتا تھا جو

Marfat.com

صورتِ حال کے بناؤ بگاڑ میں شامل رہنے والے شخص میں ہوتی ہے۔ یہ طے کر لینے کے بعد کہ وہ چاپلوسی والی تاریخ نہیں لکھے گا، اس کے ذہن میں یہ گنجائش پیدا ہو گئی تھی کہ ذاتی فوائد اور نقصانات سے اوپر اُٹھ کر اپنے زمانے کے حالات کی تحقیق اور تجزیہ کر سکے۔

سب سے آخری بات یہ ہے کہ کشمیر جیسے علاقوں کو، جو بدھ، یونانی، چینی اور ترکی اثرات کے لیے کھلے ہوئے تھے، سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہندوستانی روایت پر غیر تقلیدی یا خارجی اثرات پڑے، اور اسی بنا پر غیر تقلیدی اندازِ فکر کی تربیت ہو سکی۔ اس سے یہ مطلب نہیں نکالنا چاہیے کہ کلہن نے ایسی تاریخ اس وجہ سے لکھی کہ وہ غیر مقلد تھا۔ وہ ہرگز ایسا نہ تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس کی تحریر کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جن سے راسخ العقیدگی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ کلہن ایک ایسا شخص تھا جس کا ذہن بند نہیں تھا، اور بہرکیف، ایک اچھے اور لائق مورخ کے لیے یہی ایک لازمی شرط سمجھی جاتی ہے۔

Marfat.com

حوالہ جات

1- Stein, Introduction, p.6

2- اِس مقالے کے لیے راج ترنگنی کا وہ معیاری ایڈیشن استعمال کیا گیا ہے جس کی ترتیب و تدوین M.A. Stein نے کی ہے۔ حوالے اصل متن کے کتاب نمبر اشلوک نمبر کے مطابق دیے گئے ہیں۔ جہاں جہاں ترجمے دیے گئے ہیں وہاں یکسانیت کے خیال سے Stein کا مندرجہ ذیل ترجمہ استعمال کیا گیا ہے:

Kalhan's Raj taranagni, a chronicle of the Kings of Kashmir, (Westminister 1900)

3. یعنی بلہن کی وکرمن کا دیو چرتر۔

4.	VII	1715
5.	II	17-55
6.	II	92
7.	VII	916-917
8.	I	179
9.	IV	248-251
10.	I	158
11.	VII	1715

Marfat.com

12. VII 449

13. V 248, V 255, V 259, VI 121.

14. VII 494 sq

15. VIII 258

16. IV 621-163, VII 1226, VII 89-94.

17. V 180-181

18. II 132, V 465, VIII 900.

19. VIII 76

20. VII 13, VII 400, VIII 890-900, VIII 2224.

21. IV 347-348

22. V 165-177

23. VII 1087-1091.

24. A. L. Basham, 'The Kashmir chronicle' in *Historians of India, Pakistan and Ceylon* (ed. C. H. Philips), p. 57 ff.

25. ان تعلقات کے بارے میں، مارتنڈ کے مندر، ہروان میں بدھوں کے آثارِ قدیمہ اور برزاہوما میں پتھر کے زمانے کے آثار سے پتہ لگتا ہے۔

26. I 177.

Marfat.com

بدہ پرکاش

رشید الدّین 1247 میں ہمدان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے علمِ طب پڑھا اور اس میں اتنی قابلیت پیدا کی کہ ایل خاں اباقہ نے انھیں درباری طبیب مقرر کر دیا۔ غازان کے دورِ حکومت میں انھیں بڑی شہرت ملی، اور 1298 میں انھیں وزیرِ اعظم بنا دیا گیا۔ 1303 میں وہ غازان کے ساتھ ایک مہم پر گئے۔ اور اسی دوران عربی میں خط و کتابت کی۔ اُلجائتو خدا بندہ کے زمانے میں ان کی شہرت اور زیادہ بڑھ گئی۔ نئے دار السلطنت سلطانیہ کے نواح میں ایک علاقے کا نام ان کے نام پر رشیدیہ رکھا گیا، اور وہاں بڑی عالیشان عمارتیں، مسجدیں، مدرسے اور ہسپتال بنائے گئے۔ 1309 میں انھوں نے ایک اور شہر ربعِ رشیدی کے نام سے بسایا، جو تبریز کے مشرق میں غازان کے مقبرے کے قریب تھا، دریائے سراورد کا پانی لانے کے لیے چٹانوں کو کاٹ کر بہت زیادہ لاگت سے ایک نہر بنوائی۔ چونکہ وہ شہر تیس ہزار مکانوں پر مشتمل تھا اس لیے اسے بہت سے قطعوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ کوچۂ علما کے نام سے ایک علاحدہ قطعہ تھا جس میں چھ سات ہزار علما اور طلبہ رہتے تھے۔ اس کے بازاروں میں 1500 دوکانیں تھیں، اس میں 24 کارواں سرائیں تھیں اور بہت سے باغات، مسجدیں، حمام، مال گودام، کارخانے، کاغذ کی ملیں اور ایک ٹکسال تھی۔ اس کے ہسپتال (دار الشفا) میں ہندوستان، چین، مصر اور میسوپوٹامیہ کے بہت سے جراح اور طبیب کام کرتے تھے، اور ان میں سے ہر ایک پانچ طالب علموں کو پڑھاتا تھا۔ شہر کے کتب خانے کی عالیشان عمارت اس دور کا

Marfat.com

ایک عجوبہ تھی۔ تاریخِ وصّاف کے بموجب ان کی (رشید الدّین کی) کتابوں کی کتابت، توضیح، جلد بندی پر 60000 دینار کی رقم خرچ کی جاتی تھی۔ لیکن ان کی ترقّی کا راستہ ہموار نہیں تھا۔ ان سے علی شاہ کا جھگڑا ہوا جس کی وجہ سے دربار میں ان کے خلاف سازش ہوئی۔ اکتوبر 1317 میں ابوسعید خاں نے انھیں معزول کر دیا اور جولائی 18 سن 1318 میں انھیں پھانسی کا حکم دے دیا گیا۔ عوام کی بھلائی کے ان کے سارے کام ہیچ قرار دیے گئے، اور یہ بات مشتہر کی گئی کہ وہ ایک یہودی کے گھر پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ تیمور کے لڑکے میرن شاہ نے ان کی لاش قبر سے نکلوا کر یہودیوں کے قبرستان میں دفنا دی۔ اس طرح اس بڑے آدمی کی بے قدری کی گئی۔

رشید الدّین اپنے زمانے کے بڑے عالم اور بہت زیادہ لکھنے والوں میں سے تھے۔ ان کے ادبی کاموں میں سب سے اہم کتابیں یہ ہیں: جامع التواریخ، جس کے ضمیمے میں عالمی جغرافیہ شامل ہے، اس کی مدد سے تاریخِ عالم بیان کی گئی ہے: کتاب الاحیا والآثار (عمارتوں اور جانوروں پر رسالہ) جس کے 24 ابواب میں زراعت، نباتات، کان کنی اور خام دھاتوں کی صفائی، جانوروں کی دیکھ بھال، بے ریڑھ کے حیوان، موسمیات، عمارت سازی، قلعوں کا استحکام، جہاز سازی وغیرہ کا ذکر ہے۔ توضیحات (تشریحات) میں 19 خطوط اور ایک دیباچہ ہے، ان خطوط میں دینیات اور تصوّف کے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ مفتاح التفاسیر (تفسیروں کی کلید) جو گناہ و ثواب، جنّت و دوزخ، قسمت و آخرت اور قرآن کے بارے میں بہت سے سوالوں پر بڑی پُراز فہم تحقیق ہے، ان میں ایسے خیالوں کو مسترد کیا گیا ہے جیسے آواگون اور تناسخ الارواح۔ رسالۂ سلطانیہ (شاہی رسالہ) جو دینیات سے متعلق ان خطبات کا انتخاب ہے جو 1307 کے رمضان میں اُلجائتو کی موجودگی میں دیے گئے تھے، لطائف الحقائق (گہری سچائی) جو دینیات کے مختلف مسائل پر چودہ خطوط کا مجموعہ ہے۔ بیان الحقائق (سچائی کی تشریح) جس کے سترہ خطوط میں دینیات کے مسائل، چیچک اور گرمی کی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے دواؤں پر اور منگولوں کے انتظامِ حکومت پر چار رسالے لکھے اور انھیں عربی، فارسی اور چینی زبانوں میں چھپوایا تھا،

Marfat.com

لیکن یہ تلف ہو چکے ہیں۔ ان کے کوئی 53 خطوط کا مسودہ جس کا نام منشات ہے اب بھی موجود ہے۔ انھوں نے یہ خطوط اپنے بیٹوں اور عہدیداروں کے نام لکھے تھے، اور ان میں سیاسی نیز مالی معاملات کا ذکر ہے۔ ان سے اس زمانے کے واقعات اور انتظامی حالات پر بڑی روشنی پڑتی ہے۔ خط نمبر اپنے بیٹے مجدالدین کے نام لکھا ہے جس میں ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے فوجی تیاریاں کرنے کے حکم کی اطلاع دی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے خلاف مہم شروع کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ خطوط نمبر 29 انھوں نے سندھ کے مقام ملتان سے شیراز کے مولانا قطب الدین مسعود کو لکھا تھا اس میں ان کے سفرِ ہندوستان کا حال ہے۔ یہ سفر انھوں نے ایل۔خاں کے حکم پر کیا تھا تاکہ ہندوستان کے فرمانرواؤں سے سفارتی تعلقات قایم کیے جائیں۔ اس سفر کے نتیجے میں انھیں ایسی بہت سی دواؤں اور مفردات کا علم ہوا جن سے ایرانی لاعلم تھے۔ اس سفر نے ہندوستانی زندگی اور تہذیب کے بارے میں ان کے شوق کو جگا دیا ہوگا اور انھیں ایسے مواقع فراہم کیے ہوں گے کہ وہ ان چیزوں کا مطالعہ کر سکیں۔ ان خطوط سے اس عالم کی بے مثل لیاقت، وسیع النظری اور شوق و مشاغل کی بے کراں وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔

رشید الدین نے اپنی کتابیں چھپوانے اور انھیں محفوظ رکھنے کے لیے بڑی کاوش کی۔ انھوں نے اپنی عربی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں اور فارسی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا، اور طب سے متعلق تحریروں کی اشاعت چینی زبانوں میں کی، اور ان سب کتابوں کی بہت سی جلدیں ربع رشیدی کے کتب خانے میں جمع کروائیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی ساری تصنیفات جامع التصانیف الرشیدی کے عنوان سے ایک جگہ جمع کیں۔ اس میں نقشے، تصویریں اور ضمیمے شامل کرائے اور اسے بھی اسی کتب خانے میں جمع کروا دیا۔ ان میں سے ہر ایک کتاب کی دو جلدیں ہر سال ... خرچے سے بغداد کے معیاری کاغذ پر چھپوائی جاتی تھیں۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ کتب خانے ... ان کو نقل کرے۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود ان کے ہم وطنوں کی

Marfat.com

لاپرواہی کے باعث ان کی بہت سی کتابیں تلف ہوگئیں۔

رشید الدین کو علم سے کتنا لگاؤ تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے نجی کتب خانے میں شعروشاعری، تاریخ اور سائنس پر ۶۰۰۰۰ جلدیں تھیں، جن میں ممتاز خوش نویسوں کے منتخب رسم الخط میں لکھے ہوئے قرآن کے سو نسخے بھی شامل تھے۔ اس سے اس بات کی تشریح ہو جاتی ہے کہ انھیں اپنی قاموسی تحریروں کو محفوظ رکھنے کے واسطے لیے جانے والے اقدامات کے بارے میں کتنی تشویش رہتی تھی۔

حالانکہ رشید الدین نے انواع واقسام کے مضامین لکھے، لیکن جامع التواریخ ان کی شہرت کا منارہ ثابت ہوئی۔ اس کا پہلا حصہ ترکوں اور منگولوں کی تاریخ پر مشتمل ہے، اور اس میں چنگیز خاں سے لے کر غازان خاں تک کے واقعات کا بڑا تفصیلی بیان ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں حضرت آدم سے حضرت محمدؐ تک کا سلسلہ نسب ہے، اسلام کی آمد سے پہلے ایران کی کہانی ہے، ہلاکو کے حملے کے وقت تک خلافت کے وقائع ہیں، اس کے بعد کی فارس حکومتوں کا روزنامچہ اور یہودیوں، فرنیکوں، چین اور ہندوستان کی تاریخ ہے، ساتھ میں شاکیہ منی، بدھ اور ان کے مذہب کے بارے میں ایک طویل بیان ہے۔ منگولوں کی تاریخ لکھتے وقت انھوں نے اس معلومات سے فائدہ اُٹھایا جو غازان خاں اور پلاد چنگ چانگ کے ذریعے حاصل ہوئی تھی۔ چین کے بارے میں انھیں دو چینی عالموں لی۔تا۔چی اور ماک یسن سے معلومات حاصل ہوئی تھی۔ فرنیکوں کے بارے میں انھیں بہت کچھ آئیولس سے حاصل ہوئی تھی، جو پیسا کا ایک تاجر تھا، اور ہندوستان کے بارے میں جو تحریر کیا ہے اس میں کمالا شری نے ان کی مدد کی تھی، جو کشمیر کا ایک بدھ عالم تھا۔ اسی لیے یہ کتاب انسانی تاریخ کے بین الاقوامی احساس کا پہلا اظہار سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بارے میں رشید الدین یوں اظہار رائے کرتے ہیں:

"جب چنگیز خاں، اس کے عظیم الشان خاندان اور اس کی عظیم نسلوں نے ساری

Marfat.com

دُنیا کی بادشاہت حاصل کی، تو دُنیا کے سارے ممالک، چین اور ماچین (جنوبی چین)، ختائی (شمالی چین)، ہند اور سندھ، مغلستان، ترکستان، شام (میسوپوٹامیہ)، روم، آس (آلائن) روس، سرکاس، کپچاک، کالار، بشکیر، ایک لفظ میں یوں کہنا چاہیے کہ چار دانگ عالم کے سارے ممالک اس کے زیرِ نگیں ہو گئے۔ چنگیز خاں نے دُنیا کو ایک شکل دے دی اور سارے لوگوں کے دِلوں میں مساوات کا احساس پیدا کر دیا۔ اب جب کہ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ساری دُنیا چنگیز خانیوں کی کسی نہ کسی شاخ کے تحت ہے، ہر مذہب و ملّت (ادیان والملل) سے تعلّق رکھنے والے فلسفی، نجومی، علما اور مورّخین (حکما و منجمین وارباب دانش واصحاب تواریخ) جن کا تعلّق ختائی، قدیم ہندوستان، کشمیر، تبّت، اوئی غور سے ہے، اور دوسرے لوگ جیسے ترک، عرب، فرنیک، بڑی تعداد میں ہماری نظروں کے سامنے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی کتابیں ہیں جن میں ان کے ملکوں کی تاریخ، تاریخ وار سلسلۂ واقعات اور مذہبی خیالات لکھے ہوئے ہیں، اور یہ لوگ خود بھی ان مضامین سے واقف ہیں۔"

جامع التواریخ منگول دَور کے اسی بین الاقوامی ماحول اور وسیع المشرب نظریے کی تجسیم اور اظہار ہے۔ اس مقالے میں ہمارا مقصد کتاب کے اس حِصّے پر مختصراً بحث کرنا ہے جو ہندوستان کے بارے میں دیا گیا ہے۔ اس حِصّے کے دو جُز ہیں (قسم ہیں) جو بالترتیب دس اور بیس ابواب (فصل) پر مشتمل ہیں۔ دوسرے جُز (قسم) کا ضمیمہ ایک رسالہ ہے جو پورا کا پورا آواگون اور تناسخ الارواح (تناسخ، نسخ) کے عقیدے کی تردید میں ہے۔ پہلے جُز کے پہلے چار باب البیرونی کی کتاب الہند پر مبنی ہیں اور ہندوستان کے بارے میں عام معلومات دیتے ہیں۔ پانچویں باب کا کچھ حصّہ، جس میں سلاطینِ دہلی (در تاریخ سلاطینِ دہلی) کا روزنامچہ ہے، البیرونی اور زرجانی

Marfat.com

سے اخذ کیا گیا ہے اور یہاں رشید الدین نے خود بھی کچھ رائے زنی کی ہے۔ چھٹا باب کشمیر کے بارے میں ہے جس میں کشمیر کی تاریخ، خصوصاً منگول دَور کی تاریخ کے بارے میں بالکل نئی معلومات دی گئی ہے۔ ابواب سات تا دس میں چار زمانوں یا یُگوں کا اور ان بادشاہوں کا ذِکر ہے جنھوں نے اِس دَوران میں حکومت کی ہے۔ یہ ابواب رشید الدین کی اپنی تخلیق ہیں۔ دوسرے جُزکے بیس ابواب میں گوتم بُدھ کی زندگی اور تعلیمات کا ذکر ہے۔ فارسی زبان میں بُدھ دھرم پر یہ ایک بے مثل کام ہے۔

ہندوستانی تاریخ کے بارے میں ہمیں رشید الدین سے جو نئی معلومات حاصل ہوئی ہے اس کی ایک خصوصیت یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ انھوں نے ہندوستان کو بُدھوں کی عینک سے دیکھا ہے، بالکل اس طرح جیسے البیرونی نے ہندوستان کو کٹّر ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ ترتیا زمانے کے راجہ ہرش چندر کے بیان کے سِلسلے میں یہ کہا گیا ہے کہ اس کی بیوی اور بیٹا "تناسخ الارواح کی اسی منزل پر ہیں جس پر شاکیہ منی تھے"۔ یہ اکسداکو خاندان کے راجاؤں کا دَورِ حکومت تھا۔ ترتیا زمانے کی خصوصیت دِلیپ اور اُس کے بیٹے رَگھو کے دَورِ حکومت ہیں۔ آخرالذکر کے ایک بیٹی سُندروتی تھی جس کی شادی باپ کی لاعلمی میں ہر ہما کے بیٹے ودالک یا دلک (۹) سے ہوئی تھی، اور اس سے ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس بیٹے نے جب راج گدّی کا دعوا کیا تو رگھو نے اسے نرکھ کا سراپ دے دیا۔ اس نے نرکھ کے باسیوں کی خدمت کی اور بُدھ استواود لوکتیشور (امیتا برخان) کے رُتبے پر پہنچا۔ یہ کہانی ہندوستانی دیو کہانیوں سے میل نہیں کھاتی اور شاید کسی بُدھ ماخذ سے لی گئی ہے۔ اس کے بعد رامائن کی کہانی اختصار کے ساتھ دی گئی ہے۔ دواپر۔ یگ کا حال کرت ویراور پرشورام کی لڑائی کی کہانی سے شروع ہوتا ہے اور کورو پانڈو کے زمانے کے واقعات بیان کرتے ہوئے مہابھارت کی جنگ پر پہنچ جاتا ہے۔ کالی یگ کی تاریخ بُدھ ہشتر کی سورگ یاترا اور ان کی حکومت اولادوں میں بٹ جانے سے شروع ہوتی ہے۔ ان ... اولیا میں ایک شاکیہ تھے جنھوں نے کپل وستو کا شہر بسایا اور جس سے شدھودھ ... ...

Marfat.com

پیدا ہوئے۔ یہاں بھی کورو پانڈو کے خاندان کو گوتم بُدھ کے خاندان سے ملانے کی جو کوشش کی گئی ہے اس سے رشید الدّین کے بُدھ نظریے کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے بعد مگدھ کے موریوں اور نندوں کی تاریخ آتی ہے۔ اس میں مصنّف چندر گپت کو سابق نندا خاندان کا رکن بتاتا ہے۔ وہ اس کے بارے میں ایسی معلومات دیتا ہے جو کسی اور مآخذ سے نہیں ملتی، یعنی یہ کہ اس کے منتریوں نے اس کی رانی کو قتل کر دیا کیونکہ اپنی بڑھی ہوئی محبت کے باعث چندر گپت ریاست کے معاملات کو نظر انداز کرنے لگا تھا، چندر گپت کے جانشین بندوسار کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ اس کے برہمن رانی سے دو بیٹے تھے، ایک اشوک اور دوسرا وگت اشوک۔ راجہ بڑے بیٹے کو جانشین بنانا چاہتا تھا، لیکن منتریوں نے اس وقت تک کے لیے چھوٹے کو راجہ بنا دیا جب تک دوسرے بیٹے محاذِ جنگ سے واپس نہ آجائیں۔ لیکن اس عرصے میں اس نے اتنی اچھی طرح چلایا کہ دوسرے بیٹے ماند پڑ گئے۔ اس لیے حکومت اسی کے ہاتھوں میں رہی اور اس کا چھوٹا بھائی وگت اشوک برہمن بن گیا۔ پھر رشید الدّین اشوک کے بعد کے چھ سو برسوں کا عرصہ چھوڑ جاتے ہیں اور کشمیر کے شری ہرش دیو کے زمانے میں جا پہنچتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی بیویوں میں سے ایک بیوی اس کے دربار کے ایک شاعر کو بیحد پسند تھی۔ شری ہرش دیو نے وہ عورت اُسے دے دی اور دونوں کو سزا کے طور پر ترکستان چلے جانے کا حکم دیا۔ منگول انہی کی اولاد ہیں۔ منگولوں کا تعلق ہندوستان سے پیدا کرنے کی یہ ایک عجیب و غریب ترکیب ہے۔ غالباً یہ ان کشمیری بُدھوں کے دماغ کی ایک انوکھی اختراع تھی جنھوں نے اپنے منگول آقاؤں کی عنایتیں حاصل کرنے کے لیے ان کے آباو اجداد کے ہندوستانی ہونے کے بارے میں یہ کہانی گڑھ لی تھی۔ منگولوں یا تاتاریوں نے اس زمانے میں کشمیر پر حملہ کیا جب ہندوستان پر وکرمادتیہ حکومت کرتا تھا۔ اس نے انھیں شکست دی۔ اس جگہ واضح طور پر گپتا خاندان کے چندر گپت وکرمادتیہ اور شاکھا حملہ آوروں کی اس جنگ کا حوالہ دیا گیا ہے جو وشاکھ دت کی دیوی چندر گپت میں بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد رشید الدّین کشمیر کے للتادتیہ کا حوالہ دیتے ہیں اور اسے سنکندر کہتے ہیں۔ یہاں بھی ہمیں ہندوستانی فاتحوں

Marfat.com

کو مغربی فاتحوں کے متوازی لانے کا رُجحان نظر آتا ہے۔ رشید الدین کی کتاب کا سب سے زیادہ قابلِ ذکر حصّہ وہ ہے جس میں وہ منگول حملے اور کشمیر کی فتح کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ کمل شری کی سند پر ہمیں بتاتے ہیں کہ کشمیر کے راجہ رام دیو کے دَورِ حکومت میں اوگودے خاں کے حکم پر ایک بہت بڑی منگول فوج نے، جس کی سربراہی اُوکوتونوین کر رہا تھا، کشمیر پر حملہ کیا۔ فوج نے راجدھانی کا محاصرہ کر لیا اور پھر فتح کر لیا۔ رام دیو ایک کالے خچّر پر سوار ہو کر منگولوں سے بھاگا، اور پھر گھوڑے پر سوار ہو کر چوڑی کالی ندی کو ایک دلیرانہ چھلانگ لگا کر پار کیا، اور اس طرح تعاقب کرنے والوں سے اپنی جان بچائی۔ یہ ندی غالباً کشپتنک تھی جو جھیلم کی ایک معاون ندی ہے۔
اس کے بعد منگولوں نے مسلسل چھ مہینے تک شہر کو لوٹا، اور بعد میں ایک گورنر مقرر کر کے واپس چلے گئے۔ سات سال کے بعد رام دیو اس گورنر کو نکالنے اور اپنی حکومت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ منگو خاں کے زمانے میں سالی نوین اور تاکودر کے تحت ایک اور منگول فوج نے کشمیر پر حملہ کیا، اس کے شہروں کو لوٹا، لوگوں کو مارا اور قیدی بنایا۔ رام دیو مر گیا اور اس کے بیٹے لکشمن دیو (1286 - 1273) نے منگولوں کی سرپرستی قبول کر لی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بیٹے سمہادیو (1301 - 1286) اور اس کے بعد سہادیو (1320 - 1301) کے زمانے میں کشمیر نے برائے نام منگولوں کی ماتحتی قبول کر لی تھی۔ اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کارل جہن اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ رشید الدین کے بیان میں رام دیو دراصل دو راجاؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے، جن کو راج دیو کہا جاتا تھا، اور جنھوں نے بالترتیب 1212 سے 1235 تک اور 1252 سے 1273 تک راج کیا تھا۔ پہلے راج دیو کے دَورِ حکومت میں کشمیر پر منگولوں کا پہلا حملہ ہوا تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق منگولوں کو نکالنے کا سہرا دراصل راج دیو کے جانشین سمگرام دیو (1252 - 1235) کے سر بندھنا چاہیے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ لکشمن دیو (1286 - 1273) کی مسند نشینی کی اجازت قبلائی خاں (1294 - 1259) اور اباقہ خاں (1282 - 1265) نے دی تھی نہ کہ منگو خاں اور ہلاکو خاں نے۔ بہت ممکن ہے کہ

Marfat.com

لکشمن دیو کا کوئی مورث ہو جس کو منگولوں سے مسند نشینی کی اجازت ملی ہو، اور اس کے جانشینوں نے ان سے اس کی تجدید کرائی ہو۔ بہر حال، رشید الدین نے یہ بات صاف طور سے لکھی ہے کہ تیرھویں صدی میں کشمیر ایران کے منگول ایل خانوں کی ماتحتی میں آ گیا تھا۔

رشید الدین کی تاریخِ ہندوستان کے دوسرے جُز میں، جو بیس ابواب پر مشتمل ہے، گوتم بدھ کی زندگی اور تعلیمات کا ذکر ہے۔ یہ بڑی جانی بُوجھی بات ہے کہ تیرھویں صدی میں بدھ دھرم منگولوں میں بہت مقبول تھا۔ یُنان اور جنوبی چین کے خلاف اپنی مہم شروع کرنے سے پہلے منگو خاں نے قراقرم میں ساگاموتی برکان کے نام پر، جو شاکیہ منی بدھ کا منگول نام ہے، ایک عظیم الشان استوپ بنوایا تھا کہ اسے اپنی مہم میں کامیابی ہو۔ ہلاکو، جو بدھ استومیتری کا فاتح تھا، ارغون (1284-1291) اور غازان (1295-1304) ــــ آخر الذکر اسلام قبول کرنے سے پہلے ــــ اس عقیدے کے پُرجوش حامی اور ماننے والے تھے۔ اس دور میں ایران بدھ یادگاروں سے اور بہت بڑی تعداد میں بدھ راہبوں سے، جنھیں بھکشی کہا گیا ہے، بھرا ہوا تھا۔ فارسی مورخ علاالدین عطا ملک جوینی نے بدھوں کے بارے میں لفظ توئن استعمال کیا ہے، جو چینی لفظ تاؤ۔ چین سے اخذ کیا گیا ہے، اور اپنی تاریخِ جہاں کشائے (1441) میں ان کے مذہب کی یوں تعریف کی ہے کہ یہ مذہب نیک زندگی کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں بہت سے اچھے احکامات اور تعلیمات ہیں جو سارے پیغمبروں کے نظریوں اور عقیدوں سے میل کھاتی ہیں۔ ان میں سے بہت سی تعلیمات انسان کو گناہ اور بُرائیوں سے گریز کرنے اور دوسروں پر ظلم نہ کرنے کی تلقین کرتی ہیں، اور اسے ہدایت کرتی ہیں کہ وہ بُرائی کا بدلہ اچھائی سے دے، اور دوسرے جانداروں کے تئیں ظالمانہ رویّہ نہ اپنائے۔ ایران میں بدھوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1295 میں غازان کے قبولِ اسلام کے بعد دوسرے مذاہب کے لوگوں پر جو جبر کیا گیا اس کے باوجود انھوں نے 1309-10 میں یہ کوشش کی کہ الجائتو ان کا مسلک اختیار کر لے۔ بہر کیف، چودھویں صدی کے پہلے نصف میں بدھ دھرم اسلام

Marfat.com

کے اثر سے مغلوب ہو گیا تھا۔

عالم منگول میں بدھ دھرم کی اشاعت کرنے میں کشمیر کے راہبوں نے بڑا اہم رول ادا کیا۔ دو کشمیر راہبوں نے، جن کے نام چینی ترجموں میں وتوچی اور ناموو دیے ہوئے ہیں، منگولوں کو لاما دھرم سے متعارف کرایا۔ مارکو پولو کا کہنا ہے کہ وہ بدھ لوگ جن کی قیادت کشمیر کے راہب کر رہے تھے اپنے تقدس اور دانائی کے لیے مشہور تھے۔ انہی راہبوں میں کمل شری تھا جس نے رشید الدین کے ساتھ مل کر ہندوستان کی تاریخ اور بدھ دھرم پران کے رسالے کی تالیف کی۔ کمل شری اور اس کے ہم چشموں کے کام ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ایران کا بدھ دھرم تبت کے مقابلے میں کشمیر سے زیادہ قریب رہا۔ اس لحاظ سے وہ مشرقی منگولوں کے بدھ دھرم سے مختلف تھا، جنھوں نے زیادہ تر تبت کے لاما دھرم سے فیض حاصل کیا تھا۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رشید الدین نے کمل شری کے ایما پر بدھ دھرم کا اتنا تفصیل سے کیوں اور کیسے ذکر کیا۔ اس کا جواب تیرھویں صدی کی آخری دہائی اور چودھویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں ایران کے مذہبی بحران میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ 1295 میں غازان کے قبول اسلام کے بعد محض سیاسی وجوہات کی بنا پر بدھوں کو جبر کا سامنا کرنا پڑا، اور ان کی بہت سی یادگاریں تباہ کر دی گئیں۔ اسی لیے، اس سماج میں اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے واسطے بدھ دھرم کے پیرو مسلمانوں کے سامنے اپنے دھرم کی تشریح کرتے کی کوشش کر رہے تھے، اور اسلام اور بدھ کی مشترکہ باتوں پر زور دے رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رشید الدین کے رسالے میں بدھ اصطلاحات اسلامی اصطلاحات میں بدل کر پیش کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر، بدھوں کو پیغمبر کہا گیا ہے، دیوتاؤں کے حوالے اس طرح دیے گئے ہیں جیسے فرشتوں کے، بھوتوں کو خبیث کہا گیا ہے، اور مار کا ذکر ابلیس کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس میں دوسرے پیغمبروں کے مقابلے میں، جو غرور، انسانیت اور خود غرضی کے لیے مشہور ہیں، بدھ شاکیہ منی کو اخلاص اور مہربانی کے پیغمبر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اشاعت اسلام

Marfat.com

سے پہلے مکہ اور مدینہ کے لوگ بدھ تھے، اور کعبے میں ایسی مورتیوں کی پوجا کرتے تھے جو بدھ سے ملتی جلتی تھیں۔
اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ترکستان کے لوگ پہلے پہل بدھ تھے اور یہ کہ ان کے قبولِ اسلام کے بعد بھی
اس ملک میں بدھوں کے بہت سے مندر موجود ہیں۔ اس کے مطابق بدھ دھرم حبشہ کے اندرونی
علاقوں اور کچھ دیگر ممالک میں پھیلا ہوا تھا۔ اس میں یہ بات صاف طور سے دی ہوئی ہے کہ
مانزنی کے لوگ نہایان کے ماننے والے تھے، جب کہ تبت اور ننگوت مہایان سے وابستہ تھے۔ بدھ
کی زندگی، جو باب چہارم سے شروع ہوتی ہے کم و بیش اسی کہانی جیسی ہے جو مہایان حلقوں میں
عام ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ کہیں کہیں اسلامی خیالات نظر آتے ہیں جیسے مریدوں اور پیروں،
مدرسوں اور خانقاہوں، بہشت اور حوروں اور معبود کے نزولِ وحی والے کردار، اور ایسی ہی
دوسری باتوں کے حوالے دیتے وقت۔ اس کے ضمیمے میں کتابوں کی جو فہرست دی گئی ہے اس
میں اس طرح کے حوالے ہیں کہ بدھ خالقِ باری، اللہ تعالیٰ کے حکم سے کام کر رہے تھے۔ مثال کے
طور پر، ایک جگہ یوں لکھا ہوا ہے: "شاکیہ منی نے کہا کہ اللہ کے حکم سے، جو سب سے افضل ہے، اور
جس کی گواہی فرشتے دیتے ہیں، میں عارف کل اور صاحب کرامات ہوں اور سارے جبیشوں پر حکومت
کرتا ہوں"۔ ایک اور رسالے میں بتایا جاتا ہے کہ: "شاکیہ منی کہتے ہیں کہ خالق افضل نے مندر بنانے
اور شاکیہ منی کی مورتیاں ان میں رکھنے کا حکم دیا"۔ ایسی تقریریں ان پیغمبروں کی یاد دلاتی ہیں جو
خالقِ اعلا اللہ تعالیٰ کے حکم سے کام کرتے تھے۔ اس لیے مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بدھ دھرم پر
رشید الدین کا رسالہ ان بدھ راہبوں کے رجحانات کی عکاسی کرتا ہے جن کی قیادت کمل شری
جیسے لوگ کر رہے تھے۔ یہ راہب چاہتے تھے کہ مہایان قسم کے بدھ دھرم کے خاص خاص اصولوں میں
اسلامی تصورات کی آمیزش کر کے پیش کریں، جس میں تانترک خیالات کی خفیف سی جھلک بھی
نہ ہو، کیونکہ ایسے خیالات مسلم عوام کے لیے فطری طور پر مکروہ تھے۔ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ کمل
شری کا منصوبہ یہ تھا کہ رشید الدین کے ذریعے بدھ دھرم پر ایک ایسا رسالہ نکالا جائے جو
عوام اور ایک ایسے دربار پر اثر ڈال سکے جس نے حال ہی میں اسلام قبول کیا تھا۔ یہ منصوبہ واقعات

Marfat.com

کی اس زنجیر میں ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے جس کی انتہا 10-1309 میں الجائتو کو بدھ دھرم میں واپس لینے کی کوشش تھی۔

رشید الدین کی جامع التواریخ میں ہندوستان پر جو جُز ہے اس کے مضامین کا خلاصہ دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ہندوستانی تاریخ اور ہندوستانی مذہب اور تہذیب کے مُسلم ادراک کی بعض تفصیلات کے لیے یہ کتنی اہم کتاب ہے۔ وہ تمام معلومات جو اس میں فراہم کی گئی ہے اس لائق ہے کہ اس کا ان تمام ثبوتوں اور شہادتوں کے ساتھ بغور مطالعہ کیا جائے جو ہمارے پاس موجود ہیں۔ مثال کے لیے میں یہاں ایک ایسی عبارت کا مطالعہ تجویز کرتا ہوں جس کا تعلق مسلم حکومت کے قیام کے بعد کی ہندوستانی تاریخ سے ہے۔ یہ معلومات بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہ تقریباً عصری ماخذوں پر مبنی ہے۔ میرا یہ بیان ایک مسودے پر مبنی ہے جو رام پور کی رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس مسودے میں سے مناسب اقتباسات جناب امتیاز علی عرشی، لائبریرین نے میرے لیے نقل کیے ہیں۔ میں ان کا بیحد ممنون ہوں۔

یہ اقتباسات (فنِ تاریخِ فارسی نمبر 186، نمبر اکائی 121) شہاب الدین غوری سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ایک جنگ سے شروع ہوتے ہیں جو اس کے اور ایک ہندوستانی راجہ کے درمیان ہوئی، اور جس میں آخر الذکر مارا گیا۔ بتایا گیا ہے کہ اس جنگ میں ہندوستانی راجہ کے ساتھ سات سو ہاتھی اور "الف ہزار آدمی" تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں تراوڑی کی اس لڑائی کا حوالہ دیا گیا ہے جو شہاب الدین اور پرتھوی راج چوہان کے درمیان ہوئی۔ یہ لکھا گیا ہے کہ لڑائی کے خاتمے قریب شہاب الدین نے پرتھوی راج کو قیدی بنا لیا اور یہ سوچا کہ اسے دوبارہ اجمیر کے تخت پر بٹھا دے۔ پرتھوی راج رسو کے مطابق اسے غزنہ لے جایا گیا، اور بعض مُسلم مصنّفین، جیسے حسن نظامی، کا خیال ہے کہ اسے اجمیر لے جایا گیا۔ ایک سِکّے کی بُنیاد پر، جس پر شہاب الدین غوری اور پرتھوی راج کو تابعدار سردار کی حیثیت سے دوبارہ تخت نشین کرا دے (D. Sharma,

(Early Chauhan Dynasties, p.87, D.C. Ganguly, the Struggle for Empire, p.112.

Marfat.com

لیکن منہاج السراج قطعی طور پر کہتا ہے کہ "پتھورا اپنے ہاتھی سے اُترا، ایک گھوڑے پر سوار ہوا اور سرپٹ دوڑا دیا، لیکن سرسوتی (سرسی) کے قریب پکڑا گیا اور جہنم رسید کر دیا گیا۔"
(Tabaqat-i-Nasiri, Elliot and Dowson, History of India II, p. 297)
یہ مصنف واقعات کے اسی بیان کی تائید کرتا ہے۔

اسی مسودے کی جلد اوّل کی اکائی نمبر 165 تا 167 میں شہاب الدین کے آخری ایام اور وفات کے بعد کے واقعات کا ذکر ہے۔ جب خار ختائی (قراختائی) کی فوج نے، جو سلطان محمد خوارزم شاہ کی مدد کے لیے آئی تھی، شہاب الدین کو شکست دی اور مار بھگایا، تو یہ افواہ اُڑ گئی کہ وہ مارا گیا۔ چنانچہ ہندوستانی قبیلوں اور سرداروں نے، جنھیں شہاب الدین نے محکوم بنا لیا تھا، یہ سوچا کہ اس کا جوا اتار پھینکنے کے لیے یہ موقعہ غنیمت ہے۔ دیبل کے بیٹے نے جو کوہ جد پر حکمراں تھا اور مسلمان ہو چکا تھا، اپنے آباد کا مذہب دوبارہ اختیار کر لیا۔ خصوصاً کھوکروں نے جو اسے خراج دیا کرتے تھے، بغاوت کر دی اور لوٹ مار شروع کر دی۔ ایک شخص اَمک مل نے مُلتان پر قبضہ کر لیا۔ شہاب الدین نے مُلتان کی صورتِ حال کو اوّلیت دی، اور باغی کو پکڑوا کر قتل کرا دیا اور محمد بن ابو علی کو مُلتان اور لاہور (لاہاوار) کا صوبے دار مقرر کر دیا، اور اسے یہ اختیار دیا کہ خراج کی رقم اکٹھی کر کے بھجوائے جو دو سال سے بقایا تھی۔ لیکن نیا صوبے دار کھوکروں کے خطرے پر قابو پانے میں ناکام رہا، اور یہ اطلاع بھجوائی کہ راستے بھر ان کے خطرے کی وجہ سے خراج بھیجنا ممکن نہیں۔ اس پر شہاب الدین نے قطب الدین ایبک کو، جو ہندوستان میں اس کی فوجوں کا سپہ سالار تھا، کھوکروں سے نمٹنے کا حکم دیا، لیکن اس کی دھمکیوں اور وعدوں سے بھی کچھ زیادہ فائدہ نہ ہوا۔ ہندوستان میں چاروں طرف شورش اور ہنگامے بپا تھے۔ چنانچہ شہاب الدین کو اپنی وہ مہم جو ختائی کے خلاف ہونی تھی ملتوی کرنی پڑی، اور وہ پانچ ربیع الاوّل 602ھ کو ہندوستان میں داخل ہو گیا۔ تیز رفتاری سے بڑھتے ہوئے 25 ربیع الآخر کو ایک سخت مقابلے کے بعد اس نے کھوکروں کو مغلوب کر لیا۔ دوسری نماز کے وقت تک قطب الدین بھی اپنی فوج کے ساتھ پہنچ گیا اور کھوکروں پر ٹوٹ پڑا۔ دو طرفہ حملے میں گھر کر کھوکر ہار گئے۔ اس کے بعد بڑے پیمانے پر ان کا قتلِ عام ہوا۔ بچے کھچے

Marfat.com

کھوکر ایک اُونچی پہاڑی کی طرف بھاگے اور آس پاس میں آگ لگادی۔ لیکن جب مسلمان ان کے قریب پہنچے تو انھوں نے ہتھیار ڈالنے یا دُشمن کے ہاتھوں مارے جانے پر خودکشی کو ترجیح دی، اور سارے کے سارے زندہ جل جانے کے لیے آگ میں کُود پڑے۔ یہ انوکھی معلومات اس کے خلاف ہے جس کے مطابق مسلمانوں نے کھوکروں کی پناہ گاہ میں آگ لگادی اور انھیں زندہ جلا دیا۔

جواں مردی کے ساتھ قربانی دینے کی یہ ایک اعلا مثال ہے۔ یہ ایک قسم کا اجتماعی جوہر تھا، جو مردوں نے اپنی عزت بچانے کے لیے انجام دیا۔ اس طرح کی مثال کسی اور جگہ مشکل ہی سے ملے گی۔ لیکن شہاب الدّین کی زندگی کے دن بھی تھوڑے ہی رہ گئے تھے۔ لاہور میں مختصر قیام کے بعد جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوا اور دریائے سندھ کے کنارے دامل کے گاؤں میں خیمہ زن ہوا، تو دو یا تین ہندو، جو کھوکروں کی شکست اور قتلِ عام سے جھلّائے ہوئے تھے، دریا میں چھپی ہوئی کسی جگہ سے نمودار ہوئے اور اس کے جسم پر خنجر سے اندھا دُھند بیس زخم لگائے۔ وزیر معید الملک اور امراء اور رُوسا نے اس کے زخم سیے اور یہ بہانا کر کے کہ وہ بیمار ہے اسے غزنہ لے گئے۔ لیکن جونہی لوگوں کو اس کی موت کا حال معلوم ہوا چاروں طرف مخالفتیں پھُوٹ پڑیں۔

شہاب الدّین کی موت کے بارے میں جیسے ہی علم ہوا، کچھ فقیہوں نے یہ افواہ اُڑادی کہ استاد البشر فخر الدّین رازی خوارزم شاہ کے بڑے گہرے دوست ہیں، اور اسی کے کہنے پر انھوں نے شہاب الدّین کو مروا دیا۔ اس طوفان سے بچنے کے لیے مولانا نے وزیر کے ہاں پناہ لی، جو حقیقتِ حال سے واقف تھا، اور اسی وجہ سے اس نے انھیں ایک دُور دراز مقام پر بھیج کر اس شرارت سے بچالیا۔ اس زمانے میں غوری حکومت میں بھی دو گروہ بڑے نمایاں تھے ـــــ ایک وہ جو حاکمِ بامیان، بہاالدّین کے موافق تھا، اور دوسرا وہ جو سلطان غیاث الدّین کے بیٹے غیاث الدّین محمود کا حامی تھا۔ بامیان کا بہاالدّین شمس الدّین محمد بن مسعود کا بیٹا تھا، اور اس بیوی سے تھا جو غوری سردار، سلطان غیاث الدّین اور شہاب الدّین کی بہن تھی۔ غوری اسے اچھی نظر سے

Marfat.com

دیکھتے تھے، اور انہی کی مدد سے، اس نے اپنے ہم جدّی بھائی عبّاس سے، جو اس کے باپ کی ایک ترک بیوی سے تھا، تخت چھینا تھا۔ چنانچہ شہاب الدّین کی موت کے بعد غوریوں نے اسے غزنہ آنے کی دعوت دی، لیکن غزنہ پہنچنے پر اسے دردِ سر کا ایک خوفناک دورہ پڑا جس کی بنا پر اسے لگا کہ اس کی موت قریب ہے۔ اس نے اپنے بیٹوں، علاالدّین اور جلال الدّین، کو بلایا اور انھیں نصیحت کی کہ وہ اس سمجھوتے کے ساتھ غیاث الدّین محمود سے صلح کرلیں کہ غزنہ اور ہندوستان ان کے پاس رہے گا، اور غور اور خراسان غیاث الدّین محمود کے پاس۔ اس نے علاالدّین کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ لیکن ہندوستان میں امیروں نے قطب الدّین کو تخت پر بٹھا دیا، جو شمسِ ہندوستان کے لقب سے پکارا گیا۔ اس نے سندھ، لاہور اور ملتان پر اپنا قبضہ مستحکم کرلیا۔ تاج الدّین یلدوز نے زابلستان اور غزنہ پر قبضہ کرلیا۔ امیر محمود جو سلطان غیاث الدّین کا بیٹا تھا، ہرات اور فیروزکوہ پر قابض رہا، اور عزالدّین حسین خیرمال نے، جو ہرات کا حاکم تھا، خود کو سلطان محمد خوارزم شاہ سے وابستہ کرلیا۔ اس طرح، مخالفتوں کی وجہ سے غوری حکومت کا زوال ہوگیا، اور ان کے بجائے خوارزمیوں کی حکومت شروع ہوگئی۔ چونکہ خوارزم شاہوں کو منگولوں کا خطرہ ہر وقت رہتا تھا اس لیے وہ ہندوستان میں کوئی دلچسپی نہ لے سکے، اور ایبک کے جانشینوں نے ایک محفوظ حکومت کا لطف اٹھایا۔

غوریوں کے بارے میں اس تھوڑی سی معلومات سے بہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایشیا اور ہندوستان کی تاریخ کے لیے اس بیان کی کتنی اہمیت ہے۔

Marfat.com

منتخب کتابیں

E. Quantremere	Historie des Mongolo de la Perse par Rashid-al-Din.
F. G. Brown	Literary History of Persia, Vol. III.
K Jahn	Histoire universclle de Rahid-al-ᶜDin Fadl Allah Abul Khair, I: Histoire Des Francs.
K. Jahn	Rashid-al-Din's History of India, Collected Essays with Facsimiles and Indices.
T. Olschki	Marco Polos Asia.
B. Spuler	Die Mongolen in Iram.
W. Barthold	Turkestan down to the Mongol Invasion.
P. Ratchneosky	'Die mongolischen grossKhane und die buddhistische Kirche', Asiatica (1956) p. 491.
Arnold. J. Toynbce	A Study of History, Vol. X

Marfat.com

امیر خسرو بحیثیت مورّخ

سیّد حسن عسکری

فلسفی ہندوؤں کے برعکس، جنھوں نے اس دُنیا کو سراب سمجھا اور اسی بنا پر تاریخ سے ایک قسم کی غفلت برتی، مسلمان شروع ہی سے قدیم چینیوں اور یونانیوں کی طرح، ماضی کا علم، اشخاص اور واقعات، حادثات اور سانحات کا حال، محفوظ رکھنے کی ایک شدید خواہش کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ تلاش و جستجو اور علم تاریخ کے ایک طبعی احساس کی بنا پر انھیں واقعاتِ انسانی کے دھارے میں دلچسپی، اور ماضی کو اندھیروں میں گم ہو جانے سے بچانے کی فکر، پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے ایسی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا جیسے سوانحیں، تاریخی حکایتیں اور ذاتی یا عوامی واقعات کے روزنامچے۔ اسی وجہ سے ہندوستان میں ابتدائی ترکوں کی سرپرستی میں تاریخ نگاری کو فروغ ہوا۔ دورِ وسطیٰ کے ابتدائی زمانے میں ہندوستان میں مختلف قسم کا تاریخی ادب پیدا ہوا۔ اس دور کی تاریخی تحریریں اسلوبِ بیان، صنفِ ادب، نظریہ، طریقہ تحریر اور مضمون کے لحاظ سے بڑی مختلف تھیں۔ منہاج سراج، حسن نظامی، فخرِ مدبر کے تحریری کام ایک دوسرے سے بڑے مختلف ہیں، اور برنی اور عفیف نیز دوسروں سے بھی بہت مختلف ہیں۔ لیکن یہ سارے لوگ پیشہ ور مورّخ تھے، اور ان کو اسی حیثیت سے تاریخ کے جدید یورپی مصنّفین نے تسلیم بھی کیا ہے۔ بعض مصنّفین[1] کے نزدیک امیر خسرو کا معاملہ ذرا مختلف ہے، جس کے بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔ امیر خسرو پانچ دیوانوں کے علاوہ چار تاریخی مثنویوں

Marfat.com

اور ایسی دونشروں کے خالق تھے جن کا مواد تاریخی ہی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں نظریۂ تاریخ بحیثیت مجموعی اس سے بہت مختلف تھا جو آج ہے۔ دَورِ وسطیٰ میں تاریخ نگاری کی یہ پُرانی روایت کہ تاریخی دستاویزیں ایک خاص طرز میں لکھی جاتی تھیں جن میں خطابت اور شاعری بھی ہوتی تھی، جدید ذہن کو پسند نہیں آسکتی، کیونکہ مُبالغہ آمیز تاریخ کے پُرانے نمونوں سے اُسے کراہت ہوتی ہے اور انھیں پڑھنے میں سخت دُشواری پیش آتی ہے۔ یہ بڑی فطری بات ہے کہ تاریخ اور دوسرے مضامین کے بارے میں جدید مفکّروں کے نظریات بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ بدل جائیں، اور مورّخین کا تناظر وہی نہ رہے جیسا پہلے تھا۔

تاریخ کے معنی اب زیادہ جامع ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے بیانات کا مرکوز کرتے ہیں، اور فتوحات کو بناتے ہیں، کچھ لوگ اقتصادی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی عناصر کو اہم اور فیصلہ کُن سمجھتے ہیں۔ آج کل ہم لوگ اس طرح سوچتے ہیں کہ حقائق کی تفصیلات اور خشک انداز میں واقعات کے ان سلسلوں کا خالی خولی بیان، جو واقعات درحقیقت پیش آچکے ہیں، نہ ضروری ہے اور نہ ان تفصیلات سے تاریخ بنتی ہے۔ یہ بتانا زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ ان کی بنا پر ایسا کیوں ہوا۔ ایک مورّخ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اسباب و نتائج کی کھوج کرے گا، اور ان قوتوں کو تلاش کرنے میں کوشش کرے گا جنھوں نے واقعات کو ایک مخصوص شکل دینے میں مدد دی۔ تاریخ کی رُوح، تحقیقِ ماضی، پاسِ صداقت، معروضیت، واقعات اور تحریکات کے سبب و اثر کے رشتوں، صحت مند اور تنقیدی فیصلوں اور تاریخ کی ترجمانی کرتے وقت احساسِ معقولیت، میں ملتی ہے۔ مورّخ کا کام وکیل کی طرح کسی بڑے واقعے یا حقیقت کا بطلان یا اسے صحیح ثابت کرنا نہیں ہوتا، بلکہ مختلف النوع اور کثیر التعداد مآخذی اشیا کی چھان بین اور جانچ پرتال کرنا ہوتا ہے، اور ایک جج یا جیوری کی حیثیت سے ان پر فیصلہ دینا ہوتا ہے۔ اس کو خاص فکر اس بات کی ہوتی ہے کہ ان ثبوتوں اور شہادتوں کی مدد سے پوری صورتِ حال کو سمجھے جو ثبوت و شہادت موجود ہوں اور لائقِ تصدیق ہوں۔ اسے

Marfat.com

اپنی ساری ماخذی اشیا کو تلاش کرنا چاہیے اور پھر انھیں بیان کرنا چاہیے۔

مندرجہ بالا معیار سے موازنہ کرنے کے بعد کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ امیر خسرو نے تاریخ میں کچھ قابلِ قدر اضافے کیے؟ کیا ان کے بارے میں وہی کہا جا سکتا ہے جو ایلیٹ اور ڈاؤسن نے بنیاکتی[2] کے بارے میں کہا ہے کہ وہ شاعر بھی تھا اور مورخ بھی؟ ایک جدید مورخ کی رائے تو یہ ہے کہ امیر خسرو نے تاریخ نہیں نظم لکھی۔ ایک مورخ کا کام یہ ہے کہ وہ ماضی کی ازسرِ نو تعمیر کرے۔ وہ کہی ہوئی اور کی ہوئی باتوں کی تحقیق کرنا چاہتا ہے تاکہ حال کو سمجھ سکے اور مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کر سکے۔ لیکن امیر خسرو کے لیے ماضی میں سوائے اس صورت کے کوئی کشش نہ تھی جب حکمراں بادشاہوں کے احکام بجا لینے کی وجہ سے انھیں انعام و اکرام کی توقع ہوتی یا ایک غیر فانی شہرت کی خواہش ہوتی۔ ان کی ساری چھ تاریخی کتابیں بے ربط موضوعات سے بھری ہوئی ہیں، جن میں رنگین، خیالی اور طوالت آمیز اندازِ بیان، مبالغہ آمیز لہجے، فنی اور ادبی ترکیبوں، شاعرانہ تشبیہوں اور استعماروں اور مختلف اصنافِ سخن کے استعمال کی وجہ سے، تاریخوں کا تسلسل کم ہے، اور انہی چیزوں پر تاریخی اور جغرافیائی باریک بینی، درستی اور تسلسل قربان کر دیے گئے ہیں۔ امیر خسرو کی زندگی اور نشو و نما، ان کی شخصیت پر پڑنے والے اثرات اور ان اصولوں پر جنھوں نے ان کی علمی رہنمائی کی ہوگی، اگر جدید ذہن رکھنے والا کوئی شخص نظر ڈالے، تو اسے بجا طور پر بڑی ناامیدی ہوگی۔ انھوں نے خاصی لمبی عمر پائی۔ ان میں اپنے ماحول کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے کی بڑی صلاحیت موجود تھی۔ ان میں یہ پوشیدہ صلاحیت بھی خوب تھی کہ وہ گزری ہوئی نسلوں کے مجموعی تجربات استعمال کر سکتے تھے، اور انھیں اس صورت سے ادا کر سکتے تھے کہ وہ واقعی تاریخ کا نمونہ بن جائیں اور آنے والی نسلوں کے لیے معنی خیز اور فائدے مند ثابت ہوں لیکن انھوں نے یہ مواقع گنوا دیے۔ جیسا کہ شاید امیر خسرو نے سوچا ہو، تاریخ میں ایسے مفروضات جیسے قسمت کے ناقابلِ فہم و ادراک طور و طریق اور انسانی معاملات میں مقدس چیزوں کی دخل اندازی شامل نہیں ہوتی، نہ ایسے واقعات کا رسمی بیان شامل ہوتا ہے جس کا تعلق

Marfat.com

بادشاہوں، درباریوں اور امیروں کے افعال سے ہو، نہ صاحبِ اقتدار لوگوں کی مدح خوانی کی جاتی ہے، اور نہ ایسے لوگوں کو اچھے اور بُرے، مناسب اور غیر مناسب، مذہبی اور غیر مذہبی افعال کی ذرّہ برابر پرواہ کیے بغیر ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے جن کی زندگی میں ان کی بے جا تعریف کی گئی ہو۔ مورخ کا تعلّق جتنا جماعتوں سے ہوتا ہے اتنا افراد سے نہیں ہوتا، جتنا انسان کے اپنے فیصلوں سے ہوتا ہے اتنا غیبی اسباب و علّت سے نہیں ہوتا، جتنا ماضی کے مطالعے سے ہوتا ہے اتنا کسی ایک شخص کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں کے بیان اور ان کی جانچ پرکھ سے نہیں ہوتا۔

کوئی شخص مندرجہ بالا فقروں کی موزونیت سے خصوصاً اس صورت میں انکار نہیں کر سکتا جب وہ تیرھویں صدی کے مزاج اور اس زمانے کی صورتِ حال اور ماحول سے نگاہیں پھیرے جو امیر خسرو کی حیات کا زمانہ ہے۔ ان کے کارناموں کا اندازہ ان کی نثر اور نظم کی بُنیاد پر کیا گیا ہے، اور اس لحاظ سے انھیں بلا شبہ ایک باکمال ادیب اور فنکار کا نہایت اُونچا مقام حاصل ہے، جس اعلا مقام کے وہ یقیناً مستحق ہیں۔ لیکن بحیثیت تاریخ نگار ان کی لیاقت مشتبہ ہے۔ پھر بھی کیا یہ کہنا جائز ہوگا کہ ان کے تاریخی کاموں میں وہ کچھ نہیں ملتا جسے ایک جدید ذہن والا تاریخ کی تعریف اور تاریخ کے تصوّر سے وابستہ کر سکے۔ ہم ان پر یہ الزام رکھنے میں کہاں تک حق بجانب ہوں گے کہ وہ ایک وسیع تاریخی نظارے کی ضرورت محسوس کرنے میں ناکام رہے، ورنہ ان کا بیان مسلسل، معروضی، تنقیدی، تاریخ وار، حقیقی، درست حقایق پر مبنی اور اخلاقی اعتبار سے تعلیمی ہوتا؟ اور ان پر یہ الزام کس حد تک رکھا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کی رسموں، روایتوں، احساسِ فخر اور تعصّبات سے اُوپر نہ اُٹھ سکے؟ کیا واقعی انھوں نے وہ موقعہ، جو انھیں ملا تھا، گنوا دیا؟ یہ دُرست ہے کہ التمش کے ایک لاچین ترک نسل کے درباری کے بیٹے، اور ماں کی طرف سے، بلبن کے دربار کے ایک ہندی النسل اعلا عہدے دار کے نواسے، ہونے کی بنا پر سیاسی حلقوں میں ان کے بڑے عُمدہ تعلّقات تھے۔

Marfat.com

انھیں بہت سے اہم واقعات خود دیکھنے، اور ان صاحبِ علم اور قابلِ ذکر لوگوں سے جن سے ان کے تعلقات تھے نہایت اہم تاریخی معلومات حاصل کرنے کے بڑے موقعے حاصل تھے۔

لیکن انھیں تاریخ سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ مذہب، فن اور ادب کا شوق، حُسن کی تلاش اور اپنی مالی ضروریات جائز طور سے پوری کرنا ان کے مقاصدِ خاص تھے۔ اس بات کا پورا امکان تھا کہ اپنی پرورش اور سماج میں اپنے مقام کی بنا پر وہ اس زمانے کی سیاست میں ملوث ہو جاتے، لیکن نظام الدین اولیا کے ایک مشہور شاگرد اور صوفی ہونے کے باعث وہ اس اعتبار سے دُنیا کے اندر بھی تھے اور باہر بھی کہ ہر چند انھیں روزی کمانے کے لیے ادبی کاروبار کا سہارا لینا پڑا لیکن میدانِ مذہب اور سیاست کے نشیب و فراز پیدا ہونے والی نزاعی صورتوں اور مسئلوں سے انھوں نے خود کو علاحدہ رکھا۔ وہ ذہین اور صاحبِ علم تھے اور ان میں یہ لیاقت تھی کہ تاریخی موضوعات پر تاریخ وار اور تنقیدی بحث کر سکیں، ماضی کا ایک مربوط اور باقاعدہ حال لکھ سکیں۔ لیکن امیر خسرو کی نظر میں تاریخ صرف عصری تاریخ تھی، اور ان پر ادبی کارنامے انجام دینے کا جو غلبہ طاری تھا وہ اس سے کبھی پیچھا نہ چھُڑا سکے۔

امیر خسرو نے کہیں بھی مورّخ ہونے کا دعوا نہیں کیا ہے، اور بڑی صاف گوئی سے ہمیں بتا دیا ہے کہ اہم تاریخی موضوعات پر انھوں نے جو بے ترتیب تحقیقی کام کیے ہیں وہ یا تو حکمراں بادشاہوں کے مشورے پر یا پھر ان کی نذر کرنے کے لیے کیے ہیں۔ ایسا کرنے کی کوئی اندرونی خواہش نہ تھی۔ تاریخ اس وقت تک نہیں لکھی جا سکتی جب تک ان بے شمار واقعات میں، جن سے مخزنِ معلومات مرتب ہوتا ہے، انتخابِ حقائق کے واسطے کوئی بنیاد تلاش نہیں کی جاتی۔ امیر خسرو کا انتخاب بڑا من مانا ہے، اور جن واقعات اور موضوعات پر انھوں نے بحث کی ہے ان میں پوشیدہ بنیاد ان کے انتخاب سے میل نہیں کھاتی۔ لیکن بیشتر معاملات میں

Marfat.com

اصولِ انتخاب انھوں نے اپنی مرضی سے نہیں دوسروں کے کہنے سے بنایا ہے۔ وہ نہ صرف علاالدین کی بڑائی اور مدح خوانی کرتے ہیں، جو کئی اعتبار سے عظیم تھا، بلکہ نوح سپہر، اور اعجازِ خسروی کے دیباچے میں بھی[5]، اس کے نکمّے اور حقیر جانشین کی مبالغہ آمیز تعریف اور بڑائی کرتے ہیں۔ بڑے سے بڑے اور اچھے سے اچھے بادشاہ میں خوبیوں کے ساتھ خرابیاں موجود تھیں، لیکن امیر خسرو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھیں صرف خوبیوں سے سروکار تھا اور بُرائیوں کو نظرانداز کرتے تھے۔ اعجازِ خسروی کی وزنی جلد[6] کے چند صفحات پر ایک سرسری نظر، اور ان کی رومانی مثنویوں ہشت بہشت[7] اور مطلع الانوار[8] میں عورتوں کی بابت ان کے مشاہدات، کسی بھی شخص کو اپنی یہ رائے بدل دینے کے لیے کافی ہوں گے۔

بہت سے متعلّقہ حقائق انھیں معلوم ہوں گے، لیکن اپنے حالات کی بنا پر ان حقائق کا دُہرانا خود ان کے لیے پریشانی کا سبب بن سکتا تھا۔ خزائن الفتوح یا تاریخِ علائی میں علاالدین کے ہاتھوں، 16 رمضان 695ھ کو، اپنے چچا[9] اور خسر، جو ایک نرم و نیک طبیعت سلطان اور بانیٔ خلجی حکومت تھا، کے ظالمانہ قتل کا ذکر کرنے کی وہ شاید ہمّت نہ کر سکے۔ وہ اس تاریخ کا ذکر علاالدّین کی تخت نشینی کی تاریخ کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی غیر سرکاری کتاب اعجاز خسروی میں بھی وہ اپنے سرپرست سلطان کے نفرت انگیز کاموں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ہمیں اس نازک صورتِ حال کے بارے میں برنی سے معلوم ہوتا ہے جو قتلغ خواجہ اور ترغی کی قیادت میں آئے ہوئے منگولوں نے پیدا کر دی تھی، لیکن امیر خسرو اس ہولناک اور بے ایمان سلطان کی ان ہزیمتوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھتے جو اسے اپنے داخلی اور خارجی دُشمنوں کے ہاتھوں اُٹھانی پڑتی تھیں۔ ان کے روحانی رہنما[10] اور کیقباد، مبارک خلجی اور غیاث الدّین تُغلق کے درمیان جو پریشان کُن تعلقات رہے ان کا حوالہ قران السعدین، نوح سپہر اور تُغلق نامہ کسی میں کہیں نہیں ملتا ہے۔

لیکن اپنے شاعر و مورخ کے کردار کو چیلنج کرنے اور ان کی علمی راستبازی پر شبہ کرتے

Marfat.com

سے پہلے ہمیں ان دنوں کے ماحول کو نظر میں رکھنا چاہیے جب حکمراں جابر اور دخل در معقولات کے عادی ہوتے تھے اور قابلِ گرفت باتوں کو راز رکھنا ضروری تھا۔ وقت کے مضحکہ خیز رواجوں کے مطابق اس بات کی اجازت تھی کہ استعمال انگیز تفصیلات کے بعض حصوں کو چھوڑ دیا جائے، بڑے رنگین انداز میں طول نویسی کی جائے، حقائق کو ادب کی چاشنی کے ساتھ پیش کیا جائے اور اعلا عہدیداروں کے کردار اور سیرت کے بارے میں لکھا جائے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حقائق کو جان بوجھ کر چھپانے کا رجحان عام تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض جگہ جہاں امیر خسرو نے بظاہر بڑھ چڑھ کر ڈرامہ نگاری کی ہے، یا ضرورت سے زیادہ سہل نگاری اختیار کی ہے، یا واقعات کو بیان میں شامل نہیں کیا ہے اور ان کی درمیانی کڑیاں نہیں ملائی ہیں، وہاں ان سب باتوں کا اصل معنی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے، کیونکہ ان کی مرصع اور مزین عبارت کے باوجود عام طور سے درست تاریخی حالات سامنے آتے ہیں، جن میں ایسے حقائق بھی شامل ہوتے ہیں جن پر دوسروں کی نظر نہ پڑ سکی۔ امیر خسرو ایک ایسے مذہبی آدمی تھے جن میں احساسِ وقار اور احساسِ ذمہ داری خوب تھا۔ ہم ان کے اندر بسے مورخ کو شاید اس لیے معاف نہ کر سکیں کہ اس نے وہ سارے حقائق بیان نہیں کیے جو اسے معلوم تھے، لیکن ان کی مشکلات اور محدودات نظر میں رکھی جائیں تو ان پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ انھوں نے حقائق جان بوجھ کر مسخ کیے۔ اس کے برعکس ہمارے پاس ایسے ثبوت موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک کھلے ہوئے غیر جانبدار ذہن کے مالک تھے، بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ وہ بڑے عالی ظرف تھے۔ ان مرتدوں، ظالموں اور علائی خاندان کے بیخ کنوں کے بارے میں لکھتے وقت، جن کو اس زمانے کے مسلمان اپنا بدترین دشمن خیال کرتے تھے، وہ ایک تازگی بخش اور معروضی رویے کا کھلا ہوا ثبوت دیتے ہیں۔

جن لوگوں نے برنی کے ان صفحات کا مطالعہ کیا ہے جو خسرو خاں اور اس کے شریک جرم لوگوں کے بیدردانہ افعال کے بارے میں لکھے گئے ہیں، وہ ان لوگوں کے بارے میں، جن کو

Marfat.com

اس نے ملعون، بے خانماں، غلیظ پاروا ری اور مردار خور لکھا ہے، اس کے شدید طعنوں اور ملامتوں کا مقابلہ امیر خسرو کے مندرجہ ذیل مصرعوں سے کریں جو تغلق نامہ کے صفحہ 19 پر دیے ہوئے ہیں:

بہت سے ہندو جو برادوس کہلاتے ہیں اس کے ساتھ ہو گئے تھے اور اس نمک حرام کے کاموں میں شریکِ جرم بن گئے تھے۔ برادو ان نڈر ہندوؤں کا صفاتی لقب ہے جو اپنے سر ہاتھوں پر رکھے پھرتے ہیں۔ یہ خبلگجو لوگ اپنے سروں کی پرواہ نہیں کرتے اور دوسروں کے سر اتارنا بھی جانتے ہیں۔ اس فرقے کے لوگ ہمیشہ اپنے حکمرانوں کی اگلی صفوں میں رہتے ہیں اور ان کے حکم پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے سدا تیار رہتے ہیں۔ یہ منکرینِ خدا، کفار، دس سروں والے خبیثوں کی طرح تھے جو مستقبل سے آنکھیں پھیر کر ایک ایسی جنگ میں شامل ہونے کو تیار تھے جو یک لخت شروع ہو گئی۔ حسن (خسرو خاں) نے ان سب کو ایک جگہ (خزانے کے پاس) روک کر جمع کر لیا اور ان کے پیروں میں سونے کی بیڑیاں ڈال دیں۔" پھر صفحہ 124 پر ہمیں ان جانباز سورماؤں کے غضبناک جارحانہ حملے اور ان کی ابتدائی کامیابی کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ جب دونوں فوجیں اس مصمم ارادے کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے آئیں کہ مخالف کی صفوں کو تتر بتر کر دیں، ان پر فتح حاصل کریں اور انھیں الٹے دیں، تو بدقسمت خسرو کی فوج کا ایک برادو اس تیزی سے باہر نکلا جیسے غضب ناک لہروں کا ایک پورا دریا امڈ آیا ہو۔ اس تند و تیز حملے میں انھوں نے وہ ثابت قدمی اور استقلال دکھایا کہ ملک غازی کی فوج کا ایک بازو ٹوٹ کر الٹ گیا۔ مخالف فوجوں کی صفوں میں اندر تک گھس جانے کے بعد انھوں نے لشکر کے عقب پر حملہ کر دیا۔ لوگوں میں اس قدر شور و غل اور ہنگامہ بپا ہوا کہ ایک برادو سرے پر گر پڑا۔ فوج کے بہت سے قوی اور مضبوط دستے بھاگ کھڑے ہوئے، اور جس سوار کا جس سمت منہ اٹھا باگیں اٹھا دیں۔ لیکن ملک غازی اپنے مٹھی بھر سواروں کے ساتھ میدان میں ڈٹا رہا کیونکہ اسے اپنی زندگی داؤں پر لگانے میں مزہ آتا تھا۔ تین سو سواروں کے ایک دستے کے علاوہ جو اس کی کمان میں تھا، میدانِ جنگ میں آگے پیچھے کوئی نہ رہا۔ جب ملک غازی نے یہ صورتِ حال دیکھی تو غیظ و غضب میں بھر گیا، اور جو لوگ موجود تھے ان

Marfat.com

سے غصے میں چیخ کر کہا "میں اس وقت تنہا نہیں جب تک میرا سر کاندھوں پر موجود ہے۔ مجھے دوسروں کی مدد درکار نہیں، خدا میرا مددگار ہے۔"

یہ اقتباسات امیر خسرو کے سنجیدہ اور معقول رویے اور ان کے طریقہ بیان کے خود ہی شاہد ہیں۔ لیکن شاید وہ لوگ ان پر غور کرنا پسند نہ کریں جو یہ سمجھتے ہیں کہ "امیر خسرو کے افراد یا تو نہایت نیک سیرت ہوتے ہیں یا نہایت بدسیرت، وہ یا تو فرشتے ہوتے ہیں یا شیطان ہوتے ہیں، انسان نہیں ہوتے۔" آخری جملے میں مستقبل سے تعلق سلطان نے خدا پر جو بھروسہ ظاہر کیا ہے وہ اس شخص کے لیے اشتعال انگیز ہو سکتا ہے جس کا کہنا یہ ہے کہ "نہ صرف امیر خسرو بلکہ دور وسطیٰ کے سارے مورخ اور سوانح نگار یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی خوبیاں اور خرابیاں وقت اور واقعات کی اس دنیا سے کہیں دور طے ہوتی ہیں، یعنی انھیں خدا طے کر دیتا ہے۔" مغربی تہذیب کے پیروں اور مستشرقین کا طور و طریق اور ان کا مذہبی اور سماجی نظام فکر ہمیشہ ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے۔ مستشرقین کا نظریہ ہے کہ تاریخ میں غیر معمولی افراد کی حیثیت اہم ضرور ہوتی ہے، لیکن بعض اوقات ان کی قسمت بنانے یا بگاڑنے میں ایک اَن دیکھی قوت کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ واقعات اور حادثات کے نتائج کی ذمہ داری انسان کی سعی اور کوشش پر موقوف ہوتی ہے، لیکن خود انسانی افعال ہمیشہ فرمانِ الٰہی کے تابع ہوتے ہیں۔ چوتھے خلیفہ حضرت علی کا کہنا ہے کہ: "میں نے قوتِ الٰہی کو اس وقت محسوس کیا جب مصمم ارادوں کے باوجود ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔" قرآن کہتا ہے کہ "اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ کم تعداد فوج ان فوجوں پر فتح یاب ہوتی ہے جو تعداد میں بہت زیادہ اور بہتر ہوں۔" مغرب کے وہ عالم جو زندگی اور افعالِ انسانی کے مادی نظریے سے منسلک ہو چکے ہیں ان بیانات کو سراہ نہ سکیں گے۔ لیکن تاریخی ادب میں غیر متوقع حادثات کی بہت مثالیں موجود ہیں۔ اسی مثنوی میں سے کچھ اور مصرعوں کا حوالہ دینا کارآمد ثابت ہوگا۔

اس دوسری لڑائی کا بیان جاری رکھتے ہوئے، جس لڑائی میں ہفتے کے دن ماہ شعبان

Marfat.com

کی پہلی تاریخ، 720ھ کو حوض خاص کے نزدیک خسرو خاں نے پیش قدمی کی تھی، ہمارا مصنّف کہتا ہے کہ غاصب کی فوج سے تقریباً ایک ہزار خبگو بر دو (اس لفظ کا تلفظ بروز بھی ہے) گھوڑ سواروں کا ایک بڑا دستہ غازی ملک کی فوجوں میں گھس پڑا اور انھیں بے دست و پا کر کے رکھ دیا غازی ملک کے پاس صرف تین[12] سو سوار ایسے رہ گئے تھے جن پر وہ بھروسہ کر سکتا تھا۔ اس نے ہمت نہ ہاری اور اپنے مقام پر جما کھڑا رہا۔ اس کی پامردی اور اس کے دلیرانہ الفاظ نے اس کے کچھ سپاہیوں کی ہمت بندھائی جن کی قیادت بہرام آئبہ، بہاالدین سائستہ اور ملک شادی کر رہے تھے لیکن یہ سب افراد مشکل سے کُل پانچ سو ہوں گے۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس سلسلے میں امیر خسرو نے تغلق نامہ میں کیا لکھا ہے: "جب ملک غازی نے اپنے آگے پیچھے نظر دوڑائی تو اپنی چھوٹی سی فوج کے سوا کوئی دکھائی نہ دیا۔ لیکن اس نے اس جم غفیر کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی جو اس کے خیال میں چھتر کو گھیرے ہوئے تھا۔ اس نے پورے زور سے "اللہ اکبر" کا نعرہ لگایا اور چھتر سبز چھتر بردار کی طرف کف اُڑاتا (لہروں کی طرح) ہوا جھپٹا۔ اس نے غیض و غضب کے ساتھ ایسا شدید حملہ کیا کہ سارا میدانِ جنگ آوازوں سے گونج اٹھا۔ اس نہایت صاحبِ ایمان شخص کے تند و تیز حملے نے بے ترتیب فوجوں کا انتشار دو چند کر دیا۔ . . . . ملک غازی نے جس طرف باگیں اُٹھائیں دشمن کی ہمت اسے دیکھتے ہی پست ہو گئی۔ یک بیک ایک آدمی سامنے آیا جس کے اس نے تیر سے ایک جان لیوا زخم لگایا۔ پھر اس نے بڑی دلیری سے ایک شدید حملہ کیا اور چھتر بردار پر ایسی ایک ضرب کاری لگائی کہ چھتر الٹ کر اس بدبخت شخص (خسرو) کے سر پر گر پڑا۔ چھتر کے زمین پر گرتے ہی دشمن کی فوجوں کا سارا نظم و نسق اور ترتیب اور رسمی وقار اور نشانِ شاہی (جو علموں کی طرح ہاتھیوں پر لے جائے جاتے تھے) نہس نہس ہو گئے۔ اُدھر حسن (خسرو) اپنی مفرور فوجوں کے ساتھ سر بسر پاؤں رکھ کر بھاگ رہا تھا، اور اِدھر فرمانِ شاہی (فتح کا) سُنانے کے لیے نقارے پر چوٹ پڑ رہی تھی۔"

بہادر تغلق کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا حریفِ خاص کم حوصلہ اور مرعوب ہو جانے والی

Marfat.com

ذہنیت کا شخص تھا۔ جمع شدہ خزانے کی تھیلیوں کے مُنہ کھول دیئے، اور شاید اپنے سابقہ ہم مذہبوں کے جلد مشتعل ہو جانے والے جذبات سے کھیلنے کی وجہ سے اس نے اپنے گرد ایک بہت بڑا گروہ جمع کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ نڈر، بے باک بردو تھے جو جنگی ہاتھیوں کے سامنے صفیں باندھے کھڑے تھے۔ "دس ہزار رانا اور راوت گھوڑ سوار تھے" اور خود غرض مسلمان تھے "جو ہندوؤں کے خادم اور خدمت گار بن گئے تھے"۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی فوج میں اتنے بہت سے ہندو اور مسلمان تھے کہ کافر اور مسلمان دونوں کو سخت تعجب تھا۔[13] "بردو لوگوں نے، جن میں سے ہر ایک پشت پر (گھوڑے کی) چست اور پھرتیلا بن جاتا تھا، اپنی ابتدائی ہزیمتوں کے باوجود ہمت نہیں ہاری تھی"۔ جب ملک غازی کے شہسوار لوٹ مار اور غارت گری میں مصروف تھے تو وہ خود میدانِ جنگ میں موجود تھا۔ دفعتاً شور وغل کرتے ہوئے ہندوؤں کا ایک گروہ، جو کہیں گھات لگائے بیٹھا تھا، سخت حملے کے ارادے سے نمودار ہوا۔ ایک ہزار سے زیادہ سیاہ فام بردوں نے نہایت غضب ناک حملہ کیا، اور ہندی پیش قبض خون بہانے کے لیے تیزی سے چلنے لگے۔ بردوں کی فوج کا یہ دستہ جھنڈے پر حملہ آور ہوا اور جھنڈے کا ڈنڈا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ملک غازی کا جھنڈا اور شاہی نشان زمیں بوس ہو گئے لیکن اللہ جلِّ شانہٗ نے "ملک غازی کے سینے میں نہ جانے کتنا مضبوط دل دے دیا تھا کہ اس شدید اور ناگہانی حملے کے باوجود وہ اسی جگہ کھڑا رہا جہاں کھڑا تھا"۔ اس کے بعد وہ سطریں ہیں جن میں ان اقدامات اور کوششوں کا ذکر ہے جو بگڑتی ہوئی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے کی گئیں۔ اس جگہ ہمارا شاعر و مورّخ فلسفیانہ انداز میں کہتا ہے کہ: "جب قسمت کسی شخص کے سر پر تاجِ شاہی رکھتی ہے، تو غنیم جو نقصان پہنچانا چاہتا ہے اس کے نتیجے میں خود ہی تباہ ہو جاتا ہے۔ دشمن کوئی بھی تالا لگائے، اس کی ہر انگلی تالے کی کنجی بن جاتی ہے۔ اگر نگاہِ بصیرت سے دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر چیز کو صلاحیت اور درستی کے ساتھ کرنے کی خوبی احکامِ الٰہی سے پیدا ہوتی ہے"۔[15]

کیا تغلق کی فتح اور بعد میں اس کی تخت نشینی محض ایک حادثہ تھی، یا حسب الاسباب

Marfat.com

نے یہ مقسوم کردیا تھا کہ وہ ایسا طریقہ اپنائے گا جس سے دوسروں پر فتح یاب ہوگا، جب قسمت کے نشیب و فراز کو سبب بتاکر علائی خاندان کی بربادی پر ماتم کیا تو امیر خسرو کے نقاد کی تیز نظروں نے دیکھ لیا اور اسے اسلامی اخلاقی انداز کہہ دیا، لیکن اس کی پر تجسس نظریں بعض ان قابلِ ذکر سطروں پر نہیں پڑیں جو اس کے الزامات میں سے ایک الزام کہ "امیر خسرو نے اپنی معلومات کے مآخذوں کا ذکر نہیں کیا ہے" کا جواب فراہم کر سکتی ہیں۔ وہ سطریں یہ ہیں کہ "وہ بدنصیبیاں اور آفات سماوی جن کے متعلق پہلے کبھی سُنا کرتا تھا اب خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہیں[16]۔" یہ بات دو شہزادوں، فرید اور ابوبکر، عمر پندرہ اور چودہ سال، کے ہولناک قتل کے تفصیلی اور افسوس ناک بیان کے ضمن میں کہی گئی ہیں۔ ان دونوں نے اچھی تعلیم پائی تھی اور قرآن حفظ کیا تھا۔ ایک تیر چلانے کی مشق کرتا تھا، اور دوسرے کو جو بڑا ذہین لڑکا تھا، خوشنویسی کا شوق تھا۔ دونوں پانی کی کمی کے باعث مٹی سے وضو (تیمم) کرکے نماز پڑھ رہے تھے کہ بدمعاشوں کی تلواروں نے ان کے ٹکڑے کردیے۔ تین بچے ہوئے شہزادے، علی، بہا اور عثمان تھے جن کی عمریں آٹھ اور پانچ سال کے درمیان تھیں۔ ان کو اندھا کردینے کی غمگین اور دل سوز داستان ایک قابلِ اعتبار چشم دید گواہ کی شہادت پر بیان کی گئی ہے۔ "یہ باتیں اس شخص کے دُکھے ہوئے دل سے نکلی ہیں جو اس حادثے کا چشم دید گواہ تھا[17]۔" ایک اور مقام پر، خلوص اور وفاداری کی خوبیاں تفصیل سے بیان کرنے کے بعد، ہمارا مصنف ایک بہت باخبر گواہ کا حوالہ دیتا ہے۔ "اس پر ایک شخص نے جو معاملات سے بہت اچھی طرح واقف تھا یہ بتایا کہ جب غازی ملک کو یہ معلوم ہوا کہ خسرو سرسوتی تک پہنچ چکا ہے تو غنیم کی کثیر التعداد فوج سے خوف زدہ ہونے کے بجائے وہ خوش ہوا۔ اپنی توقعات کی کمی کی بنا پر اس نے اس طرح کی خوشی اور دل لگی کا اظہار کیا جیسے ایک خونخوار بھیڑیا بھیڑوں اور مینڈھوں کی کثیر تعداد دیکھ کر کرتا ہے[18]۔"

امیر خسرو پر ایک الزام یہ رکھا جاتا ہے کہ "انھوں نے افراد کو تاریخی صورتِ حال میں اس طرح شریکِ کار یا ان کے بموجب عمل کرتے نہ سمجھا جس طرح جدید مورخین سمجھتے ہیں۔" اس سلسلے میں

ان کی کچھ سطریں لائقِ غور ہیں: "اس داستان کا بیان اتنا حکمی اور قطعی ہے کہ جو کچھ قطب الدین (مبارک خلجی) پر گزری وہ حق تعالا کی طرف سے پہلے ہی مقدر میں لکھا جا چکا تھا۔"[19] صرف ایک ہی قابلِ ذکر سطر خسرو خاں کے واقعے کے پورے پسِ منظر کے بارے میں بہت کچھ بتا دیتی ہے: "اگر میرے پاس ناموزوں حرکتیں نہ کی گئی ہوتیں تو ایسی باتیں مجھ میں پیدا نہ ہوئی ہوتیں، مجھ سے یہ غداری سرزد نہ ہوئی ہوتی۔"[20] یہ مختصر لیکن پرمعنی جواب، جو اس نے اپنے جرائم کی وضاحت کے لیے دیا، اصل سبب اور شاید ایک جائز شکایت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ برنی جس بات کو بالکل عریاں کر کے دکھاتا ہے ہمارے شائستہ اور مہذب شاعر و مورخ نے اسے نیا تشریح کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ انھوں نے بہرکیف، اپنے سابق مرحوم سرپرست کو بخشا نہیں ہے، اس کے کردار اور اطوار کا پردہ فاش کر دیا ہے جو اس کی تباہی کا سبب بنے، اور انھوں نے حکمرانوں کی بدچلنی اور لاپروائی کے نتائج پر اپنی فصاحت خوب صرف کی ہے: "شراب اور عشق۔ شباب اور ہوس، لطف اور انبساط، حکومت اور کامیابی، جس کا سر ان ہواؤں سے بھرا ہو وہ مستقبل کا خیال اور فکر کیسے کر سکتا ہے؟ ایک حکمراں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ عشق اور ہوس میں غرق ہو جائے۔ ایک بادشاہ خدا کی مخلوق کا مستقل محافظ ہوتا ہے۔ ایسے سرپرست کے لیے شراب میں دُھت رہنا غلط ہوگا۔ اگر گدڑیہ خالص شراب کے استعمال سے اپنے آپ کو تباہ کرتا ہے تو اس کا ریوڑ بھیڑیے کے پیٹ میں ابدی نیند سو جاتا ہے۔ قانون کے ذریعے، جس کے معنی حکومت کے بنائے ہوئے قانون اور قواعد ہیں، معاملات (سیاسی) میں استحکام چوکس اور خبردار رہنے سے رہتا ہے۔ جو شخص علاقوں کی ساری دولت اپنی مٹھیوں میں دبائے بیٹھا ہو اس کے لیے کہاں تک موزوں ہو گا کہ لاپرواہی سے پلنگ پر پیٹھ لگا کر سو جائے۔ کیونکہ بالآخر وہ ندامت کے بوجھ سے دب جائے گا۔ یہ بات بادشاہ پر خاص طور سے صادق آتی ہے کیونکہ اس کی کھال کے نزدیک دوستوں سے زیادہ دشمن ہوتے ہیں۔"[21] اگر تاریخ کا کوئی اخلاقی مقصد ہے تو سیاسی پسِ منظر کے ساتھ ایسے مشاہدات اور نظریات، جو ہمیں اس مقام کے علاوہ اور جگہوں پر بھی ملتے ہیں، محض یہ کہہ کر کہ یہ دلی غیر حقیقی

اور روایتی ہیں، رد نہیں کیے جا سکتے۔

امیر خسرو کے نقاد کو علاقوں کی وہ خصوصیات اور جغرافیائی تفصیلات واضح اور مفید نہیں لگتی ہیں جو انھوں نے دی ہیں۔ دہلی، مسجدوں میں ادا کی جانے والی نمازوں، بلند و بالا اور مزین میناروں، حوضِ شمسی یا سلطانی کے بارے میں بڑی مرصع زبان میں جو بیان دیے گئے ہیں ان پر جوش محسوس کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ دارالخلافہ کے اندرونی اور بیرونی حصار جو پہاڑیوں پر بنے تھے، نیا شہر جس کے بارے میں غلط کہا گیا ہے کہ کیقباد نے بنوایا تھا، روضہ باغ اور اس کے قریب ندی، دہلی سے اودھ (قرآن السعدین)، دیپالپور سے دہلی (تغلق نامہ)، دہلی سے دریائے نربدا اور کوہ وندھیاچل کے پار دور افتادہ علاقوں (خزائن الفتوح) کے لیے جو راستے اختیار کیے گئے تھے، ان سب چیزوں کے بیان سے محض چند ہی لوگوں کو روشنی نہیں ملتی۔ اس کی فوج کے کوچ کا تفصیلی حال، جو منزل بہ منزل ایک جگہ سے دوسری جگہ چل رہی تھی جیسے عالم پور، ہانسی، مدینہ، روہتک، منڈولی، پالم، کشن پور، لہرواتی (تغلق نامہ)، شاید اتنا اہم نہ ہو کہ نقاد کی نظر پڑ سکے، اور نہ دور افتادہ علاقوں کے صوبائی حکمرانوں کے خطوط کی حتی الامکان طور پر کم سے کم وقت میں وصولی، چودھویں صدی عیسوی کے ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل پر روشنی ڈال پاتی ہے۔ جہاں تک شمال اور جنوب میں علاالدین کی مہموں کا معاملہ ہے، گو ان کی تاریخیں اور مہینے تک دیے گئے ہیں، مقاموں، دریاؤں اور دروں کا ذکر کیا گیا ہے، اور بعض ایسے اشارے بھی ہیں جیسے ہیروں اور جواہرات کی فراوانی کا حوالہ، لیکن جغرافیائی تفصیلات اور واقعات کی تاریخ وار ترتیب ویسی نہیں ہے جیسے ایک مورخ کرتا ہے۔ اس بات کو محسوس نہیں کیا گیا ہے کہ بہت سے مقامات، جن کا ذکر کیا گیا ہے، اس بنا پر نہیں پہنچانے جا سکتے کہ جدید نقشوں میں ان کے نام بدل دیے گئے ہیں۔

اگر مورخ کا کام یہ ہے کہ تازہ اور نقریبانئی روشنی ڈال کر، اور ماضی کے ذخیرۂ علم میں اضافہ کرکے واقعات کی اور زیادہ تشریح کرے، تو ٹھوس، حقیقی معلومات کا جو خزانہ امیر خسرو کی کتابوں،

Marfat.com

خصوصاً مفتاح، خزائن اور تغلق نامہ میں ملتا ہے اور کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ اور اس بنا پر وہ مورخ کہلانے کے حقدار بن جاتے ہیں۔ حالانکہ عاشقہ، نوح سپہر، قرآن السعدین اور کسی حد تک رسائل اعجاز میں بھی سیاسی اہمیت کی قابلِ قدر معلومات کچھ کم نہیں ہے، لیکن یہ کتابیں ان لوگوں کو بڑی ٹھوس معلومات فراہم کر سکتی ہیں جو سماجی اور تہذیبی تاریخ پر کام کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ طولانی، پر تصنع اور تھکا دینے والا انداز رسائل میں ملتا ہے۔ اس کی چار ضخیم جلدوں میں خطوط کے نمونوں اور ایسی دستاویزوں کی بھرمار ہے جن کا ظہور امیر خسرو کے ایجادی دماغ اور بہت لکھنے والے قلم کے ذریعے 1283/682 اور 1325/725 کے درمیان ہوا۔ اسی اندازِ تحریر اور طوالتِ بیان نے محققین کو خوف زدہ کر دیا ہے، اور انھوں نے یہ کہہ کر کتاب رد کر دی ہے کہ اس میں ایسی خیالی اور انشائی خط و کتابت دی ہوئی ہے جو لغو اور لاحاصل معلومات سے پُر ہے، اور جس کا اس زمانے کی سیاسی، سماجی، عقلی اور تہذیبی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ معدودے چند لوگوں نے تنقید اور احتیاط کے ساتھ اس کے مضامین کی جانچ پرتال کی ہے، اور اس میں تاریخ کے کسی پُرجوش طالبِ علم کو یقیناً ایسی مفید معلومات مل سکتی ہے جو اس کے صفحات پر ادھر اُدھر بکھری ہوئی ہے۔

یہ بات آسانی سے ثابت کی جا سکتی ہے کہ امیر خسرو کی کتابیں حقیقی معلومات کی بنی بنائی کان ہیں، اور انھیں یہ کہہ کر کہ تاریخی اعتبار سے بے تکی باتیں لکھی ہیں، رد نہیں کرنا چاہیے۔ مورخ برنی اپنے نظریات کے ثبوت میں بعض اوقات انھی کے حوالے دیتا ہے۔ بہت سی تفصیلات کے سلسلے میں برنی کے دعووں کو ان حقائق سے تقویت ملتی ہے جو امیر خسرو نے دیے ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو صرف انھی کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ ضروری ہوگا کہ یہاں ایک مثال پیش کی جائے۔ تغلق حکومت کے بانی سلطان کے بارے میں برنی ہمیں بہت کم بتاتا ہے۔ امیر خسرو نے ان لوگوں کے منہ سے یہ الفاظ کہلوائے ہیں جنھوں نے اسے تاج شاہی پہننے پر آمادہ کیا، "جب سنجیدہ مشورہ دینے والوں نے یہ سنا تو انھوں نے کہا کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں وہ درست ہے اور آپ کو یہ کہنا زیب

Marfat.com

دیتا ہے۔ لیکن اس منصب سے مُنہ موڑ کر آپ ایک موتی کو نہ صرف خود سے جدا کر رہے بلکہ دوسروں کو دے رہے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کی تلوار نے جو کر دِکھایا وہ نوکِ قلم سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب خان (علاالدین) نے رنتھمبور کے قلعے پر حملہ کیا اور اس کا محاصرہ کر لیا تو رائے کرد نے یہ سمجھ کر ایک بڑا طوفانی حملہ کیا کہ تلوار کے فولاد سے لوہے کے محاصرے کو کاٹ پھینکے گا۔ اس نے قلعے کے اندر سے ایک بہت بڑی فوج بھیجی جو پہاڑی چشمے کی طرح خس و خاشاک کو بہا لے جاتی۔ خان کے پڑاؤ میں وہ انتشار پھیلا اور شور و غُل بپا ہوا کہ ایک دوسرے پر گرنے لگا خان نے آپ کو حملہ کرنے کا حکم دیا، اور آپ نے سب سرداروں سے آگے بڑھ کر حملہ کیا۔ آپ نے جنگ میں ایسے وار کیے کہ ساری دُنیا بیدم ہو کر رہ گئی۔ رائے کی فوج کے دو تہائی سپاہی کٹ گئے اور ایک تہائی سینکڑوں بہانے بنا کر پیچھے کھڑے رہے۔ جب آپ فاتح کی حیثیت سے واپس ہوئے تو آپ خان کے ہاتھوں کا (نہایت من پسند) شاہین بن گئے۔ یہ آپ کی خوش نصیبی کی شروعات اور بلند بختی کی صبح کاذب تھی۔ جب سلطان رحلت فرما گئے تو تغلقوں کی وفاداری اور اعتماد آپ کے ساتھ رہا . . . . جب ایک اور کافر (منگول) نے برن (بلند شہر) پر حملہ کیا اور ہندوؤں کی طرح بہت سے مسلمانوں کو بھی غلام بنا لیا، تو بادشاہ (علاالدین) نے آپ کو اس کی سمت بھیجا۔ ان کے خون کے چشمے بہانے کے ذِمّہ دار آپ ہی تو ہیں۔ ان میں چار تومان (جن میں سے ہر ایک میں دس ہزار تھے) اور چار میر (سردار) تھے، جن میں سے ہر ایک تاتاری حکومتوں کا شہزادہ تھا۔ جب آپ نے بدبخت اقبال کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا تو آپ کو اس پر فتح نصیب ہوئی، جس فتح میں خوش قسمتی کا بھی ہاتھ تھا۔ پھر ترتاق اور علی بیگ کی جنگ میں بھی اس طرح سر لڑھکائے جیسے دیگ لڑھکائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد کپک[23] اور تائیو کی فوجیں آپ کا نشانہ بنیں۔ ان کافروں کو ایک ایک کر کے مارنے کی ذمہ داری بھی آپ ہی پر ہے۔ پھر بنبل کے نزدیک، دریا (سمندر) کے کنارے، کافروں کی فوج دریا کی چڑھ آئی تھی۔ اس میں جنگجو کافروں کا ایک تومان (10,000) تھا۔ اتنی ہی تعداد رائے بنبل کے ساتھ تھی۔[24] زمین کافروں کے بوجھ سے اس

Marfat.com

طرح دب گئی تھی جیسے دریا کے نیچے تہہ دب جاتی ہے۔ آپ کا مشہور و معروف نام تغلق غازی ہے اور اس مغل کا نام بھی تغلق تھا۔ آپ "تغلق" نے جہاد کے لیے تلوار اٹھائی تھی۔ اس تغلق نے کافروں کی مدد کے واسطے اپنی کمان پر تیر چڑھایا تھا۔ . . . آپ نے اپنی نگاہِ تیر سے کافروں کے دل چھید دیے اور ان سب کو قیدی یا غلام بنا لیا۔ آپ نے رائے بنبل سے دولت وصول کی، اور ان دلیروں کی فوجوں کی صفیں توڑ دیں۔ اس طرح آپ نے اِدھر اُدھر اٹھارہ جنگیں لڑیں، اور ان میں سے ہر ایک میں فتح یاب ہوئے۔"

تغلق نامہ میں بھی دوسری کتابوں کی طرح، ایسی باتوں کی کمی نہیں جن سے تہذیبی اور سماجی معنی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ شہزادہ ابوبکر کے ان رحم انگیز الفاظ سے، جو اس نے عین اس وقت اپنی ماں سے کہے تھے جب قاتل اسے مارنے والے تھے، اس زمانے میں مروج یہ رسم اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جونہی مسیں بھیگنا شروع ہوں ایک شاندار ضیافت کا انتظام کیا جائے اور مہمانوں کی خاطر مدارات کی جائے۔ "جوان رخساروں پر سبزہ آغاز جشنِ مہمان داری کے لیے اشارہ ہوتا ہے۔ مجھ پر تم ہی توجہ کرو گی کوئی اور نہ ہوگا۔"[26] یہاں ہمیں ایک اور مروجہ رسم کی جھلک ملتی ہے۔ "ہوس پرستوں سے بھرے اس شہر میں صدریاں (ڈھیلے ڈھالے جامے) پہنے بہت سی دلہنیں تمہیں سڑکوں پر گھومتی نظر آئیں گی۔"[27] جنگجو ہندوؤں کا حوالہ دیتے وقت امیر خسرو لکھتے ہیں: "وہاں اہیر دیو، ابر دیو، امر دیو، خبیث در خبیث موجود تھے، نرسی سائیں سی، برسی، بائر بیمار، پرمار، سب ناگوں کی طرح چلا رہے تھے مار، مار (مارو، مارو)۔ ان کے جسم پر صندل کے رنگ کے چھینٹے دیکھ کر صندل کی گیلی لکڑی شرم کے مارے سوکھ گئی تھی۔ مرنے کے لیے تیار، ان سب نے اپنے گرد ریشم کے ٹکڑے لپیٹ رکھے تھے، اور اس بات پر انھیں بڑا غرور تھا کہ ان کے پاس ہیرے جواہرت لگی تلواریں تھیں۔ لیکن ہندوؤں میں یہ راج کہ جب جنگ کے لیے باہر نکلتے ہیں تو اپنے سروں کے گرد ایک قسم کے ریشم کا ٹکڑا باندھ لیتے ہیں جسے بہارامن (غالباً اصل لفظ برہمن ہے) کہتے ہیں۔ . . . . اپنے جھنڈوں سے گایوں کی دُمیں باندھ کر وہ دم سے ہر بال کے تشدد کے سینکڑوں فعل بھی باندھ لیتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے گلوں میں سور کے

Marfat.com

دانتوں کے ہار بھی لٹک رہے تھے، جو ان کے خونخوار ہونے کی علامت تھی اور اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ وہ شیروں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ان نکمّے لوگوں کے ساتھ جو جنگی بھاٹ (رجز گانے والے) تھے وہ ان کے بچاؤ کے لیے جادو ٹونے میں مصروف تھے۔" ہمیں تغلق کے نشان اور جھنڈے کے بارے میں کچھ نہیں کہنا، سوائے اس کے کہ ہندوؤں کے برعکس اس کے جھنڈے کا امتیازی نشان مور پنکھ تھا۔ جہاں تک ہندی الفاظ اور محاوروں کا تعلق ہے، وہ خاصی بڑی تعداد میں بڑے موزوں طریقے سے استعمال کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں، ایک بہت قابلِ ذکر سطر کا حوالہ دینا کافی ہوگا: "جو بخشد تیرے خطارا یہ زاری گفت" (ہائے ہائے تیر مارا)[29]۔

اس سے پہلے کہ یہ مضمون ختم کیا جائے یہ بتا دینا ضروری ہوگا کہ امیر خسرو کے تاریخی کاموں میں خوبیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی۔ تقریباً چار دہائیوں پر پھیلے ہوئے تاریخی سلسلے کے جن جدا جدا حصّوں پر انھوں نے کام کیا ہے ان کتابوں کی زبان اور اندازِ بیان نہایت پر تصنع، بناوٹی اور غیر واضح ہے، اور ان کا مقابلہ دورِ وسطیٰ کے دوسرے مؤرخوں کے تاریخی کاموں سے نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ کے بارے میں ان کا ادراک اُن تاریخی دستاویزوں پر مبنی نہیں ہے جن میں واقعات اور حادثات باقاعدہ اور تاریخ وار ترتیب میں دیے ہوئے ہیں، نہ باقاعدہ خیالات پر مبنی ہے، بلکہ اشخاص اور پُرکشش عنوانات پر مبنی ہے۔ وہ ہمیشہ سیدھے سادے انداز میں نہیں لکھتے، اور اپنے جذبات کا اس بنا پر شاذ و نادر ہی اظہار کرتے ہیں کہ کہیں ان لوگوں کو گراں یا ناگوار نہ گذرے جو صاحبِ اقتدار ہیں۔ انھوں نے ان لوگوں کے بارے میں بھی بڑے ضبط کے ساتھ لکھا ہے جن کے برتاؤ یا کردار کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ملک کافور اور مبارک خلجی کے ظالمانہ افعال سے نظریں نہ پھیر سکے، لیکن آخر الذکر کے بارے میں عذرِ لنگ پیش کرنے میں ذرا نہیں جھجکے۔ انھوں نے عاشقہ[30] میں جو علاالدین کے نکمّے بیٹے اور جانشین کی زندگی میں لکھی گئی تھی یہ لکھا ہے کہ: "جب وہ بے رحم اور سنگ دل (بے مہر) سلطانِ بدخو و بدمزاج (ترش چہر) ہو گیا اور اپنے اعزا اور اقربا کی طرف سے دل میں کینہ رکھنے لگا، تو اس نے اپنی سلطنت کے لیے ان کا خون بہانا مناسب سمجھا اور انھیں شمشیرِ آبدار کے لیے موزوں

Marfat.com

جانا۔ اس نے انتقام جو کنبہ پرور بننے کا فیصلہ کرلیا تاکہ ملک میں کوئی اور حصّہ دار نہ رہے۔ اس نے خفیہ طور سے کسی شخص کو خضر خاں کے پاس بھیجا اور معذرت کے ساتھ اسے یہ بتایا کہ اس کے دِل میں خضر خاں کے خلاف کیا ہے (بُرا خیال) جسے وہ پال رہا ہے'' ہر شخص کو تعریف یا ملامت کرتے وقت توازن برقرار رکھنا چاہیے اور غیر ضروری شدّت اور ناپسندیدگی کا رویّہ نہیں اپنانا چاہیے۔ حال کے معیار سے ماضی کو جانچنا مناسب نہ ہوگا۔ یہ تو کہا نہیں جاسکتا کہ امیر خسرو کو ان لوگوں سے کوئی خاص مخاصمت تھی جو بدسیرت اور نِکمّے تھے، لیکن قومی زندگی میں صاف گوئی ہمیشہ ہی خطرناک رہی ہے۔ دہلی کے عظیم صوفی حضرت نظام الدّین اولیاء کے منظورِ نظر خرقہ پوش درویش (جو پیوند لگے صوفیوں والے کپڑے پہنے) نہیں تھے، اور ہم ان سے یہ توقع نہیں کرسکتے کہ وہ اپنے زمانے کے بڑے لوگوں کے کردار اور ارادوں کو کھول کر رکھ دیں گے، یا انسانی واقعات کے اسباب و نتائج کے اُلجھاؤ کو سُلجھا دیں گے۔ ان کو محض اس بات کی فکر تھی کہ اپنی ادبی لیاقت کا مظاہرہ کریں اور غیر فانی شہرت حاصل کریں نیز اپنے ادبی کارناموں پر انعام و اکرام بھی حاصل کریں۔ جانبداری کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ مورّخ تھے۔ یہ بہرحال ماننا پڑے گا کہ ان کے کاموں کی بڑی تاریخی اہمیت ہے، اور انھوں نے تاریخی ادب کو جو کچھ دیا ہے وہ کسی صورت سے کم نہیں ہے۔

Marfat.com

حوالہ جات

1. P. Handy, Historians of Medieval India, Chepter V

مندرجہ بالا کتاب کے باب پنجم میں امیر خسرو کی تاریخ نگاری کا تذکرہ ہے۔

2. H. Elliot and Dowson. History of India as told by its own Historians, Vol. III, Chapter XII.

3. Handy. Historians of Medceial India, p. 43.

4۔ وہ اوران کے نانا ہندوستان کے مخصوص "چھلینے" کے بڑے شائق تھے۔ اس ضمن میں مصنف کا ایک خاصہ طویل مقالہ دیکھیے جس کا عنوان 'Betal Chewing and Early Muslims' ہے۔ امیر خسرو راوت عرض یا عارضِ ممالک "الملک والملک" کے بارے میں لکھتے ہیں: "اس بارے میں میری معلومات سب سے افضل ہے کہ میرا سلسلۂ نسب اس سیاہ رخسار (عارضِ سیاہ) والے سے ملتا ہے، اور میں نے اپنے خاندان کی ابتدا اور سلسلۂ نسب سے تعلق رکھنے والی معمولی ترین تفصیلات بھی بتا دی ہیں۔ وہ سیاہ فام سلطنت کا سب سے شستہ تمہیدی بیان تھا۔ میں خود قسمت کے لوکِ قلم کی تخلیق ہوں اور اس سیاہ فام کا مقولہ ہوں میں سبزۂ خشک (حقیر، ادنا اور معمولی چیز) کو ڈبو دیتا ہوں اور موتی نکال لاتا ہوں۔ دیکھو اس کالے بادل سے کتنی عمدہ (ہمیشہ بہنے والی) ندی پھوٹ پڑی ہے۔"

5۔ خسرو، اعجازِ خسروی (لکھنؤ 1865) جلد اوّل صفحات 28 تا 31۔

6۔ ایضاً، جلد چہارم صفحات 40 تا 44، مضبوط اور کمزور بادشاہ، وزرا اور عہدے دار

Marfat.com

جلد چہارم، 48 اور 49، اچھے اور بُرے کاریگر، ان کے علاوہ بُرے قاضی، بداطوار عہدیدار، ادنا قسم کی موشگافیاں کرنے والے وکلا، عالم دین۔ اچھے اور بُرے مشائخ، گرے ذوق کے لوگ، مخنث، رقاصائیں، غلام، عورتیں اور مرد وغیرہ۔

7۔ انھوں نے اپنی صاحبزادی مستورا کو جو خط لکھا اس کے لیے دیکھیے: خسرو، ہشت بہشت، (لکھنؤ 1873) صفحات 21 تا 25۔

8۔ خسرو، مطلع الانوار، (لاہور 1280ھ) دسواں مقالہ، صفحات 192 تا 198۔

9۔ 697ھ سے 705ھ کے دوران وہ جہاں تک پیش قدمی کر چکے تھے اور دارالسلطنت کا محاصرہ کر چکے تھے۔ تفصیلی بیان کے لیے برنی کو دیکھیے۔

10۔ دربار کی حاضری کا سوال، رہائش کی تبدیلی، خضر خاں سے مقابلہ، صوفی سے عقیدت، خسرو خاں کی رقم قبول کرنا اور سماع خاص باتیں تھیں۔

11۔ ان کی بعض روایتوں کی تصدیق دوسرے مآخذوں سے بھی ہوتی ہے، جیسے خسرو خاں کے ساتھیوں کے بارے میں ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ نہایت بہادر اور شجاع تھے، انھوں نے تغلق کے دستوں کو شکست دی اور اس کے خیمے لوٹے۔

12۔ دیکھیے خسرو، تغلق نامہ، مدیر سید ہاشم فرید آبادی (اورنگ آباد 1933) چھپے ہوئے متن میں، جس میں بہت سی غلطیاں ہیں، سی سعد (300) غلط دیا گیا ہے۔

13۔ ایضاً صفحہ 112۔

14۔ ایضاً صفحات 128، 129۔

15۔ ایضاً صفحہ 132۔

16۔ ایضاً صفحہ 23۔

17۔ ایضاً صفحہ 238۔

18۔ ایضاً صفحات 83، 84۔

Marfat.com

19۔ ایضاً صفحہ 23۔

20۔ ایضاً صفحہ 149۔

21۔ ایضاً صفحہ 16۔

22۔ ایم' الف میں ایک قابلِ ذکر سطر دی ہوئی ہے "کارلے نامی بہادر شاہ سواراں بروں زد نوبت باچند یاراں" (کارلے' جو مشہور و معروف بہادر سورما اور نشہ سوار تھا باہر نکلا اور اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے سارے مجمع کو پسپا کر دیا) لیکن 'کارلے' کرد نہیں ہو سکتا۔

23۔ امیر خسرو' جو ذو معنی الفاظ استعمال کرنے کے بڑے شائق تھے' نے کابک (تیتر) اور تے ہو (کوئل) لکھا ہے۔ کے' الف میں انھوں نے منگول سرداروں کے نام اقبال' تائی' بو اور کپک لکھے ہیں۔

24۔ رائے نیبل' حیدر' زرک حتیٰ کہ کادر کے بارے میں بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ کون تھے۔

25۔ اس کا مقابلہ آج کل کی رسم "مونچھوں کے کونڈے" سے کیجیے۔

26۔ تغلق نامہ' صفحہ 25۔

27۔ ایضاً' صفحہ 86۔ ایسی اور بہت سی باتوں کے حوالے اعجاز خسروی مطلع الانوار اور ہشت بہشت میں ملتے ہیں۔

28۔ بھاٹ عموماً گویے شاعر ہوتے تھے جو نسب نامے' شجرے اور خاندان کی تعریف گا کر سناتے تھے۔ یہ افسوں گر یا جادوگر نہیں ہوتے تھے۔

29۔ یہ 'ہائے' ہائے' کھڑی بولی کے فعلِ امدادی 'ہائے' سے مختلف ہے۔ دیوانِ حافظ کے اس نسخے میں جو ہندوستان میں طبع ہوا ہے' یہ سطر موجود ہے' جو اگر اصلی ہے تو ان لوگوں کے لیے بڑی قابلِ توجہ ہے جو لسانی تحقیقات کے شائق ہیں۔ ساقی اگارت ہوائے ماہائے جز بدا معیار پلیش ماشائی۔ پندرھویں صدی کے بہاری صوفی' قاضی علا شتاری' چودھویں صدی

Marfat.com

کے اُچھ کے صوفی مخدوم سیّد جلال بخاری کے یہ الفاظ دُہراتے ہیں "خندہ ہائے پھندہ کہاں" (معدن الاسرار)۔

30۔ بعض لوگوں کے مطابق مبارک خلجی کی موت کے بعد عاشقہ میں اضافہ کیا گیا، کیوں کہ امیر خسرو سلطان کے زمانۂ حیات میں اس کی بابت بدنامی کی کوئی کہنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔

Marfat.com

ضیاالدّین برنی

کے۔اے۔نظامی

برنی بڑے واضح طور سے لکھتا ہے کہ "یہ ایک بڑا بیش قیمت کام ہے جس میں متعدد خوبیاں ہیں۔ اگر آپ نے اسے تاریخ کی حیثیت سے دیکھا ہے تو آپ کو اس میں بادشاہوں اور ملکوں کا بیان ملے گا۔ اگر آپ نے اس میں قوانین، حکومت کے ضابطوں اور انتظامی معاملات کی کھوج کی تو یہ کتاب ان سے مبّرا نہ ہوگی۔ اگر آپ بادشاہوں اور حکمرانوں کے لیے پند و نصائح چاہتے ہیں تو اس کتاب میں انھیں جتنی بڑی تعداد میں اور جتنے بہتر انداز سے پیش کیا گیا ہے اس کا مقابلہ کوئی دوسری کتاب نہیں کر سکتی۔ اور چونکہ ہر وہ بات جو میں نے لکھی ہے دُرست اور صحیح ہے، اس لیے یہ تاریخ بڑی قابلِ اعتبار ہے۔ مزید یہ کہ چونکہ میرے تھوڑے سے لفظوں میں بڑے معنی پنہاں ہیں اس لیے میری مثال لائق تقلید ہے۔" تاریخ فیروز شاہی کے بارے میں یہ خیال خود برنی کا ہے۔ لیکن جدید دور کا کوئی بھی مصنّف اس بات کا صحیح تعیّن کرنے سے پہلے کہ اس کے کام کی تاریخی اہمیت کتنی ہے، بہت سے اہم نکات کے بارے میں اس سے سوال و جواب کرنا چاہے گا۔ خود تاریخ کے بارے میں برنی کا کیا خیال تھا؟ اس نے معلومات کس طرح حاصل کی، اسے جانچا اور اس کی ترجمانی کی؟ وہ کون سے داخلی عناصر تھے جو اسی کی فکر میں شامل تھے اور حقائق کے حصول، انتخاب، اور بیان پر انھوں نے کس طرح اثر ڈالا؟ تاریخ اس کے نزدیک کس حد تک ماضی کے تجربے کو دُہراتی تھی؟ وہ فوائد اگر تھے تو کیا تھے جن کو برنی اپنی تاریخی تحریروں کی مدد سے حاصل کرنا چاہتا تھا؟ دَورِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ نگاری میں برنی کی دین، اور اس دور کے مورّخین میں اس کے مقام کا تعین

Marfat.com

ان ہی سوالوں کے کسی جواب کی بنا پر کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک فلسفۂ تاریخ اور اس کے مطالعے سے حاصل ہونے والے فوائد کے بارے میں برنی کے خیالات کا تعلق ہے، تاریخ فیروز شاہی کے دیباچے[2] میں ان پر ایک بڑی سیر حاصل بحث موجود ہے۔ دورِ وسطیٰ کے بیشتر علما کی طرح اس نے بھی ہر علم کی ابتدا قرآن سے کی ہے۔ مسلمانوں میں تاریخی رویے کی نشوونما کا آغاز بھی وہ ان آیاتِ قرآنی سے کرتا ہے جن میں نبی آدم سے کہا گیا ہے کہ ان لوگوں اور تہذیبوں کے انجام سے سبق لیں جن کا کبھی دُنیا میں دور دورہ تھا' لیکن جو اب ایک عرصہ ہوا' داستانِ پارینہ بن چکی ہیں۔ دورِ وسطیٰ کا مُسلّم تعلیمی نظام چونکہ دینیاتی طرز کا تھا' اس لیے اس رویے کے منبع کا سُراغ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ لیکن یہ بات کہ اس رویے کا اس کی تاریخی فکر پر اثر تھا۔ ایک حد کے بعد نہیں کہی جا سکتی۔ مذہبی اصطلاحات کا استعمال اس نے محض ادبی روایات طور پر کیا' اس سے زیادہ نہیں۔

برنی تاریخ کو افعالِ انسانی کے ایک بہت بڑے منظر کی صورت میں دیکھتا ہے جو اس لیے انسان کے سامنے لایا گیا ہے کہ زندگی کے سفر میں اُس کے بھٹکتے قدموں کو رہنمائی مل سکے[3]۔ اس کے بموجب زمانۂ حال کو دُرست کرنے میں ماضی کے تنقیدی مطالعے کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ بات کہ سلطنتوں، حکومتوں اور افراد کا عروج اور زوال کس بنا پر ہوتا ہے ان لوگوں پر واضح ہو جاتی ہے جو تاریخی تبدیلیوں کا مطالعہ غور سے کرتے ہیں۔ تاریخ کے ذریعے انسانی معاملات کے بارے میں ایک غیر معمولی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے اور اچھے و بُرے' نیک و بد' دوست و دُشمن میں تمیز کرنے میں مدد ملتی ہے۔ وہ انسان کے نظریے کو حقیقت پسندانہ بنا دیتی ہے۔ کیونکہ وہ دوسروں کے تجربات سے سیکھتا ہے۔ اس کے مطالعے سے حکمراں میں وہ جرأت پیدا ہو جاتی ہے جو مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے اور اسے وہ بصیرت ملتی ہے جو مملکت کے مختلف امراض کی تشخیص و علاج کے لیے درکار ہوتی ہے[4]۔ اسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بدی کا بدلہ بدی اور نیکی کا بدلہ نیکی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ برنی لکھتا ہے کہ تکلیف میں مُبتلا ایک معمولی شخص کو جب تاریخ

Marfat.com

کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر بھی زندگی صعوبتوں اور امتحانوں سے نہ بچ سکے تو اس میں صبر کی ایک بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے[5] لیکن بدقسمتی سے تاریخ کا علم بُرے دنوں میں خود برنی کے کام نہ آسکا۔

تاریخ کے بارے میں برنی کے دو خیال بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور لائقِ توجہ ہیں:- (1) اس کا کہنا ہے کہ تاریخ کی بنیاد سچائی پر ہوتی ہے[6] مورخ کے بیانات قطعی طور پر دُرست اور اس قسم کے مبالغوں اور افراق سے پاک ہونے چاہئیں جو شاعروں کے کلام کا خاصہ ہوتے ہیں[7] غلط بیانات سے مورّخ کا وقار گر جاتا ہے۔ اور اس کے کام کی قدر کم ہو جاتی ہے۔ مزید برآں، دروغ گوئی کی سزا کے طور پر آخرت میں اسے نجات نہیں ملتی[8] اس سے پتہ لگتا ہے کہ مورخ کی حیثیت سے برنی کا احساسِ ذمہ داری علمی اور مذہبی دونوں طرح کے خیالات سے متاثر ہوتا ہے۔ (2) برنی علمِ حدیث اور تاریخ کو جڑواں سمجھتا ہے[9] اور یہ کہتا ہے کہ تاریخ کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کیونکہ روایات اکٹھا کرنے والا کوئی عالم اس وقت تک اچھا عالم نہیں بن سکتا جب تک اُسے تاریخ پر پوری دسترس حاصل نہ ہو۔ برنی نے علمِ حدیث اور علمِ تاریخ کے درمیان جس طرح کی مناسبت ظاہر کی ہے اس سے ڈاکٹر ہارڈی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تاریخ کے بارے میں برنی کا رُجحان دینیات سے متاثر تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ برنی کو جو چیز مجبور کرتی ہے کہ مطالعۂ تاریخ اور مطالعۂ احادیث ایک ہی قوسین میں رکھے جائیں وہ دینیات کا مواد نہیں اصولِ اسناد ہے۔ جس کے بارے میں ہٹی کے الفاظ یہ ہیں کہ "جدید تاریخ نگاری کی نہایت بنیادی شرائط پوری کرنا ہے"، جیسے کسی بھی واقع کا سُراغ اس شخص تک لگانا جو یا تو خود اس واقعہ میں شریک رہا ہو یا اُس نے دوسروں کو شریک ہوتے دیکھا ہو، اور ان سارے لوگوں کی صداقت اور راست گوئی ان کے کردار، برتاؤ، حالات اور پس منظر کی تحقیق کے ذریعے جانچنا، جنھوں نے اس واقعے کا دوسروں سے بیان کیا ہو۔ احادیث کے عالموں نے تصدیقی تحقیق کے جو اصول واضع کیے تھے ان کا لبِّ لباب یہی تھا۔ برنی کی نظر میں تاریخ اور حدیث جڑواں علوم ہیں، اور اس کے خیال میں تصدیقی اصولوں کا اطلاق دونوں پر

Marfat.com

یکساں طور سے ہوتا ہے۔

پھر بھی یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اس کتاب کے دیباچے میں جن تجریدی اصولوں کا ذکر ہے و
فکر و خیال کی سطح پر برنی کے سارے بنیادی اصولِ موضوعہ کا احاطہ کر لیتے ہیں یا محض اِن کا حوالہ د
کر تاریخِ فیروز شاہی کی تکنیک اور نیت کا تجزیہ کرنا ممکن ہے۔ تاریخِ فیروز شاہی کا مطالعہ ایک
نہایت پر پیچ عمل ہے، اور اس کے لیے برنی کے فکر و خیال کی بنیادی اقسام کی جانچ کرنا اتنا ہی
ضروری ہے جتنا اس کے بدلتے ہوئے جذبات کا تجزیہ کرنا۔ اس مقالے میں برنی کی فکر سے تعلق
رکھنے والے وہ مخصوص رجحانات تلاش کیے گئے ہیں جن کی پرورش ایک خاص سماجی پس منظر میں
ہوئی اور یہ کہ بدلتی ہوئی ہر مختلف صورتِ حال میں کس طرح کی حساس طبیعت کے ردِ عمل نے تاریخ
کے بارے میں اس کے خیالات اور رجحانات کو متاثر کیا۔

برنی ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا جس نے دورِ سلطنت میں حکمرانوں کے تین شاہی
سلسلوں، الباریوں، خلجیوں اور تغلقوں کی خدمت کی تھی۔ اس کے نانا سپہ سالار حسام الدین
بلبن کے دور میں ایک اہم عہدیدار تھے جنھوں نے وکیلِ دار بربک سلطانی[12] کے فرائض انجام
دیے تھے۔ سلطان کو ان پر پورا اعتماد تھا، اور اسی لیے انھیں لکھنوتی[13] کا شحنہ مقرر کیا تھا، اور
چونکہ تغرل کی بغاوت کے بعد سلطان کو بنگال میں اپنی طاقت مضبوط کرنے کی بڑی فکر تھی اس
لیے یہ عہدہ نہایت اہم تھا۔ برنی کے والد موید الملک ارکلی خاں کے نائب کے عہدہ پر فائز تھے، اور
دورِ وسطیٰ کی دہلی کے سب سے شاندار علاقے کلوگڑھی[15] کے ایک عالی شان مکان میں رہتے تھے۔ اس
کے چچا علاء الملک اس وقت سے علاء الدین کے ہم راز تھے جب وہ کڑہ کے صوبیدار تھے حقیقت یہ
ہے کہ جلال[16] کے خلاف کی جانے والی سازش میں انھوں نے علاء الدین کی مدد کی تھی۔ جب علاء الدین
دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اس نے پہلے انھیں کڑے اور اودھ پر مامور کیا اور بعد میں مملکت کی سب
سے بڑی ذمہ داریوں میں سے ایک یعنی دہلی کی کوتوالی سونپ دی[18]۔ وہ ان سے ہر نازک مسئلے پر
مشورہ کرتا تھا خواہ اس کا تعلق اس کے ذاتی مذہب[19] سے ہو یا منگولوں کے حملے سے[20]۔ برنی کے

Marfat.com

والد مویدالملک کو برن کی نیابت اور خواجگی ملی[21] محمد بن تغلق کے دور میں برنی نے خود بھی دربار سے ناتا جوڑ لیا اور سترہ برس تک سلطان کا ندیم رہا[22]۔ یہ ایک ایسی عزت تھی جس کا لطف دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحتیں رکھنے والا شخص ہی اُٹھا سکتا تھا۔ سلطان اکثر اس سے مشورہ کرتا تھا[23]۔ اور اس کے علم تاریخ کا معترف تھا[24]۔ جب فیروز شاہ تغلق تخت پر بیٹھا تو دربار پر برنی کا سارا اثر زائل ہو گیا اور ان اسباب کی بنا پر جن پر بعد میں بحث کی جائے گی، اس کی سیاسی ترقی یک لخت ختم ہو گئی کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کے بعد اس کے خاندان کا کیا حشر ہوا کیونکہ اس زمانے کی اور بعد کی دستاویزات اسی بارے میں بالکل خاموشی ہیں۔ ایسے زمانے میں جب بدلتے ہوئے سلسلۂ شاہان کے ساتھ حکمراں طبقے کا رنگ بدل رہا تھا اس کے خاندان میں وہ سیاسی سُوجھ بُوجھ موجود تھی جس کی بنا پر فیروز شاہ تغلق کے عروج کے زمانے تک اس خاندان نے اپنی حیثیت برقرار رکھی۔ لیکن وقت آیا جب برنی کے ایک غلط سیاسی اندازے سے کچھ ایسے عناصر نے خوب فائدہ اُٹھایا جو ملک کی سیاسی زندگی میں نئے نئے اُبھرے تھے۔ برنی اپنا کھویا ہوا وقار پھر کبھی حاصل نہ کر سکا۔

درباری تعلقات کے علاوہ برنی اور اس کے خاندان کے افراد کو ملک کے اعلاترین تعلیمی حلقوں میں جانے اور اس زمانے کے بہترین داناؤں سے ملنے کے موقع ملے۔ علائی دور کے چھیالیس عالموں میں سے کچھ 'عالم' جن کو برنی غزالی اور رازی کا ہم پلّہ سمجھتا تھا، اس کے اساتذہ میں شامل تھے[25]۔ امیر خسرو اور امیر حسن سنجری اس کے نہایت قریبی دوست تھے۔ برنی کہتا ہے "وہ میری اور میں ان کی صحبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے[26]۔" دہلی کے اعلاترین سیاسی اور تعلیمی دونوں حلقوں میں برنی اپنے شائستہ آداب، بڑھتی ہوئی مجلسی دلکشی اور بذلہ سنجی و ظرافت کے لیے مشہور تھا[27]۔ خاندانی پسِ منظر اور ذاتی حیثیت نے اسے سماج کے اُونچے طبقے کا فرد بنا دیا تھا۔ اگر کوئی مقام ایسا تھا جہاں وہ عوام سے قریب ہو سکے تو وہ شیخ نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی لیکن یہاں بھی، اپنی زندگی کے آخری برسوں میں، جو شکست خوردگی اور ہمت شکنی کے احساسات سے پُر تھے، وہ اس

Marfat.com

ذہنی سکون کی تلاش میں آیا تھا جو مادّی شان و شوکت کی خواہشات میں ڈوبی ہوئی رُوح کبھی نہ حاصل کر سکی۔

اسی لیے اِس کا سماجی نقطۂ نظر سماج میں خود اس کے مقام سے متاثر رہا۔ سماج کے بارے میں اس کا سارا تصور شاہی خاندان اور اُونچے طبقے کی زندگی سے ہم آہنگ ہو کر رہ گیا۔ اس سماجی رویے کے لیے تصوراتی غذا اس نے ایران کی معیاری تاریخ نگاری سے حاصل کی۔ وہ یہ حوالے دینے سے کبھی نہیں تھکتا کہ فارسی کے ساسانی ہیرو بادشاہت کے بہترین نمونے تھے۔[28] اس نے تاریخی منظر کو' شاہی کے قدموں میں بیٹھ کر دیکھا اور ساری توجہ شاہی خاندان اور حکمران طبقوں پر مرکوز کر دی۔ اس کے نزدیک تاریخ ان کی تاریخ تھی اور اقتدار صرف ان ہی کا حق تھا۔ اسے یہ بات کبھی نظر نہ آسکی کہ عظمتِ انسانی بادشاہت سے جُدا اور خود مختار بھی کوئی شے ہے۔ اس کی نظروں میں پیغمبر اسلام بھی سلطانِ پیغمبران تھے۔[29] اور اسے اپنے روحانی پیشوا شیخ نظام الدین اولیا کی عظمت وجود باری تعالا پر اُن کے ایمان میں نہیں ان کی خانقاہ کی ظاہری شان و شوکت میں نظر آئی کہ بے شمار لوگ وہاں آتے جاتے تھے۔[30] اپنی زندگی کے آخری برسوں میں بھی جب وہ اپنے غم زدہ وجود کا بار شیخ نظام الدین اولیا کی خانقاہ کے ایک کونے میں لیے بیٹھا تھا' خود کو امیرانہ پیچیدگیوں سے آزاد نہ کر سکا۔ طاقت کا یہی وہ خُمار تھا جس نے اس کی رُوح کو پژمُردہ کر رکھا تھا۔ اس نے کبھی قسمت سے مصالحت نہ کی چنانچہ اس کی اندرونی بے اطمینانی بڑھتی چلی گئی۔ ظرافت طنز میں بدل گئی اور محرومیت نے خوش مزاجی کی جگہ لے لی۔ اگر وہ اپنے ذہن کی امیرانہ پیچیدگیوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتا تو سلطانوں کی تاریخ لکھنے کے بارے میں کبھی نہ سوچتا۔ اس کے برخلاف اس نے چشتی صوفیوں کی تاریخ لکھی ہوتی' جو سیاسی طاقت اور اقتدار سے بے پرواہ اور زمانے کی حکومت سے دُور رہے۔[31] لیکن ایسا کرنے کے بجائے اس نے ایک تاریخ' ایک فتاوائے جہانداری اور ایک حسرت نامہ کی تالیف کے بارے میں سوچا' جن میں سے ہر کتاب اس شکستہ اور محروم شخص کا کرب اور مصیبت ظاہر کرتی ہے جو اپنی کھوئی ہوئی حیثیت دوبارہ حاصل کرنے کے لیے مایوسی کے ساتھ

Marfat.com

جدوجہد کر رہا ہو۔ اس نے برمکیوں کا بیان عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا کیونکہ ان کی تاریخ میں اُسے خود اپنے انجام کا عکس نظر آیا۔ اس نے پیغمبر کی سوانح، 'ثنا محمدی'[32] اس وقت لکھی جب خود اس کے الفاظ میں اسے صبح تک زندہ رہنے کی امید نہ تھی۔ یہ سوانح اس نے کسی تحریکِ علمی کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اس امید کے ساتھ لکھی تھی کہ اس کی رُوحانی برکت سے اسے بھٹینر کے قید خانے سے چھٹکارا مل جائے گا۔ وہ لکھتا ہے کہ "اس کتاب کی تالیف کی بنا پر، جو میرے مذہبی اور دُنیاوی معاملات میں میری محافظ، پُشت پناہ ہے، میں وقتاً فوقتاً اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کرتا ہوں"۔ لیکن ناموافق حالات اس کی ذہنیت نہ بدل سکے۔ وہ جس امیرانہ ذہن کے ساتھ پیدا ہوا تھا اسی ذہن کے ساتھ مر گیا اور تمام عمر انسانیت کو امرا کی عینک سے دیکھتا رہا۔

یہ طبقاتی شعور بالآخر ایک ذہنی پیچیدگی بن گیا اور اسی بنا پر سماج کے نچلے طبقوں کے بارے میں اس کا رویہ تلخ ہو گیا۔ اس کی تلخی کی بنیاد مذہبی یا سماجی نہیں، سیاسی تھی۔ جب عہدیداروں کا ایک نیا طبقہ، جس میں لڈھا، نجیا، منکا، شیخ بابو نائک، پیرا وغیرہ قسم کے اشخاص شامل تھے، محمد بن تغلق کے زمانے میں اُبھرا، تو برنی نے اپنی تلخ سیاسی حقیقت پسندی کی بنا پر آنے والے اس طوفان کی گڑگڑاہٹ سُنی۔ جو مستقبل قریب میں منتظمین کے سارے پُرانے خاندانوں کے پاؤں اُکھاڑ دینے والا تھا۔ تاریخ سے محمد بن تغلق کا لگاؤ، ادب میں اس کی دلچسپی، اور سب سے زیادہ خود برنی سے لگاؤ ان سب باتوں کی وجہ سے دربار میں برنی کی حیثیت مسلّم رہی، لیکن برنی اس ماحول میں اپنے کو اجنبی پاتا تھا جس میں ادنا لوگ اور نو دولتیے پُرانے امرا کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہوتے تھے۔ محمد بن تغلق کی موت کے ساتھ برنی کے وقار کا سب سے بڑا سہارا ٹوٹ گیا اور حالات کچھ اس تیزی سے ناموافق ہوئے کہ رات وہ ایک نہایت طاقتور امیر کی طرح سے سویا اور صبح ایک غریب گداگر کی طرح اُٹھا۔ اس پر یہ ساری مصیبت ایک بے تکی فاش غلطی کی وجہ سے آئی۔ جب سندھ میں محمد بن تغلق کی یکایک موت ہوئی، تو خواجہ جہاں نے

Marfat.com

دہلی کے تخت پر ایک کم عمر لڑکے کو بٹھا دیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ سندھ میں شیخ نصیر الدین چراغ اور دوسرے لوگوں نے فیروز کو پہلے ہی تخت نشین کرا دیا ہے۔ برنی نے براہ راست یا بالواسطہ خواجہ جہاں کے فعل کی حمایت کی، اور اس طرح خود کو ایک ایسے امیر سے وابستہ کر لیا تختہ دار جس کا مقدر بن چکا تھا۔ دہلی میں فیروز کی آمد پر خواجہ جہاں اور دہلی میں ان کا حمایتی گروہ بڑے خطرے میں پڑ گیا۔ اگر فیروز خود فیصلہ کرتا تو شاید ان امیروں کو معاف کر دیتا جنھوں نے صدق نیت سے یہ کام کیا تھا، لیکن امرا کے ایک نئے گروہ نے، جس نے اس دوران میں سیاسی خلا پُر کر لیا تھا اور نئے انتظامیہ میں بڑا ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا فیروز شاہ کو مجبور کر دیا کہ امرا کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے۔ خواجہ جہاں مروا دیا گیا اور اس کے ساتھ بہتوں کے سر قلم ہوئے، لیکن برنی اپنے دشمنوں کی کوششوں کے باوجود[34] اپنی جان بچانے میں کامیاب رہا۔ خود فیروز شاہ کے دخل دینے پر اس کی جان بچی[35] لیکن اسے اپنی سابقہ حیثیت، رتبے اور جائداد سے محروم کر دیا گیا۔ وہ نہایت رنج کی حالت میں لکھتا ہے کہ "خدا نے مجھے زندگی کی ابتدا میں عزت بخشی اور آخر میں ذلیل و خوار کر دیا"[36]۔ نئی صورتِ حال نے برنی کو بڑی المناک حالت پر پہنچا دیا تھا۔ تین نسلوں کے امیر، اور سابق سلطان کے ندیم، کو نیچے گرا کر سخت محتاجی کی حالت پر پہنچا دیا گیا تھا[37]، دوستوں نے کنارہ کر لیا تھا، رشتے دار نظر انداز کرتے اور مخالفین ذلیل کرتے تھے۔ سخت نا امیدی کی حالت میں وہ لکھتا ہے کہ "مچھلیاں اور چڑیاں بھی اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ ایک میں ہی نہیں ہوں" اُداسی اور شکست خوردگی نے بالآخر اس کے دماغ پر سایہ کر لیا۔ اب جو شخص سیاسی منظر پر چھایا وہ خان جہاں مقبول تھا۔ یہ پیدائشی ہندوستانی تھا جس نے سارے پرانے ممتاز خاندانوں کو قوت اور اقتدار کے مقام سے دھکا دے کر اپنے لیے ایک اونچا مقام حاصل کیا تھا۔ برنی کے شکست خوردہ ذہن نے اب رشتہ اسباب کی ایک پوری نئی زنجیر بنانی شروع کی۔ اگر سابقہ سلطانوں نے کم نسل لوگوں کو ترقی دینے کی حکمت عملی نہ اپنائی ہوتی تو خان جہاں مقبول کو یہ مقام کبھی حاصل نہ ہو پاتا۔ اس معاملے میں محمد بن تغلق بہت بڑا مجرم تھا۔ اس نے طبقہ امرا میں نئے عناصر

Marfat.com

شامل کرے، اور خصوصاً سماج کے نیچے طبقوں کے اشخاص شامل کرے، پُرانے اور باعزت خاندانوں کا زور توڑ دیا تھا۔ وہ فلسفی[38] تا جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے، اس کے ذہن میں یہ خیالات ڈالنے کے ذِمّہ دار تھے۔ ان فلسفیوں کو، جو دُشمنِ استحکام و عزت ہیں، سماج سے باہر نکال دینا چاہیے اور استحکام کے خیال سے فلسفے کو ممنوع قرار دینا چاہیے[39]۔ کم نسل لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کی ممانعت ہونی چاہیے کیونکہ اسی بنا پر وہ انتظامیہ کے عہدوں کے لائق بن جاتے ہیں۔ انھیں مستقل لاعلمی کی حالت میں رکھنا چاہیے۔ اس طرح تعصّبات یکے بعد دیگرے برنی کی فکر کے تار و پود میں داخل ہوتے گئے، اور زندگی اور سماج کے بارے میں اس کے پورے نقطۂ نظر اور میلان کا رنگ بدلنے لگا۔ اس نے کم نسل لوگوں اور فلسفیوں سے نفرت کرنا شروع کر دی، اور اس بات کی مخالفت کرنے لگا کہ تعلیمی سہولتیں عوام تک پہنچائی جائیں۔ برنی کی صورتِ حال کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ وہ کچھ اسی طرح سے سوچنے لگے۔ زیادہ گہرائی سے تجزیہ کیا جائے تو ظاہر یہ ہوتا ہے کہ اس کے تعصّبات کی آبیاری مذہبی نظریات نے نہیں بلکہ اس کی شکست خوردہ زندگی نے کی تھی۔ اس حقیقت سے واقف ہونے کی بنا پر کہ اُونچی اور نیچی نسل کا فرق مسلمانوں کے مذہبی تصوّرات کی روشنی میں جائز قرار نہیں دیا جا سکتا، اس نے اسے کُفر اور ایمان کے تصادم کی شکل دینے کی کوشش کی۔ لیکن ان نام نہاد کم نسلوں میں سے بہت سے افراد، جن کو وہ ایک اصول کی آڑ میں بُرا بھلا کہہ رہا تھا، نومسلم تھے۔ انھیں کافر کیسے کہا جا سکتا تھا؟ یہاں برنی اپنے اس نظریے کا سہارا لیتا ہے کہ کم نسلوں کی تبدیلی مذہب ہمیشہ ادھوری اور نا تمام رہتی ہے۔ وہ کبھی صدقِ دل سے مذہب تبدیل نہیں کرتے۔ وہ ریاکار ہوتے ہیں۔ پھر وہ اپنے اس نظریہ تردید کی آڑ لینے کی کوشش کرتا ہے جو فتاوائے جہانداری میں پیش کیا گیا ہے، لیکن اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں کہیں بھی کسی مذہبی سند کا سہارا نہیں لیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اِسے پورا احساس تھا کہ نسل کی بُنیاد پر کیا جانے والا فرق دراصل دُنیاوی ہوتا ہے۔ مذہبی نہیں، اور اپنے اس راز کو وہ شہزادہ محمد کی سیرت بیان کرتے وقت افشا کرتا ہے[40]

Marfat.com

یہ سب تو ان حالات کے بارے میں تھا جن میں برنی کے خیال و فکر کی بنیادی قسموں کی نشوونما ہوئی۔ اب چند لفظ اسی سلسلے میں کہ تاریخ کے بارے میں اس کا کیا رجحان تھا۔ اس دور کی تاریخ میں برنی نے خود اپنے عروج و زوال کے اسباب ڈھونڈے، اور اس تلاش نے اس کے بیان میں داخلیت کے باریک دھاگے شامل کر دیے۔ اسے حکمرانوں اور ملکوں کے رویّوں اور افعال میں اپنی زندگی کا المیہ اور اس کے اسباب بڑے نمایاں طور پر نظر آئے۔ وہ بلبن کے بارے میں لکھ رہا ہے۔ یکایک اس کے ذہن میں اپنی صورتِ حال کے مطابق یا مخالف کوئی صورتِ حال نظر آجاتی ہے اور وہ اپنی بات کرنے لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے، اس فلک نانہجار نے مجھ پر جو ظلم توڑے ہیں اگر لکھوں تو دو کتابیں تیار ہو سکتی ہیں[41]۔ وہ جلال الدین خلجی کی خاص مجالس کا ذکر کرتے وقت اپنی قسمت کا رونا روئے بغیر نہیں رہ سکتا[42]۔ یہ ماتم بار بار دُہرایا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پوری کتاب میں مورخ اپنی شکست خوردہ زندگی کا بوجھ کاندھوں پر اُٹھائے موجود ہے، اور ذرا سا طیش آنے پر دل کا غبار نکالنے لگتا ہے، گریہ و ماتم کرنے لگتا ہے اور سوال کرنے لگتا ہے کہ کیا تاریخی معلومات اس کی زندگی کے المیے کی تشریح میں مدد دے سکتی ہے، وہ لکھتا ہے کہ "وہ مایوسی جو میرے دل میں گھر کر گئی ہے لہو کے آنسو بن کر میری آنکھوں سے بہتی ہے۔ لہو کے دریا کی ایک لہر میری آنکھوں میں اُٹھتی ہے، میرے قلم سے ٹپکتی ہے اور کاغذ کو داغدار کر دیتی ہے[43]۔ کوئی کتاب اگر ایسے ذہنی اور جذباتی ماحول میں لکھی جائے تو اس پر داخلیت یقیناً ناقابلِ تلافی حد تک چھائی ہوئی ہو گی۔ اس کے بیان میں داخلیت کے ان دھاگوں کی تلاش بڑا دلچسپ عمل ہے وہ انتظام کے بارے میں محمد بن تغلق کے تقریباً ہر فعل اور حکمت عمل کو برا بھلا کہتا ہے لیکن جب اس کی موت کا حال بیان کرنا شروع کرتا ہے تو اس کا دل خون بہانے لگتا ہے[44]۔ کیوں؟ ایسے بھی سلطان گزرے جو محمد بن تغلق سے زیادہ المناک حالات میں فوت ہوئے۔ ان کے بارے میں اس نے ان احساسات کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے علاوہ اس نے سلطان کے بارے میں جو رویّہ عام طور پر رکھا ہے اس کے لحاظ سے بھی صدائے ماتم کی جگہ اطمینان کا ایک

Marfat.com

سائنس زیادہ موزوں رہتا۔ لیکن محمد بن تغلق کی موت میں اسے اپنے وقار زیست کی ماتمی صدا سُنائی دی۔ وہ سلطان کے لیے اس قدر رویا ہے جتنا خود اپنے لیے۔ محمد بن تغلق کے بارے میں اس کا سارا بیان نفسیاتی کیفیات سے پیدا ہونے والے واہموں سے لبریز ہے۔ وہ اس پر تعریفوں کی بارش کرتا ہے اور اسے پیغمبروں اور صوفیوں کے معبد میں جگہ دیتا ہے۔ اور پھر یک لخت ایک دوسرا موقف اختیار کرکے اسی پر طعنوں کی بوچھار کرنے لگتا ہے، اور اسے اس میں نمرود اور فرعون کی بُرائیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ محبّت اور نفرت کی اس عجیب دو رنگی نذر کی جڑیں بھی برنی کی اپنی نفسیات میں تھیں۔ سلطان کی شخصیت اتنی زیادہ بے جوڑ خصوصیات کا انبار، یا مجموعۂ اضداد، نہ تھی جتنی خود مورّخ کی شخصیت جو قابلِ رحم حد تک شکست تھی۔ اس نے سلطان کی سیرت کا تعیّن اپنی نفسیاتی کیفیات کا سایہ ڈال کر کیا ہے۔ محمد بن تغلق نے بڑے بڑے عہدوں کے دروازے لائق افراد کے لیے کھول دیے، کثرتِ تحکیمات مجدّد کو اپنایا[45]، بلا کسی امتیاز کے لوگوں کو بڑی تعداد میں امرا کے طلسماتی، حلقے میں داخل کرلیا، الہامی کتابوں اور پیغمبروں کی حدیثوں کو فلسفیانہ دلچسپیوں کی بنا پر شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا (کتبِ سماوی و احادیث انبیا)۔ اِسی حکمتِ عملی کی بنا پر چاروں طرف انتشار پھیل گیا اور برنی کے اپنے خاندان کی طرح پُرانے اور باعزت خاندان بڑے کمزور ہوگئے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر وہ سخت ملامت کا مستحق تھا۔ اور برنی سلطان کو بدنام کرنے لگتا ہے لیکن یہ مزاجی کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔ مورّخ محمد بن تغلق کے دَور پر اپنی ذہنی بلغار کے بعد جونہی پلٹتا ہے اور یکایک اپنی موجودہ قابلِ رحم حالت کا احساس کرتا ہے، تو اس کے جذبات کا رُخ بدلنا شروع ہوجاتا ہے "محمد بن تغلق کے دَورِ حکومت میں میرا بڑا مرتبہ اور حیثیت تھی[46]"، ایسا سرپرست اور مربّی لائقِ تعریف ہے اور ہمارا مورّخ سلطان کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملانے لگتا ہے۔ جب برنی دَورِ حال میں ہوتا ہے تو اسے محمد بن تغلق سے لگاؤ رہتا ہے۔ جب وہ دَورِ ماضی میں ہوتا ہے تو اس کے لیے نفرت کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ نفرت اور محبّت مورّخ کی مزاجی کیفیات کے

Marfat.com

ساتھ بدل بدل کر ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ مورّخ کی یہ لطیف نفسیاتی کیفیت جونہی سمجھ میں آجاتی ہے اس کی فراہم کردہ ساری معلومات درست تناظر کی وجہ سے بڑی بامعنی اور موزوں لگنے لگتی ہے۔

محمد بن تغلق اور برنی کے خیالات اور نظریات میں جتنا بنیادی فرق تھا اتنا کسی دو اشخاص میں نہیں ہو سکتا۔ وہ دونوں دو مختلف دُنیاؤں کے باشندے تھے سلطان سیاست کے معاملے میں انقلابی اور مذہب کے معاملے میں عقلیت کا قائل تھا۔ برنی سیاست کے معاملے میں ایک تنگ خیال رجعت پسند اور مذہبی معاملات میں روایت کی اندھی تقلید کا حامی تھا۔ برنی کی تعریف کرنی چاہیے کہ سلطان اور اس کے اپنے خیالات کے درمیان بہت بڑا فرق ہونے کے باوجود وہ محمد بن تغلق کی مکمل شبیہ پیش کر دیتا ہے۔ دو اور اہم ہمعصر مورّخین، عصامی اور ابنِ بطوطہ محمد بن تغلق کے بارے میں بڑی مفید معلومات فراہم کرتے ہیں جس سے ہمیں اس کے دَورِ حکومت کی تاریخیں متعیّن کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے، لیکن سلطان کی بابت برنی کا مطالعہ جس حد تک زود فہم، واضح اور جامع ہے اس حد کو ان دونوں میں سے کوئی چھُو بھی نہیں پاتا۔ ابنِ بطوطہ کا محمد بن تغلق ایک عالمانہ مزاج کا شخص ہے جو کمزوری کی حد تک فیاض لیکن بنیادی طور پر ایک جابر فرماں روا ہے۔ عصامی کا سلطان ناعاقبت اندیش، بددین ظالم اور من موجی بادشاہ ہے۔ تاریخِ فیروز شاہی کے صفحات کے ذریعے ہی سلطان کی عملی اور متحرک شخصیت ہم پر ظاہر ہوتی ہے۔ پڑھنے والے کو کہیں کہیں درشت، تلخ اور سخت تنقید ملتی ہے، لیکن ان سب کے بیچوں بیچ سے سلطان کی فکر اور شخصیت اپنے سارے تاریک اور روشن پہلوؤں کے ساتھ اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ایسا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کسی خاص دعوے کے ثبوت میں حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور نہ داخلیت کی دخل اندازی گوارہ کی گئی ہے[47]۔ یہ بات عجیب ضرور لگے گی لیکن حقیقت یہی ہے برنی کے گہرے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ داخلی عناصر حقائق کی ترتیب میں نہیں بلکہ سیرت کے

Marfat.com

تعیّن میں کارفرما نظر آتے ہیں۔

اس کے اس میلان طبع سے قطع نظر کہ وہ تاریخ کے نشیب و فراز میں خود اپنی قسمت کے نشیب و فراز ڈھونڈنے لگتا ہے، برنی عملاً ایک خاصہ دیانت دار مورخ تھا۔ حقائق اس کے اپنے یا اس کے خاندان کے لیے خواہ کتنے ہی خوشگوار کیوں نہ ہوں وہ نہ انہیں چھپاتا ہے اور نہ مسخ کرتا ہے۔ وہ بڑی راستبازی سے اعتراف کر لیتا ہے کہ چونکہ محمد بن تغلق کے سامنے اسے سچ بولنے کی جرأت نہ ہوئی اس لیے اس نے ریاکاری سے کام لیا[48] کٹرہ میں علاالدین خلجی کی سازشانہ سرگرمیوں کا ذکر کرتے وقت جن کو بُرا کہتے ہوئے وہ ذرا نہیں جھجکتا اپنے چچا علاالملک کی شمولیت پر پردہ ڈالنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا[49] اس کے ذہن کی سطح پر جو بھی حقائق اُبھرے جُوں کے تُوں درج کر دیے اور اپنے کسی دعوے کے بطلان یا ثبوت میں حقائق کو منتخب یا رد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بڑھاپے کی وجہ سے وہ واقعات کی تاریخ وار ترتیب اکثر بھول جاتا ہے۔ وہ وہی کچھ لکھتا ہے جو اسے یاد آجاتا ہے اور یاد اسے وہی آتا ہے جو اس کے دماغ پر گہرا نقش چھوڑ چکا ہوتا ہے۔ برنی کے کام میں یہ ایک بڑی خامی ہے۔ تاریخوں کی ترتیب کا کمزور خاکہ بلاشبہ کسی بھی تاریخی کام کا عیب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن برنی کا مقصد اپنے قاریوں کو واقعات کی کوئی فہرست مہیا کرنا نہیں، بلکہ اس زمانے کے مزاج کی ایک جھلک دکھانا ہے۔ وہ ماضی کو دوبارہ جنم دیتا ہے اور اپنے قاری کو اس میں ملوث کر لیتا ہے۔ برنی ایک ایسا مورخ ہے جس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب تاریخ وار ترتیب کا خاکہ دوسرے مآخذوں سے مل جائے۔ منہاج نے اپنی طبقاتِ ناصری میں التمش کی زندگی اور سرگرمیوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے، لیکن یہ ذکر اتنے بے جان انداز میں کیا گیا ہے کہ قاری کے ذہن میں فوجی مہمات کے ایک لمبے اور نہ ٹوٹنے والے سلسلے کے علاوہ التمش کی سیرت یا شخصیت یا اس کے دور کے مسائل کے بارے میں کوئی تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ برنی بلبن کے سلسلے میں اتفاقی طور پر التمش کا حوالہ دیتا ہے، لیکن اس کے چند ہی حوالہ جات اتنے جاندار اور بامعنی ہیں کہ ان کی مدد سے

Marfat.com

وہ پورا دَور منور ہو جاتا ہے۔ منہاج ان مہموں کا ذکر تو کرتا ہے جو التمش نے اپنے سابقہ رفیقوں یعنی معزالدین اور قطب الدین کے غلام عہدیداروں کو جو بڑی تعداد میں تھے کس طرح کچلا اور راضی کیا۔ برنی لکھتا ہے کہ التمش دربار میں اس طرح کے فقرے استعمال کرتا تھا: جب میں ان بڑے امیروں کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے کہ تخت سے اُتر کر ان کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دوں۔ ایسا لکھ کر برنی ہمیں اس زمانے کی صورتِ حال کے بارے میں کسی بھی ہمعصر مورخ سے کہیں زیادہ بتا دیتا ہے۔ یہ ایک مختصر اور اتفاقی فقرا ہے لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ التمش کو اپنے ملکوں کا اعتماد اور اشتراک حاصل کرنے کے لیے کس طرح کام کرنا پڑتا تھا اس بارے میں کہ التمش صوفیوں اور مذہبی لوگوں کی سرپرستی کرتا تھا، منہاج کا بیان بڑا معمولی اور مبہم ہے اور سلطان کی شخصیت اور سیرت کو سمجھنے میں اس سے کوئی خاص مدد نہیں ملتی۔ برنی کے حوالہ جات سے سلطان کی شخصیت نہایت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ منہاج کی نسبت برنی اس بارے میں زیادہ لکھتا ہے کہ التمش کے سامنے کون کون سے مذہبی رویے اور عقیدے پیش کیے گئے اور ان پر اس کا کیا ردِ عمل ہوا۔ اس بارے میں جو کچھ برنی لکھتا ہے وہ ہمیں اس زمانے کے مزاج سے زیادہ نزدیک لے جاتا ہے، اور ایسا لگنے لگتا ہے کہ ہمیں اس زمانے کے مسائل کا ادراک ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی تاریخ اور اس کے مزاج کے بارے میں برنی کا ادراک ابتدائی دَورِ وسطیٰ کے کسی بھی فارسی روزنامچہ نگار کے مقابلے میں بہتر تھا۔ اپنی تمام ترخامیوں کے باوجود اس دَور کا کوئی اور مورخ اس کی بلندیوں کو چھو بھی نہیں پاتا۔ منہاج جس نے واقعیات کی تاریخ وار ترتیب کا بڑی سختی سے خیال رکھا ہے۔ اس نے تاریخ کو بڑی بے لطف، رُوکھی پھیکی اور اُکتا دینے والی چیز بنا دیا ہے۔ اس کے بیانات کا اس دَور کے اقتصادی اور سماجی پسِ منظر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ طبقاتِ ناصری سے کوئی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ قرونِ وسطیٰ کی عظیم ترین حکومتوں میں سے ایک جب قائم کی جا رہی تھی تو اس وقت کونسی تہذیبی اور سماجی قوتیں بروئے کار تھیں نئے ماحول سے مطابقت اور مصالحت کے عمل کس طرح شروع ہوئے اور کام کرنے لگے؟

Marfat.com

ایک غیر ملکی انتظامیہ اس ملک میں اپنی جڑیں گہری کرنے میں کس طرح کامیاب ہوا؟ یہ وہ سوالات ہیں جو کسی شخص کے ذہن میں بار بار آتے ہیں لیکن منہاج کے صفحات میں کہیں ان کا جواب نہیں ملتا۔ برنی نے دورِ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کی ایک اور اہم تبدیلی یعنی خلجی شہنشاہیت کے عروج پر بحث کی ہے۔ اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس تبدیلی کی رُوح اور اس کے فوجی، تہذیبی اور معاشی سارے پہلوؤں کو اُجاگر کر دیا ہے۔ علاالدین خلجی نے جو جنگیں لڑیں اُن کی تفصیلات غلط ہو سکتی ہیں لیکن اس نے خلجی دور کے بارے میں جو مکمّل تاثر دیے ہیں وہ تاریخی اعتبار سے اتنے اہم ہیں کہ امیر خسرو بھی اپنی خزائن الفتوح میں اس معیار تک نہیں پہنچ پاتے۔

ڈاکٹر پی۔ ہارڈی کا کہنا ہے کہ برنی تاریخ کو دینیات کی ایک شاخ سمجھتا ہے اور ماضی کو نیکی اور بدی کے میدان کار زار کے نظریے سے دیکھتا ہے۔[50] بدقسمتی سے ان کا یہ نظریہ حقائق سے ثابت نہیں ہوتا برنی اس بات سے خوب واقف تھا کہ سیاسی زندگی میں تبدیلیاں کس طرح آتی ہیں چنانچہ اس کا ہر صورتِ حال کا تجزیہ بنیادی اور لازمی طور پر سیاسی ہے اس بات کا یقین کرنے کے لیے کہ وہ ان قوتوں کو کتنا سمجھتا تھا جن کی وجہ سے سیاسی اقتدار کا زوال اور خاتمہ ہوتا ہے، ہمیں بلبن کی وسایا کے بارے میں اس کے ان بیانات پر نظر ڈالنی ہوگی جو سیاسی اقتدار کے استحکام کے بارے میں ہیں[51]، اور ملک نظام الدین[52]، احمد چپ[53]، الماس بیگ[54] اور ملک کافور[55] کی سیرتوں اور سرگرمیوں کے جو تجزیے اس نے کیے ہیں انھیں بھی دیکھنا ہوگا۔ انتظامیہ اور اس کے مسائل کو برسوں تک بہت نزدیک سے دیکھنے کی وجہ سے اسے ان عناصر اور قوتوں کا عملی اندازہ کرنے میں بڑی مدد ملی، جو اس زمانے کی سیاست پر قابو رکھنے والی حکومتوں کی زندگی پر اثر انداز ہوئیں۔ دورِ وسطیٰ کے سارے مُسلم مصنفوں میں صرف اُسی نے یہ سوال پُوچھا تھا کہ کیا شریعت کے قوانین اپنی ساری جزویات کے ساتھ نافذ کیے جا سکتے ہیں یا نہیں؟ راسخ العقیدگی اور قدامت پسندانہ نظریات کے باوجود وہ یہ اعلان کرتے

Marfat.com

ذرا نہیں جھجکتا کہ اب انتظامیہ کے لیے شریعت کے قوانین نافذ کرنا ممکن نہیں کیونکہ وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ ریاست کے قوانین (ضوابط) کا سہارا لیا جائے۔ صرف وہی شخص ایسا بیان دے سکتا تھا جس میں تاریخ کا گہرا احساس موجود ہو، اور اسلام کے سیاسی نظام میں جو تبدیلیاں صدیوں میں ہوئی تھیں اُن سے واقف ہو۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک علیم تھا، لیکن اُسے سیّد نورالدّین مبارک اور قاضی مغیث کی قوسین میں نہیں رکھا جا سکتا، کیونکہ اسے حقائق کا احساس ان سے کہیں زیادہ تھا۔ اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ فتاوائے جہانداری، جس میں اس نے یہ رائے پیش کی ہے، فیروز شاہ کے دَورِ حکومت میں لکھی گئی تھی، اور عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اس کے دَور کا انتظامیہ مذہبی طرز کا تھا۔ اس زمانے میں یہ بات کہنا کہ شریعت کے قوانین کا نفاذ عملی سیاست کی حدود کے باہر جا چکا ہے، فیروز کے انتظامیہ کی اصلی رُوح اور مزاج پر ایک نہایت صحیح فیصلہ صادر کرنے کے مترادف ہے۔ پروفیسر حبیب کا یہ کہنا دُرست ہے کہ برنی کے واسطے "تاریخ کوئی ریکارڈ یا کوئی روزنامچہ یا کوئی کہانی نہ تھی۔ وہ یقیناً ایک سائنس تھی، طبقاتِ عمرانی کی سائنس اور اس کی بنیاد مذہب یا روایات پر نہ تھی بلکہ مشاہدے اور تجربے پر تھی۔"[56]

برنی نے بلبن سے فیروز شاہ تغلق تک دہلی کے نو حکمرانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ بلبن کے بارے میں اس کا خیال ان باتوں پر مبنی ہے جو اس نے اپنے نانا سپہ سالار حسام الدّین سے سُنیں۔ التمش کے دربار میں سیّد نورالدّین مبارک غزنوی کی تقریروں پر بلبن کی رُودادیں ان ہی کی سند پر بیان کی گئی ہیں۔[57] اس نے اِسی ذریعے سے بلبن کی وسایا کے بارے میں معلومات حاصل کی۔ حسام الدّین بلبن کے ساتھ لکھنوتی گئے جہاں طغرل کی بغاوت کچلنے کے بعد اس نے انھیں وہاں کا شحنہ مقرر کیا۔ لکھنوتی مہم کے بارے میں اس کا نہایت صاف ستھرا بیان غالباً اس کے نانا کی رودادیوں پر مبنی تھا۔ اس کے علاوہ بلبن نے بغراخاں کے لیے ہدایتیں شمس دبیر کو تحریر کرائیں، جو امیر حسن سنجری کا رشتہ دار تھا اور امیر حسن سنجری

Marfat.com

بلبن کا دوست تھا۔ حسن اور خسرو سے اسے شہزادہ محمدؔ کی زندگی اور سرگرمیوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی، جلال الدّین خلجی کے زمانے سے فیروز تغلق کے دورِ حکومت تک کا حال وہ ذاتی مشاہدے اور ذاتی تجربے کی بنا پر لکھتا ہے۔ اس نے اپنے چند ہی ہمعصروں کی سندیں پیش کی ہیں[58]۔ اس نے خلجی کی مہموں کا بیان فضول سمجھا کیونکہ تاج الدّین پہلے ہی یہ منزل طے کر چکا تھا۔ اور برنی کسی پٹے ہوئے راستے پر چلنے کا عادی نہ تھا۔ اسی لیے جن باتوں کی بنا پر اس نے معلومات کا انتخاب کیا ان میں سے ایک بات یہی تھی کہ آیا اسی عنوان پر پہلے سے کچھ تحریریں موجود ہیں یا نہیں۔ اگر کسی عنوان پر پہلے سے مواد موجود ہوتا تو وہ تفصیلات سے اجتناب کرتا تھا۔ اگر نہ ہوتا، تو ضروری تفصیلات بڑے شوق سے دیتا تھا۔ ترکان چہل گانی کے ایک اہم فرد، ملک قطب الدّین حسن کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ ملک پر کئی جلدیں لکھی گئیں ہیں[59]۔ لیکن اس کے بارے میں میرا اپنا بیان تقریباً ترسانے کی حد تک مختصر ہے۔ گو برنی اس کا ذکر نہیں کرتا، لیکن یہ تمام عصری ادب اس نے کبھی پہلے پڑھا ہوگا۔

جب برنی نے تاریخِ فیروز شاہی لکھی تو اس کے پاس کچھ یادداشتیں رُوداد یں یا اندراجات تھے؟ پروفیسر حبیب کا خیال ہے کہ اس کے پاس خود اپنی یادداشت اپنے قلم، دوات اور کاغذ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کی کتاب کے بڑے حصّے کے بارے میں یہ بات دُرست لگتی ہے۔ لیکن تاریخِ فیروز شاہی میں بعض ایسے مقامات آتے ہیں جب پڑھنے والے یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ برنی کے پاس کچھ تحریری معلومات موجود تھی۔ جیسے مخصوص عہدیداروں، صُوبیداروں وغیرہ کی فہرستیں جو ہر سلطان کے بیان سے پہلے لکھی ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ محض اس کی یادداشت کا کمال نہیں ہو سکتا۔ چونکہ یہ فہرستیں مُتن میں شامل نہیں ہیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہ کبھی بعد میں اس کے ہاتھ لگیں اور اس نے ان کو محض موزوں مقامات پر جوڑ دیا۔

کیا تاریخِ فیروز شاہی، فتاوائے جہانداری سے پہلے لکھی گئی یا بعد میں؟ یہ سوال بڑا

Marfat.com

معقول ہے کیونکہ اس بنا پر یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ آیا برنی ایک سیاسی مفکّر تھا جس نے تاریخ کو اپنا لیا۔ یا وہ دراصل مورّخ تھا اور بدل کر مفکّر بن گیا۔ آیا اس نے تاریخ کو اپنے سیاسی خیالات کے قالب میں ڈھال لیا۔ یا تاریخ کے علم نے اس کے سیاسی خیالات کو جنم دیا۔ داخلی شہادتوں سے۔ اسلوبِ بیان، عبارت اور مضمون سے۔ ثابت ہوتا ہے کہ فتاوائے جہانداری تاریخ کے بعد تالیف کی گئی۔

تاریخ فیروز شاہی کی تالیف کے پیچھے برنی کے کیا مقاصد تھے؟ اس نے یہ تاریخ اس لیے لکھی کہ اس کے مایوس رُوح کو اس کام میں سکون ملا، خود کو ترقّی دینے کا احساس پیدا ہوا۔ اور اس بات کا ایک موقع ملا کہ اپنے نام اور اس شہرت کو غیر فانی بنا سکے جو اس سے چھینی جا رہی تھیں۔ یہ خیال دُرست نہیں لگتا کہ اس نے فیروز شاہ کی عنایتیں حاصل کرنے کے لیے ایسا کیا۔ وہ تاریخ فیروز شاہی میں جگہ جگہ لکھتا ہے کہ اس کی خواہش ہے کہ فیروز شاہ اس کی تاریخ پر ایک نظر ڈالے۔ لیکن یہ چیز محض ایک خواہش سے زیادہ نہ تھی، جو کتاب شروع کرنے کے بعد پیدا ہوئی اور تالیف کا اصلی مقصد ہرگز یہ نہ تھا۔ اس ضمن میں ایک اور بات کی طرف توجہ دِلائی جا سکتی ہے۔ برنی اپنی کتاب میں محمد بن تغلق پر بڑی لعن طعن کرتا ہے۔ ہمیں فتوحات اور دوسرے مآخذوں سے یہ پتہ لگتا ہے کہ فیروز شاہ اس کی بڑی عزّت کرتا تھا اور اس کے لیے خداوندِ نعمت اور مخدوم و مربّی من ، جیسے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ برنی ایک ایسی کتاب کے ذریعے فیروز کی عنایتیں کیسے حاصل کر سکتا تھا جس کتاب میں اس نے اپنے مخدوم میں نمرود اور فرعون کی سی بُرائیاں بتائی ہوں؟ ہاں یہ ممکن ہے کہ فیروز اپنے سے پہلے والے ممتاز فرمانبردا کا دل سے قائل نہ ہو اور محمد بن تغلق سے دِلی لگاؤ کے ظاہری دعوے تو کرتا ہو لیکن حقیقتاً نہ اس کی عزّت کرتا ہو اور نہ اس سے محبّت کرتا ہو۔

ایک اور بات کا امکان بھی ہے۔ تاریخِ فیروز شاہی غالباً ایک نہیں دو کتابیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف دو علاحدہ علاحدہ تاریخیں لکھنا چاہتا تھا: ایک جس میں بلبن

Marfat.com

سے محمد بن تغلق تک ابتدائی فرمانرواؤں کا تذکرہ ہو، اور دوسری جس میں صرف فیروز شاہ تغلق کا تذکرہ ہو۔ چونکہ وہ دوسری کتاب مکمل نہ کر سکا اس لیے دونوں کو ملا کر تاریخ فیروز شاہی کا نام دے دیا۔ اس سلسلے میں کئی باتیں غور طلب ہیں: (1) ایسا لگتا ہے کہ برنی کے ذہن میں تاریخ لکھنے کے کئی مختلف منصوبے تھے۔ کسی وقت اس نے ایک عالمی تاریخ[64] لکھنے کا خیال کیا لیکن دو وجوہات کی بنا پر یہ خیال ترک کر دیا: لائق تعظیم پیش رو منہاج السراج کا پاس و لحاظ اور تاریخ کے بارے میں عام طور پر لوگوں کی بے اعتنائی۔ (2) کیقباد کے بارے میں برنی کے بیان سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس سلطان کے بارے میں الگ سے ایک رسالہ لکھنا چاہتا تھا۔ (3) تاریخ فیروز شاہی کے شروع اور بعد کے وہ دونوں حصے جن میں فیروز شاہ کا ذکر ہے عبارت کے لحاظ سے اور طریقۂ فکر، تجزیے اور رنگ بیان کے نقطۂ نظر سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ پہلے حصے کا برنی بڑا تیز فہم، چبھتی ہوئی تنقید کرنے والا نقاد اور بعض مقامات پر تلخی برتنے والا شخص ہے۔ دوسرے حصے میں وہ ایک سیدھا سادھا چاپلوس ہے۔ (4) برنی موضوعات کی ایک فہرست دیتا ہے جن کا تذکرہ وہ فیروز شاہ کے بیان میں کرنا چاہتا ہے۔ اس فہرست سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں الگ سے ایک کتاب لکھنے کا منصوبہ تھا اور کسی بڑی کتاب میں محض ایک باب لکھنے کی نیت نہ تھی۔

تاریخ فیروز شاہی کے آخری حصے کا برنی ایک بے شرم خوشامدی لگتا ہے۔ اسے فیروز شاہ کی شخصیت میں ملکوتی خوبیاں نظر آتی ہیں اور اس کے دربار کو وہ اللہ کے دربار سے تعبیر کرتا ہے جہاں امرا ایسے کھڑے ہوتے ہیں۔ جیسے عرش پر جبرائیل کھڑے ہوں[65]۔ وہ فیروز کو آسمان پر چڑھا دیتا ہے اور خواجہ جہاں پر لعنت بھیجتا ہے تاکہ خواجہ جہاں کے ساتھ مل کر فیروز شاہ کے خلاف سازش کرنے کا وہ پرانا الزام دھل جائے۔ یہاں برنی ان معیاروں سے خود بخود گر جاتا ہے جو اس نے اپنی کتاب کے دیباچے میں تحریر کیے ہیں۔ لیکن خان جہاں مقبول کے بارے میں اس کا حوالہ بڑا معنی خیز ہے۔ یہ ایک ایسی تاریخ ہے جو فیروز شاہ کے لیے تنبیہ کا کام بھی دے

Marfat.com

سکتی ہے اور زوحتہ الصفا کے مصنف کے ان قولوں میں سے ایک کی یاد دلاتی ہے کہ موزخین کو اپنے حقیقی جذبات کا اظہار کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ اس کے بارے میں برنی کے فقرے یہ ہیں "پچھلے چھ برس سے وزارت اس کے سپرد کر دی گئی ہے۔ اسے دیوانِ وزارت پر بیحد اور کامل اختیار ہے اور اسے مطلق العنان بنا دیا گیا ہے۔ شہنشاہ نے اِسے اپنی مرضی سے جو رعایتیں دے رکھی ہیں دہلی کے کسی سابقہ سلطان نے اپنے وزیر کو کبھی نہیں دیں[66] وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی تعریف بھی کرنی چاہیے اور اس سے خبردار بھی رہنا چاہیے۔"

تاریخِ فیروز شاہی کو سمجھنے کے لیے برنی کے اسلوبِ بیان اور اس کی اصطلاحات کا سمجھنا ضروری ہے جو اصطلات اس نے استعمال کی ہیں ان میں سے بعض کا مفہوم خصوصی ہے۔ اور برنی کے خیالات سمجھنے کے لیے اس مفہوم کا سمجھنا ضروری ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ خلجی ترک نہیں تھے[67] تو لفظ ترک کو نسل کے معنی میں استعمال نہیں کرتا[68]، جب وہ ہندوؤں کے خلاف علاالدین کے سخت ضابطوں کا حوالہ دیتا ہے تو وہ ہندوؤں کی اصطلاح فرقہ وارانہ معنی میں استعمال نہیں کرتا، جب وہ محمد بن تغلق کے ٹیکس بڑھانے کی بات کرتا ہے کہ دس گُناہ بڑھا دیا[69] تو وہ اس محاورہ کا استعمال ریاضی کے معنی میں نہیں کرتا۔

ایک ہی مقالے میں برنی کے ساتھ انصاف کرنا مشکل ہے اس مقالے میں اس کے فکر و خیال اور شخصیت کے بعض بنیادی پہلوؤں پر توجہ دلائی گئی ہے۔ برنی ان موزخین میں سے ہے جو اس وقت تک قاری کی سمجھ میں نہیں آسکتے جب تک وہ ان کے فکر و خیال کی بنیادی قسموں اور ان کی شخصیتوں کے خصوصی پہلوؤں سے واقف نہ ہو جائیں۔ تاریخ فیروز شاہی وہی سمجھتا ہے جو ضیاالدین برنی کو سمجھتا ہے۔

Marfat.com

حوالہ جات

ا۔ برنی، تاریخِ فیروز شاہی (بب، انڈ، 1860 تا 1862) صفحہ 23۔

2۔ ایضاً صفحات ا تا 23۔

3۔ ایضاً صفحہ ا، صفحہ 48 بھی دیکھیے، جہاں وہ اقدامات بیان کرنے کے بعد جو بلبن نے اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے اُٹھائے، وہ بلبن کی موت کے صرف ستر برس بعد اس کے پورے خاندان کے خاتمے کا حوالہ دیتا ہے۔

4۔ ایضاً صفحہ اا

5۔ ایضاً صفحہ 12

6۔ ایضاً صفحات 12، 13

7۔ ایضاً صفحہ 16

8۔ ایضاً

9۔ ایضاً صفحات 10، اا

10۔ تاریخِ فیروز شاہی، صفحات 10، اا

اا۔ Balazuri, the Origins of Islamic state, trans, Hitti (Neir york 1916), Introduction, p. 3.

12۔ ایضاً صفحات 32، 41

13۔ ایضاً صفحہ 87

Marfat.com

14۔ ایضاً صفحہ 209

15۔ ایضاً

16۔ ایضاً صفحہ 222

17۔ ایضاً صفحہ 248

18۔ ایضاً صفحہ 250

19۔ ایضاً صفحات 265، 266

20۔ ایضاً صفحہ 255

21۔ ایضاً صفحہ 248

22۔ ایضاً صفحہ 504

23۔ ایضاً صفحات 509 تا 511؛ 516، 517

24۔ ایضاً صفحہ 521

25۔ ایضاً صفحہ 354

26۔ ایضاً صفحہ 116

27۔ میر خورد، سیر الاولیا، (دہلی 302 ہجری) صفحہ 312

28۔ تاریخ فیروز شاہی، صفحات 18، 20 وغیرہ

29۔ ایضاً صفحہ 2

30۔ ایضاً صفحات 343، 344

31۔ جیسا کہ برنی کے دو اور ہمعصروں، میر خورد اور حمید قلندر، نے کیا تھا۔

32۔ اس کتاب کا اکیلا مسودہ رضا لائبریری، رامپور میں محفوظ ہے۔

33۔ تاریخ فیروز شاہی، صفحہ 505۔ برنی کے مطابق یہ سارے لوگ کم نسل تھے، نجبا جو ملک بنایا گیا اور گجرات، ملتان اور بدایوں پر مامور کیا گیا، ایک ماہرِ موسیقی کا بیٹا تھا دلدھا

Marfat.com

ایک مالی تھا اور شیخ بابو نائک ایک جولاہے کا بیٹا تھا۔

34۔ ایضاً صفحات 556، 557

35۔ ایضاً صفحہ 557

36۔ ایضاً صفحہ 166

37۔ ایضاً صفحات 204 تا 205

38۔ ایضاً صفحات 43، 464 تا 465۔ برنی نے خصوصیت سے ذیل کے فلسفیوں کے نام لیے ہیں: سعد، عبید، نجم انتشار، مولانا نجم الدین۔

39۔ ایضاً صفحات 43، 465

40۔ ایضاً صفحہ 68

41۔ ایضاً صفحہ 69

42۔ ایضاً صفحہ 200

43۔ ایضاً صفحہ 166

44۔ ایضاً صفحات 525 تا 526

45۔ ایضاً صفحہ 467

46۔ ایضاً

47۔ صرف دو مثالیں دی جارہی ہیں:

(1) برنی جلال الدین خلجی کا بڑا مداح ہے اور اس کی بڑی عزت کرتا ہے وہ اسے سلطانِ حلیم کہتا ہے اور ان سب کو برا بھلا کہتا ہے جو اس کی المناک موت کا سبب بنے۔ لیکن یہ بات اسے تفصیلات بتانے سے نہیں روک پاتی۔ تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ جلال پوری تیاری کے جانے اور احتیاط برتنے کے سارے مشوروں کو نظرانداز کر کے خود ہی موت کے کھاجبڑوں میں گھس پڑا۔

Marfat.com

(ب) برنی سیدی مولانا کے واقعے کا حوالہ دیتا ہے اور اپنی خوش اعتقادی میں اس واقعہ کو آندھی اور فوراً بعد میں ہونے والی خوراک کی کمی سے جوڑ دیتا ہے لیکن اس کے بیان سے یہ شبہ کسی کو نہیں رہتا کہ اس کی خانقاہ بے اطمینان عناصر کی پناہ گاہ بن گئی تھی۔

اور بھی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

48۔ تاریخ فیروز شاہی، صفحات 16 تا 17

49۔ ایضاً صفحہ 222

50- Hardy, Historians of Medieval India, p. 39

51۔ تاریخ فیروز شاہی صفحہ 77 (et seq)

52۔ ایضاً صفحہ 132 (et seq)

53۔ ایضاً صفحات 184، 224 وغیرہ

54۔ ایضاً صفحہ 229 (et seq)

55۔ ایضاً صفحہ 375 (et seq)

56- Mohammed Habib! The Political theory of the Delhi Saltante, p 125.

57۔ تاریخ فیروز شاہی، صفحہ 41۔

58۔ اسے جن لوگوں سے معلومات حاصل ہوئی اُن میں خواجہ ذکی، ملک قارا بیگ، امیر خسرو اور امیر حسن کا نام لیتا ہے۔ تاریخ فیروز شاہی، صفحات 67، 114، 229، 118، 370۔

59۔ ایضاً صفحہ 113

60- The Political theory of Delhi Sultante p. 126.

61۔ تاریخ فیروز شاہی، صفحات 24، 126، 174 وغیرہ

62۔ ایضاً صفحہ 132

Marfat.com

63۔ فتوحات فیروز شاہی، صفحات ۱۸ تا ۱۹

64۔ تاریخِ فیروز شاہی، صفحہ 49

65۔ ایضاً صفحہ 578

66۔ ایضاً صفحات 578 تا 579

67۔ ایضاً صفحہ 176

68۔ ایضاً صفحہ 287

69۔ ایضاً صفحہ 473

Marfat.com

دورِ وسطیٰ کے کشمیر میں تاریخ نگاری

محبّ الحسن

اس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ سلطنت کے دور میں کشمیر کی صرف فارسی تاریخ نگاری کا ذکر کیا جائے۔ اب یہ بات عام طور پر مان لی گئی ہے کہ صرف کشمیر ہی ہندوستان کا وہ واحد علاقہ تھا جہاں مسلمانوں کی آمد سے پہلے تاریخ نگاری کا دور دورہ تھا۔ اور حالانکہ بہت سے روزنامچے لکھے گئے، لیکن صرف کلہن کی راج ترنگنی ہی تلف ہونے سے بچ سکی۔ یہ 9-1148ء میں مکمل ہوئی۔[1] دو سو سال بعد جوناراج نے اس زمانے سے لے کر سلطان زین العابدین تک کے زمانے کے حال قلم بند کیا اور کلہن کی طرح اس کا بھی نام راج ترنگنی رکھا۔ 1459ء میں جوناراج کے انتقال کے بعد اس کے شاگرد شری ورنے، اس وقت کی تاریخ سے لے کر جہاں تک جوناراج نے لکھی تھی، 1486ء تک کا حال لکھا۔ شری ور کے انتقال پر براجیہ بھٹ نے اپنی راجیہ وُلیتک تالیف کی جس نے 1517ء سے 1596ء تک کے دور کا احاطہ کرلیا۔[2] کشمیر میں لکھا جانے والا یہ سنسکرت کا آخری روزنامچہ تھا۔

چنانچہ کشمیر میں تاریخ نگاری کی ایک ٹھوس روایت موجود تھی، اور مزید یہ ہوا کہ سلطنت کے قیام کے بعد ایران اور ترکستان سے جو عالم فاضل لوگ آئے وہ اپنے ساتھ ایرانی اور وسط ایشیائی روایتیں لائے لیکن تعجب یہ ہے کہ ابتدائی اَسّی برسوں میں فارسی کی کوئی تاریخی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس کا صرف ایک ہی سبب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں درباری زبان سنسکرت تھی۔ سلطان زین العابدین (70-1420ء) کے زمانے سے فارسی ادب اور دربار

Marfat.com

کی زبان کی حیثیت سے سنسکرت کی جگہ لے لی۔ اور فارسی تاریخیں لکھی جانے لگیں۔ ان میں سے دو تاریخیں سلطان کے درباری شاعروں، ملّا احمد اور ملّا نادری کی تھیں لیکن افسوس کہ ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ ان تاریخوں کا بھی کوئی سراغ نہیں ملتا جو سلطان فتح شاہ کے دوسرے دورِ حکومت (1493 - 1505ء) میں قاضی ابراہیم نے چک فرمانرواؤں کے زمانے (1566 - 88ء) میں ملّا حسن قادری نے لکھیں[3] مغلوں سے پہلے کے دور میں تالیف ہونے والی صرف ایک ہی کتاب اب تک محفوظ ہے۔ یہ سیّد علی کی تاریخ کشمیر ہے۔ جو یوسف شاہ کے دورِ حکومت میں لکھی گئی۔ باقی ساری کتابیں جو اب تک موجود ہیں مغلوں کے دورِ حکومت میں لکھی گئی تھیں۔ اس کے باوجود انھیں دورِ سلطنت کی کتابیں سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ ان کے مصنّف کشمیر میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے اور انھوں نے بعد کے شاہ میر اور چک ادوار میں زندگی گزار دی۔ چنانچہ دورِ سلطنت کی تاریخوں میں سیّد علی کی تاریخ کشمیر ہے جو 1579ء میں مکمّل[4] ہوئی، ایک گمنام مورّخ (اومر 287) کی تاریخ کشمیر ہے جو 1590ء میں لکھی گئی[5]، ایک اور گمنام مورّخ کی کتاب بہارستانِ شاہی ہے جو جہانگیر کے زمانے میں لکھی گئی[6]، حسن بن علی کاشمیری کی تاریخ کشمیر ہے جو جہانگیر ہی کے زمانے میں لکھی گئی[7]، حیدر ملک کی تاریخ کشمیر ہے جو 21-1620ء میں مکمّل ہوئی[8]۔ کشمیر کی اور دوسری تاریخیں اس سے قطع نظر کہ وہ مندرجہ بالا کتابوں کی اختصار شدہ شکلیں ہیں، اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی میں لکھی گئی ہیں۔ اور اسی بنا پر اس موضوع کے لیے خارج از بحث ہیں۔

مندرجہ بالا کتابوں میں بہارستانِ شاہی اور حیدر ملک کی تاریخ سب سے زیادہ اہم ہے۔ دوسری کتابیں گو بعض پہلوؤں کے اعتبار سے مفید ہیں، لیکن تاریخوں کے تسلسل کے لحاظ سے قابلِ نقص ہیں۔ ان میں عام طور سے واقعیات کے خلاصے ہیں اور بعض اہم تاریخی واقعیات کا ذکر نہیں ہے، مثال کے طور پر سیّد علی کی تاریخ محض ان وجوہات کی بنا پر اہم کتاب سمجھی جاتی ہے کہ اس میں مرزا حیدر دغلت کی کشمیری ترقیوں کا ذکر ہے، جن پر اس نے اپنے

Marfat.com

ذاتی مشاہدے کی مدد سے لکھا ہے اور دورِ سلطنت کی مذہبی تاریخ کا ذکر ہے جس نے کتاب کے ایک تہائی حصے کا احاطہ کر رکھا ہے، لیکن اس میں بہت اہم تاریخیں دی ہوئی ہیں اور دورِ سلطنت کی سیاسی تاریخ کو زیادہ تر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ گمنام مصنف (اومر 267) کی تاریخِ کشمیر سلطان شمس الدین (1540ء) کے دورِ حکومت کی کشمیری تاریخ ہے۔ اس میں بھی چند ہی تاریخیں دی ہوئی ہیں اور بہت سے اہم واقعات کا ذکر نہیں ہے جیسے وادیٔ کشمیر میں سیّد علی ہمدانی کی آمد۔ اس کے علاوہ بعض مقامات پر تحریر بہت اُلجھی ہوئی اور ناقابلِ اعتبار ہے۔ حسن بن علی کی تاریخِ کشمیر کی ایک مختصر تاریخ ہے، جو ایک کشمیری امیر جلال الدین ملک کی درخواست پر لکھی گئی۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے محفوظ کرانا چاہتا تھا۔ کتاب کا دعوا ہے کہ اس نے قدیم زمانے سے 1616ء تک کے دور کا احاطہ کر لیا ہے لیکن دراصل یہ سلطان حسن شاہ کے دورِ حکومت (84-1472ء) تک محدود ہے۔ بعد کا بس ایک معمولی سا حوالہ یہ ہے کہ یعقوب شاہ نے اکبر کی اطاعت قبول کر لی تھی۔

اس کے برخلاف بہارستانِ شاہی اور حیدر ملک کی تاریخ، تاریخوں کے تسلسل اور جغرافیائی خصوصیات دونوں اعتبار سے بہت کارآمد کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں اس دور کی تفصیلات جس دور کا یہ احاطہ کرتی ہیں دوسرے روزناموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ دی ہوئی ہیں۔ بہارستان کے مصنف کے بارے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم کہ وہ غالباً بیہاقی سیدوں کا ملازم تھا اور ان ہی کے ایما پر اس نے یہ کتاب لکھی کیونکہ اس نے اس کتاب میں ان کی ترقی اور کاموں کو خاص مقام دیا ہے اور ان کی بہت مدح سرائی کی ہے۔ اس کے ماخذوں میں کلہن کی راج ترنگنی، جوناراج اور شری ور کے روزنامچے، ملا احمد، ملا قادری، قاضی ابراہیم اور ملا حسن قادری کی فارسی تاریخیں تھیں، جو سب اس کے زمانے میں موجود تھیں جہاں تک بعد کے شاہ میر اور چک فرمانرواؤں کا تعلق ہے اس نے اس کے بارے میں اپنے ہمعصروں یا ذرا بعد کے ہمعصروں سے معلومات حاصل کر کے یا اپنے ذاتی تجربے

Marfat.com

کی بنا پر لکھا ہے۔ حیدر ملک نے اپنی تاریخ کشمیر کے بادشاہوں اور اپنے ان آباؤ اجداد کے عظیم کارناموں کو محفوظ رکھنے کے خیال سے لکھیں، جن آباؤ اجداد نے اپنے ملک کی تاریخ بنانے میں بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔[10] حیدر ملک رام چندر کے خاندان سے تھے۔ جو کشمیر کے آخری ہندو راجہ سنادیو کا سپہ سالار تھا۔ ایک اچھا سپاہی مدبر سیاست داں، مورخ اور انجینئر ہونے کی وجہ سے وہ خود بھی ایک صاحب کمال شخص تھا۔ اس نے بیس برس تک یوسف خاں چک کی خدمت کی اور جب مغلوں نے کشمیر فتح کیا تو جلاوطنی کے ایام میں وہ اس کے ساتھ ہندوستان میں بھی رہا۔ یوسف خاں کے انتقال کے بعد وہ جہانگیر کا ملازم ہو گیا جس نے اسے چغتائے اور رئیس الملک کا لقب دیا۔[11] حیدر ملک نے بھی ان ہی ماخذوں سے استفادہ کیا جن سے بہارستان شاہی کے مصنف نے کیا تھا۔ جہاں تک چک دور کا تعلق ہے اس نے خود ہی بہت سے واقعات دیکھے تھے کیونکہ وہ زمانہ اس کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ اس کے علاوہ اسے بہت کچھ معلومات اپنے والد اور دادا سے ملی۔ جو سلطنت کے دور میں اعلا سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ کشمیر کی تاریخیں، کشمیر کی تاریخ نگاری کی اس روایت سے کس حد تک متاثر ہوئیں جس روایات کی نمائندگی کلہن، جوناراج یا شری ور کرتے تھے۔ ان کے مطالعے سے بہر حال یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مصنف نے ہندوستان اور ایران کی تاریخ نگاری کی روایتوں کی نقل کی ہے۔ ان دونوں ملکوں سے ان کا تہذیبی تعلق رہا۔ کشمیر کی فارسی تاریخوں میں واقعات بیان کرتے وقت تاریخوں کے تسلسل کا سختی سے خیال رکھا گیا ہے گو ان میں تاریخیں کم دی گئی ہیں لیکن انھیں حکومتوں کے دور، بغاوتوں، جنگوں اور فتوحات اور شاہی سلسلوں کے عروج اور زوال کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے۔ واقعات کے بیچ بیچ میں شعر دیے گئے ہیں جن سے کوئی نہ کوئی سبق ملتا ہے یا صوفیوں کی کرامات کی حکایتیں اور کہانیاں یا ایسے دوسرے مافوق الفطرت حالات دیے ہوئے ہیں جو کشمیر کے پہاڑوں، جھیلوں، چشموں اور دریاؤں میں رونما ہوئے۔[12] ان میں وادی کی اندر اشاعت اسلام کے بارے میں خاصا کچھ دیا گیا ہے،

Marfat.com

لیکن لوگوں کی سماجی اور اقتصادی حالات پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ حالانکہ ان میں زیادہ تر واقعیات کا محض بیان ہے لیکن بعض اوقات تشریح کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی واقعہ کیوں رُونما ہوا۔ چنانچہ مرزا حیدر دغلت کی طاقت توڑنے کا حال بیان کرتے وقت حیدر ملک تشریح کرتا ہے کہ اس کا سبب اس کے وہ ظالمانہ اقدامات تھے جن کی بنا پر کشمیر کے لوگ مخالف ہو گئے اور بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔[13] بہارستان کا مصنف اس ظلم کے بارے میں زیادہ واضح ہے اور یہ کہتا ہے کہ مرزا حیدر کی طاقت اس بنا پر توڑی گئی کہ وہ شعبوں، شافعیوں اور صوفیوں پر جبر کرتا تھا۔[14] اسی طرح یہ کتابیں مغلوں کی فتح کشمیر کا سبب یہ بتاتی ہیں کہ یوسف شاہ عیش طرب میں وقت گزارتا تھا اور ریاست کے معاملات میں بے پرواہی برتتا تھا۔ اس کا مزید سبب یہ بتاتی ہے کہ یعقوب شاہ نے وادی کے دفاع کا خیال نہ رکھا اور سُنیوں پر جبر کیا۔[15]

کشمیر کی فارسی تاریخوں کے بعض دلچسپ پہلوؤں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جذبۂ حب الوطنی کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ کشمیر کے مورخین کو کشمیر کی سرسبز وادیوں، برف سے لدی پہاڑیوں چکردار راستوں سے بہتے ہوئے دریائے جہلم، حیات آفریں اور مقدس چشموں اور دلکش مناظر سے محبت ہے۔ وہ بڑے فخر کے ساتھ سلطان شہاب الدین کی فتوحات اور سلطان زین العابدین کی تہذیبی عظمتوں کا ذکر کرتے ہیں، اور ۱۵۲۷ء کے بعد تک کشمیریوں نے مغلوں کے حملوں کو جس کامیابی سے روکا اس کی بڑی مدح سرائی کرتے ہیں۔ وہ یوسف شاہ پر بڑی تنقید کرتے ہیں کہ اس نے مغلوں کے خلاف جدوجہد ختم کر دی اور ان کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اور اس کے بیٹے یعقوب کی بڑی تعریف و توصیف کرتے ہیں کہ اس نے بڑے ناموافق حالات میں جنگ جاری رکھی اور بالآخر جب کشمیر کی آزادی سلب ہو جانے پر ان کا رنج والم بظاہر پوشیدہ رہتا ہے لیکن روزناموں کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو نظر آنے لگتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ روزنامچے مغلوں کے دور میں لکھے گئے تھے اور ان کے مصنف کھل کر کوئی

Marfat.com

ایسی بات نہیں لکھ سکتے تھے جو اُن کے نئے آقاؤں کو ناراض کر دے۔

پورے ہندوستان کی بیشتر اہم تاریخوں نیز صوبائی حکومتوں کی تاریخوں میں ہندوستانی تاریخ کے قبل از اسلام دَور کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس کشمیر کی فارسی تاریخیں اس جزیرے کی افسانوی ابتدا سے شروع ہو جاتی ہیں اور ان میں قدیم راجاؤں کی تاریخ دی جاتی ہے اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ دَورِ وُسطیٰ کے مورخین کے پاس گو قدیم ہندوستان کی کوئی ایسی تاریخ موجود نہ تھی جس سے مواد حاصل کیا جا سکے، لیکن کشمیر کی تاریخ پر کلہن کی راج ترنگنی بڑی آسانی سے دستیاب ہو جاتی تھی، جس کا فارسی ترجمہ بھی سلطان زین العابدین کے زمانے میں کیا جا چکا تھا۔

بہارستانِ شاہی کا اندازِ بیان بڑا پُر تکلف اور طوفانی ہے، جبکہ حیدر مِلک کی تاریخ شاہ اور صاف ستھری زبان میں لکھی گئی، دونوں ہی اعتدال کے ساتھ لکھتے ہیں اور سخت زبان سے گریز کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر دونوں غیر مسلموں کو عادتاً جہنّم رسید نہیں کرتے وہ کُفر اور کافر جیسے الفاظ کا استعمال تو کرتے ہیں، لیکن اُن میں تحقیر کا پہلو نہیں ہوتا؛ اور حالانکہ وادی میں اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں وہ سیّد علی ہمدانی اور ان کے بیٹے محمد ہمدانی کی سرگرمیوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتے ہیں، لیکن ان کی تحریر سے برنی یا بدایونی کا کٹرپن ظاہر نہیں ہوتا۔ کشمیر کے مورخین اپنی تشخیصوں کے معاملے میں زیادہ تر تحمّل اور معروضیت سے کام لیتے ہیں چنانچہ بہارستان کا مصنّف شیعہ ہونے کے باوجود یعقوب شاہ کی اس تعصّبانہ حکمتِ عملی کو ناپسند کرتا ہے جو اس نے سُنّیوں کے خلاف روا رکھی، اور قاضی مُوسا کے قتل پر بھی تنقید کرتا ہے کیونکہ یہ حکمِ قتل اس بنا پر دیا گیا تھا کہ انھوں نے اذان میں حضرت علی کا نام لینے سے انکار کر دیا تھا۔[16] اسی طرح، گو بہارستان کا مصنّف اور حیدر مِلک دونوں ہی سلطان سکندر کی ان سرگرمیوں کا حال بیان کرتے ہیں جو بت شکنی سے تعلّق رکھتی ہیں، لیکن سلطان زین العابدین اور اس کے جانشینوں نے کشمیر میں ہندو مذہب کی حیثیت بحال کرنے اور ہندوؤں کے ساتھ رواداری

Marfat.com

کے ساتھ پیش آنے کے سلسلے میں جو اقدامات کیے ان کو وہ ناپسند نہیں کرتے۔ بہارستان کا مصنف لکھتا ہے:

"سلطان سکندر کے زمانے میں جو مندر توڑے گئے تھے انھیں دوبارہ بنوایا گیا جو ہندو جموں اور کشتاور بھاگ گئے تھے انھیں واپس بلایا گیا۔ ہندوؤں کے علم و ادب کی حوصلہ افزائی گئی۔ ہندوؤں کو پوجا پاٹ کرنے اور رسم و رواج ادا کرنے کی پوری آزادی دی گئی۔ چنانچہ انھوں نے سال کے مخصوص دنوں میں اپنے تہوار منانے شروع کر دیے۔ سلطان زین العابدین خود ان تہواروں میں شرکت کرتا تھا۔ وہ گویّوں اور رقاصوں کو تحائف دیتا اور اسی وجہ سے بڑا مقبول ہو گیا تھا۔ زین العابدین کی سرپرستی میں ہندو مذہب کے احیا کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کی رسمیں اپنا لیں۔ حتیٰ کہ یہ رسمیں صاحبِ علم لوگوں اور علما میں رائج ہو گئیں۔ یہ صورتِ حال شمس الدین عراقی کے زمانے تک برقرار رہی جس نے بت پرستی کے خلاف ہتھیار اُٹھا لیے۔"

اِن مورخین نے کشمیر کی قدیم تاریخ کے لیے جس ماخذ سے استفادہ کیا وہ کلہن کی راج ترنگنی تھی، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے کلہن کی تکنیک نہ اپنائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے کتبوں اور دستاویزوں سے رجوع نہ کیا۔ اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انھوں نے ان سرکاری محافظ خانوں سے فائدہ اُٹھایا جو سلطانوں نے قائم کیے تھے اور نہ انھوں نے سلطنتِ دہلی کی تاریخوں کا مطالعہ کیا۔ اُن کے ماخذ محض ابتدائی کشمیری کتابیں تھیں جن کے بیانات بلا تنقید تسلیم کر لیے گئے۔ کشمیر کے علاوہ کسی اور تاریخی کتاب سے استفادہ نہ کرنے کی بنا پر اُن کے بیانات میں بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کا بیان چونکہ زیادہ تر اپنے ہی سابق مورخین کے بیان پر مبنی ہے۔ اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ شہاب الدین نے پہلے بدخشاں

Marfat.com

کابل، غزنی اور قندھار فتح کیے اور پھر دہلی فتح کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔ وہ ستلج کے کنارے خیمہ زن ہوا جہاں فیروز شاہ تغلق مقابلے پر آیا۔ یہاں ایک جنگ ہوئی، لیکن شکست و فتح کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر کار معاہدۂ امن ہو گیا۔ طے یہ پایا کہ سرہند سے کشمیر تک کا سارا علاقہ فیروز شاہ کا ہو گیا۔ دہلی اور سری نگر کے حکمرانوں میں علاقائی معاہدے کے ساتھ شادی کا رشتہ بھی ہوا۔[18]

اگر عصری تاریخوں کا مطالعہ کیا جاتا تو یہ بیان جھوٹا ثابت ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کشمیر کے مورخوں نے دہلی سلطنت اور ترکستان کی تاریخیں دیکھنے کی زحمت گوارہ کی ہوتی تو اُن سے غلطیاں سرزد نہ ہوتیں۔ ان میں یہ رُجحان عام تھا کہ واقعات کو بلا تنقید مان لیتے تھے۔ اس رُجحان میں ایک غلط قسم کا جذبہ حب الوطنی بھی شامل ہو گیا جس کی بنا پر انھیں برابر یہ فکر رہتی کہ کشمیر کے سلطانوں کے کارنامے بڑھا چڑھا کر بیان کیے جائیں۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حقیقی واقعات اور من گھڑت قصّوں میں تمیز نہ کر سکے۔

جس بات کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں وہ یہ ہے کشمیر کے مورخوں نے مشترک ماخذوں کی بُنیاد پر لکھا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان بیانات میں یکسانیت اور عدم تنوع ہے۔ چنانچہ روزنامچوں میں، خواہ شاہ میر حکومت کے قیام کا بیان ہو یا سلطان شہاب الدین کی فتوحات کا، یا خواہ سیّد علی ہمدانی اور اُن کے بیٹے محمد ہمدانی کی سرگرمیوں کا بیان ہو یا سلطان زین العابدین کے کارناموں کا، سب ہی بیان ایک جیسے لگتے ہیں۔ ہاں جب ہم بعد کے شاہ میر اور چک ادوار پر پہنچتے ہیں تو بیانات میں تنوع اور اختلافات نظر آتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ایسے مشترک ماخذ نہیں ملتے جن سے مواد حاصل کیا جا سکے۔

Marfat.com

حوالہ جات

1- Kalhana, Rajatarangini, English trans. M.A. Stim, 2 vols, London, 1900.

2- جناراج، شری ور، پراجیہ بھٹ اور شکا کی کتابوں کی ترتیب و تدوین 1896ء میں Peterson نے کی، بمبئی۔ انگریزی ترجمہ J.C. Dutt نے کیا انگریزی ترجمہ کا نام اور حوالہ یہ ہے:

Kings of Kashmir, 3 vols. Calcutta 1879-98

3- Mohibbul Hasan, Kashmir under the Sultans, P.1.

4- شعبۂ تحقیق و طباعت، سری نگر

5- Tarikh-i-Kashmir-K. Hof Stats biblis thek Munich.

6- بہارستان شاہی 509 'Indian office'.

7- حسن بن علی کاشمیری، تاریخ کشمیر 315 'Bodleian'.

8- حیدر ملک، تاریخ کشمیر 509 'Indian office.'

9- بیہاقی سید سلطان سکندر کے زمانے میں کشمیر آئے۔ انھوں نے شاہی خاندان میں شادیاں کیں، اور وادی کے سیاسی معاملات میں اہم رول ادا کیا۔ بیہاقی سیدوں میں سے ایک تھوڑی مدت کے لیے بادشاہ بھی رہا۔

10- حیدر ملک، تاریخ کشمیر، الف، 3 اے

Marfat.com

11- حیدر ملک کو ان خطابات سے سرفراز کیے جانے کا خاص سبب یہ تھا کہ شیر افگن کے قتل کے بعد اس نے اور اس کے بھائی علی ملک نے مہرالنسا کی جان اور عزت بچائی تھی۔ اس ضمن میں میرا مندرجہ ذیل مضمون دیکھیے:۔

A Note on the Assassination of Afgan, Dr. Yazdani, Commemoration Volum, ed. H.K. Sherwani 1966.

12- حیدر ملک نے اپنی تاریخ کا پورا ایک حصہ کشمیر کی جھیلوں، چشموں وغیرہ میں رونما ہونے والے مافوق الفطرت واقعات کے لیے وقف کر دیا ہے۔

13- ایضاً 146a

14- بہارستانِ شاہی ff 111b - 112b ؛ 120a-b

15- حیدر ملک، تاریخِ کشمیر، 192a-b ' بہارستانِ شاہی ff 181a — b,

16- ایضاً

17- ایضاً ff. ff 48

18- ایضاً 206 f ؛ حیدر ملک، تاریخِ کشمیر ff 108b — 109b.

Marfat.com

شیخ سکندر کی مراتِ سکندری اور اس سے پہلے کی کتابیں

ایس سی۔ مِسرا

سکندر بن منجھو کی مراتِ سکندری کو اس بنا پر غالباً ناقابلِ رشک یا شاید لائقِ رشک اعزاز حاصل ہو چکا ہے کہ اس نے پہلے اور بعد کی ساری کتابوں کو پسِ پُشت ڈال دیا ہے۔ اب یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ خصوصاً تاریخِ کشمیر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے یہ ایک سہل کتاب ہے۔ اٹھارھویں صدی کے ایک مُغل مورّخ نے جو مُغل گجرات پر اتنا ہی یا پھر اس سے زیادہ ممتاز مصنّف سمجھا جاتا ہے، محض اتنا ہی کیا ہے کہ دَورِ سلطنت پر جو چند صفحات لکھے ہیں ان میں مرات کے ابتدائی حصّے کا خلاصہ چند ایک اضافوں کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ بعد کے مصنّفین حتیٰ کہ برطانوی مصنّفین نے بھی اس دَور کا سرسری جائزہ لیتے وہ شاید ہی اس سے زیادہ کچھ لکھا ہے۔ سر ڈینسی روس نے اتفاقاً ظفرالوالیہ دریافت کی جو اتنی ہی قابلِ قدر اور جامع ہے جتنی مرات ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے یہ اس ملک میں لکھی جانے والی عربی تاریخوں میں غیر مذہبی انداز کی واحد تاریخ انداز کی واحد تاریخ ہے۔ اسی اتفاقی دریافت کے بعد ہی یہ تسلیم کیا گیا کہ مرات کی ہم پلہ اور اتنی ہی قابلِ قدر کتابیں موجود ہیں'' اور اس کو جو اعلا مقام دیا گیا تھا وہ مقام نہ خود اس کے لیے حق بجانب تھا اور نہ ان تاریخوں کے لیے حق بجانب تھا اور نہ ان تاریخوں کے لیے جن کی جگہ اس نے لی تھی۔ کیونکہ یہ دوسری تاریخیں گُمنامی کی حالت میں پڑی رہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُدھر تو مرات کی جلدیں ہندوستانی اور غیر ملکی کتب خانوں میں بڑھتی رہیں اور

Marfat.com

اُدھر دوسری کتابیں کمیاب ہوتے ہوتے تقریباً نایاب ہوگئیں، اور ایک قابلِ قدر کتاب تو بالکل ہی غائب ہوگئی۔

تاہم، گجرات کے مورخوں نے گجرات کی بڑی خدمت کی۔ پہلے ہی سلطانوں کے زمانے سے تاریخیں، روزنامچے اور، غلط نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ نفرت انگیز حد تک خوشامدانہ قصیدے لکھے جانے لگے تھے۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہاں اُن کی فہرست دوں یا تاریخی اعتبار سے اُن کی قدر و قیمت بتاؤں۔ یہ کام میں ایک اور مقالے میں کر چکا ہوں اور یہی کام دوسرے مصنفین بھی کر چکے ہیں۔ میں صرف یہ بتانا چاہوں گا کہ سرکاری تاریخ نگاری کو شروع ہی سے سلطانوں کی سرپرستی حاصل رہی اور سکندر کو خواہ دریا دل نہ کہا جا سکے لیکن نہایت راست باز ضرور کہا جائے گا کیونکہ اس نے پُرزور طریقے سے یہ کہا ہے کہ جن مورخین نے بادشاہوں کے افعال ان کے زمانے میں درج کیے، اُن مورخین نے اپنے بیان میں نقصان دہ مدات شامل نہ کرکے حق پر مصلحت کو ترجیح دی۔[2]

افسوس کہ سکندر نے جو تاریخیں استعمال کیں ان میں دو یا تین کے علاوہ بقیہ یا تو مل نہ سکی ہیں یا پھر ابھی تک دریافت نہ ہو سکی ہیں، اسی لیے ہم اس کے فیصلوں پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ اس کے باوجود انھیں ایک حد تک جانچا جا سکتا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سب میں نہ سہی، لیکن بہت سے مورخین میں وہ ساری خوبیاں اور خامیاں موجود تھیں جو درباری مورخین میں ہوتی تھیں۔ حلوی شیرازی نے اپنی منظوم تاریخِ احمد شاہی میں صنفِ ادب کی خاطر مضمون کو قربان کر دیا ہے، کم از کم طمطراق والے ان اشعار میں تو ضرور قربان کیا ہے جو مرات میں نقل کیے گئے۔ اسی لیے انگریزی ترجموں میں ان شدید اعتراضات کو شامل نہ کرنے کی وجہ سے کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔ شاید اپنے غیر شاعرانہ لمحات میں جنھیں سکندر نے نقل کرنا مناسب نہ سمجھا، حلوی نے ضرور کچھ نہ کچھ نئی معلومات دی ہوگی۔ لیکن اگر داخلی ثبوت سے کچھ روشنی مل سکتی ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کا امکان نہیں معلوم ہوتا۔ وہ تاریخیں زیادہ قابلِ قدر اور

Marfat.com

زیادہ حوصلے کے ساتھ لکھی گئی ہیں جو عالمگیر ہیں اور سال وار ترتیب دی گئی ہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ موجود ہیں۔ یہ سب، سلطان محمد شاہ جو گجرات میں 'بگاڑ' کے نام سے مشہور تھا، کے دورِ حکومت میں لکھی گئی ہیں۔ سب سے پہلی کتاب تاریخِ محمود شاہی ہے جس کے مصنف کے بارے میں شبہ ہے اور جس کا بیان ضمیمۂ محمود شاہی تک چلتا ہے۔ تیسری بھی ایک عالمگیر تاریخ 'تاریخِ بہادر جہاں ہے'، جو مشکل ہی سے ہندوستان کی تاریخ کہی جا سکتی ہے۔ یہ کتاب بلاشبہ وسیع العلمی کی ایک یادگار ہے، اور موجودہ سباق میں اس بنا پر یہ بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کی مدد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ احمد آباد کے دربار میں یا پٹن کی خانقاہوں میں کس انداز کا علم و فضل پروان چڑھ رہا تھا کیونکہ جیسا مجھے معلوم ہوا ہے کہ پٹن کی خانقاہوں میں حدیث اور فقہ جیسے اعلا مضامین کی قدر تھی اور تاریخ کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

مجھے ابھی تک طبقات محمود شاہی کا مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا، لیکن ایک مستند حوالے سے معلوم ہوا ہے کہ وہ اتنی بیش قیمت نہیں ہے جتنی توقع کی جاتی تھی[3]۔ غالباً اس کے بعض بیانات غیر واضح ہیں۔ مصنف نے واقعات کو سال وار ترتیب کے ساتھ درج کیا ہے، اور اسی بنا پر اپنے اُوپر اور زیادہ پابندی عائد کر لی ہے۔ ایسی ترتیب تاریخوں کے تسلسل کے اعتبار سے لاکھ اچھی سہی لیکن غور و فکر کے لیے کم موقعہ دیتی ہے، حالانکہ یہی غور و فکر تاریخ نگاری کی رُوح ہوتا ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ یہ کتاب غالباً کبھی مکمل نہ ہو سکی، اور اس کے دونوں نسخے 'ایک ناتمام متن کے نہایت نامکمل مسودے ہیں'۔ گجرات پر کام کرنے والے مورخ کو تاریخِ محمود شاہی سے زیادہ مدد ملتی ہے۔ لیکن سکندر نے اسی کتاب پر نیشن زنی کی ہے۔ اس کی رائے میں اس کے مصنف نے اپنے سارے جوہر حق کی پردہ پوشی میں صرف کر دیے ہیں۔

درباری تاریخیں یا ایسی تاریخیں جو کسی کے حکم پر کسی کی خوشی کی خاطر لکھی جاتی ہیں جیسا کہ یہ دونوں ہیں، عام طور سے بڑی مفصل، جزویات پر حد سے زیادہ زور دینے والی، رنگینی زبان سے مزین اور طویل نویسی کا نمونہ تو ہوتی ہیں، لیکن شاذ و نادر ہی حق اور حق کے سوا کچھ نہیں؛

Marfat.com

کے اصول پر عمل کرتی ہیں۔ کھُردری سطح پر روغن لگانے کا یہ میلا مالوہ کی عصری تاریخ معاصد محمود شاہی میں بہت نمایاں ہے جو الکرمانی نے لکھی ہے۔ اس کی پُر پیچ اور بل دار نثر تقریباً آٹھ سو ایسے صفحات میں چکّر کاٹتی رہتی ہے، جو مبالغہ آمیز القابات سے پُر ہیں۔ سکندر نے الفاظ کی اِسی بھر مار اور کھُلی ہوئی ملاوٹ میں حق کو فضولیات سے علاحدہ کرنے کے لیے قدم اُٹھایا۔ اس نے اپنے پیشرو مصنّفوں پر جو سخت اعتراضات کیے ہیں وہ اعتراضات اور خود اس کی معذرت اِس ہیں کہ نقل کیے جائیں۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان مصنّفین میں سے جس نے بھی حکمراں سے انعام لیا یا سرپرستی کی توقع رکھی اس نے اس سبب کی بنا پر اپنی تاریخ میں مکمّل اور دُرست واقعات بیان کرنے سے گریز کیا۔ اِسی لیے ان صفحات میں وہ بیانات شامل نہیں کیے ہیں جو اُن سرپرستوں کی تعریف سے تعلق رکھتے ہوں، ویسے کوئی انسان خوبیوں اور خامیوں سے بالاتر نہیں ہوتا۔۔"

اور گجرات کے ان سلطانوں کا ذکر کرتے وقت جو منصفانہ برتاؤ کرتے تھے، میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ ان کے محض اچھے افعال کا ذکر کروں اور بقایا افعال کو مبہم رہنے دوں کیونکہ تولنے ہی پر یہ پتہ لگا کہ اچھے افعال بُرے افعال پر بھاری ہیں۔ اور بعض صورتوں میں بُرے افعال سرے سے ہیں ہی نہیں۔ بہر صورت، لائق اعتماد اشخاص سے اچھا یا بُرا جو کچھ بھی سُنا ہے یا تاریخوں کی چھان بین سے جو کچھ بھی جمع کیا ہے اسے قلم بند کرلیا ہے تاکہ قاریوں کو یہ علم ہوجائے کہ ان حکمرانوں کی اچھائی کس حد تک ظاہر ہو اور انھوں نے بُرائی سے کہاں تک پرہیز کیا۔ اور انھوں نے فتح (جہانگیری) اور حکمرانی (جہاں بانی) کے لیے کیا طریقے اختیار کیے، لہٰذا اس مختصر کتاب کا نام آئینۂ سکندر رکھا ہے تاکہ ہر واقعہ بغیر کسی کمی بیشی کے مکمل طور سے اس میں نظر آسکے۔۔۔۔"[5]

ایک ایسے بازار میں جو پہلے ہی سے بھرا پڑا تھا نئی شے لانے پر سکندر نے بڑی نیک نیتی کے ساتھ معذرت چاہی ہے۔ اس کی رائے میں جب سچ کا پورا علم ہوجائے گا، اُس وقت بھی

Marfat.com

محنت سے بنی ہوئی اس کی یہ تصویریں ماند نہ پڑیں گی۔ بلکہ ان کے حسن میں اضافہ ہو جائے گا کیونکہ ان کے بارے میں بُرے سے بُرا کہا جا چکا ہوگا اور ابہام دُور ہو چکا ہوگا۔

اس پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ متعدد دُشواریوں کے باوجود محض اسی سبب کی بنا پر سکندر نے کاغذ اور قلم سنبھال لیا، ظاہر ہے کہ سلطانوں کا زمانہ پہلے ہی گوشۂ گمنامی میں جا چکا تھا۔ اسے اپنی محنت کے صلے میں کسی انعام یا سرپرستی کی توقع نہ تھی۔ بس شاید محنت سے حاصل کی ہوئی ایک جائز شہریت کی توقع ہو۔ اور بھی کئی اہم باتیں دریافت کی جا سکتی ہیں، جنھوں نے سکندر کو مجبور کر دیا ہوگا کہ وہ اپنی زندگی کی شام میں ایک اتنی مشکل مہم سر کرنے کا فیصلہ کرے جس کی انجام دہی پر کسی بڑے انعام کی توقع بھی نہ ہو۔

یہ بات بہر حال کسی صورت میں نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ سکندر کو اپنے علاقے سے لگاؤ اور اس کے ماضی کے بارے میں تشویش تھی۔ اس کی نظر میں مغلوں کا گجرات سلطانوں کے گجرات کے آگے ماند تھا۔ وہ چمپانیر کی عظمتِ رفتہ کا ماتم کرتے ہوئے کہتا ہے "یا غفور الرحیم کیا چمپانیر ایسا ہی تھا؟ اب تو یہ شیروں اور چیتوں کا مسکین ہے۔ اس کی عمارتیں تباہ ہو چکیں، ان کے شہروں کی جائداد اور املاک بربادی کی ہواؤں کی نظر ہو گئی، حتیٰ کہ اس کا پانی بھی زہر آلود ہو گیا....
یہاں تو قرآن کی اس پیشن گوئی کا اطلاق ہو چکا ہے کہ صفحۂ ہستی سے ہر چیز مٹ جائے گی، سوائے ذوالجلال و والاکرام کی ذات کے جو ہمیشہ رہنے والی ہے[5]۔"

مثال کے طور پر کہیں اور جب سکندر پُرتگالیوں کے خلاف سلطانوں کی شجاعت اور مغلوں کی نسبتاً کمزوری کا مقابلہ کرتا ہے تو فیصلہ ہمیشہ گزرے ہوئے زمانے کے حق میں کرتا ہے۔ سورتھ کا ملک جس میں مالوہ، خاندیش اور گجرات کی ساری خوبیاں موجود تھیں اور جس کے بندرگاہ گجرات کو مالِ تجارت فراہم کرتے تھے، وہی ملک صوبیداروں کے مستقل تبادلوں کی وجہ سے لُوٹ مار کرنے والے بحری ڈاکوؤں، فریبی تاجروں، جھوٹے مرشدوں، زبردستی قبضہ کرنے والے زمینداروں اور شکستہ حال فوجیوں کی آماجگاہ بن گیا ہے[6]۔

Marfat.com

ظاہر ہے کہ یہ کل بیان دُرست نہیں ہے۔ یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ اکبر اور جہانگیر کے زمانے کا گجرات کیا واقعی محمود شاہ بگاڑا اور مظفر شاہ کے زمانے کے گجرات سے کم مالدار تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ان بوڑھے آدمیوں کی سی آہ زاری ہے، جو ہمیشہ اپنے اور اپنے سے پہلے کے زمانے کے گرد حلقۂ نور دیکھا کرتے ہیں۔ لیکن کہیں اس سے زیادہ کوئی اور بات تو نہیں ہے؟

یاد رہے کہ سکندر کی دو ہی نسلیں گجرات میں رہی تھیں۔ اس کے والد ہمایوں کے ساتھ گجرات آئے اور غالباً تبوا کے انتہائی قابلِ تنظیم اور شاہانہ سیّدوں کی ملازمت اختیار کر کے وہیں رہنے لگے۔ اِسی ملازمت کے دوران سکندر کے والد وہاں منجھو کو خاصہ اعزاز حاصل ہوا، اور سکندر کو ان کے پوتے سیّد حامد، اُن کے بیٹے سیّد مراد اور خود ان کی معیت میں سن بلوغ کے نئے تجربات ہوئے۔ اکبر کے پورے دَورِ حکومت اور جہانگیر کے دَور کے پہلے پانچ برسوں تک وہ ان ہی سیّدوں کے ساتھ رہا اور اس کے بعد مغلوں کی ملازمت اختیار کر لی۔

لہٰذا سکندر کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک حیثیت چیدہ قسم کے غیر ملکی کی تھی کیونکہ گجرات میں وہ ایک ایسی برادری کا فرد تھا جو واقعی غیر ملکی تھے اور جس نے اپنا تہذیبی ورثہ شمال سے حاصل کیا تھا، اور دوسری حیثیت اپنی برادری کے ان اہم رُتبہ افراد کے درمیان تھی جو دوسرے علاقوں میں رہ رہے تھے اور خود کو اِن علاقوں کے ماحول میں ڈھال چکے تھے اور وہیں کے باشندے کہلانے لگے تھے۔ سکندر دراصل امرائے اسی غیر ملکی حکمران طبقے کے واسطے سمت کا تعیّن کر رہا تھا اور اسے یہ فکر تھی کہ ان پران کے اور اپنے دیس اور دیس کے تہذیبی ورثے کی عظمت ثابت کرے۔ اِسے ایسے دَورِ ماضی سے کوئی سروکار نہ تھا جو تاریک ہو۔ سلاطین دہلی کے گجرات سے بھی اسے دلچسپی نہ تھی کیونکہ اس دَور نے گجرات کی عظمت میں شاید ہی کچھ اضافہ کیا ہو، لیکن گجرات کے سلطانوں کا معاملہ کچھ اور تھا۔ سکندر شاید اس بیان کی مخالفت نہ کرتا کہ مغلوں کے سارے صوبوں میں گجرات کا ماضی سب سے زیادہ پُر عظمت تھا۔

اس جگہ میں اپنی یہ رائے پیش کر دوں کہ جس جذبے نے ایسے غیر ملکی اعمال کی تربیت کی

Marfat.com

جنھوں نے اس ملک کو اپنا لیا تھا، اور اپنے ان کارناموں پر فخر کرتے تھے جو انھوں نے اس ملک میں انجام دیے تھے، وہ جذبۂ قوم پروری کے اس نوزائیدہ جذبے سے ملتا جلتا تھا جس نے صنعتی سماج سے پہلے جنم لیا تھا۔ یہ جذبہ لوگوں کے اندر جڑ نہ پکڑ سکا۔ کیونکہ جوابی عمل مختلف محرکات کی بنا پر ہو رہے تھے اور سکندر جن اعلا خیالات کا اظہار کرتا تھا وہ ذہنوں میں سرایت نہ کر سکے تھے لہٰذا یہ جذبہ مشکل ہی سے نفوذ کے لائق تھا۔ یہ کاغذ کی طرح باریک تھا اور صرف سطح تک ہی محدود تھا لیکن اس نے ایک ایسا ذہنی خاکہ ضرور تیار کر دیا تھا جس کی مدد سے حکمراں طبقے کے افراد میں اتفاق ہو سکے اور وہ اپنے پرائے میں تمیز کر سکیں۔

لہٰذا سکندر کے لیے دورِ حال جو سب کا ملا جلا ورثہ تھا اتنا روشن دور نہیں تھا جتنا ماضی کیونکہ اس زمانے کے گجرات اور گجراتیوں کو مغل امرا میں ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ اسی لیے سکندر کو خواہ انعام و اکرام کی زیادہ توقع نہ ہو لیکن ان مغل امرا کے قدر و منزلت کی توقع ضرور تھی جو گجرات کے باشندے تھے۔ اور تبوالے سیّدوں سے تو کوئی بھی توقع نہ تھی۔ اور یہ کتاب گجرات اور اس کے عوام کے ورثے کی اہمیت ان امرا کے ذہنوں میں بھی بٹھا سکتی تھی جن میں سے بعض امرا سے بھی اعلا حیثیت کے مالک تھے۔ سکندر نے اپنی کتاب کی ایک جلد خود اعتماد الدولہ کو پیش کی تھی، اور غالباً اسی مقصد سے آگرہ کا سفر کیا تھا۔ اس سے محض مادی مقاصد کے حصول کی خواہش ہی کا نہیں بلکہ مصنف کے بجا فخر کا بھی پتہ لگتا ہے جو اسے اپنی کتاب اور اس کے موضوع پر ہوتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ خصوصیت ہر علاقے کے طبقہ امرا میں تھی لیکن گجرات کے بارے میں ہمیں زیادہ علم ہے کیونکہ یہاں ادب اور تاریخ نگاری کی روایت زیادہ گہری ہے، اور غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دریائے گنگا کے وسطی میدان اور بنگال کو چھوڑ کر مادی اعتبار سے یہ صوبہ مغل صوبوں میں سب سے زیادہ مالدار تھا۔ اس کے سمندری ساحل کی وجہ سے عربی اور فارسی روایت سے اور زیادہ رابطہ قائم کرنے کا موقع ملا، جس کی بنا پر ایک دیسی مسلم روایت نے

Marfat.com

جنم لیا۔اس روایت کی نشو و نما مقامی مسلم برادریوں نے کی۔ سرکاری طبقے میں سے بعض برادریوں کو بدعتی سمجھتے تھے۔ یہ کہنا یقیناً بڑا مشکل ہے کہ گجرات کا ٹھپہ کتنا گہرا تھا اور دوسرے علاقوں کے ٹھپوں سے کس طرح مختلف تھا لیکن یہ بات خاصی واضح ہے کہ ایک تو یہ ٹھپہ تھا ضرور۔ دوسرے حکمراں طبقے کے افراد میں تمیز کرنے اور اس طبقے کو غالباً مختلف سطحوں پر تقسیم کرنے میں مدد دیتا تھا۔ تیسرے یہ کہ علاقوں سے تعلق اور اسی بنا پر فخر کا ایک احساس بھی پیدا کر دیتا ہے۔

میں نے پہلے اس بات کا حوالہ دیا ہے کہ سکندر کے والد نے تبوا کے سیّدوں کے تحت ترقی کی، خود اس نے ان کی ملازمت کی، اور تمام عمر اُن سے تعلّق رہا۔ یہ بات تو واضح ہو چکی ہے کہ سکندر گجرات کے سلطانوں کا بڑا مدّاح تھا لیکن وہ غالباً اُن سے بھی زیادہ اپنے سرپرست کے خاندان اور اس کے آباؤ اجداد کی عزّت اور تعظیم کرتا تھا۔ ظفر خاں کے لیے گجرات کی سلطنت حضرت مخدوم کا عطیہ تھی۔ گجرات میں اُن کے جانشین سیّد برہان الدّین نے ظفر خاں کے جانشین قطب الدّین شاہ کو وہ ذرائع فراہم کیے تھے جن کی مدد سے وہ مالوہ کے سلطان محمود شاہ کے مقابلے میں خود کو بچا سکا تھا۔ جب قطب الدّین شاہ نے ان کی اطاعت چھوڑ دی تو نیست و نابود ہو گیا۔ اس کے جانشین اور گجرات کے عظیم ترین سلطان کی پرورش شاہ عالم کے گھر ہوئی۔ شاہ عالم ان سیّدوں میں سب سے افضل تھے اور گجرات میں آج بھی ان کی بہت تعظیم کی جاتی ہے۔

اس طرح کی نہ جانے کتنی مثالیں دی جا سکتی ہیں کیونکہ سکندر کی تاریخ ایسی ہی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ سکندر کا تعصب یا اس کی جانبداری حقیقتاً اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اس کی تاریخ طبقاتِ اکبری یا گلشنِ ابراہیمی کے ساتھ ملا کر پڑھی جائے۔ ان میں سے کوئی بھی مصنّف سیّدوں کو وہ افضلیت نہیں دیتا جتنی سکندر کے صفحات میں نظر آتی ہے۔ اس کی بابت بھی بظاہر معقول دلیلیں دی جا سکتی ہیں کہ سکندر نے اپنے سرپرستوں کو اُونچا اُٹھانے کے لیے سلطانوں کا ذکر موزوں سمجھا۔

پھر بھی سکندر کے لیے یہ کہنا مشکل ہی سے جائز ہو گا۔ سکندر کو اس میں کوئی دورنگی نظر

Marfat.com

نہیں آئی کیونکہ ایک مملکت کا دُنیاوی ستون تھا اور دوسرا مذہبی، اور ہر چند کہ دُنیاوی حکمراں اپنے میدان میں افضل ضرور تھے لیکن ان پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ اپنے سے برتر اس اقتدار کے آگے جُھکیں جو راسخ العقیدگی، روحانی ورثے اور میدانِ مذہب میں ذاتی برتری کی بنا پر حاصل ہوتا تھا۔ اِسی کے ساتھ حکومت کے مذہبی ستونوں کا بھی یہ فرض تھا کہ حکمران مشکل میں پھنسا ہو تو اسے بچائیں اور جب یہ توازن برقرار رہتا ہے تو ملک پھُولتا پھلتا ہے۔ سکندر کو بڑا افسوس تھا کہ اس بے لِکھے معاہدے پر ہمیشہ عمل نہیں کیا جاتا، اور وہ اس کا ذِمّہ دار سیّدوں کو نہیں سلطانوں کو ٹھہراتا ہے۔

اس خیال کی تہہ میں دَورِ وسطیٰ کا محلت واثر والا مفروضہ ہے۔ اس زمانے میں یہ بات عام طور سے مانی جاتی تھی کہ حالات کو معمول سے بدلنے کے لیے ایک مافوق الفطرت ہستی دخل انداز ہوتی ہے۔ اس زمانے کے تقریباً سارے لوگوں کی طرح سکندر کو یہ یقین تھا کہ رُوحانی تربیت، اخلاقی سختی اور شاید اختیاری خود ذِلّتی سے جرأت حاصل ہوتی ہے[10]۔ اس لیے نیکی محض شخصیت کی روحانی ترقی ہی نہیں بلکہ ایک ایسا ذریعہ بھی ہے جس کو اختیار کر کے ماحول کو تبدیل یا کم سے کم متاثر کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے جنھیں یہ خوبی عطا ہوئی ہے انھیں اس کی تربیت کرنی چاہیے، اور دوسرے لوگوں کو ان کی عزّت کرنی چاہیے۔

ظاہر ہے کہ سکندر نے ان قدروں کو اپنے زمانے کے روایتی اور راسخ العقیدہ خاکے کے سیاق میں دیکھا۔ اس نے یہ سمجھا کہ حکمران اور صوفی دونوں کی پہلی ذِمّہ داری یہ ہے کہ ایمان کا بول بالا کر دیں، بدعتوں کی بیخ کنی کریں، اور مملکت میں نظم وضبط بھی قائم رکھیں تاکہ مصدقہ نیکیاں پروان چڑھیں۔ مسلمان حکمران جہاں تک ممکن ہوسکے آپس کے ٹکراؤ سے گریز کریں۔ لیکن ہمیشہ ایسا کرنا ممکن نہیں، کیونکہ حکمران بھی اکثر اوقات خطا کر بیٹھتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات لائقِ توجہ ہے۔ کہ سکندر مالوہ سے نزاع قائم رکھنے کی ذِمّہ داری گجرات کے فرمانوں پر نہیں ڈالتا۔ وہ اس کی ذمّہ داری اپنی حب الوطنی کی وجہ سے مالوہ کے سلطانوں کے سر ڈالتا ہے۔

Marfat.com

گو تاریخی اعتبار سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بات ہمیشہ ہی دُرست رہی۔

یہ خاکہ نظر میں ہو تو اس بات پر تعجب نہیں ہوتا کہ سکندر جو تبوا کے سیدوں اور خصوصاً شاہ عالم اور ان کے جانشینوں کی روحانی استعداد اور بلند رُتبے کا قائل تھا، احمد آباد اور تبوا کے درمیان ناگریز قسم کے تناؤ کو اس نظر سے دیکھتا تھا جیسے یہ سب کچھ سلطانوں کی خباثت کی وجہ سے ہو۔ یہ خباثت لائق مذمت تھی۔ تاریخ اس کی نظر میں، جیسا کہ اس نے اپنی کتاب کی تمہید میں لکھا ہے "تدریس بالمثال تھی۔ عظیم انسانوں کے افعالِ ماضی" دَورِ حال کے لیے سبق کی حیثیت رکھتے ہیں[1]۔ اس اعتبار سے تبوا کے سیدوں کی تاریخ اس کے لیے اتنی ہی کثیر الاسباق تھی جتنی سلطانوں کی تاریخ۔

مجھے یہ لگتا ہے کہ ہمیں جو چیز وصف و ثنا بالارادہ معلوم ہو رہی ہے وہی چیز سکندر کے لیے صحیح ادراک کی حیثیت رکھتی تھی۔ مخدوم جہانیاں، سید برہان اور شاہ عالم کو عروج دے کر وہ اس جذبہ کی عکاسی کر رہا تھا جو گجرات بھر میں جاری و ساری تھا۔ ان ہی حضرات کے جذبے سے تعلق رکھنے والی ایک اور شاخ ڈھولکا میں تھی جس کا اِسے ذاتی تجربہ تھا۔ اس نے اپنی تاریخ کا ایک تہائی حصّہ مغلوں کی فتح سے پہلے سلطنت کے آخری چالیس برسوں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اور یہ دَور ایک ایسی سیاست کا دَور تھا جس میں امرا نے بعض اوقات سیاسی جوڑ توڑ کے علاوہ کچھ اور طریقے بھی اختیار کیے اور چونکہ سید مبارک اور ان کے بیٹوں نے ان سرگرمیوں میں بڑا حِصّہ لیا اس لیے اس نے اس دَور کا بیان تفصیل سے لکھا ہے۔

اس بات کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ سید مبارک کی ملازمت کے دوران اس کے والد نے جو کردار ادا کیا اس کا ذکر کرتے وقت سکندر کے بیان سے جانبداری کیوں جھلکتی ہے۔ اس نے اس دَور کا ذِکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اس دَور کے بارے میں بیشتر معاملات اسے اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی شیخ یوسف سے حاصل ہوئی[2]۔ یہ اس لیے ہو سکتا ہے کہ محض فرزندانہ محبّت ہی وہ اکیلا سبب نہ ہو جس کی بنا پر یہ پہلو قدرے غیر متناسب ہو گیا؛ ہمدردی کا جذبہ تو

Marfat.com

موجود تھا ہی لیکن خود مآخذی مواد بھی اسی طرح کے بیان پر مجبور کر رہا تھا۔

بہر حال یہی وہ جگہ ہے جہاں سکندر اپنے رویّے کے بعض کم خوش گوار پہلوؤں کا اظہار کرتا ہے۔ کردار کی یہی خصوصیات ان لوگوں میں عام طور سے پائی جاتی ہیں جو آقاؤں سے عنایت کے طالب ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے ایک ساتھی 'منشی' آرام کشمیری کی کتاب' جو سیّد مبارک کے لیے لکھی گئی تھی، کو نیچا دکھانے کے لیے بڑی کاوش کرتا ہے۔ آرام کشمیری بھی وہیں ملازم تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ آرام کشمیری اور سکندر ایک دوسرے کے حریف تھے اور ان کے تعلقات اچھے نہ تھے' یا شاید سکندر کے والد اور یہ مصنّف ہم منصب لوگ تھے۔ بہر صورت آرام کی تاریخ اب موجود نہیں لیکن سکندر کی قدرے غیر منصفانہ رائے موجود ہے۔[3] اگر اس رائے کے ساتھ اس کے بعد والا پیراگراف بھی ذہن میں رکھا جائے جس میں سکندر اپنے والد اور بھائی کی سند پیش کرتا ہے تو یہ تاثر قائم نہیں ہوتا کہ یہ اضافہ قدرے بے موقع ہے اور اچھے مزاق کا ثبوت نہیں دے رہا ہے۔

اسی طرح سکندر' ان لوگوں کے بارے میں پورا انصاف نہیں کرتا جو اس سے پہلے گزر گئے۔ ان کے بارے میں اس کی مخالفانہ تنقید کا حوالہ پہلے ہی دیا جا چکا ہے اور جہاں تک ہمیں علم ہے وہ اس کے لائق بھی تھے۔ ہاں کم سے کم ایک کتاب ایسی ہے جو اس تنقید سے مستثنا ہونی چاہیے۔ یہ تاریخِ بہادر شاہی ہے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے سکندر نے زیادہ تر معلومات اسی کتاب سے حاصل کی ہے کیونکہ اس کے زمانے میں یہی کتاب بڑی مشہور رہی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سکندر اس مصنّف کے مطابق لکھتا ہے تو اس کی تاریخ نگاری اپنے کمال پر ہوتی ہے۔ بعد کے صفحات میں جب وہ لائق اعتماد اشخاص پر بھروسہ کرنے لگتا ہے تو مرنے کی خاطر لمبی حکایتوں کی طرف مائل نظر آتا ہے اور چھان بین کرنے کے بجائے غیر متعلق معلومات دینے لگتا ہے لیکن تعجب ہے کہ گویہ کتاب مستقل اس کے پاس رہی ہوگی اور اسے مصنّف اور خود کتاب کے بارے میں خوب علم ہوگا لیکن وہ کہیں اس کا نام نہیں لیتا۔ ہمیں اس کے مصنّف حسام خاں کا نام مرات سے نہیں بلکہ ظفر الوالیہ

Marfat.com

سے معلوم ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مصنّف کا نام صاف طور سے نہ لیتا اتنی فاش غلطی ہے کہ سر ڈینیلسن روسی نے اسے "خاموش رہنے کی سازش کہا ہے"۔[14] سکندر پر یہ الزام رکھنا کچھ ٹھیک نہیں لگتا کہ اس نے جان بوجھ کر نام چھپایا۔ ایک جگہ وہ موضوع بدل کر محمود شاہ بگاڑا کے ایک بڑے امیر کی نشاندہی اس طرح کرتا ہے کہ وہ امیر تاریخ بہادر شاہی کے مصنّف کے اجداد میں سے تھا۔[15] لیکن سکندر کا پہلا حوالہ یہ ہے کہ اس کا مصنّف ایک شخص تھا جبکہ اسے اس شخص کے نام، خطاب اور عہدے کا ضرور علم ہوگا۔ دوسرے سکندر کی پوری تاریخ میں کہیں بھی حسام خاں کا نام نہیں ملتا۔ اور آخری بات یہ ہے کہ سکندر نے جس کتاب سے اتنا زیادہ مواد حاصل کیا۔ اس کا ذکر تحقیر آمیز انداز سے کیا ہے ان سب باتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جو شخص ایک بجا احسان کو بھی تسلیم نہ کرے وہ یقیناً جھگڑالو اور بخیل ہوگا۔[16]

سکندر کی کتاب دوسری تخلیقی کتابوں کی طرح، اس کی شخصیت کا نچوڑ اور اس کی ..... (Weltanchauung) کا عکس ہے۔ وہ ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتا تھا جو ذریعۂ معاش کے لیے خاص طور سے جاگیرداروں کا دستِ نگر تھا، اور پیشۂ سپہ گری کی طرف کم شہری ملازمتوں کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اس کے درجے کے لوگ غالباً دیوان، نائب دیوان اور ایسے ہی دوسرے بہت سے عہدیدار تھے جو مغل امرا کی طویل غیر حاضری کے دوران جاگیروں کا انتظام اور ان کے دوسرے مفادات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اس کے ہم درجہ اور ہم لیاقت لوگ بہت سے شہری اور عدالتی عہدوں پر فائز تھے مغل انتظامیہ نے قاضی، محتسب، امین اور دوسرے بہت سے ایسے ہی عہدوں کے دروازے ان لوگوں کے لیے وا کر دیے تھے۔

لہٰذا جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں اس طبقے کے مخصوص رویّے اور خصوصیات موجود ہیں تو تعجب نہیں ہوتا۔ اس کا علم حیرت انگیز تھا، صاف ستھری اور بڑی نفیس زبان میں لکھنے کی لیاقت تھی، اور ایک مخصوص انداز میں ثبوتوں اور شہادتوں کی جانچ پڑتال کرنے کی صلاحیت

Marfat.com

تھی۔ اس کی اپنی حدود تھیں۔ وہ واقعات کو سطح سے نیچے نہیں دیکھ سکتا تھا، کیونکہ اس کے نزدیک تاریخ کا مطلب یہ تھا کہ اخلاقی نصیحتوں کے ساتھ واقعات بیان کر دیے جائیں۔ اس بنا پر چیر پھاڑ یا تجزیہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان واقعات کے پیچھے کیا منطق کام کر رہی ہے جن کی بنیاد پر لازماً اس کی تاریخ کی اندرونی ساخت قائم ہوئی۔

سکندر دراصل مجھے ایک مخصوص قسم کا مغل دانشور لگتا ہے ـــــ قدامت پسند، عالم، خود رائے لیکن راست گو، صاحبِ بے تخیّل اور ایسے سماجی نیز مذہبی رویّوں کا انتہائی موافق جو مصدقہ ہوں۔ اس کی تاریخ جن مخصوص خوبیوں کی حامل ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ کردار کی ان ہی خصوصیات کی عکّاسی کرتی ہے ـــــ اور چنانچہ جس زمانے میں لکھی گئی ہے اس زمانے کا بہترین نمونہ بن چکی ہے۔

Marfat.com

حوالہ جات

۱۔ مرات کے مآخذوں اور اس کے زمانۂ تصنیف پر اس کتاب کے برودا والے ایڈیشن کی تمہید میں پورے طور سے بحث کی جا چکی ہے۔ اور اسی لیے اس بحث کو یہاں دُہرایا نہیں گیا ہے۔ اس میں اس کتاب کے ادبی مآخذوں کی پوری فہرست بھی شامل ہے۔ برودا ایڈیشن کا پورا حوالہ ذیل میں دیا جا رہا ہے :۔

The Mirat-i-Sikandri of Shaikh Sikandar ibn Mohammed urf Manjhu ibn Akbar; edited by S.C. Misra and M.L. Rehman; Baroda, the M.S. University of Baroda, 1961. Introduction, pp 1-56; Bibliography pp 53-56.

میں دو ایسے مضامین کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو کتابوں کی فہرست تیار ہونے کے بعد شائع ہوئے۔ مضامین یہ ہیں :

Z.A. Desai, Mirat-i-Sikandri as a source for the study of cultural and social condition of Gujrat under the Sultanate (1403-1572).

Marfat.com

Journal of the Oriental Institute, Baroda, vol. X No 3 (March 1961); and Jean Abbin, the Secretary of Mahmud Ganan and his lost Chronicle, Journal of the Resurch Society of Pakistan, Vol 1 Part II (October 1964) pp-9-13

2. مرات سکندری، برودا والا متن (مسودہ) صفحہ 2

3. Aubin جس کا حوالہ پہلے دیا گیا ہے صفحہ 11

4. ایضاً صفحہ 11

5. مسودہ، صفحہ 2

6. مسودہ صفحہ 137: ترجمہ (فضل اللہ لطف اللہ، دھرم پور، نیا ایڈیشن) صفحہ 68

7. مسودہ، صفحات 16 - 115: ترجمہ، صفحہ 52

8. مسودہ، تمہید، صفحات 48-48

9. مرات کا پونہ والا متن، کتاب کے نام والے صفحے پر بالائے سطر، مسودہ، تمہید، صفحات 1 اور 46

10. مسودہ، صفحات 11-10، 77-71، 81-80، 9091 اور اس کے بعد والے صفحات شاہ عالم کے لیے دیکھیے۔ صفحہ 132 اور اس کے بعد صفحات اور شیخ جیو کے لیے دیکھیے ــــ 71-170، 30 - 228 اور اس کے بعد والے صفحات۔

11. مثال کے طور پر ملک محمد اختیار اور داور الملک کی کہانی۔ مسودہ، صفحہ 161 اور اس کے بعد والے صفحات۔

12. مسودہ، صفحہ 361 اور صفحہ 438

13. مسودہ، صفحہ 361

Marfat.com

E. Denisson Ross. editor An Arabic History of Gujrat. Zafar-ul-Wabhdi, Muzzuffar, Wa-Alih of 'tballah Muhammed bin Qamaral-Makki, al Asafi Ulngh Khani also known as Hajji ad-Dabir Indian Texts Series (3 volumes London, John Murray for Goverment of India, 1910, 1921 and 1928) Vol. II. Introduction, p XXVIII. -14

۱۵- مسودہ، صفحہ 126

۱۶- مسودہ، صفحات 2-1

Marfat.com

مرزا ناتھن ـــــ سترّھویں صدی کا ایک توزک نگار★

قیام الدّین احمد

ڈاکٹر بورہ نے بہارستانِ غیبی کی ترتیب و تدوین کی ہے اور اس کے پورے مسودے کا ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے اس کی دریافت پر ان الفاظ سے اس کا خیر مقدم کیا تھا کہ یہ کتاب شمالی مشرقی ہندوستان کی تاریخ کی ترتیبِ نو کے کام میں ایک نئے عہد کا آغاز کرے گی[2]۔ اس کی دریافت سے پہلے بنگال اور آسام کی تاریخ کے واسطے جن عصری مآخذوں سے معلومات حاصل کی جاتی تھی وہ کچھ زیادہ فائدے مند نہ تھے۔ ان میں اس علاقے کی سماجی اور سیاسی تاریخ کی بہت معمولی تفصیلات دی ہوئی تھیں۔ مرزا ناتھن نے اس علاقے کی تاریخ پر بہت بڑا احسان کیا ہے، اور جادو ناتھ سرکار، جن کے سر اس کتاب کی دریافت کا سہرا ہے، اس احسان کو بہت مانتے ہیں۔ اس بارے میں ان کے الفاظ یہ ہیں: "دورِ جہانگیر (1627 — 1601) کے بنگال کے بارے میں ہمیں آج جتنی معلومات ہے قرونِ وسطیٰ کے بنگال کے کسی اور دور کے بارے میں اس کی نصف درست یا نصف مکمل معلومات بھی نہیں ہے[3]۔" اس کتاب کی دریافت کے بعد جن مصنفین نے بھی اسے دیکھا ہے ان سب نے بڑے جائز طور سے اسی پہلو پر زور دیا ہے[4]۔ لیکن کتاب کے صرف ایک ہی پہلو پر غور کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے موضوعات کو اور اصل مزاج کو نظر انداز کر دیا گیا۔

بہارستان دراصل علاالدین اصفہانی (عرف مرزا ناتھن)، جن کا لقب شتاب خاں

★ بہارستانِ غیبی کی نوعیت اور اس کے مضامین کی ایک اور جانچ۔

Marfat.com

تھا' کی توزک ہے۔ اسے فارسی کے روایتی روزناموں کے انداز سے ترتیب دیا گیا ہے' یعنی اسے چار دفتروں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر دفتر کے اپنے عنوانات اور ضمنی عنوانات ہیں[5] لیکن اچھی توزکوں کی طرح' مصنّف خود اس کتاب کا مرکزی کردار ہے۔ پوری کہانی اسی کی سرگرمیوں کے گرد بیان کی گئی ہے۔ کتاب کا خاص مقصد یہ ہے کہ توزک نگار کی دُنیاوی ترقی کا ایک دَور بیان کر دیا جائے۔ صوبائی تاریخ اور فوجی مہموں کی تفصیلات دوسرے درجے میں آتی ہیں' اور توزک نگار نیز اس کے والد کی دُنیاوی ترقیوں کے ضمن میں بیان کی گئی ہیں۔

مصنّف کتاب کی ابتدا اسی مروّجہ انداز میں کرتا ہے جس انداز میں باقاعدہ روزناموں کی ابتدا کی جاتی ہے "اس حقیر ناچیز کے ذہن میں یہ خیال گزرا کہ اگر بنگال کے وہ تھوڑے سے واقعات قلم بند کیے جائیں جو جہانگیر بادشاہ کے دَورِ مسعود میں واقع ہوئے تھے تو اس تحریر کا نقش صفحاتِ وقت پر باقی رہے گا۔ . . . . لہٰذا یہ بیان اس توقع کے ساتھ قلم بند کیا جا رہا ہے کہ اگر یہ اہلِ علم کی پرتجسس نظروں سے گزرے . . . تو وہ اسے قلم اصلاح سے سنوار دیں' اور اس کے مضامین جہانگیر کی تاریخ میں شامل کر لیں۔"

لیکن اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مضامین نجی بیاض کے اندراجات سے زیادہ ملتے ہوتے ہیں۔ واقعات اور حادثات پورے طور سے کسی ایک مقام پر نہیں بیان کیے گئے بلکہ مختلف صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔ (شاید جس طرح واقع ہوئے یا مصنّف کو جس طرح یاد آئے)۔

پوری کتاب چار دفتروں میں تقسیم کی گئی ہے' جن میں سے تین کا تعلق بنگال کے تین صوبیداروں اسلام خاں' قاسم خاں اور ابراہیم خاں سے ہے۔ چوتھے دفتر میں ان واقعات کا بیان ہے جو شاہ جہاں کی بغاوت کے دوران پیش آئے۔ دفاتر اوّل و سوئم پہلے اور تیسرے صوبیداروں کے لیے وقف کر دیے گئے ہیں اور ان ہی کے نام سے ہیں۔ ان تینوں صوبیداروں کو جوڑنے والی کڑی خود مرزا ناتھن ہے۔ اس دَور کا انتخاب کسی ذاتی وصف یا تاریخی اہمیت کی بنا پر نہیں کیا گیا

Marfat.com

ہے بلکہ اس بنا پر کہا گیا ہے کہ یہی زمانہ خود توزک نگار کی سرگرم فوجی ترقی کا زمانہ بھی ہے۔ پہلے دفتر کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ اسلام خاں بنگال کا صوبیدار مقرر ہوا، لیکن بات یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد خاص موضوع یہ ہے کہ مرزا ناتھن کے والد، اہتمام خاں کا میر بحر کی حیثیت سے تقرر ہوا اور انھوں نے بنگال کا سفر طے کیا۔ حتیٰ کہ صوبائی سرداروں کو کچلنے کی کہانی بھی مرزا ناتھن اور اس کے والد کے کارناموں کی طرح بیان کی گئی ہے۔ مرزا ناتھن اس کے والد اور اور صوبیدار کے درمیان جو معمولی نوعیت کے اختلافات ہوئے ان کا ذکر بے جا طوالت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ (صفحات 33، 34، 115، 147، 156 وغیرہ)۔ ان معمولی جھگڑوں میں توزک نگار اور اس کے والد کی اہمیت بڑھا چڑھا کر بیان کی گئی ہے۔ ہر چند کہ وہ صوبیدار کے ماتحت تھے لیکن پڑھنے والے کو یہ لگتا ہے جیسے برابر درجے کے افسران ایسے اہم معاملات پر جھگڑ رہے ہیں، جن کا تعلق ریاست کی حکمتِ عملی سے ہے یہی بات دوسرے دفتروں پر بھی صادق آتی ہے۔ اگر کوئی شخص اعداد و شمار اکٹھا کرنا اور ہر دفتر کی جانچ پڑتال کرکے یہ معلوم کرنا چاہتا ہو کہ صوبیدار پر کتنی جگہ صرف کی گئی ہے اور توزک نگار نیز اس کے والد پر کتنی جگہ صرف ہوئی ہے، تو تناسب : یا شاید اس سے بھی زیادہ آئے۔

ڈاکٹر سرکار، جنھوں نے یہ مسودہ دریافت کیا ہے، وہ بھی اس طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "بہارستان یہ دعوا کرتی ہے کہ وہ تین خاص صوبیداروں کے تحت بنگال اور اڑیسہ کی تاریخ ہے۔ . . . لیکن شتاب خاں اور اس کے والد اہتمام خاں کے افعال کا بیان بھی اتنا زیادہ تفصیلی ہے جتنی صوبیداروں کی تاریخ ہے، اور تقریباً نصف کتاب کے بارے میں یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ یہ توزکِ شتاب خاں ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کی اصل افادیت" ان ساری تفصیلات میں مضمر ہے جو یہ بنگال اور اُڑیسہ کے زمینداروں کو مکمل طور سے مغلوب کرنے کے بارے میں نیز مغل سلطنت اور مشرقی سلطنت کے منگول بادشاہت کے درمیان ہونے والے طویل اور لامتناہی سلسلۂ جنگ کے بارے میں بہم پہنچاتی ہے۔"[7]

پروفیسر شرما نے خاصی تفصیل سے کتاب کا معائنہ کیا ہے۔ انھوں نے مغل ہندوستان کے

Marfat.com

فہرستِ مآخذ میں اسے صوبائی تاریخوں کے حصے میں جگہ دی ہے۔ حالانکہ اسی فہرست میں توزکوں کا حصہ بھی موجود ہے۔ وہ مصنف کی لاف زنی پر تنقید کرتے ہیں "اس کا شمار نہایت شیخی باز تاریخ نگاروں میں ہے جس کا ایک مقصد برابر یہ رہا ہے کہ اپنی خدمات بڑھا چڑھا کر بیان کرے . . . . . جب کبھی مغل فتح یاب ہوتے ہیں تو فتح کا سرچشمہ وہ خود ہوتا ہے، جب کبھی ان پر کوئی آفت آتی ہے تو اس کا سبب اعلا عہدیداروں کی رقابت ہوتی ہے[8]" مصنف کی انا بلکہ خودستائی بھی اچھی طرح نمایاں ہیں لیکن اہم نقطہ یہ ہے کہ یہ سب باتیں کتاب کی اصل نوعیت کے مطابق ہیں ـــــ یہ ایک توزک ہے۔ سارے توزک نگار چیزوں کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ واقعات کو شکل دینے میں ان کی ذات بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ اچھے توزک نگار اپنی تصویروں کا عکس ڈالتے وقت ایک معیار نظر میں رکھتے ہیں اور خود پر قابو رکھتے ہیں لیکن شتاب خاں بعض اوقات مضحکہ خیز بن جاتا ہے یہ خامی بہت سے توزک نگاروں میں پائی جاتی ہے لیکن اسی طرح کی خامی اس قسم کے کام کی نوعیت کے عین مطابق ہے۔

اس سلسلے میں بہت سی اور باتوں کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی جاسکتی ہے، جیسے غیر رسمی اسلوب بیان اور بعض واقعات کو ذاتی معاملہ بیان کر کے پیش کرنا، نیز باغی شہزادے (صفحات 763، 769، 772، 775 تا 776) اور دوسرے اعلا عہدیداروں (صفحات 115 تا 116، 155 تا 156) کا سراپا بے تکلفی سے بیان کرنا۔ اس میں ایسے موثر بیان ہیں جن کا نقش ذہن پر بن جاتا ہے جیسے یہ بیان کہ ایک ہارا ہوا، لٹا کھنڈا اور بھوکا شاہ جہاں اپنے ترکش کو تکیہ بنائے ایک پیڑ کے نیچے سو رہا ہے اور سہسرام کے نزدیک ایک جنگل سے بکرا پکڑ کر اور اس کا گوشت بھون کر ناشتہ کر رہا ہے (صفحہ 763)۔ یہ بیان کہ شاہ جہاں مرزا ناتھن کے پاس چل کر جاتا ہے اور اس سے وہ خط چھین لیتا ہے جو وہ اپنے گھر لکھ رہا تھا (صفحہ 772)۔ یہ بیان کہ کمسنی شہزادہ اورنگ زیب۔ بعد میں یہی ایک ایسا شہنشاہ بنا جو شریعت کی سختی سے پابندی کرتا تھا۔ چھپ کر مرتبان سے وہ کیلے نکال کر کھا رہا ہے جو شاہجہاں نے مرزا ناتھن کے لیے بچا رکھتے تھے (صفحہ 780)۔ یہ سارے

Marfat.com

بیانات ان سرکاری روزنامچوں کے بیانات کے مقابلے میں بڑے تازگی بخش معلوم ہوتے ہیں ، جن سرکاری بیانوں میں کردار نگاری بڑے روایتی انداز سے کی گئی ہے۔

ایک عظیم صوبیدار اسلام خاں کا یہ واقعہ بھی بڑی وضاحت اور بے باکی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنے بیٹے ہوشنگ سے کسی معمولی بات پر ناراض ہو کر تمام درباریوں کے سامنے اِسے مارتا ہے "اس سے پہلے کہ کوڑا لایا جائے، اس نے اپنا سر گھٹنوں سے نیچے جُھکا کر ایک لوٹا اُٹھایا اور اسے پیٹنا شروع کر دیا . . . . " خواجہ دانش کو حکم دیا گیا کہ شامیانے کے بانسوں سے اِسے مارے۔ جب اس نے رو کر یہ کہا کہ "آپ خود مجھے مار سکتے ہیں، خدارا خواجہ کو روکیں کہ وہ مجھے ڈنڈوں سے نہ ماریں تو اس نے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ وہ بھی اسے ماریں" دیوان اور دوسرے عہدیداروں نے اسے بچانا چاہا تو ان پر بھی بہت سخت ہاتھ پڑے۔ (صفحات 115 تا 156)۔ اس قسم کے اندراجات کسی صوبائی تاریخ کے لیے نہیں بلکہ کسی ذاتی بیاض کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔

اس کتاب کی ایک اور خصوصیت اس کا اسلوبِ بیان ہے جس سے قدرے طمطراق ظاہر ہوتا ہے۔ دوسری توزکوں کے برعکس، بہت سے مقامات پر بیان میں صیغہ حاضر استعمال نہیں کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے بعض اوقات محض نمائشی اور مصنوعی لگتے ہیں۔ اکثر اوقات مصنف اپنے لیے محض لفظ ناتھن یا ایسے منکسرانہ القاب استعمال کرتا ہے جو رواجاً استعمال کیے جاتے تھے۔ آخری حصّے میں وہ شتاب خاں کے لقب کا استعمال کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی عرفیت یا القاب سے واقف نہ ہو تو یہ سمجھے گا کہ مصنف کسی اور کے بارے میں لکھ رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پوری کتاب میں اسلوبِ بیان نمایاں طور پر دو قسمی انداز کا ہے یہ ایک عجیب مجموعہ ہے جس میں رسمی قسم کی تصنع آمیز عبارتوں کے ساتھ غیر رسمی اور بے تکلف بیانات شامل کر دیے گئے ہیں۔

کتاب کا اختتام بھی قابلِ توجہ ہے۔ یہ اچانک ہو جاتا ہے اور ان کتابوں کے اختتام سے بالکل مختلف ہے جو منصوبے کے ساتھ لکھی جاتی ہیں۔ کہانی کہیں درمیان سے شروع ہوتی ہے

Marfat.com

اور اس سے پہلے کہ کوئی منطقی نتیجہ نکلے، ختم ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ دفترِ چہارم کا خاص موضوع یعنی شاہجہاں کی بغاوت کی کہانی بھی پورے طور سے بیان نہیں کی گئی ہے۔

ڈاکٹر بورہ کو یقین ہے کہ کتاب جس صورت میں ملی ہے وہی اس کی مکمل صورت ہے۔ بہرکیف اس شبہ کی گنجائش خاصی ہے کہ کتاب کی جو جلد دستیاب ہوئی ہے کیا وہ مکمل کتاب ہے یا اپنی مکمل شکل میں ہے۔ اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ موجودہ جلد وہ ناتمام مسودہ[9] ہے جو شتاب خاں نے اپنے نوٹس کی بنیاد پر قلم بند کیا، اور بعد میں اسی نے اس مسودہ کو باقاعدہ تاریخی شکل دینی چاہی۔ اس نے چھانٹے ہوئے مواد کی ابتدائی درجہ بندی تو کی (جیسے دفتروں میں تقسیم کیا، ہر دفتر کی تمہید لکھی اور انھیں صوبیداروں کے نام معنون کیا وغیرہ) لیکن کتاب مکمل نہ کر سکا۔

پروفیسر شرما نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے[10] کہ موضوعات کی جو فہرست مسودے سے منسلک کی گئی ہے اس میں ابواب کے خلاصے دیے گئے ہیں" لیکن خلاصے قابلِ اعتماد نہیں ہیں " مصنف نے بہت سے مقامات پر واقعات کو اپنی خواہش کے مطابق موڑا ہے، چنانچہ ابواب کے خلاصوں میں ایسی بہت سی باتوں کا ذکر کر دیا ہے، جنھیں غالباً بعد میں وہ خود ابواب میں شامل کرنا چاہتا تھا لیکن بالآخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایسا نہیں کرے گا۔" اس بات سے اس شبہ کو بھی تقویت ملتی ہے کہ کتاب کی جو جلد دستیاب ہوئی ہے وہ اصل کتاب کا پہلا مسودہ ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ کتاب کے ایک ہی پہلو پر ساری توجہ صرف کرنے کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ اس کی اصل نوعیت نظر انداز کر دی گئی ہے بلکہ یہ بھی ہوا ہے کہ بہت سا مواد جو کتاب کے صفحات پر بکھرا ہوا ہے، اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا ہے۔ اس علاقے میں مغل حکومت کی توسیع سے قطع نظر، جس پر پہلے ہی بہت جانچ پڑتال کی جا چکی ہے، اس کتاب میں فوجی، انتظامی اور سماجی معاملات پر ایسی بہت کچھ معلومات ملتی ہے جو ہماری توجہ کی محتاج ہے۔ ذیل میں جو مثالیں دی جا رہی ہیں وہ کوئی مکمل اور جامع مثالیں نہیں ہیں۔ انھیں محض اس نکتے کی وضاحت کرنے کے لیے انتخاب کیا گیا ہے۔

Marfat.com

پروفیسر شرما بھی کتاب کے گوناگوں فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن یہاں جو مثالیں آپ کی نظر سے گزریں گی ان میں سے بہت سی مثالیں یا تو اس خلاصے میں شامل ہی نہیں کی گئی ہیں جو انھوں نے چھپوایا ہے یا پھر بنا کسی تنقید کے سرسری طور پر لکھوا دی گئی ہیں۔

اِنتظامی معاملات

پہلے دفتر کے آخر میں جہان اسلام خاں کے انتقال کی بنا پر کی جانے والی سرکاری تبدیلیاں بیان کی گئی ہیں، مصنّف ایک اہم انتظامی نکتے کا ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ شاہی ضابطوں میں یہ لکھا تھا کہ جب بنگال کا صوبیدار فوت ہو تو وہ "شاہی افسر اس کی جگہ لے جو مونگھیر میں مقیم ہو۔۔۔۔ لیکن اگر مونگھیر میں کوئی اعلا افسر موجود نہ ہو تو بہار کا صوبیدار بنگال چلا جائے" تقدم کی یہ ترتیب کسی دستورالعمل یا سرکاری تاریخ میں نہیں دی گئی ہے۔ اس کی بنا پر ذہن میں کئی سوال اُٹھتے ہیں۔ اس اصول کے پیچھے کیا خیال کارفرما تھا؟ ظاہر ہے کہ بہار کا صوبیدار اس اعلا شاہی عہدیدار سے کہیں اونچے مرتبے کا شخص ہوتا تھا جو مونگھیر میں تعینات کیا جاتا تھا۔ اس لیے بنگال کے صوبیدار کی جانشینی کے معاملے میں موخرالذکر کا حق کیوں افضل سمجھا گیا؟ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ موخرالذکر ایسی جگہ ہوتا تھا جہاں سے نسبتاً تیزی کے ساتھ ڈھاکہ پہنچ کر ان خطروں کو دُور کیا جاسکتا تھا جو درمیان کی لمبی مسافت کی وجہ سے صوبے کے استحکام کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اگر یہ دُرست ہے تو کیا اس اصول کا اطلاق صرف بہار اور بنگال پر ہوتا تھا؟ کیا دوسرے صوبوں کے لیے بھی اسی قسم کے اصول وضع کیے گئے تھے؟ ہرچند کہ یہ کتاب ان سوالوں کے جواب فراہم نہیں کرتی لیکن اس بنا پر اہم ضرور ہے کہ ہمیں ایسے سوال کرنے کا موقع دیتی ہے۔

ناتھن مزید لکھتا ہے کہ بہار کا صوبیدار ظفر خاں بنگال کے صوبیدار کا جانشین بننے کے شوق میں اسی اصول کی خلاف ورزی کر کے اور اسلام خاں کے بھائی قاسم خاں کا حق مار کر جو اس

Marfat.com

وقت مونگھیر میں تعینات تھا یہ عہدہ حاصل کرنے کے ارادے سے ڈھاکہ پہنچ گیا۔ لیکن صوبے کے دیوان بخشی اور خبر نگار نے شہنشاہ اطلاع بھیج دی کہ ظفر خاں لگر دیش (آج کا چھوٹا ناگپور) کے راجہ کا محاصرہ کیے ہوتے ہے اور اگر وہ کچھ دن اور محاصرہ کیے رہا تو راجہ سے بتیس مثقال وزن کے جواہرات پیش کش کے طور پر وصول کرلے گا۔ شہنشاہ ناراض ہوگیا۔ اور ظفر خاں کو حکم دیا کہ اپنی نامکمل مہم وہیں روک دے اور قاسم خاں (جو ضابطے کے مطابق اس جگہ کا مقدار تھا) کو بنگال کا صوبیدار مقرر کیا۔ اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضابطے پر عمل کیا گیا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر صوبیدار اصول وضوابط کی خلاف ورزی کرتا تو ماتحت صوبائی افسران خصوصاً خبر نگار بعض اوقات اس کی بھی رپورٹ کر دیتے تھے۔ ان کا شعبہ ان کا خاصہ تحفظ کرتا ہوگا تاکہ وہ بے خوف وخطر کام کرسکیں۔

ہمیں ایک اور مثال ملتی ہے جس سے اس بات کی خوب وضاحت ہو جاتی ہے کہ صوبائی خبرنگار بڑے خوش تدبیر اور بے خوف ہوتے تھے۔ اس درمیانی مدت میں جب اسلام خاں کا بیٹا آگرہ روانہ ہو چکا تھا اور قاسم خاں ابھی ڈھاکہ پہنچا نہیں تھا صوبائی دیوان مرزا حسین بیگ کے آدمیوں نے ان بازاروں کو اپنی نگرانی میں لے لیا جو پہلے اسلام خاں کے کوتوال کی نگرانی میں تھے۔ چونکہ بازاروں کی نگرانی بڑا نفع بخش کام تھا اس لیے قاسم خاں نے آگے ہی بازاروں کے لیے اپنا کوتوال مقرر کر دیا، اور یہ کوشش کی کہ دیوان کے آدمی ہٹا کر خود ان پر قبضہ کرلے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیوان کے بیٹوں اور ان کے مسلح آدمیوں اور صوبیدار کے سپاہیوں کے درمیان بڑا جھگڑا ہوا۔ اول الذکر مغلوب ہوگئے" انہیں زدوکوب کیا گیا اور گرفتار کرلیا گیا اور ان کا مال واسباب ضبط کرلیا گیا۔

خبرنگار خواجہ لغمہ بڑے مخمصے میں پھنس گیا کہ شہنشاہ کو کس طرح اس معاملے کی اطلاع دے۔ قاسم خاں نے سرحدوں پر اتنے سخت پہرے لگا رکھے تھے کہ "خان صاحبان کے خطوط اور روزنامچہ نگاروں کی رپورٹوں کا تو کہنا ہی کیا وہاں سے ایک چڑیا بھی اس کے علم اور حکم کے

Marfat.com

بغیر بالائے ہند (ہندوستان) نہیں جاسکتی تھی۔ اسی کے ساتھ اسے یہ فکر بھی تھی کہ اگر واقعے کی اطلاع نہ دی گئی اور شہنشاہ کو کسی دوسرے ذریعے سے اطلاع مل گئی تو میں کیا جواب دوں گا ؟" چنانچہ اس نے ایک بڑی اچھی ترکیب سوچی۔ اس نے اپنے دو قاصدوں کو جوگیوں کا رُوپ بھروایا اور جہانگیر کے قریبی خدمت گار انی رائے سنگھ ولان کے پاس بھیج دیا۔ انھیں رائے کے ہمراہ جاکر جھروکا درشن کے وقت شہنشاہ کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی۔ قاصد "بہت سے حیلے بہانے" تراشتے ہوئے ڈھاکے سے آگرہ پہنچے اور ہدایت کے مطابق اپنا کام کیا۔ شہنشاہ نے معاملے کی نزاکت کو سمجھ لیا اور ایک افسر سادات خاں کو اس کی تفتیش پر معمور کیا۔ قاسم خاں کو متنبہ کیا گیا کہ "چشتی خاندان کی خدمات اور ان پر اپنی عنایات کے پیشِ نظر ہم نہیں چاہتے کہ تمھاری ملازمت اور ترقیوں کا خاتمہ ہو جائے۔" اسے حکم دیا گیا کہ دیوان کا غصّہ فرد کرے، اطمینان کا ایک خط اس سے حاصل کرے، اور سادات خاں کے ذریعے بھجوا دے۔ قاسم خاں نے دیوان اور اس کے بیٹوں کو مختلف صورتوں سے نواز کر ان کا غصّہ فرد کیا۔ اس نے ایک لاکھ روپیہ اور اپنی ذاتی جاگیریں سے پرگنہ، مادھوپور بھگوان، ان کی نظر کیا۔ اس کے علاوہ شاہی افسرِ تفتیش نے سب کے سامنے پورے واقعہ کا حلفیہ بیان لیا، اور اس پر امرا کی مہریں ثبت کرائیں۔ اس نے مظلوم دیوان کا بیان بھی تحریر کروایا اور سارے کاغذات شہنشاہ کے سامنے پیش کر دیے۔

چنانچہ ہمارے سامنے اس واقعہ کا پورا بیان موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خبرنگار کی رپورٹ محض داخل دفتر ہی نہیں کی جاتی تھی، بلکہ اس کی بنا پر چھان بین کی جاتی تھی اور متعلقہ شعبہ کی پوری مشین اس کی تصدیق کر کے کسی ٹھوس نتیجہ پر پہنچ جاتی تھی[12]۔

اس واقعہ کی طرف بھی توجہ دلائی جاسکتی ہے کہ ایک شاہی افسر، صوبیدار اور دوسرے صوبائی افسران کے فرائض کی بابت فرمان اور زبانی ہدایتیں لے کر روانہ کیا گیا تھا۔ یہ ہدایتیں جو قوسین میں دی گئی ہیں انتظامی دستاویزوں کی حیثیت سے بڑی قابلِ قدر ہیں[13]۔

Marfat.com

آمدنی کا حد سے زیادہ تخمینہ

مغلوں کے انتظامِ اراضیات کی بہت بڑی خرابی یہ تھی کہ بہت سے پرگنوں اور دیہی علاقوں کی اصلی اور واجبی آمدنی (جمع) میں اختلافات تھے۔ اکبر کے دورِ حکومت میں جمع، جیسے جمع رقمی کہا جاتا تھا، کے جو اعداد و شمار موجود تھے وہ سور حکومت سے ورثے میں ملے تھے، اور اصل سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے افسران کو اپنی جاگیر سے جو آمدنی ہوتی وہ سرکاری تخمینے سے کہیں کم تھی، اور اس بنا پر جاگیرداروں اور منصب داروں میں بڑی بے اطمینانی پھیل گئی۔ اکبر نے اس مسئلے پر مستقل توجہ دی اور کئی بار اسے حل کرنے کی کوشش کی۔ آمدنی کا ایسا تخمینہ کروانے کے لیے جو زیادہ قابلِ اعتبار ہو پہلے اس نے قانون گو افسران کی مدد لی پھر براہِ راست نگرانی کے ساتھ پیمائش کروائی۔ اس سے کچھ فائدہ ضرور ہوا لیکن یہ آزار پوری طرح سے دُور نہ ہوا۔ دراصل سرکاری اور اصلی تخمینوں کا فرق ایک ایسی بُرائی کی شکل میں تسلیم کر لیا گیا جسے دُور کرنا ممکن نہ تھا۔ ڈاکٹر عرفان حبیب سترھویں صدی کی بہت سی دستاویزوں کی بنیاد پر یہ بتلاتے ہیں کہ شاہ جہاں کے دور میں اس بُرائی پر قابو پانے کے لیے تناسب فی ماہ کا ایک نیا طریقہ تیار کر لیا گیا تھا۔ اس کے بموجب جاگیریں مختلف قسموں میں بانٹ دی گئی تھیں، اور جاگیر کی قسم کا دار و مدار اس بات پر تھا کہ اُن کی اصلی اور واجبی آمدنی میں کیا تناسب ہے۔ چنانچہ اوّل درجے کی جاگیر وہ تھی جس کی اصل آمدنی سرکاری تخمینے کے عین مطابق ہو۔ اس جاگیر کو دوازدہ ماہہ کہا جاتا تھا۔ وہ جاگیر جس کا تناسب 50٪ تھا ششماہہ کہلاتی تھی، اور بقیہ نام بھی تناسب کے لحاظ سے تھے۔ ڈاکٹر حبیب جہانگیر کے دور میں بھی اس نظام کی ایک مثال دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ کہتے ہیں کہ یہ نظام شاہ جہاں کے زمانے میں عام ہو گیا تھا۔" مرزا ناتھن بھی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو اس نظام کی ایک اور مثال معلوم ہوتا ہے۔[5] یہ واقعہ معنی خیز ہے کیونکہ یہ اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب یہ نظام عام نہ ہو پایا تھا۔

Marfat.com

اس زمانے میں جب شاہ جہاں بغاوت کر چکا تھا اس کے ایک اہم عہدیدار شیر خاں فتح جنگ کو تاج پور، پورنیا میں ایک جاگیر عطا کی گئی۔ شیر خاں فتح جنگ کو اس کی تخمینی آمدنی کے بارے میں کچھ شبہات تھے۔ مرزا ناتھن کو، جو اس وقت عملی طور پر اکبر نگر کا فوجدار تھا، یہ حکم دیا گیا کہ تخمینے کی درستی کی جانچ کرے۔ چنانچہ ایک افغان عہدیدار اور خاجہ ٹوڈر مل، جو شتاب خاں کا میر سامان تھا، دونوں کو معاملے کی پوری طرح چھان بین کرنے کے لیے کہا گیا تاکہ "نہ تو رعیت یا جاگیردار کو کوئی تکلیف پہنچے اور نہ شاہی آمدنی میں کمی آئے۔" ان کو تنبیہ کیا گیا کہ بڑی دیانت داری سے کام کریں، کیونکہ ہو سکتا ہے شتاب خاں "اصل حالات معلوم کرنے کے لیے خُفیہ طور پر دوسرے کارکنان سے تفتیش کرائے" یا وہ خود وہاں پہنچ جائے۔[16] انھیں آمدنی کا ایک صحیح رجسٹر تیار کرنا تھا . . . . جو رعیت کی رضامندی سے تیار ہو، اس پر قانون گو افسران کے دستخط ہوں اور اس میں چودھریوں کا معاہدہ (قبولیات) شامل ہو، جس کی تصدیق شیر خاں (موہوب الیہ)[17] کے کارندے نے کی ہو۔ افسران نے جانچ کرنے کے بعد پرگنے کی آمدنی ایک لاکھ بیس ہزار روپے بتائی، اور "وہ پرگنہ شیر خاں کو، اس کی تنخواہ کے عوض جو دو لاکھ چالیس ہزار روپے تھی، چھ ماہ کے لیے ہبہ کر دیا گیا۔"[18]

دفتر دوم کا اختتامی حصّہ بھی بڑا قابلِ قدر ہے۔ اس کا تعلق صوبائی انتظام کے ایک اہم نکتے سے ہے، یعنی ان مشکلات سے ہے جو بعض اوقات اس درمیانی عرصے میں پیش آتی تھیں جب ایک برطرف صوبیدار جا چکا ہو اور دوسرا ابھی آیا نہ ہو۔ جانے والے صوبیدار کے ذاتی افسران بڑے مخمصے میں پھنسی جاتے تھے۔ ان کی وفاداری کا بڑا سخت امتحان ہوتا تھا، ایک طرف مملکت ہوتی، دوسری طرف ان کا پہلا آقا۔ قاسم خاں نے برطرفی کے بعد جو روش اختیار کی اس سے یہ مسئلہ پوری طرح سامنے آجاتا ہے۔[19]

مدود کامروپ کے دیوان اور بخشی، میر صفی کے افعال بھی باعثِ دلچسپی ہیں۔ اس نے پرگنوں کی آمدنی کے تخمینوں میں تبدیلیاں کیں۔ اس نے یہ جدید طریقہ شروع کیا کہ کاشتکاروں

Marfat.com

کی فردِ مالگذاری سے تیر اندازوں کا بھتہ نکال لیتا تھا۔ اس نے پرگنوں کو دو درجوں میں تقسیم کردیا' ایک حصّہ کردریوں (جو براہِ راست سرکاری انتظام کے تحت تھے؟) کے سُپرد کیا اور دوسرا مستجیروں (آمدنی کا حساب لگانے والے) کے سُپرد کیا جو "اپنے اخراجات اور فائدے" کے پیشِ نظر بڑھا کر تخمینہ لگاتے تھے۔ اس میں سب سے بڑی بے اطمینانی اور ابتری پھیلی اور دیوان کو ہٹا دیا گیا تاکہ "بغاوت کو پھیلنے سے روکا جائے جس کی ابتدا ٹیکسوں میں اس اضافے کی وجہ سے ہوئی تھی جو پیکوں اور تیر اندازوں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔"[20]

فوجی معاملات

یہ کتاب فوجی تفصیلات کے اعتبار سے بڑی کارآمد ہے۔ قلعوں کی تعمیر' محاصرے کا طریقہ' جنگی آلات' جنگی کشتیوں کی قسمیں' وغیرہ۔ مصنّف ایک بحری افسر تھا' اور جن بحری معرکوں کا اس نے ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر معرکوں میں خود شامل ہوا تھا۔ اسی وجہ سے مختلف بحری معرکوں کے بیانات نہ صرف واضح ہیں (جیسے ہارے ہوئے باغی اودیتیہ کا دریائی راہ تعاقب اور پھر اس کا بھاری کشتی چھال گری سے ہلکی اور تیز رفتار کشتی کو سا میں کود کر بال بال بچ نکلا (جلد اوّل صفحہ 129) بلکہ بڑے معلوماتی بھی ہیں۔ بحری فوج مغلوں کی بہت بڑی کمزوری تھی' اور فارسی روزنامچوں میں اس موضوع پر بہت کم معلومات ملتی ہے۔

ایک مثال بڑی معنی خیز ہے جس سے انجینئرنگ میں مصنّف کی مہارت اور اس علاقے میں بحری لڑائیوں کے بعض مسائل ظاہر ہوتے ہیں۔ اسلام خاں جب بھاٹی کی مہم پر گیا تو اہتمام خاں کو حکم دیا گیا کہ کشتیوں کا ایک بیڑا لے کر اس کے پیچھے جائے۔ اس بیڑے کو نہر کدیا کے ذریعے سیال گڑھ جانا تھا لیکن یہ معلوم ہوا کہ نہر بہت اتھلی ہے۔ چنانچہ فوری طور پر یہ فیصلہ کرنا ضروری ہوگیا کہ آیا نہر کے راستے جایا جائے یا نہیں' کیونکہ وقت کے ساتھ نہر اور اتھلی ہو جاتی اور بحری بیڑا اس میں پھنس کر رہ جاتا۔ نہر کی گہرائی کا معائنہ کرنے کے لیے مرزا ناتھن کو آگے بھیجا گیا۔ اس دوران میں پانی

Marfat.com

روکنے کے لیے "مٹی اور گھاس کے بند" بنائے گئے۔ ناتھن نے دیکھا کہ نہریں اور دُور جانا ممکن نہیں، لیکن خوش قسمتی تھی کہ نہر سے کچھ فاصلے پر اسے دو جلتے یا پانی کے دو بڑے ذخیرے اور ایک داہا یا گہری دلدل نظر پڑی۔ اس نے یہ پانی نہر میں پہنچانے کے لیے دس ہزار کشتی باتوں کی مدد سے "آدم قد گہرا" ایک نالہ کھدوایا۔ اور مزید پچیس ہزار کشتی باتوں کی مدد سے نہر کے دہانے پر ایک پشتہ لگوایا تاکہ نہر کا پانی دریائے کراتویا میں نہ داخل ہو پائے۔ اس طرح، بیڑے کو لے جانے کے لیے نہر میں خاصہ پانی اکٹھا کر لیا گیا۔[21]

کشتیوں کے بیڑے کا تنقیدی بیان اور زیادہ قابلِ قدر ہے۔ کشتیوں کی مختلف قسموں کے نام دیے گئے ہیں ـــ کٹاری، منی کی، بتھیلا، پیارا، کوسا، بلیا، پال، غراب (آبی توپ خانہ۔ توپ دار کشتی) مچھوا، پشتہ، جلیا، وغیرہ۔ جنگی کشتیوں پر کس طرح توپیں نصب کی جاتی تھیں، اُن کو گاڑیوں یا ٹھٹاری کی قطار کے پیچھے کس طرح چھپایا جاتا تھا، توپ داغتے وقت کس طرح یہ قطار نیچی کر لی جاتی تھی، اس سبب کا بیان یوں کیا ہے "بڑی کشتیاں جن پر بڑی توپیں یا زبرزنگ (میدانی توپیں) نصب تھیں قلعے کی فصیلوں کی طرح صفوں میں کھڑی کر دی گئیں۔ کشتیوں کی ہر صف کے آگے اس نے گاڑیوں، جنھیں ٹھٹاری کہتے ہیں، کی قطاریں لگا دیں اور ان پر میناروں کا ایک پورا سلسلہ کھڑا کر دیا، اور ان میں سے ہر مینار پر ایک لال جھنڈا لہرا دیا۔ گاڑیوں پر چیتوں اور شیروں کی کھالیں بچھا دیں اور ہر بڑی توپ پر شیروں کی کھالیں ڈال دیں۔ ہر کشتی پر سُنہرے کام کا ایک شامیانہ لگا تھا۔ . . . اگر توپ خانہ استعمال کرنا ہوتا تو یہ گاڑیاں جو کشتیوں پر دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک قلعے کی دیوار کی طرح کھڑی تھیں یک لخت کشتیوں پر اُلٹائی جا سکتی تھیں، اور ہیبت ناک توپوں کے دغنے کے بعد دُھواں ختم ہونے سے پہلے اپنی سابق حالت میں دوبارہ کھڑی کی جا سکتی تھیں۔" اس کے بعد ایک آبی پُل ہے "جیسا پُل کسی سالار نے کبھی نہ بنایا ہوگا۔" کشتیوں کی ٹولیاں اس طرح باندھی گئی تھیں کہ پورا بیڑا خواہش کے مطابق ایک صف میں سیدھا بھی چل سکتا تھا اور دائیں بائیں مُڑ بھی سکتا تھا۔ ملاحوں کی وردیاں فولاد کی

Marfat.com

بنی ہوئی نہیں[22]

میدانی جنگ کی تفصیلات کی قدر و قیمت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ بانس کے لٹھار اور مورچے دفاع اور فوجی استحکام کے عام طریقے تھے۔ ان دفاعی مورچوں کو توڑنے کے لیے ہاتھی (جو اس علاقے میں بہ کثرت پائے جاتے تھے) استعمال کیے جاتے تھے۔ بعض اوقات ہاتھیوں کے حملے سے پہلے دیواروں کی جڑیں کھودنے کے لیے توپوں کی حفاظتی مار میں پہلے بیل دار (انجینئر سپاہی) روانہ کیے جاتے تھے۔ وہ ایک بھاری حفاظتی پردے کے پیچھے چھپ کر جس کے نیچے پہیے لگے ہوئے تھے اور جسے ٹھٹری یا گردوں کلاں کہا جاتا تھا، دشمن پر حملہ آور ہوتے تھے۔ یہ انوکھی مشین بڑی وزنی ہوتی ہوگی، کیونکہ ایک موقعہ پر اسے کھینچنے کے لیے مرزا نا تھن اور بہت سے سپاہیوں کو بڑا زور لگانا پڑا تھا۔[23] ہاتھیوں کے اکیلے مقابلے بھی بڑی وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں[24]۔

محصور قلعوں کے سامنے اونچی نیچی مچانیں بنانے کا طریقہ بھی نرالا تھا ان مچانوں کو اتنا اونچا اٹھایا جاتا کہ دیوار پناہ کے پیچھے کی چیزیں نظر آنے لگیں، اور پھر اس اونچائی سے قلعے کی محافظ فوج پر گولا بارود کی جاتی تھی۔ دن کے وقت بے شمار بیلکوں اور عام مزدوروں کی مدد سے گھاس کاٹ کر اس کے ڈھیر لگالیے جاتے تھے۔ رات کے وقت ان ڈھیروں پر مٹی لیس کر ان کی سطح سخت کر لی جاتی تھی۔ یہ ڈھیر یا تو ایک پر ایک کرکے رکھے جاتے تھے ورنہ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے محصور قلعے تک پھیلا دیے جاتے تھے۔ لیکن یہ ترکیب بعض اوقات محاصرہ کرنے والوں پر ہی الٹ جاتی تھی کیونکہ دشمن یک لخت حملہ کر دیتا تھا اور لمبے لمبے بانسوں کے سروں پر جلتے ہوئے لوٹے لپیٹے تیزی سے آگے آئے ..... اور گھاس کے ڈھیروں میں آگ لگادی اور اس سے پہلے کہ گھبرائے ہوئے بہشتی پانی لانے کے بارے میں سوچیں، آگ چاروں طرف پھیل گئی اور پلک جھپکتے ہی گھاس کے ڈھیر جل کر راکھ ہوگئے... اور دشمن کامیاب ہوگیا۔"

سماجی معاملات

یہ پوری کہانی جنگوں کے گرد گھومتی ہے۔ اس کی وجہ سے سماجی دلچسپی کے معاملات بہم

Marfat.com

سوچنے کا موقعہ یا گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ لیکن فوجوں کے کوچ، محاصروں اور مہموں کے درمیان سماجی دلچسپی کے معاملات کی جھلک ضرور نظر آتی ہے ــــ خوشی اور غمی کی تقریبات عقائد کی کمزوری[25]، فال نکلوانا (صفحہ 487)[26]، جادو ٹونے کرنا[27]، غلامی کا رواج، مسلمانوں میں جوہر کی رسم ادا ہونا وغیرہ۔

اِس شاندار ضیافت کا بیان بھی بہت خوب ہے جس کا اہتمام مرزا ناتھن نے اپنے باپ کی وفات کے چھ ماہ بعد، سوگ کی مدت گزرنے کے موقع پر کیا تھا۔ وہ جمعہ کا دن تھا، جب سب مل کر نماز پڑھتے ہیں۔ اسلام خاں خود نماز میں شریک ہونے والا تھا، اور یہ منادی کرا دی گئی تھی کہ جو نماز میں شریک نہ ہوگا اس پر جرمانہ کر دیا جائے گا۔ ضیافت میں شریک ہونے والے بہت سے لوگ نماز کے لیے جانا چاہتے تھے، لیکن مرزا ناتھن نے ان سے یہ کہہ کر رُکنے کی درخواست کی کہ "اگر جُرمانے کی فکر ہے تو اس کی ذِمّہ داری میں لیتا ہوں"۔ سارے مہمان رُک گئے۔ جب مجلس گرم ہوئی تو مہمانوں نے خوب مے نوشی کی، اور اتنی زیادہ پی لی کہ جب اسلام خاں وہاں آیا تو وہ احباب اسلام خاں کے نزدیک نہ گئے۔ جنھوں نے بہت پی رکھی تھی اور مرزا ناتھن کے مکان کے مختلف راستوں سے اِدھر اُدھر نکل گئے۔ مرزا کے ملازموں نے اپنے کپڑوں پر عرقِ گلاب اور گُل نارنگی کی خوشبو لگا لی اور مُشک وغیرہ چھڑک کر کمرے کی فضا کو اس درجہ معطّر کر دیا کہ شراب کے تعفّن کی جگہ بُوئے فردوس آنے لگی"۔ ضیافت سات دن اور سات راتیں چلتی رہی، اور مرزا ناتھن اس کے بارے میں خود یہ کہتا ہے کہ "وہ ایک ایسا جشنِ احباب تھا جس کا بیان دُنیا کی تاریخوں میں ہونا چاہیے۔"

جوہر کی رسم ادا کرنے کا ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ یہ رسم خود مرزا ناتھن کے خاندان کے افراد نے ادا کی تھی۔ بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ نہ صرف بورہ بلکہ اس کتاب کے بارے میں لکھنے والے سارے مصنّف اس اہم واقعہ کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ آسامیوں کے خلاف جنگ میں مرزا ناتھن کی فوج کو ہزیمت اُٹھانی پڑی اور یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ قلعے پر دُشمن کا قبضہ ہو جائے گا۔ مرزا ناتھن اپنے حرم کی خواتین کو ہاتھیوں پر سوار کر کے دُور بھیج دینا چاہتا تھا، لیکن چونکہ پورا شاہی توپ خانہ ہاتھیوں پر لدا ہوا تھا اس لیے صرف ایک ہاتھی مل سکا۔ خواتین کو ایک لائق اعتبار ملازم کے

ساتھ روانہ کیا گیا اور ملازم کو یہ ہدایت کی گئی کہ مرزا ناتھن کی موت کی خبر سنتے ہی خواتین کو ختم کر دے۔ چونکہ حرم کے خدمت گاران ہاتھیوں کی کمی کی وجہ سے بھیجے نہ جا سکے، اس لیے انھیں جوہر کرنے کا حکم دے دیا گیا، اور "مرزا کے محل کے پچاس سے لے کر اسّی افراد نے جوہر کیا، اور فوج کے اُن بہت سے اشخاص نے بھی جوہر کیا جنھیں اپنی عزت و آبرو خطرے میں نظر آئی[29]۔" گو اس دہشت ناک اور غیر اسلامی رسم کے عام ہونے کے بارے میں ڈاکٹر بورہ کا خیال ضروری طور سے درست ہو سکتا ہے، لیکن یہ بات معنی خیز ہے کہ یہ دونوں نادر مثالیں دُور افتادہ مشرقی علاقے میں رونما ہوئیں۔ یہ ممکن ہے کہ ناتھن کی بعض بیویاں بھی اسی علاقے کی رہنے والی ہوں جہاں وہ مدتوں مقیم رہا تھا۔ یہ اور زیادہ معنی خیز ہے کہ "انھوں نے جوہر کی رسم ادا کی۔

متفرق معاملات

اس بارے میں حوالے موجود ہیں کہ بنگال کی آمدنی دارالخلافہ بھجوانے میں کتنے خطرات پیش آتے تھے۔ یہ حوالے اٹھارھویں صدی سے متعلق ہیں جب بنگال کی آمدنی شہنشاہ کے ذرائع آمدنی میں بہت اہمیت رکھتی تھی۔ بہارستان میں ایک اور واقعے کا ذکر ہے جس سے نہ صرف دشواریاں پتہ لگتی ہیں بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان دشواریوں پر کیسے قابو پایا جاتا تھا۔

شاہ جہاں نے شتاب خاں کو اکبر نگر کا حاکم اعلا مقرر کیا۔ اس کے اہم فرائض میں سے ایک یہ تھا کہ آمدنی اور جنگی ساز و سامان باقاعدگی سے بھجواتا رہے (اس نے اس دوران میں ایسی کشتیوں کے ذریعے جن میں پانچ سو سے ایک ہزار من تک سامان بھیجا جا سکتا تھا، چار ہزار من بارود، آٹھ ہزار من جستہ، لوہا اور سنگ گرم بھجوایا تھا)۔ اس نے ایک موقع پر سات لاکھ روپیہ بھجوایا تھا چونکہ موسم برسات اپنے شباب پر تھا، سڑکیں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں اس لیے یہ روپیہ صرف دریا کے راستے ہی بھیجا جا سکتا تھا۔ اس راستے میں بھی سیلاب کا یا کشتیوں کے ڈوب جانے کا خطرہ تھا۔ اس لیے شتاب خاں نے ذیل کا انوکھا راستہ ڈھونڈ نکالا۔ اس نے پہلے یہ حساب لگا کر پانی کسی بھی جگہ چھ فٹ سو

Marfat.com

سے زیادہ نہ ہوگا۔ چنانچہ اس نے سو رسّیاں منگوائیں جن میں سے ہر ایک چھ سو فٹ لمبی اور درمیانی انگلی کے برابر موٹی تھی۔ اس نے پانچ سو موٹے چھوٹے اور کھوکھلے تونبے بھی منگوائے جو تیرنے کی مشق میں کام آتے ہیں۔ ایک لاکھ روپے کی پہلی قسط ہزار ہزار روپے کے سو تھیلوں میں تقسیم کر دی گئی۔ ہر رسّی کے ایک سرے سے روپے والے ہر تھیلے کا مُنہ اور دوسرا سرے سے ایک تونبہ باندھ دیا گیا۔ یوں تو عام طور سے روپوں کے تھیلے بکسوں میں رکھ کر بھیجے جاتے تھے، لیکن بجائے اس کے انھیں لکڑی کے لٹھوں پر رکھ دیا گیا جو کشتیوں پر رکھے ہوئے تھے۔ مزید احتیاط کے خیال سے مچھیروں کی کشتیاں ساتھ کر دی گئیں جن پر ماہر غوطہ خور موجود تھے "جو پانی کے اندر دو سو فٹ گہرائی تک غوطہ مار سکتے تھے۔" ان تیاریوں کے پیچھے یہ اسکیم تھی کہ اگر کوئی کشتی ڈوبی تو روپوں کے تھیلوں میں بندھے ہوئے بہت سے تونبے تیرتے نظر آئیں گے اور مچھیرے روپوں کے تھیلوں کو پانی کی بالٹیوں کی طرح، بڑی آسانی سے اُوپر کھینچ لیں گے۔ اگر روپوں کا کوئی تھیلا اتفاق سے دریا کی تہہ میں کسی چیز میں اٹک گیا تو غوطہ خور غوطہ لگا کر اسے چھڑا لیں گے۔[31]

عظیم الشان شاہ جہاں، تاج اور بہت سی دوسری نفیس عمارتوں کا خالق، بڑا مشہور شخص ہے۔ بہارستان یہ ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اسے ابتدائی ایام سے ہی عمارت سازی کا شوق تھا۔ اس پریشانی کی حالت میں بھی جب شاہی دستے اس کا تعاقب کر رہے تھے، اکبر نگر پہنچ کر اس نے یہ معلوم کرنے کا موقع نکال لیا کہ جس شاہی ایوان کی تعمیر کا اس نے حکم دیا تھا وہ کس حد تک مکمل ہو چکا ہے۔ اسے مجوزہ نقشے کی معمولی تفصیلات بھی یاد تھیں۔ چنانچہ عمارت میں جو ذرا ذرا سی تبدیلیاں کی گئی تھیں ان کے بارے میں بھی اس نے جواب طلب کیے۔ وہ داروغۂ عمارت سے ناراض ہو گیا اور حکم دیا کہ اس کے ساٹھ کوڑے لگائے جائیں۔ اس نے نئی تبدیلیوں کے واسطے حکم دیا اور ایک خاص خواب گاہ کی تعمیر کے لیے فوری طور پر سامان مہیا کیا گیا۔ جھروکہ اور غسل خانے کی عمارتیں بنائی گئیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ لکڑی کا سامان تیار کرنے والے کُل چھتیس کارخانے ـــ کارخانہ جات رخوتی۔ جن میں کام ہو رہا تھا ان کا انتظام دُرست کیا گیا ـــ اس کام کے لیے شتاب خاں نے اپنی حبیب خاص

Marfat.com

سے سترہ ہزار روپے دیے[32]

مغل دَور کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اسی دَور میں عصری اور نیم عصری روزنامچوں کی بہتات ہے۔ ان میں سے بیشتر نہ صرف دربار شاہی سے متاثر نظر آتے ہیں بلکہ اہم شخصیات اور بڑے بڑے سیاسی واقعات کے اذکار سے پُر ہیں۔ اسی وجہ سے اس دَور کے بارے میں جو نظریہ قائم کیا گیا ہے اس میں توازن قدرے کم ہے۔ بابر اور جہانگیر دونوں کی شاہی توزکیں اپنی مثال آپ ہیں، اور دوسری کتابوں کے مقابلے میں بڑی تازگی بخش ہیں لیکن یہ شہنشاہوں کی توزکیں ہیں اور فطرتاً ان کا نقطۂ نظر ایک مخصوص اعلا سطح تک محدود ہے۔ بہارستان ایک صوبائی فوجی افسر کی توزک ہے۔ اس کے مشاہدات اور بیانات ایک ایسا نظریہ پیش کرتے ہیں جس کا تعلق ایک بالکل مختلف سطح سے ہے۔ لیکن اس دَور کے بارے میں ایک دُرست اور مکمل خیال بنانے کے لئے ایسی کتابیں نہایت ضروری ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بہارستان کے بعض بیانات خوش اعتقادی پر مبنی ہیں بلکہ فضول ہیں، پھر بھی ان بیانات کی مدد سے بہت سے نکات کے بارے میں ہمارا ادراک دُرست ہو جاتا ہے، اور اسی بنا پر کتاب کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ ہمیں اگر ایسی بہت سی کتابیں مل جائیں تو خاصہ فائدہ ہو۔

Marfat.com

حوالہ جات

1- اصل مسودے کا حوالہ یہ ہے۔

"Biblis theque National, Paris; Gentil 42 supplement 252.

سب سے پہلے ڈاکٹر جادو ناتھ سرکار نے اسے عوام سے متعارف کرایا۔ اس کے بارے میں ان کے بعض مقالے بنگالی کے ماہواری رسالے پراباسی میں شائع ہوئے۔ بعد میں انھوں نے ایک مقالہ JBORS کے 1921 میں لکھا، جس میں اس کی دریافت کا پورا حال اور اس کی پوری فہرست مضامین دی۔

2- (Department of Historical & Antiquarian Studies)

آسام سرکار کے تحقیقِ تاریخ و سلف کے شعبے نے 1936 میں شائع کیا۔ میرا مضمون اسی مدون متن پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر بورہ نے اس مسودے کی وہ روٹوگراف نقل استعمال کی ہے جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر سرکار نے اپنے استعمال کے لیے جو دستی نقل اور روٹوگراف نقل کروائی تھی، ملک میں اس کے علاوہ فارسی متن کی کوئی نقل موجود نہیں ہے۔ ڈاکٹر سرکار کی دستی نقل اب نیشنل لائبریری کلکتہ میں موجود ہے، لیکن میں اسے استعمال نہ کرسکا۔

History of Bengal, Vol II; Preface p X, ed J. N. Sarkar, Dacca, 1948. -3

S.R. Sharma's articals entitled Bengal under -4

Marfat.com

Jahangir, J I H Vols XI, XIII – XIV and Prince Shahajahan in Bengal, IHQ Vol XI. Also see S. N. Bhatta Charya's article, entitled Rebellion of Shahjahan and his carrier in Bengal, IHQ, Vol X and his book. A History of Mugal North-East Frontier Policy Introduction.

5- طبع شدہ متن میں جو عنوان اور ضمنی عنوان دیے گئے ہیں ان میں سے سارے عنوان اصل متن میں نہیں ہیں۔ ان میں سے کچھ عنوان مدیر نے دیے ہیں۔ لیکن چاروں دفتر ان کے عنوان اور جن کے نام وہ معنون کیے گئے ہیں یہ سب اصل متن کے مطابق ہیں۔

6- Baharistan-i-Ghaybi, tr. M. I. Boral (Gauhati 1936) Vol I pp 282–287, 294–295; Ibid; pp 741, 777 etc. Henceforth quoted as Baharistan.

7- JBORS; op. cit; p3.

8- Sharma, Bibliography of Mughal India, pp 69–70.

9- چونکہ اور زیادہ درست معلومات موجود نہیں ہے۔ اس لیے اس نکتے پر بہت زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن داخلی ثبوت اس نکتے کے حق میں ہیں۔

10- Journal of Indian History, Vol XI p 334.

11- تعجب ہے کہ ڈاکٹر بورہ کہیں یہ حوالہ نہیں دیتے کہ مسودے میں یہ فہرست موجود ہے۔ پروفیسر شرما نے ڈاکٹر سرکاری کی روٹو گراف نقل سے استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے بھی یہ فہرست ضرور دیکھی ہوگی۔ ڈاکٹر سرکار نے JBROS میں اپنا جو مقالہ چھپوایا تھا اس مقالے میں عنوانات کی یہ پوری فہرست دی تھی، لیکن انھوں نے خاص طور سے یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ یہ فہرست اس فہرست کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے جو اصل متن سے منسلک ہے۔

12- Baharistan, Vol I, pp 282-87, 294–95, 298.

13- Ibid; pp 309–10 See also p 213

Marfat.com

14- Irfan Habib, Agrarian System of Mughal India (1556 — 1707), (Aligarh 1963), pp 264-65, footnote 30.

15- Baharistan, Vol II pp 741-42, 777.

جیسا کہ ابتدا (یعنی فٹ نوٹ نمبر 2) میں بتایا گیا ہے یہ مضمون طبع شدہ انگریزی متن پر مبنی ہے اس عبارت کا ترجمہ پورے طور سے میرے مفہوم کی حمایت نہیں کرتا ہے۔ لیکن اگر اس واقعے کو غور سے پڑھا جائے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ وہی ماہواری تناسب والی امداد کا معاملہ ہے جو حبیب صاحب نے بیان کیا ہے۔

16- مغل انتظامیہ کے مختلف شعبوں میں دوہری جانچ کا جو نظام رائج تھا' یہ معاملہ اس نظام ہی کا ایک نمونہ ہے۔ جہاں ایک طرف یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ اس رواج سے مغل افسران کی عام بد دیانتی ظاہر ہوتی ہے' وہیں یہ دلیل بھی دی جا سکتی ہے کہ سرکار معاملات کی اصل نوعیت سمجھنے اور درست معلومات اکٹھا کرنے کے لیے کتنی سخت کوشش کرتی تھی۔

17- ان تفصیلات کی مدد سے وہ طریق کار ظاہر ہوتا ہے جس کے تحت یہ نظام کام کرتا تھا۔

18- ڈاکٹر بورہ نے اس کا یہی ترجمہ کیا ہے۔ لیکن میرے خیال سے جس عبارت کا ترجمہ چھ ماہ کی تنخواہ کیا گیا ہے اس کا اصل مفہوم ماہواری تناسب نظام ہے۔

19- بہارستان' جلد اول' صفحات 421' 440

20- ایضاً' صفحہ 289

21- ایضاً' صفحات 45' 47

22- ایضاً' صفحات 48' 49

23- ایضاً' صفحات 235' 237

24- ایضاً' صفحات 181 تا 182' 283

25- ایضاً' صفحہ 168

Marfat.com

26- ایضاً، صفحہ 487

27- ایضاً، صفحہ 273، اور جلد دوم، صفحہ 626

28- ایضاً، اوّل، صفحات 215، 216

29- ایضاً، جلد دوم، صفحات 298، 299

30- The English Bengal, Vol II pp 24-26.

31- بہارستان۔ جلد دوم، صفحات 739، 741

32- ایضاً، صفحات 765، 772

Marfat.com

گولکنڈہ کے قطب شاہی دور کی عصری تاریخیں

ایچ۔ کے۔ شیروانی

دکن جیسے وسیع علاقے کی تاریخ میں سرگرمی کے ساتھ دلچسپی لینے والے عالم اتنی کم تعداد میں ہیں کہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس وسیع علاقے کے ایک حصّے گولکنڈہ جسے میں تلنگ آندھرا کہتا ہوں کے تاریخی مآخذوں کا لوگوں کو بہت کم علم ہوگا۔ عالموں کو یہ بات عجیب لگے گی کہ برگس نے اپنی کتاب Rise and Fall of the Mohammed Power of India کی تیسری جلد میں ایک "گمنام مصنّف" کی جس کتاب کا تخلیص شدہ ترجمہ شامل کیا ہے، اس کتاب کو ایک ممتاز مورّخ نے فرشتہ سے منسوب کیا ہے۔ مزید یہ کہ ہم ایلیٹ اور ڈاؤسن کے اتنے مرہونِ منّت ہو چکے ہیں کہ عبدالرزاق کی کتاب مطلع السعدین کے صرف اس بیان سے واقف ہیں جو اس نے شہر وجے نگر کے بارے میں لکھا ہے وہ شاہ ہرات کے سفیر معتبر کی حیثیت سے رائے کے دربار میں بھیجا گیا تھا۔

قطب شاہی دور کے بارے میں اتنا بہت سا تاریخی مواد موجود ہے کہ "ایک چھوٹے مضمون میں اس کا تجزیہ کرنا ممکن نہیں۔ لہٰذا میں نے یہ سوچا کہ اپنا مضمون ان عصری کتابوں اور دستاویزوں تک محدود رکھوں جو دکن میں لکھی گئیں۔

وضاحت کے خیال سے یہ مضمون ذیل کے حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے:

حصّہ اوّل

دکن میں لکھی جانے والی وہ عصری ہند فارسی تاریخیں جو نثر میں ہیں، اس حصّے میں بعض

Marfat.com

وہ خطوط بھی شامل کر دیے گئے ہیں جو عبداللہ قطب شاہ اور دوسرے اشخاص نے لکھے۔

حصّہ دوئم

دکن میں لکھی جانے والی وہ عصری ہند فارسی تاریخیں جو نظم میں ہیں۔

حصّہ سوئم

تلگو کی وہ نظمیں جن کا تعلق قطب شاہی دور کی تاریخ سے ہے۔

حصّہ اوّل

عصری ہند فارسی تاریخیں جو نثر میں ہیں۔

1۔ بُرہانِ معاصر

یہ بات لائق توجہ ہے کہ بُرہانِ معاصر وہ پہلا فارسی روزنامچہ ہے جس کا تعلق قطب شاہی دور کی تاریخ سے ہے اور جو دکن میں تالیف کیا گیا ہے۔ اس کا مصنّف سید علی بن عزیزاللہ طباطبائی عراق سے ہندوستان آیا اور ابراہیم قطب شاہ (80 - 1550) کی ملازمت اختیار کی۔ وہ نالارگ کے معاصرے کے وقت موجود تھا۔ یہ معاصرہ ابراہیم کے دور میں ستمبر 1681 سے شروع ہوا، اور اس کے جانشین محمد قلی کے دورِ حکومت کے ابتدائی مہینوں میں جنوری 1682 تک جاری رہا لیکن اس واقعے کو شاید زیادہ مدت نہیں گزری تھی جب اس نے قطب شاہی ملازمت ترک کر کے نظام شاہی ملازمت اختیار کر لی۔ بُرہان نظام شاہ دوئم (95 - 1591) نے اس روزنامچے کی تالیف کا کام اس کے سُپرد کیا جس روزنامچے کا نام اس کے اپنے نام پر رکھا گیا۔ کتاب کا عنوان بُرہانِ معاصر مادۂ تاریخ ہے اور اس سے 1000ھ مطابق 1592 تاریخ نکلتی ہے۔ (اتفاق سے اسی سال حیدرآباد کا شہر بھی بسایا گیا) مصنّف کا کہنا ہے کہ اس نے یہ کتاب 11 ربیع الثانی 1003ھ مطابق 16 نومبر 1594 کو مکمل کر لی تھی۔ لیکن اس کا بیان اس طویل مجلسِ امن تک جاری رہتا ہے جو شہزادہ مراد اور چاند بی بی سلطان کے درمیان ہوئی اور جو 27 رجب 1004ھ

Marfat.com

مطابق ۱۴ / مارچ 1596 کو ختم ہوئی۔ کیمرج کے جس مسودے سے طبع شدہ کتاب نقل کی گئی ہے اسی مسودے کے آخر میں ایک دلچسپ ترقیمہ ہے، جس میں لکھا ہے کہ یہ مسودہ مصنّف کے بیٹے ابوطالب نے 22 محرّم 1038ھ مطابق ۱۱ / ستمبر 1628 کو نقل کیا۔

یہ روزنامچہ تین بڑے چھوٹے طبقات یا حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصّے میں گلبرگہ کے بہمنیوں کا ذکر ہے، دوسرے میں بدار کے بہمنیوں کا ذکر ہے، اور تیسرے حصّے کا خاص موضوع احمد نگر کے سلطان ہیں جن کا ذکر ۱۴ / مارچ 1596 کے معاہدۂ امن تک جاری رہتا ہے۔ پہلا حصّہ سب سے زیادہ مختصر ہے اور مشکل سے چھپے ہوئے باون صفحات پر مشتمل ہے، دوسرے حصّے میں ایک سو پندرہ صفحات ہیں۔ لیکن آخری حصّے میں تقریباً چار سو ستر صفحات ہیں جن میں بُرہان دوئم تک کے بادشاہوں کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ دیا گیا ہے۔ چونکہ احمد نگر منتقل ہونے سے پہلے مصنّف قطب شاہی ملازم تھا۔ اِس لیے اُس نے گولکنڈہ۔ حیدرآباد۔ کی تاریخ پر بڑی توجّہ دی ہے۔ اس نے سلطان قلی قطب الملک اور اس کے بیٹے کے مختصر دورِ حکومت کا ذکر تقریباً چھوڑ کر ابراہیم قطب شاہ اور قلی قطب شاہ کے دَورِ حکومت کا ذِکر کیا ہے۔ اُس نے آخری دو بادشاہوں کا ذِکر قدرے دِلچسپی کے ساتھ کیا ہے، حالانکہ اس دِلچسپی کا سبب وہ واقعات ہیں جن کا تعلق نظام شاہی حکومت سے تھا۔ قطب شاہی سِلسلۂ حکومت کے بارے میں اس کی دی ہوئی تفصیلات بڑی مفید ہیں۔ حالانکہ اس نے برار کے حکمرانوں کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے کہ حکمراں کو محض عماد الملک لکھا ہے اور اسی سلسلے کے دوسرے حکمراں کو محض شیخ علاالدین عماد الملک لکھا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ عماد شاہی اور نظام شاہی حکمرانوں میں سخت دُشمنی تھی۔

جیساکہ ایک اور جگہ لکھا گیا ہے (شیروانی، دکن کے بہمنی۔ ایک معروضی تحقیق) جہاں تک بہمنیوں کا تعلق ہے برہان فرشتہ کی اصلاح کرتا ہے۔ بہمنی کے بعد والے دَور میں طباطبائی نے بہت سے واقعات اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے، اور اس سے پہلے کی تاریخ کے بارے میں اس نے جو معلومات فراہم کی ہے وہ بھی خاصی لائقِ اعتبار ہے۔ وہ دو معاہدوں کے وقت

Marfat.com

موجود تھا ایک فالارگ کا محاصرہ جب وہ محمد قلی قطب شاہ کا ملازم تھا اور دوسرا احمد نگر کا محاصرہ جب وہ چاند سلطانہ کے حاشیہ نشینوں میں تھا اور کسی بڑے عہدے پر فائز تھا مزید یہ کہ اس نے اس مجلسِ امن، جس نے احمد نگر اور مغلوں کے تصادم کو وقتی طور سے ختم کر دیا، کا ذکر اتنے واضح انداز میں کیا ہے کہ لگتا ہے جیسے وہ خود مجلس کی کارروائی میں شریک رہا ہو۔

پہلے دو طبقوں کا ترجمہ اور تلخیص جے۔ ایس۔ کنگ نے کی اور اسے "The History of Bahmani Kingdom" کے نام سے 1900ء میں شایع کرایا۔ اسی طرح تیسرے طبقے کا ترجمہ اور تلخیص سبرو ولزلے ہیگ نے کی اور اسے "The History of Nizam Shahi of Ahmadnagar" کے نام سے 1923ء میں شایع کرایا۔

2۔ گلشنِ ابراہیمی جسے عام طور سے تاریخ فرشتہ کہا جاتا ہے۔

محمد قاسم ہندو شاہ کا لقب فرشتہ تھا۔ 1552ء میں ایران کے مقام استرآباد میں پیدا ہوا اور 1623ء میں بیجاپور میں فوت ہوا۔ وہ احمد نگر لایا گیا تو بچہ ہی تھا۔ بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ دوئم کے دربار کی ملازمت اختیار کرنے سے پہلے 1591ء تک وہ احمد نگر میں ہی رہا۔

اس کی عظیم الشان کتاب، گلشنِ ابراہیمی یا نورس نامہ جسے لوگ عام طور پر تاریخ فرشتہ کے نام جانتے ہیں، 1606ء میں مکمل شکل میں بادشاہ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ لیکن بعد میں مصنّف نے کتاب میں توسیع کی اور اس میں 1606ء تک کے واقعات شامل کر لیے۔ ہندوستانی تاریخ کے دورِ وسطیٰ کے بارے میں جتنے روز نامچے لکھے گئے ہیں بلاشک وشبہ یہ روزنامچے ان میں سے اہم ترین روزناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ جو بھی روزنامچے اس کے بعد تالیف لکھے گئے ہیں ان کے مصنّفین کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے یا تو فرشتہ کے موضوعات میں اضافہ کیے ہیں یا پھر محض اس کی ایسی نقل کی ہے جس میں کسی خاص موضوع پر زور دیا ہے۔

Marfat.com

مصنّف نے تمہید میں بتیس کتابوں کا ذکر کیا ہے جن سے اسے معلومات حاصل ہوئی لیکن اس میں سے کوئی بھی کتاب قطب شاہی سلسلۂ حکومت کی تاریخ نہیں ہے۔ جلد دوئم کا انتہائی مختصر حصّہ چار (لکھنؤ ایڈیشن) جو تلنگ کے فرمانرواؤں کے بارے میں ہے۔ اس میں وہ ایک کتاب 'وقائع قطب شاہیہ کا حوالہ دیتا ہے جس کے بارے میں خیال یہ ہے کہ ابراہیم قطب شاہ (?10-1550) کے زمانے میں عراق کے شاہ خُرشاہ نے لکھی تھی۔ لیکن ساتھ میں وہ یہ اعتراف بھی کرتا ہے کہ یہ کتاب ایسے دستیاب نہ ہوسکی حقیقت یہ ہے کہ شاہ خُرشاہ کی کوئی ایسی کتاب ہے ہی نہیں۔ تاریخ اِلچی نظام شاہ (مصنّف خُرشاہ بن قباد الحینی) کی ایک نصف جلد موجود ہے جو 1038ھ مطابق 1628-29ء میں عبداللہ قطب شاہ کے شاہی کُتب خانے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ (سالارجنگ میوزیم، حیدرآباد، مسودہ نمبر 118 B) اس کتاب میں مصنّف نے دکن کے بہمنیوں تک کی تاریخ عالم بیان کی ہے۔ جس میں قطب شاہیوں کے ترکمان آباد اجداد کا ذکر بھی شامل ہے۔ لیکن جب وہ محمد شاہ لشکری (1463-82) اور بہمنی سلطنت کے ٹکڑے ہونے پر آتا ہے تو یہ وعدہ کرکے رُک جاتا ہے کہ بعد میں بہمنی حکومت کی جانشین حکومتوں، یعنی ان ریاستوں کے بارے میں تفصیل سے لکھے گا جن پر نظام الملک، عادل خاں، قطب الملک، عماد الملک اور قاسم بَرید نے حکومت کی۔ اگر اس نے واقعی قطب شاہیوں کی کوئی تاریخ لکھی ہے تو ہم اس سے واقف نہیں۔ اور وہ کم سے کم فرشتہ کو نہیں ملی۔

فرشتہ کے لکھنؤ والے ایڈیشن میں قطب شاہیوں پر صرف پانچ صفحے صَرف کیے گئے ہیں جبکہ عادل شاہیوں نے بانوے صفحات اور نظام شاہیوں نے چوہتر صفحات لیے ہیں۔ ان پانچ صفحات میں بھی مصنّف نے، حقائق سے لاعلمی کی بنا پر بعض کھلی ہوئی غلطیاں کی ہیں۔ اس کی غلطیوں کی چند مثالیں مانی ہوں گی:۔

(1) وہ کہتا ہے کہ محمد قلی بارہ سال کی عمر میں 989ھ مطابق 1581ء میں تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ حالانکہ وہ خود ہی یہ کہتا ہے کہ وہ یکم رمضان 973ھ کو پیدا ہوا۔

Marfat.com

2۔ 1018ھ مطابق 10-1609ء میں لکھتے وقت وہ کہتا ہے کہ سفیرِ فارس "اُغوزلُو سلطان" دکن میں مقیم تھا اور منتظر تھا کہ سلطان کی بیٹی حیات بخشی بیگم سے ایران کے شاہ عبّاس دوئم کے بیٹے کی شادی کی تجویز منظور ہو جائے، حالانکہ اس بیٹی کی شادی سلطان کے اپنے بھتیجے سے جو بعد میں سلطان محمد قطب شاہ بنا دو سال پہلے ہی ہو چکی تھی۔

3۔ فرشتہ محمد قلی اور "زنِ فاحشہ" بھاگ متی کے فرضی عشق میں اتنی زیادہ دلچسپی لیتا ہے کہ نوتعمیر دارالسلطنت کو 1018ھ مطابق 10-1609ء میں بھاگ نگر کہتا ہے، جبکہ ہمارے پاس "دارالسلطنت حیدرآباد" میں ڈھلے ہوئے 1012ھ مطابق 1603ء کے بہت سکّے موجود ہیں۔ وہ خود ہی اس بات کو بھول کر صاف لفظوں میں لکھتا ہے کہ قطب شاہی فوج کو جو 1005ھ مطابق 1597ء میں احمد نگر بھیجی گئی تھی، مغلوں نے شکستِ فاش دی اور وہ بھاگ کر "حیدرآباد" واپس آ گئی۔

لہٰذا جہاں تک قطب شاہی سلسلہ حکومت کا تعلّق ہے یہ کہنا بیکار ہے کہ فرشتہ کی گلشنِ ابراہیمی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

3۔ تذکرۃ الممالک

میر رفیع الدّین ابراہیم بن نورالدّین توفیق شیرازی 947ھ مطابق 11-1510ء کے آس پاس پیدا ہوا تھا۔ وہ محمود شاہ بہمنی کے زمانے میں اپنے باپ کے ساتھ بحیثیت تاجر بیجاپور آیا۔ لیکن علی عادل شاہ (79/1557) کے زمانے میں گردشِ ایّام نے اسے سرکاری ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا، اور بظاہر یہ لگتا ہے کہ وہ شاہی خاندان کے سامان کا مہتمم یا خوان سالار مقرر ہوا۔ اس نے رفتہ رفتہ یہاں تک ترقّی کی کہ ابراہیم عادل شاہ دوئم (1579-1626) نے 1005ھ مطابق 7-1596ء میں ایک اہم سفارتی مہم پر اسے احمد نگر بھیجا۔ اس نے کچھ مدّت تک بیجاپور کے صوبیدار کے فرائض بھی انجام دیے۔

Marfat.com

رفیع الدین نے ۱۹ رمضان 1017ھ مطابق 17 دسمبر 1608ء کو تذکرۃ الممالک لکھنا شروع کی اور 6 رجمادی الثانی 1024ھ مطابق 23 جون 1615ء کو نورس پور میں، جو بیجاپور کے نواح میں ہے، (بیجاپور کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ اس کا نام بدل کر بدیاپور رکھ دیا تھا) اسے مکمل کر لیا۔ یہ تذکرہ دراصل بیجاپور کے عادل شاہیوں کا روزنامچہ ہے، جس میں دیباچے کے طور پر ایک باب بہمنیوں کے بارے میں ہے اور آخر میں دو باب، امیر تیمور سے اکبر تک مغلوں کے بارے میں ہیں۔ باقی سات ابواب میں ابراہیم عادل شاہ دوئم تک عادل شاہیوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ لیکن بہمنی کی جانشین ریاستوں کی سیاست کچھ اس درجہ ایک دوسرے سے وابستہ تھی کہ عادل شاہیوں کی کسی بھی مفصل تاریخ میں قطب شاہیوں کو بھی خاصی اہم حیثیت دینا ضروری ہو گیا تھا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مصنف نے عادل شاہی دور کے پہلے چار حکمرانوں کو لفظ شاہ لگائے بغیر صرف ان کے نام سے پکارا ہے۔ جس سے ایسا لگتا ہے کہ ان حکمرانوں نے اپنی بادشاہت کا اعلان نہیں کیا۔ یہ بات بہرحال یاد رکھنی چاہیے کہ چوتھے حکمراں ابراہیم عادل کے بعض کتبے موجود ہیں جن پر تاریخ سال 945ھ مطابق 9-1538ء پڑی ہوئی ہے، اور جن میں اس کا نام ابراہیم عادل شاہ لکھا گیا ہے۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ اس کے یوسف عادل خاں کا شجرۂ نسب سلاطینِ ترکی محمود اوّل یا دوئم کے بجائے وسطِ ایشیا کے مقام ساوا کے محمود بیگ سے ملایا ہے، حالانکہ بعض اوقات یوسف عادل خاں کا شجرۂ نسب ترکی کے ان ہی سلطانوں سے ملایا جاتا ہے۔

مصنف نے قطب شاہیوں پر خاصی توجہ اور وقت صرف کیا ہے۔ اس نے ابراہیم قطب شاہ کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے اور نئے دارالسلطنت حیدر آباد کی تعمیر کے بارے میں بڑی معلومات فراہم کی ہے۔ اس نے نیا شہر بسائے جانے کا سبب، شہری زمین کی تقسیم، شاہی محل کے حصّوں کی تفصیلات اور ریاست میں عالموں اور دانشوروں کی حیثیت کا ذکر کیا ہے۔ مجموعی طور سے یہ کتاب قطب شاہی سلسلۂ حکومت کے ابتدائی دور

Marfat.com

خاصی اچھی سند سمجھی جاتی ہے۔

4۔ تاریخ محمد قطب شاہ

5۔ معاصر قطب شاہی

تاریخ قطب شاہی سلسلۂ حکومت کی ایک جامع اور مفصل تاریخ ہے۔ یہ سلطان محمد قطب شاہ کے حکم سے 1025ھ مطابق 1616ء میں تالیف کی گئی۔ اس کا مصنف، جو خود کو گمنام رکھنا چاہتا ہے، اس نے تمہید میں یہ لکھا ہے کہ اس کے سامنے "اعلاحضرت کے ملازمین (چاکران) میں سے ایک کی، لکھی ہوئی ایک بڑی تاریخ موجود تھی جس کو اس نے مختصر کیا ہے اور بعض ایسے حقائق بیں اضافے کیے ہیں جن کا تعلق اس دور کی تاریخ سے ہے۔ چونکہ یہ سلسلۂ حکومت کی ایک ایسی تاریخ ہے جس پر سرکاری مہر لگی ہوئی ہے اس لیے اس کا بیان سلطان قلی اور اس کے چچا اللہ قلی کے ہندوستان آنے سے پہلے سلطان قلی کے خاندان کے قارا قوونلو پس منظر سے شروع ہوتا ہے، اور اس سلسلۂ حکومت کی تاریخ کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کرکے جاری رہتا ہے۔ یہ کتاب ذیل کے چار "بیانات" اور ایک اختتامیہ بیان میں تقسیم کی گئی ہے۔

(1) سلطان قلی قطب الملک کا بیان

(2) "جمشید قطب الملک" اور اس کا بیٹا "جو سبحان قلی کہلاتا ہے" ان دونوں کا بیان۔

(3) ابراہیم قطب شاہ کے حالاتِ زندگی اور دورِ حکومت کا بیان۔

(4) سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حالاتِ زندگی اور دورِ حکومت کا بیان۔

(5) اختتامیہ بیان؛ سلطان محمد قطب شاہ کے دورِ حکومت کے "بعض واقعات" کا بیان۔

اس کتاب میں نہ صرف دربار کے واقعات، مہمات اور فتوحات کا ذکر ہے بلکہ قطب شاہیوں کے رفاہِ عامہ کے کاموں، ان کی ادبی سرپرستی اور ان کی تعمیرات کا بھی ذکر ہے۔

Marfat.com

اس نے حیدر آباد کا شہر بسائے جانے کا سبب، شہری زمین کی تقسیم کا خاکہ، مختلف عمارتوں اور دارالسلطنت سے آنے جانے والی سڑکوں کا ذکر کیا ہے۔ اس نے حیدر آباد اور گولکنڈہ کی باہمی اہمیت اور ایسے بہت سے حقائق بیان کیے ہیں جو کہیں اور نہیں ملتے۔ وہ تاریخوں کا بہت پابند ہے، اور اس نے تاریخوں کی جو ترتیب دی ہے وہ بڑی حد تک درست ہے۔ مصنّف نے یہ کتاب شعبان 1026ھ مطابق جولائی۔ اگست 1617ء میں مکمّل کر لی تھی۔

ایک اور مصنّف محمود بن عبداللہ نیشاپوری نے اس تاریخ کا بیان اپنی کتاب معاصر قطب شاہی میں 1038ھ تک مکمّل کر دیا ہے۔ اس نے 995ھ مطابق 1587ء میں محمد قلی قطب شاہ کے ملازمت اختیار کی، اور یہ کتاب 1033ھ مطابق 1624ء اور 1038ھ مطابق 1629ء کے درمیان تالیف کی۔ ابتدا میں یہ کتاب تین جلدوں میں تھی لیکن اس میں "متعدد بار تبدیلیاں اور اضافے کیے گئے۔" اس کا صرف ایک ہی حصّہ موجود ہے جو آج کل انڈیا آفس لائبریری میں ہے اور اس حصّے کے بھی آخر میں کچھ خامی ہے۔ اس میں مصنّف نے محمد قطب شاہ کے سالِ وفات 1035ھ مطابق 1626ء تک قطب شاہی دَور کی تاریخ کے علاوہ اپنے وطن ایران کی تاریخ بھی قدرے تفصیل سے بیان کی ہے اور یہ بیان 1038ھ مطابق 1629ء میں شاہ عبّاس دوئم کی وفات پر ختم ہوتا ہے۔

(6) حدیقۃ السلاطین عبداللہ قطب شاہ (1626-27) کے دَورِ حکومت کے پہلے اُنتیس برسوں (سولہ برس نہیں جیسا کہ اسٹوری کی کتاب میں دیا گیا ہے) کی بڑی صحیح تاریخ ہے جسے سلطنت کے معروف پیشوا یا وزیرِ اعظم شیخ محمد بن خاتون کے ایما پر مرزا نظام الدین احمد نے لکھا ہے۔ یہ ایک طرح کا یومیہ روزنامچہ ہے جس میں عبداللہ کی تاریخ پیدائش 21 / نومبر 1614ء سے اس کی تاریخ وفات یکم جنوری 1644ء تک اس کی زندگی کے شب و روز کا بیان ہے۔ یہ دَور قطب شاہی سلطنت کے شدید سیاسی زوال کا دَور تھا جنوری 1636ء کے منحوس "قولِ اطاعت" کے تحت قطب شاہی سلطنت فی الواقع مغل شہنشاہ کی تابع

Marfat.com

ہو چکی تھی، اور جب کبھی کوئی مغل ایلچی دار السلطنت آتا تو بادشاہ شاہی محل سے پانچ میل دُور حسین ساگر بندہ کے آخری کنارے پر پہنچ کر اس کا استقبال کرتا تھا۔ وہ مجبور تھا کہ سکوں پر شاہ جہاں کا نام بھی ڈھلوائے اور جمعہ کے خُطبے کے ساتھ شہنشاہ کے واسطے درازی عمر اور خوش اقبالی کی اور اس کی فوجوں کے لیے کامیابی کی دُعائیں کروائے۔ سلطان کو ان لوگوں کا مرہونِ منت ہونا بڑتا تھا جنھیں شہنشاہ کے دار السلطنت میں قوت حاصل تھی اور دار شکوہ، اورنگ زیب اور شہنشاہ کے وزیروں نیز سفیروں کو پست انداز میں ایسے خطوط لکھنے پڑتے تھے جو کوئی بھی خود مختار بادشاہ لکھنا گوارہ نہیں کر سکتا۔ (مکاتیبِ سلطان عبداللہ قطب شاہ، اس کتاب کا ذکر بعد میں ہوگا)۔ اور پھر بھی حدیقت کا مصنّف یہ ظاہر کرتا ہے جیسے وہ کوئی نہایت طاقتور بادشاہ ہو، اور یہ لکھتا ہے کہ بادشاہ کی پیدائش کے وقت منجموں نے پیش گوئی کی تھی کہ "وہ سلیمان اور سکندر کے مانند ہوگا اور دُنیا کے سارے بادشاہوں کو فرمان جاری کیا کرے گا۔ وہ اس کے بارے میں بڑی بڑی باتیں کرتا ہے اور مختلف تہواروں کے سلسلے میں مختلف تقریبات کا ذکر یوں کرتا ہے کہ "اس وقت پھولوں کی بھرمار تھی، عطر کے پیپے تقسیم کیے جا رہے تھے، لاکھوں شمعیں جل رہی تھیں اور ہزار ہا ہن بانٹے جا رہے تھے۔" مشرقی ساحل پر بادشاہ کی آمد کا حال کچھ ایسے الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ میدانِ زرلفت بھی فرطِ شرم سے ماند پڑ جاتا ہے۔ اور ٹھیک ان ہی دِنوں میر جملہ اپنے مرکزی مقام گنڈی کوٹا میں مقیم تھا اور رائل سیما کو فتح کر رہا تھا اور کوہِ سنیٹ تھامس کے جنوب کی بلندیوں پر قطب شاہی پرچم لہرا رہا تھا۔ اور اس دن کی تیاری کر رہا تھا جب وہ مغل سرحدوں کو عبور کر کے دربارِ شاہی کو شرمندہ کرے گا۔

حدیقت السلاطین قطب شاہی دربار کی بیاض کے مانند ہے جس میں نہ صرف شان و شوکت اور مسرت و انبساط کا ذکر ہے بلکہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ملک کا انتظام کس صورت سے کیا جاتا تھا، بڑے جاگیرداروں کے کیا طور و طریق تھے، پیشوا اور دوسرے وزیروں

Marfat.com

کے کیا کام اور فرائض تھے، مجلس دیوانداری یا پریوی کاؤنسل کس طرح قائم کی گئی، انصاف کس طرح کیا جاتا تھا اور یہاں تک کہ کن شہری اور فوجی عہدیداروں کا کس دن اور کس جگہ تقرر کیا گیا۔ اس میں لوگوں کی سماجی زندگی، اُن کے توہمات، ان کی رسموں اور تقریبوں، اور اہم بات یہ ہے کہ آبادی کے مختلف حصّوں کے درمیان خصوصاً مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کتنے عُمدہ تعلّقات تھے، اس سب کی خاصی دُرست تصویر دی گئی ہے۔ سب سے آخری بات یہ ہے کہ ہم اس کی مدد سے یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ معاشرے کی بین الاقوامی ساخت کیا تھی اور غیر معمولی اور مستقل دونوں طرح کے غیر ملکی سفارت کاروں یا حاجبوں کی دارالسلطنت میں کیا حیثیت تھی۔ کتاب کی زبان ایسی ہے کہ اس خزینۂ حقائق کے باوجود جو کتاب میں بھر دیا گیا ہے، قاری پڑھتے وقت بیزار نہیں ہوتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تقریباً ہر صفحے کے بعد اس کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

(7) حدائق السلاطین

کتاب کا پورا نام ہے حدائق السلاطین کلام الخواقین یا "سلاطین کے باغات اور شاہان کے عظیم مضامین"۔ اس کا مصنّف، علی ابن تیفور البسطامی، لکھتا ہے کہ وہ محمد ابن خاتون کا شاگرد تھا اور اس نے سلطان ابوالحسن قطب شاہ (87 - 1672ء) کے کہنے پر یہ کتاب 1092ھ مطابق 1681ء میں مکمل کی تھی۔ حدائق دراصل تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ فارسی شاعری اور ہندوستان نیز ایران کے بادشاہوں، ان کے وزیروں اور قابل لوگوں کے کچھ خطوط کا خلاصہ ہے۔ حالانکہ کتاب مکمل ہوئے مشکل سے چھ سال گزرے ہوں گے جب اس سلسلۂ حکومت کا زوال ہو گیا، اور آخری قطب شاہی فرمانروا کو دولت آباد میں تمام عمر کے لیے قید کر دیا گیا، لیکن مصنّف اپنا بیان اس دُعا پر ختم کرتا ہے کہ بادشاہ کا اقتدار اور قوت ہمیشہ برقرار رہے۔

یہ کتاب تین حدیقوں یا باغوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ اور ہر ایک حدیقے کو بہت

Marfat.com

سے طبقوں یا حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے :-

(i) پشدادیوں سے لے کر 30 ھ مطابق 51-650ء تک کے قبلِ اسلام ایرانی بادشاہ۔

(ii) ایران، وسطِ ایشیا اور ہندوستان کے مسلم بادشاہ و شہنشاہ جن میں غوری، سلجوقی، خوارزم شاہی، ترک سلاطین، تیمور سے جہانگیر تک مغل، قراقوونلو، صفوی، بہمنی جن میں صرف محمود شاہ (یعنی محمود اوّل) اور فرموز کا ذکر ہے، عادل شاہی، اور آخر میں قطب شاہی جن میں صرف سلطان قلی جس کا نام بڑا ملک ہے، جمشید محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ کے دورِ حکومت کا خفیف سا ذکر کیا گیا ہے تعجب یہ ہے کہ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن قطب شاہ کا بحیثیت شاعر یا شاعر نواز قطعاً ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

(iii) بعض وزیروں، امیروں، منصفوں اور قابل لوگوں کی سوانحیں، نظمیں اور کچھ خطوط۔ اس میں تیس سے زیادہ اشخاص کے نام ملتے ہیں لیکن شمالی ہندوستان کی نمائندگی صرف عبدالرحیم خانخاناں، علی قلی خاں، فیضی اور ابوالفضل کرتے ہیں، جب کہ دکن کی نمائندگی محمود گاواں، مرزا امین اصفہانی، محمد قلی قطب شاہ کے میر جملہ اور رضا قلی بیگ بہ ملقب نیک نام خاں کرتے ہیں۔

اس کتاب کا سارا مواد جیسا کہ خود کتاب کے نام سے ظاہر ہے، خصوصاً شاعر اور شاعری سے متعلق ہے، لیکن ہر ایک کی سوانحِ حیات سے کچھ تاریخی معلومات بھی حاصل ہوتی ہے۔ حالانکہ جیسا خود مصنف بھی اعتراف کرتا ہے، یہ معلومات ہند، فارسی اور دوسرے روزنامچوں سے حاصل کی گئی ہے۔ دو سو سے زیادہ نمبر شمار (فولیو) میں سے صرف تقریباً بیس نمبر شمار (فولیو) ایسے ہیں جن کا تعلق گولکنڈہ، حیدرآباد کی تاریخ سے ہے، لیکن ان میں بھی بعض ایسے نئے حقائق کا ذکر ہے جن کی بنا پر حدائق کو قطب شاہی تاریخ کی ماخذی کتابوں کی صف میں رکھا جاسکتا ہے۔ بہر حال یہ بات بتادینا ضروری ہے کہ اس کتاب کا معیار ایسی تاریخوں کے مقابلے میں صریحاً کم ہے جیسے تاریخِ محمد قطب شاہ، لیکن اس علاقے میں سیاسی حالات جس تیزی

Marfat.com

سے مائل بہ انحطاط تھے اس کے پیشِ نظر ایسا ہونا بڑا فطری تھا۔

(8) عبداللہ قطب شاہ کے خطوط

1۔ مکاتیب سلطان عبداللہ قطب شاہ بہ نام دارا شکوہ وغیرہ (مسودات، سالارجنگ لائبریری، ادب، نثر فارسی، نمبر 295ج)۔

2۔ عرائض واتحاد نماجات وفرامین عبداللہ قطب شاہ (مسودات، انجمن ترقیِ اُردو، کراچی، نمبر 27ج/7)۔

3۔ انشائے عبدالعلی خاں تلیقانی (مسودات، سالارجنگ لائبریری، ادب، نثر فارسی، نمبر 15)۔

عبداللہ قطب شاہ اور اس کے دَور کے بعض اہم اشخاص کے خطوط اور فرمانوں کے ان تینوں مجموعوں سے ہمیں منحوس قولِ اطاعت کے بعد اس قلمرو کی سیاسی حالت کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ نے اس منحوس قولِ اطاعت پر اس وقت دستخط کیے تھے جب محمد سعید میر جملہ اس سے غداری کر کے مغلوں سے جا ملا تھا۔ کراچی کے مجموعے میں جو مسودہ ہے وہ دراصل سالارجنگ لائبریری کے مسودہ نمبر 295ج کی ہی ایک ایسی نقل ہے جس میں بعض غیر اہم قسم کے اخراج یا اضافے کر دیے گئے ہیں۔ اس مجموعے میں آخری تاریخ رجب 1072ھ مطابق فروری، مارچ 1662ء دی گئی ہے جو مرزا ابوالحسن اور بادشاہ کی تیسری بیٹی کی شادی کی تاریخ ہے۔ مرزا ابوالحسن کے مقدر میں لکھا تھا کہ وہ قطب شاہی سلسلۂ حکومت کا آخری بادشاہ کہلائے۔ تیسری کتاب (انشائے تلیقانی) دراصل بعض ایسے چیدہ خطوط کا مجموعہ ہے جن کا مقصد فارسی کے اُن الفاظ محاوروں کی وضاحت کرتا ہے جو سترھویں صدی کے دکن میں رائج تھے، اور اس مجموعے میں نہ صرف وہ چند خطوط شامل ہیں جو دوسرے دونوں مجموعوں میں ملتے ہیں بلکہ ایسے دیگر خطوط بھی شامل ہیں جن کا اس دَور کی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

پہلے دونوں مجموعوں میں جو خطوط ہیں وہ اس دَور کا تقریباً احاطہ کر لیتے ہیں جو 1065ھ

Marfat.com

مطابق 1654ء میں میر جملہ کی غداری سے 1072ھ مطابق 1662ء تک کا دَور ہے۔ ان میں سے بیشتر خطوط پر کوئی تاریخ نہیں دی گئی ہے، بعض خطوط پر محض مہینہ اور سال دیا گیا ہے۔ اور چند ایک پر پوری تاریخ دی گئی ہے۔ یہ خطوط عبداللہ قطب شاہ نے ایران سے شاہ عبّاس دوئم، شاہجہاں، داراشکوہ، شہزادہ اورنگ زیب، شاہ جہاں کی بیٹی (غالباً جہاں آرا)، علی عادل شاہ، عبدالصمد دبیرالملک جو مغل دربار میں قطب شاہی سفیر تھا، حاجی نصیر جو بیجاپور میں قطب شاہی سفیر تھا، اور دوسرے بہت سے اشخاص کو لکھے ہیں۔

ان خطوط میں سے بعض خطوط نہایت اہم ہیں۔ ان کی وسعت اس انداز کی ہے کہ محض اس حقیقت پر ہی بھرپور روشنی نہیں پڑتی کہ عبداللہ کا حیدرآباد پورے طور سے مغل قوّت کا دست نگر تھا، بلکہ اس بادشاہ کی شدید مایوسی پر بھی روشنی پڑتی ہے جو شاہ ایران اور بیجاپور کے اپنے برادرِ نسبتی کے سامنے جھک کر اپنی کیفیت کا رونا روتا ہے۔ ان سارے مجموعوں میں پہلا خط شاہ عبّاس دوئم کے نام ہے جس میں عبداللہ تلخ انداز میں میر جملہ کی غدّاری اور "سلطان خرم کی بے ایمانی" کی شکایت کرتا ہے۔ دوسری طرف وہ نہ صرف شہنشاہ بلکہ داراشکوہ اور اورنگ زیب کو بھی پیش کی جانے والی "عرض داشتوں" میں نہایت حقیر الفاظ میں اپنے خیالات ادا کرتا ہے۔ چنانچہ جب بھی وہ شہنشاہ کا نام لکھتا ہے تو اس کے ساتھ بعض اوقات کئی کئی سطروں میں تعریف و ستائش کے بہت سے القاب لکھتا ہے، اور ان عرضداشتوں کو "اِلتجائیں" کہتا ہے۔ وہ اورنگ زیب کو "خلافتِ عظمیٰ کا درِ آبدار" کہتا ہے۔ حتیٰ کہ دہلی میں اپنے سفیر کو بھی جب کبھی کوئی فرمان بھیجتا ہے تو شہنشاہ کو بھیجے جانے والے اپنے خطوط کو "عرضداشتیں" اور خود شہنشاہ کو "مسکنِ پناہِ خلافت" لکھتا ہے۔

یہ خطوط اسی لیے بڑے قابلِ قدر ہیں کیونکہ اُن کے ذریعے عبداللہ کے دَورِ حکومت کے بعد والے زمانے کی خارجی، سفارتی اور کسی حد تک داخلی حکمتِ عملی کا دُرست اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔

Marfat.com

حصّہ دوئم

دکن میں لکھی جانے والی وہ عصری ہند فارسی تاریخیں جو نظم میں ہیں۔

(1) نسبت نامۂ شہریاری

(2) نسبت نامۂ قطب شاہی

(3) تاریخِ قطب شاہی (لندن)

(4) تواریخ قطب شاہی (حیدر آباد)

نسبت نامۂ شہریاری حسین علی شاہ فرشی نے تالیف کیا تھا۔ اور 1016ھ مطابق 1607ء میں اسے مکمل کرلیا تھا نیز 1019ھ مطابق 1610ء میں لاہور میں اسے نقل کیا تھا۔ اسی کتاب سے شروع کی کسی سطر میں تواریخ قطب شاہی کا نام آتا ہے۔ اِسے چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور "لگتا ہے کہ یہ کتاب نسبت نامہ سے اخذ کی گئی ہے"۔ فرشی کا تخلّص صفحہ پانچ پر ملتا ہے لیکن کتاب کو حیدر قلی خاں کے معتمد (منشی) ہیرالال خوشدل سے منسوب کیا جاتا ہے، اور یہ تخلّص "خوشدل" اس کتاب کی غنائی نظم میں نظر آتا ہے۔

نسبت نامۂ قطب شاہی کے نام سے بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے مجموعے میں دو جلدیں موجود ہیں (آئیو نوو 690 اور 691) اور دونوں جلدیں محمد قلی قطب شاہ (1580ء - 1611ء) کے دَورِ حکومت کی ابتدا پر ختم ہوتی ہیں۔

یہ کتاب چار مقالوں یا موضوعات میں تقسیم کی گئی ہے جن کے نام یہ ہیں:

(i) محمود شاہ بہمنی کی وفات (1518ء) تک اس سلسلۂ حکومت کا تعارف اور اس کی ابتدائی تاریخ۔

(ii) بہمنیوں کا زوال اور بڑے مُلک کا عروج۔

(iii) ابراہیم قطب شاہ کی وفات تک دکن کی سلطنتوں کے درمیان بین الریاستی

Marfat.com

جنگیں بمعہ غنائی نظموں کے جو ابراہیم اور اس کے بیٹے محمد قلی قطب شاہ کے اعزاز میں ہیں۔

(۱۷) محمد میر شاہ میر کی بیٹی سے محمد قلی قطب شاہ کی شادی کی تقریب تک اس کے دورِ حکومت کا پہلا سال۔

اِس کتاب میں نفیس قسم کی تین قلمی تصویریں ہیں۔ اس کا پہلا حصّہ علی بن ابی محمد نے محمد قطب شاہ کے کتب خانہ سے نقل کیا تھا اور 22 شوال 1022ھ مطابق 25 نومبر 1613ء کو اسے مکمّل کر لیا تھا۔ اور اس کے بقیہ حصّے سعید الدّین اصفہانی نے نقل کیے تھے۔ آئیونوو کا کہنا ہے لفظ "لاہور" بعد میں شامل کیا گیا ہے کیونکہ لفظ بہت ہی نئے خط میں لکھا ہوا ہے۔

اس کتاب کا بیان محمد قلی قطب شاہ کے دورِ حکومت کے سال اوّل میں اس واقعے سے پہلے تک جاری رہتا ہے۔ جب بادشاہ کے خُسر کو اس کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا تھا اور یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ ملک چھوڑ دے۔ لیکن لگتا یہ ہے کہ اِسے سلطان محمد قطب شاہ کے دورِ حکومت کے سال اوّل یعنی 1021ھ مطابق 1613ء میں نقل کیا گیا، اس کے پیشرو محمد قلی کے زمانے میں نہیں، حالانکہ آئیونوو یہی سمجھتے ہیں کہ اسے محمد قلی کے زمانے میں نقل کیا گیا ہے۔

وہ دوسری کتاب بھی جس کو آئیونوو نسبت نامۂ قطب شاہی (نمبر 691) کہتے ہیں "اِسی مضمون پر ہے لیکن اس کی نصف" ایک اور نظم ہے حالانکہ اس کے مصنّف کا نام "فری" اِس میں کئی جگہ آتا ہے۔

تواریخ قطب شاہی (E the ----- نمبر 1486)۔ مندرجہ بالا سطروں میں جن دو کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے یہ بھی ان ہی کی طرح کی ایک کتاب ہے اور ان ہی کی طرح اسے بھی سلطانِ وقت محمد قلی قطب شاہ کے نام معنون کیا گیا ہے۔ مصنّف جو "اپنا نام چھپاتا

Marfat.com

ہے"دس سال اس کی تالیف کے کام میں مصروف رہا۔ یہ بھی چار حصّوں میں تقسیم کی گئی ہے جن کے نام یہ ہیں:۔

حصّہ اوّل

"سلطان قلی قطب شاہ" کی پیدائش تک قطب شاہی خاندان کا شجرہ نسب۔

حصّہ دوم

"ملک سلطان قلی قطب شاہ" اور جمشید کے دورِ حکومت۔

حصّہ سوم

ابراہیم قطب شاہ کا دورِ حکومت۔

حصّہ چہارم

محمد قلی قطب شاہ کا دورِ حکومت۔

دوسری کتابوں کی طرح اس کتاب کے سرِ ورق کے مقابل کا صفحہ بھی سنہرا اور تابناک ہے۔ اس میں 137 فولیو یعنی 274 صفحات ہیں جو نفیس نستعلیق میں لکھے ہوئے ہیں۔

تواریخ قطب شاہی (سالار جنگ لائبریری، ادب، نظم فارسی، نمبر 1101) یہ کتاب بھی مندرجہ بالا تینوں کتابوں کی طرح ابتدائی قطب شاہیوں کی نظمیہ تاریخ ہے اور جیسا کہ مصنّف نے شروع میں اشارہ کیا ہے یہ محمد قلی قطب شاہ کے دورِ حکومت میں تالیف کی گئی تھی۔ اسی میں مشکل سے پچپن ورق ہیں جس کے ہر صفحے پر اکیس سطریں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ ایک حسین سنہری چمک دار کتاب ہے جو بڑی نفیس نستعلیق میں لکھی ہوئی ہے۔ اور سرورق کے مقابل کا صفحہ سنہرے خطوط میں مزین کیا گیا ہے۔ اس میں اسی سلسلہ حکومت کی تاریخ بالکل ابتدا سے دی ہوئی ہے اور بعض واقعات بڑی تفصیل سے دیئے ہوتے ہیں۔ جن میں سے بعض واقعات مصنّف کے ذخیرۂ دماغ کی پیداوار بھی ہوسکتے ہیں۔ اوراق (۵، ۹،

Marfat.com

(b) 30 اور (b) 35 پر قلمی تصویروں کے لیے خالی جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔ یہ مسودہ نامکمل ہے کیونکہ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں تحریر ہونے کے باوجود اس کا بیان 1580ء میں اس کی تخت نشینی پر ختم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسودے کے آخری چند اوراق تلف ہو چکے ہیں۔

حالانکہ یہ بات لکھی نہیں گئی ہے لیکن کتاب صریحاً چار حصّوں میں تقسیم کی گئی ہے جن میں سے ہر حصّہ حمد باری تعالیٰ سے شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح پر ہی ہر بیان ختم کیا گیا ہے۔ دوسرا بیان شروع کرنے سے پہلے "آغازِ داستان" یا کہانی کی شروعات لکھا گیا ہے۔ یہ چاروں حصّے حسب ذیل ہیں:۔

(1) کوول کونڈا کی کامیاب مہم اور بیجاپور کے اسمٰعیل عادل شاہ کی وفات تک سلطان قلی قطب الملک کا دورِ حکومت۔

(2) بیجاپور میں ملّو کی تخت نشینی سے سلطان قلی قطب الملک کے قتل تک۔

(3) "جمشید خاں" کی تخت نشینی سے شولاپور سے اس کی واپسی تک۔

(4) جمشید کی حکومت کا بقیہ دَور، سبحان کا چھوٹا درمیانی دَور اور ابراہیم کا دَورِ حکومت۔

اس کتاب میں کچھ ایسی کارآمد معلومات دی ہوئی ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتی۔ چنانچہ یہ دلچسپ واقعہ کہ جمشید اپنے شہید باپ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جاتا ہے، اپنے باپ کے قاتل کو تلاش کروا کر مُردہ دیتا ہے، اس مسئلے پر تھوڑی سی روشنی ڈالتا ہے کہ آیا جمشید خود اپنے باپ کے قتل کی سازش میں شریک تھا یا نہیں۔ اس جنگ کی بھی بعض دلچسپ تفصیلات دی گئی ہیں۔ جو جنوری 1565ء میں "دریا کرشنا کے کناروں پر" لڑی گئی۔ مسودے میں یہ اور بعض دوسرے واقعات بیان کیے گئے ہیں جو نا صرف دلچسپ ہیں بلکہ کارآمد بھی ہیں۔ جیسا کہ مندرجہ بالا سطروں میں ذکر کیا گیا ہے اس کتاب کا نام ان میں سے کسی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا ہے جو اب تک شایع ہوئی ہیں۔

Marfat.com

حصّہ سوئم

تلگو کی وہ نظمیں جن کا تعلق قطب شاہی دَور کی تاریخ سے ہے۔

۱۔ طویل نظم:

تلگومین کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو قطب شاہیوں کی محض تاریخ ہو۔ علاوہ کُتبات کے، جن سے اس مضمون کا کوئی تعلق نہیں، چند طویل نظمیں ہیں جو قطب شاہیوں کی سیاسی اور سماجی تاریخ کے بعض پہلوؤں پر کچھ روشنی ڈالتی ہیں۔ چنانچہ ادّانکی گنگادھرکوی کی تَوپاتی سمور ناموہیں سلطان قلی قطب الملک کی فتوحات کا ذکر ہے اور بحیثیت بادشاہ اس کے کردار کی تعریف کی گئی ہے۔ اس نے راجہ مندری اور سریکا کلم اوراس سے اور آگے اُڑلیسہ کی سرحدوں تک ابراہیم قطب شاہ کے حملوں کا حال بھی بیان کیاہے، اور ابراہیم کے دربار کی ایک مکمل تحریری تصویر بھی پیش کی ہے۔ اسی طرح طویل نظم چتوپادیامنی من یاری کا گمنام مصنّف قدرے تفصیل سے اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ ابراہیم تلگو کی کتنی سرپرستی کرتا تھا۔ تلگو کی تیسری اہم کتاب جس کا سماجی ڈھانچے سے تعلق نظر آتا ہے۔ یاتی چرتراموپونا گنتی یکیلنّاریاہے۔ یہ دیو مالائی نظم ہے جس میں یاتی کی کہانی ہے جو چاند سے اُترا تھا اور سارے چندرونسی اسی کی اولادیں مانے جاتے ہیں۔ یہ اتسایا خالص تلگو کی نظم ہے جس میں تتسم یا سنسکرت کا کوئی لفظ شامل نہیں ہے، اور اسے پَتن چیرو کے امین خاں کے نام معنون کیا گیا ہے۔ تاریخ کے نقطۂ نظر سے ہمیں اس کی کہانی کے مقابلے میں اس کے انتسابی تعارف سے زیادہ دلچسپی ہے۔ کیونکہ اس میں مصنّف نے امین خاں کے خاندان کے بارے میں قومی خدمت اور سفارت کے میدان میں اس خاندان کی حیثیت کے بارے میں نیز دیہی سماج کے عام ڈھانچے کے بارے میں خاصہ طویل بیان دیاہے۔ حالانکہ جن تینوں کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن کا تاریخ سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن ان کی مدد سے واقعات کے بارے میں اور خصوصاً ابتدائی

Marfat.com

قطب شاہوں کے بارے میں تلگو نقطۂ نظر معلوم ہو جاتا ہے۔

2۔ تلگو نظموں کا ایک نہایت دلچسپ مجموعہ وہ مدحیہ غنائی نظمیں ہیں جو بادشاہوں اور جاگیرداروں کے درباروں میں عموماً جمع کے وقت گائی جاتی تھیں۔ یہ ایسے بھاٹوں کی نظمیں ہیں جن کا علم اور سمجھنے کی صلاحیت بڑی مختلف ہوتی تھی، اور اسی لیے ان میں بڑا تنوع ملتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور نظمیں ویلوگوتواری و مساولی اور چکا دیواریا و مساولی ہیں جن میں متذکرہ خاندانوں کے افراد کی شجاعت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک اور کتاب راماراجوی جے۔ ایم ہے جس میں وجے نگر کے اراودو خاندان کی تعریف میں لکھی ہوئی غنائی نظمیں شامل ہیں۔ یہ سب محض خاندانی روزنامچے ہیں، اور جب لوگ قابلِ عزت ہستیوں کو دِکھانے کے لیے تعریفوں کے راگ الاپیں، تو ہمیں یہ توقع رکھنی چاہیے کہ ان کے بیانات یک طرفہ اور بعض اوقات مبالغہ آمیز ہوں گے۔ مزید یہ کہ چونکہ ان میں تاریخیں نہیں دی گئی ہیں اس لیے تاریخوں کی ترتیب اور تسلسل کے لیے ہمیں دوسرے روزنامچوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

3۔ مجموعۂ میکینیزی

ہمارے پاس دیہات کی کیفیات، جنھیں کیفیات ہی کہا جاتا ہے، بڑی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ ان کی ابتدا ڈنڈاکوائل یا محض کوائل سے ہوئی جو گاؤں کے کرنام یا افسرِ مالگزاری (پٹواری) کے پاس رہتے تھے، اور جن میں گاؤں کی سیاسی، مذہبی، سماجی اور اقتصادی حالات کے بارے میں معلومات دی ہوتی تھی، نیز روزمرہ کے ان واقعات کا حال بھی دیا ہوتا تھا جن کا تعلق اس علاقے سے ہوتا تھا۔ ہر کرنام اپنی ملازمت کے دوران ان میں اندراجات کرتا اور پھر انھیں اپنے جانشین کو سونپ دیتا تھا۔ کرنل میکینیزی نے ان سینکڑوں کوائل کی اہمیت محسوس کر کے انھیں جمع کرنے یا ان کی نقلیں کروانے کا کام شروع کیا۔ لیکن جن کرناموں اور اہلکاروں کو ان دستاویزوں کی نقل کا کام سپرد کیا گیا انھوں نے طویل بیانوں کو لفظ بہ لفظ نقل کرنا فضول سمجھا اور اپنے اپنے شوق کے مطابق ان کے خلاصے تیار کر دیتے۔ یہ وہی خلاصے ہیں جن کو

Marfat.com

"کیفیات" یا "بیانات" کہا جاتا ہے اور ان کو مجموعی طور پر "مسوداتِ میکنیری" یا "مجموعۂ میکنیزی" کہا جاتا ہے۔

یہ کیفیات "تاریخ اور دیو کہانی کا آمیزہ ہیں۔ ابتدائی دَور کے بیان میں دیو کہانی والا عنصر غالب ہے، لیکن بعد کے دَور پر اس عنصر کا غلبہ ختم ہو گیا ہے۔" اس لیے محققین کو چاہیے کہ انھیں بڑی ہوشیاری کے ساتھ استعمال کریں، خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ بعض اوقات کرنام معمولی حقائق سے بھی واقف نہیں ہوتے تھے۔ ان کیفیات میں ہمارے نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ اہم چتی ویلی، کڈپا، ہم کونڈا، کونڈا ویڈو، ننديالا، سارا، سدھاوتم (سدھوت) اور تدپاتری کی کیفیات ہیں۔

مجموعۂ میکنیزی میں رام راجنا بکھائر بھی شامل ہے جس کے بارے میں قیاس ہے کہ اس فیصلہ کن جنگ کا بیان فراہم کرتی ہے جس کو غلطی سے جنگِ تالی کوٹا کہا جاتا ہے۔ بکھائر میں اس جنگ کی بابت حیران کن اعداد و شمار ملتے ہیں دوسری باتوں کے ساتھ وہ کہتی ہے کہ "جھالنا پورا کا سمراٹھ "اکھابارا جلادین مگل پادوساہا" بھی اس جنگ میں شریک ہوا، اور بلی مچلی فوجوں میں اس کی جو فوج شامل ہوئی اس میں ڈھائی کروڑ پیدل سپاہی، ایک لاکھ ہاتھی، دو لاکھ اُونٹ، پانچ لاکھ تیر انداز، تقریباً بارہ ہزار بندوقیں اور بارہ ہزار بے سوار گھوڑے تھے۔ یہ صرف "اکھابا!" کی فوج کا حصّہ تھا۔ دوسری طرف رامارجہ کے وسائل میں 65,50,000 گھوڑے، تقریباً اُنتیس لاکھ اُونٹ، تقریباً بیس ہزار ہاتھی، 9,87,76,413 من بارود اور 9,87,65,43,21,00,000 توپ کے گولے تھے۔ ایسے ہی اعداد و شمار کی بنیاد پر جدید مورّخین میں سے ایک صفِ اوّل کے مورّخ یہ سوچتے ہیں کہ "یہ روزنامچہ ہمیں اس جنگِ عظیم کے بارے میں ہندو نقطۂ نظر بتاتا ہے اور مجاز کرتا ہے کہ اس مسئلے کی از سرِ نو جانچ کریں۔"

Marfat.com

بابر

پُشپاسُوری

بابر نے 1527ء میں لکھا تھا کہ "گیارہ برس کی عمر سے آج تک میں نے دو عیدِ رمضان ایک جگہ نہیں گزاریں۔ پچھلے سال عید پر میں آگرہ میں تھا۔ اس دستور کو قائم رکھنے کے خیال سے میں تیس تاریخ اتوار کی شب، سیکری کے لیے روانہ ہو گیا تاکہ عید کی ضیافت وہاں ہو۔[1]" یہ وہ شخص تھا جس نے کبھی مورّخ ہونے کا دعوا نہیں کیا، اور پھر بھی نہ صرف مورّخ ماننے کے لیے اس کی توزک خاصہ بڑا ثبوت سمجھی گئی، جیسا کہ لین پول کہتا ہے[2]، بلکہ بعد کے سارے مورّخین خواہ وہ ہمعصر ہوں، برطانوی ہوں یا جدید ہوں، بابر نامہ سے اس طرح استفادہ کرتے رہے ہیں جیسے بحیثیت مآخذ وہ ناگزیر ہو۔ بابر کی توزک میں جو کمیاں نظر آتی ہیں ان پر مرزا حیدر دغلت کی تاریخ رشیدی اور گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ سے کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے، لیکن خود اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ چند ایک مستثنیات[3] کے علاوہ سارے کا سارا وقت اور تنقید کی کسوٹی پر پورا اترا ہے۔ بیورج نے کہا ہے: "اس کی خود نوشت سوانح کا شمار ان انمول تحریروں میں ہوتا ہے جن کی ہر زمانے میں قدر ہوتی ہے، اور اگر اسے سینٹ آگسٹائن اور ردسو کے اعترافات نیز گبن اور نیوٹن کی توزکوں کی صف میں جگہ دی جائے تو موزوں رہے گی۔ ایشیا میں اس کی مثال شاید نہ مل سکے۔"[4] بابر خوب جانتا تھا کہ اس کا کیا رتبہ ہے۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والی نسلیں اس کی تحریروں کی جانچ پڑتال کریں گی۔ وہ لکھتا ہے: "میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ کسی کی رسوائی ہو: میں نے جو کچھ کہا ہے

Marfat.com

وہ محض سیدھی سچی حقیقت ہے۔ . . . . باتیں جس طرح رُونما ہوئی ہیں میں نے جُوں کے تُوں بتا دی ہیں۔ میں نے آج اس لمحے تک جو کچھ تحریر کیا ہے اس میں نہایت محتاط رہا ہوں تاکہ ہر لفظ سے حق بیانی ہو۔ میں نے واقعات ٹھیک اس طرح بیان کر دیے جس طرح وہ حقیقتاً رُونما ہوئے؛ لہٰذا میں نے ہر اچھا بُرا فعل، خواہ وہ فعل میرے والد کا ہو یا میرے بڑے بھائی کا، ٹھیک اسی طرح بیان کر دیا ہے جس طرح وہ واقع ہوا ہے۔ اور ہر شخص کی خواہ وہ شناسا کی ہو یا اجنبی کی؛ اچھائی یا بُرائی مکمل غیر جانبداری کے ساتھ واضح کر دی ہے۔ اس لیے قاری مجھے معاف کر دیں اور سامعین بہت زیادہ سختی سے فیصلہ نہ دیں۔"[5]

بابر کو اپنے شاہانہ ورثے پر فخر تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ تیمور کی طرح فوجی کارنامے انجام دے، اور ایک توزک تالیف کرے۔ اگر وہ ایک طرف یہ چاہتا تھا کہ واقعی بادشاہ بنے تو دوسری طرف یہ بھی چاہتا تھا کہ ہر کام جو وہ انجام دے تحریری شکل میں آجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ سارے تیموری شہزادوں سے عام طور پر یہ توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ تلوار اور قلم دونوں کو یکساں مہارت کے ساتھ استعمال کریں گے۔ اور ان سب کو ایک ہی معیار سے ناپا بھی جاتا تھا۔ بابر اپنے ایک چچا سلطان حسین بیکارا کے بارے میں لکھتا ہے: "نیمچے کے استعمال میں تیمور بیگ کی نسل کا کوئی دوسرا شخص سلطان حسین مرزا کا کبھی مقابلہ نہ کر سکا۔ اس کی طبیعت کا جھکاؤ شاعری کی طرف تھا اور اس نے ایک دیوان مرتّب کیا تھا۔ وہ ترکی زبان میں لکھتا تھا۔ اس کا شاعرانہ نام حسینی تھا۔ اس نے بہت سے شعر خاصے اچھے ہیں، لیکن اس کا پورا دیوان ایک ہی بحر میں ہے۔"[6] مرزا حیدر نے بابر کی بابت لکھا ہے کہ "ترکی زبان کی شاعری میں امیر علی شیر کے بعد اسی کا مقام تھا۔" اس نے ترکی زبان میں شاعری کی اور ایک نئی صنفِ نظم ایجاد کی جس کو موبے یان کہتے ہیں۔"

لگتا ہے کہ بابر کی عادت تھی کہ سارے واقعات قلم بند کر لیتا تھا، لیکن یہ نہیں معلوم کہ اس نے اپنی توزک کب لکھنا شروع کی۔ اس کے پہلے حصّے کو اس نے ایک نفیس ادبی اسلوب

Marfat.com

اور لطیف نثر کا جامہ پہنایا جس میں جگہ جگہ ترکی اور فارسی کے شعر تھے' لیکن بعد کا حصّہ اپنی اصل صورت یعنی بیاض کی شکل میں ہی رہ گیا۔ ایسا شاید اس بنا پر ہوا کہ اسے اس حصّے کو دوبارہ لکھنے کا موقع نہ ملا۔ ہم نے یہ نتیجہ اس کے ایک اشارے کی بنا پر نکالا ہے' اور وہ اشارہ یہ ہے کہ 1529ء میں مشرقی صوبوں سے واپس ہوتے وقت سفر میں ایک شدید طوفان اس کے اندراجات اور کاغذات اُڑا لے گیا تھا۔ "اِسی رات نمازِ تراویح کے بعد۔ ۔ ۔ ۔ موسمِ برسات کے بادل ٹوٹ پڑے اور دفعتاً باد و باراں کا طوفان آگیا' اور اتنے زور کی ہوا چلی کہ بیشتر خیمے اکھڑ گئے۔ میں اپنے خیموں کے وسطی شہ نشین میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔ طوفان اس قدر سرعت سے آیا کہ اس سے پہلے کہ میں اپنے لکھے ہوئے اوراق اور کاغذات سمیٹ پاؤں خیمہ اور اس کے چاروں طرف لگی قنات میرے اُوپر گر پڑے۔ ۔ ۔ ۔ کتابیں اور اوراق پانی میں شرابور ہو گئے' بڑی مشکل سے انھیں اِکٹھا کیا گیا اور سُرخ رنگ کے اُونی بستر پوش میں لپیٹ کر تختِ شاہی پر رکھ دیا گیا' جس پر قالین پڑے ہوئے تھے۔ طوفان دو گھڑی میں اُتر گیا۔ ہم نے۔ ۔ ۔ ۔ بڑی مشکل سے آگ جلائی اور صبح تک جاگتے رہے کیونکہ ساری رات اوراق اور کاغذات کو سُکھاتے رہے[7]۔"

بابر نے اپنی توزک میں جو تاریخی حقائق بیان کیے ہیں ان میں اس کی رائے' اس کے جذبات' اس کے فیصلے اور اس کا فلسفۂ حیات اس قدر شامل ہے کہ دونوں کا علاحدہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس کے مشاہدات پر اس کے رُجحانات کا رنگ چڑھا ہوا ہے' اور جب ہم اس کی توزک پڑھتے ہیں تو لگتا ہے کہ ہم اس کے ساتھ رہ رہے ہیں' اس کے ساتھ سوچ رہے ہیں' اسی ہیجانی رفتار سے حرکت کر رہے ہیں جو اس کا خاصہ تھی اور اُسی کی طرح اِردگرد کے حالات پر غور کرنے کے لیے ٹھہر بھی جاتے ہیں۔ بابر نے تاریخ میں جغرافیہ کا عمیق علم بھی شامل کر دیا ہے۔ اس علم کا تاریخی واقعات سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ اور اسی کی مدد اُسے مخصوص مقامات پر رہنے والے لوگوں کے وسائل' آب و ہوا اور عادات کا اندازہ لگانے میں مدد ملی۔ اس کے کہنے کے مطابق "فرغانہ آب و ہوا کے لحاظ سے پانچویں خطّے میں واقع ہے۔ ۔ ۔ ۔ فرغانہ ایک ایسا

Marfat.com

ملک ہے جس کا رقبہ بہت کم ہے لیکن اناج اور پھل کثرت سے ہوتے ہیں[8]"۔ یہی معاملہ سمرقند کا تھا۔ یہ خوشگوار مقام '37 °39 عرض البلد اور '16 °90 طول البلد پر پانچویں خطۂ آب و ہوا میں واقع تھا۔ لیکن بابر نے اتنی معلومات پر ہی اکتفا نہیں کیا، کیونکہ اس کا ذہن ریاضی داں کا سا تھا اور وہ پیمائش کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ "میں نے ہدایت دی کہ شہر پناہ کے چاروں طرف چل کر دیوار کو قدموں سے ناپا جائے اور یہ معلوم ہوا کہ اس کا محیط دس ہزار چھ سو قدم تھا"[9] اس کے بعد وہاں کے لوگوں کے بارے میں لکھتا ہے "وہاں کے سارے باشندے راسخ العقیدہ سنّی، پابندِ شریعت اور مذہبی ہیں۔" اور اس کے بعد وہ ماورالنہر کے ممتاز علمائے دین کا حال بیان کرتا ہے۔ پھر وہ اس کی حدود دریاؤں، پھلوں، سرکاری عمارتوں، بازاروں، نانبائیوں اور خانساماؤں پر آتا ہے۔ اور آخر میں کہتا ہے کہ "سمرقند میں دُنیا کا بہترین کاغذ تیار ہوتا ہے . . . . سمرقند میں ایک اور چیز کرمیزی (قرمزی مخمل) تیار کی جاتی ہے۔ جو ہر جگہ برآمد کی جاتی ہے۔"[10] مرغزاروں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ اِسے آرزو رہتی تھی کہ گھوڑے سے اُتر کر کسی مرغزار میں بہتے ہوئے چشمے کے کنارے ذرا دیر آرام کرے۔ یوریت خاں ایسا ہی ایک مرغزار تھا۔ "یوریت خاں کے چاروں طرف دریا اس انداز سے گھومتا ہے کہ درمیان میں اتنی بڑی جگہ بچ جاتی ہے جس میں ایک پوری فوج خیمہ زن ہو سکتی ہے . . . . ایسا عمدہ مقام نظر آیا تو محاصرے کے دوران کچھ عرصے کے لیے میں یہیں خیمہ زن ہو گیا۔"[11] وہ صوبوں اور تومانوں کی تفصیلات دے کر اپنے اس ناظری بیان کو مکمل کر دیتا ہے۔ کیا یہ جدید گزیٹیر سے ملتا جلتا بیان نہیں ہے؟ اُس کے صفحات سے ہر طرح کی معلومات اکٹھی کی جا سکتی ہے۔ جب وہ کابل جاتا ہے تو پھر خوش بیانی سے کام لیتا ہے، اور کہتا ہے "آپ کابل سے ایک دن میں ایسی جگہ جا سکتے ہیں جہاں کبھی برف باری نہیں ہوتی، اور دو فلکی ساعتوں (دو گھنٹوں) کے عرصے میں ایسے مقام پر پہنچ سکتے ہیں۔ جہاں ہمیشہ برف رہتی ہے . . . ."[12] اور پھر حسبِ معمول اس مقام کا، وہاں کے جانوروں، پھلوں اور پرندوں کا ذکر نیز مچھلی اور آبی

Marfat.com

اور پرندے پکڑنے کے طریقوں کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔

پھر وہ ہندوستان کی طرف بڑھا۔ اس کی حیثیت کا شخص کابل کی بادشاہت پر قناعت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بادشاہت اس لقب بادشاہ کو بھی حق بہ جانب ثابت نہ کر سکتی تھی، جس کے حصول کے لیے وہ اپنی زندگی، اپنا یقین اور اپنا عقیدہ داؤں پر لگاتا رہا تھا۔ اس کا نصب العین ایک طرف تو بادشاہوں کا بادشاہ بننا تھا اور دوسری طرف اپنے خاندانی ورثے کا محافظ بننا تھا۔ ازبکوں اور ایرانیوں نے اسے اسی کے لوگوں کی سرزمین میں دونوں باتوں سے محروم کر دیا تھا۔ بدخشاں اس کی فیاضی کی نظر ہو گیا تھا، جیسے اس نے شاہ بیگم کے نواسے کے حوالے کر دیا تھا۔ تاریخ کے علم نے ضرور اس کی توجہ ہندوستان کے ان میدانی علاقوں کی طرف مبذول کرائی ہوگی، جن کو کبھی تیمور نے فتح کیا تھا اور شاہ نامہ کا یہ طالب علم اس ملک میں داخل ہونے کے لیے، جو اس کے اقتصادی اور سیاسی خوابوں کی تعبیر بن سکتا تھا، اب ان افغانوں کی رکاوٹیں پار کر چکا تھا جن کے بارے میں وہ یہ کہتا ہے کہ "اشتعال انگیز حد تک غیر مہذب اور احمق ہیں"۔[13] وہ اپنی توزک میں یوں غور کرتا نظر آتا ہے "سلطان محمود نے جب ہندوستان فتح کیا تو وہ خراسان کے تخت پر متمکن تھا، اور سلاطین خوارزم نیز اطراف و جوانب کے سردار (ماوراالنہر) مکمل طور پر اس کے زیر اثر اور اس کے قبضے میں تھے۔ سمرقند کا بادشاہ اس کا مطیع تھا"۔[14] جب بابر بادشاہ بنا تو وہ واقعی خوشی سے پھول گیا۔ "میں نہیں کہتا کہ اس کامیابی کا سبب خود میری قوت ہے، اور نہ یہ خوش قسمتی میری کوششوں کا نتیجہ ہے اس کا سرچشمہ تو خدا ہے جو رحمان اور رحیم ہے"۔[15]

پانی پت فتح کرنے کے بعد اس نے ہندوستان کی اندرونی کمزوریوں پر غور کیا۔ "اس دور میں پورا ہندوستان کسی ایک شہنشاہ کے تابع نہ تھا۔ اپنی چھوٹی سی عملداری میں ہر راجہ بزعم خود بادشاہ بن بیٹھا تھا"۔[16] وہ مسلم اور غیر مسلم، ہر طرح کی معمولی سلطنتوں پر غور و خوض کرنے کے بعد پھر اپنے مرغوب موضوع یعنی ملک کے جغرافیہ پر آجاتا ہے۔ "ہندوستان آب و ہوا

Marfat.com

کے لحاظ سے پہلے، دوسرے اور تیسرے خطّے میں واقع ہے۔ اس کا کوئی حصہ چوتھے خطّے میں نہیں ہے۔ . . . . اس کے پہاڑ اور دریا، اس کے جنگلات اور میدان، اس کے حیوانات اور نباتات، اس کے باشندے اور زبانیں، اس کے باد و باراں، سب ہی مختلف انداز کے ہیں۔"[17]

ہندوستان کے میدانی علاقے بابر کے اس ذوقِ جمال کی تسکین نہ کر سکے جس کی جڑیں اس کی شخصیت میں گہری جا چکی تھیں۔ اس نے ہمیشہ قدرت کی وہ پاکیزہ مسرتیں حاصل کرنے کی کوشش کی، جنھوں نے ذہنی پریشانی کے عالم میں ہمیشہ اُسے سکون بخشا۔ دریائے گنگا کا وسیع میدانی خطّہ اُسے ایسی کوئی مسرت نہ دے سکا۔ اس نے اس دائمی مسئلے کا ذکر کیا ہے کہ یہاں کے لوگ ٹیکس ادا کرنے کے لیے کبھی خود سے آمادہ نہ رہتے تھے، اور موقع ملنے پر بغاوت کر دیتے تھے۔[18] شہروں کی بابت اس کا یہ مشاہدہ کہ ایک یا ڈیڑھ دن میں سارا شہر خالی ہو جاتا تھا، لوگوں کے معیارِ زندگی کا پتہ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عوام کے پاس باندھ کر چل دینے کے لیے کچھ زیادہ سامان نہیں ہوتا تھا۔ وہ جسم ڈھاکنے کے لیے زیادہ کپڑے استعمال نہیں کرتے تھے۔ وہ لکھتا ہے "یہاں کے کاشتکار اور نیچے طبقوں کے سارے لوگ ننگے رہتے ہیں۔ وہ ایک چیز لپیٹتے ہیں جسے لنگوٹی کہتے ہیں۔ . . . . عورتیں بھی ایک لانگ لپیٹتی ہیں ـــــ اس کا ایک سرا وہ اپنی کمر کے گرد باندھ لیتی ہیں اور دوسرا سر پر ڈال لیتی ہیں۔"[19] امیر آدمیوں کی تعداد یقیناً بہت کم رہی ہوگی۔ امرا سپاہیوں کی مدد سے لڑائیاں لڑتے تھے اور زمیندار منحرف کسانوں کی فوج کے ساتھ اپنے مٹی کے قلعوں میں رہتے تھے۔ اور اگر کوئی فرمارروا اتنا مضبوط ہوتا کہ ان لوگوں پر قابو پا سکے تو اِسے اُن کو ایک ایک کرکے زیر کرنا پڑتا تھا، ورنہ یہ لوگ فرمارروا کے لیے ایک کھلی ہوئی چنوتی ہوتے تھے۔ اور اُس کا اقتدار گھٹا کر اپنی طاقت بڑھاتے رہتے تھے۔ "اس ملک کے سپاہی اور کاشتکار میرے آدمیوں سے ڈر کر بھاگ گئے۔ اس کے بعد صرف دہلی اور آگرہ کے علاوہ، ہر مقام پر باشندوں نے جگہ جگہ مورچے بنا لیے، اور شہروں میں صوبیدار دفاعی انداز میں قلعہ بند ہو گئے۔ اور اطاعت

Marfat.com

اختیار کرنے یا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔[20]

ہندوستانی سماج ذات پات پر مبنی تھا۔ اور ذاتوں کے کسی قسم کے سماجی تعلقات قائم نہیں ہو سکتے تھے لیکن ذاتوں کے اس نظام کی پیچیدگی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ شخص جو اپنے باپ کی مے نوشی کی صحبتیں دیکھنے کا عادی رہا ہو تقریبات کے موقعوں پر خانوں کو جمع ہوتے اور اظہارِ دوستی کرتے دیکھتا رہا ہو، اور جو خود بھی اس طرح کی دعوتیں کرتا رہا ہو، سوائے اس کے اور کیا کر سکتا تھا کہ بیٹھ جائے اور غور کرے کہ اس کا سبب کیا ہے، اور پھر اپنے نتیجے کو یوں بیان کرے کہ ہندوستان کے لوگ "جانتے ہی نہیں کہ دوستانہ ماحول، بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملنا جلنا یا بے تکلف تعلقات کتنے دلفریب ہوتے ہیں"۔[21] ذات پات کے اس نظام کے بارے میں یا اس نظام کو وہ جو کچھ بھی سمجھتا رہا ہو اس کے بارے میں اس نے محض ایک ہی اچھی بات کہی اور وہ یہ کہ کام کے آدمیوں کی بہتات تھی۔ "ہر پیشے کے بے شمار اور لاتعداد کاریگر اور دستکار موجود ہیں۔ کسی بھی کام یا روزگار کے لیے ایسے افراد کی ایک پوری جماعت مل جاتی ہے جو نسل بعد نسل مدتوں سے اسی پیشے یا کام میں مصروف ہیں"۔[22] اس نے یہ کہہ کر انتظامی پہلو کا بھی ذکر کیا ہے بھیرا سے بہار تک سارے ممالک باون کروڑ مالگذاری وصول ہوتی تھی، جیسا کہ اس مخصوص اور تفصیلی بیان سے ظاہر ہوگا جو اس سلسلے میں دیا گیا ہے"۔[23] اس نے ہر پرگنے کی مالگزاری بھی دی ہے، لیکن بابر اپنی ساری زندگی اتنا بہترین سپاہی رہا کہ اچھا منتظم مالگزاری نہ بن سکا۔ اور ہمیں کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس نے مالگزاری کا کوئی مستقل بندوبست بھی کیا تھا۔ وہ اس حقیقت سے خوب واقف تھا کہ ہندوستان کے بارے میں اس کا بیان حرفِ آخر نہیں ہو سکتا۔ اس نے وہ سب کچھ لکھ دیا جو اس کے علم میں آیا اور جس کی وہ تصدیق کر سکا۔ وہ مزید یہ لکھتا ہے کہ "آئندہ اگر مجھے کوئی ایسی چیز نظر آئی جو لائق بیان ہو تو ضرور لکھوں گا، اور اگر میں نے کوئی ایسی بات سنی جو دہرانے کے لائق ہو، تو اسے شامل بیان کروں گا"۔[24]

Marfat.com

ہوسکتا ہے بابر نے اسلام کے بعض قوانین نظر انداز کیے ہوں یا ان کی خلاف ورزی کی ہو، ورنہ حقیقتاً وہ ایک نہایت مذہبی انسان تھا۔ اسے یہ رویہ اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ "وہ پابندی سے پانچوں وقت نماز ادا کرتے تھے اور تمام عمر انھوں نے قضائے عمری (ایام طفلی میں یا کبھی بعد میں چھوڑی ہوئی نمازوں، روزوں کے عوض نماز پڑھنا اور روزے رکھنا) بھی ادا کی۔ وہ اپنا بہت کچھ وقت تلاوت قرآن پاک پر صرف کرتے تھے۔ انھیں اپنے مُرشد خواجہ عبیداللہ سے بڑی عقیدت تھی، اور اُن کی صحبت کے وہ بڑے متلاشی رہتے تھے۔"[25] اس کے کردار میں فکرِ اسلامی کے دو رُجحانات بڑے نمایاں تھے۔ وہ مقررہ انداز میں نمازیں ادا کرنے کا بڑی سختی سے پابند رہتا، اور کوئی بہت بڑی بیماری ہی اُسے فرائض اسلام کی ادائیگی سے روک سکتی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ "سردی بڑے زوروں پر تھی، اور چار درویش کی تند ہوا کا زور ابھی کم نہ ہوا تھا، بلکہ اور تیز.... طہارتِ مذہبی کی رو سے مجھ پر غُسل واجب ہو گیا تھا، اور اسی مقصد سے میں ایک چشمے پر پہنچا جس کا پانی کناروں پر تو جم گیا تھا لیکن بہاؤ کی تیزی کی وجہ سے درمیان میں موجود تھا۔ میں نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور سولہ دفعہ غوطے لگائے۔ پانی کی شدید ٹھنڈک اندر تک گُھس گئی۔"[26] ہندوستان آتے وقت جب وہ بدعتی قلندر شہباز کے مزار کے نزدیک پہنچا، جو کوہ مُقام پر واقع تھا، تو اس نے دو پل بھی سوچے بغیر اُسے مسمار کرنے کا حُکم دے دیا۔[27] دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی بیماری سے جلد شفایاب ہونے کی امید پر وہ خواجہ عبیداللہ احرار کے رسالۂ والدیہ کا ترجمہ کرتا ہے۔[28] لیکن وہ ناسمجھی کی حد تک ضعیف الاعتقاد نہ تھا اور اس بات میں یقین کرتا تھا کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سخت کوشش کرنی چاہیے۔ اس نے اپنے خط میں ہمایوں کو یہ قطعہ لکھا تھا۔

Marfat.com

توصلے جمود کے مخالف ہوتے ہیں
یہ دُنیا اس کی ہے جو سخت کوشش کرتا ہے
بادشاہ کے علاوہ ہر چشمِ دانا
ہر حالت سے مطمئن ہو جاتی ہے

عمل پیہم یقین محکم اس کا فلسفۂ حیات تھا۔ وہ کسی مخصوص صورتِ حال کے پیشِ نظر اعلانِ جہاد کر کے انسانی کھوپڑیوں کے مینار بھی بنا سکتا تھا، یا ہندو مندروں کو چھوئے بغیر یونہی گزر سکتا تھا۔

بابر، وہ عظیم مغل، نہ ہندوستان کو کبھی اپنا وطن سمجھ سکتا تھا اور نہ ہندوستانیوں کو اپنے لوگ۔ سمرقند، اس کا گلستانِ محل، محل کے مینار جن کا عکس نہر کے پانی پر پڑ رہا ہے، یہ اس کا وہ خواب تھا جو ہندوستان میں شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکتا تھا۔ جب اُس نے آگرہ میں ایک محل اور ایک باغ بنانا چاہا تو اُسے لگا کہ یہ ساری جگہ "بدنما اور قابلِ نفرت ہے۔"[30] بہرحال، وہ جو کچھ بنانا چاہتا تھا اُسے پورا کر دیا، حالانکہ اسے جس طریقے سے بنایا گیا وہ اس کے معیار پر پورا نہ اُترا "اس صورت سے، ہندوانداز میں، قرینے اور نفاست کا خیال رکھے بغیر، میں نے بہرصورت باغات اور عمارتیں تیار کروائیں جو خاصی سڈول تھیں ..... میں نے ہر باغ میں گلاب اور نرگس ترتیب سے لگوائے اور یہ پودے ایسی کیاریوں میں اُگوائے جو ایک دوسرے کے برابر تھیں۔"[31] وہ آخری دم تک واپسی کا خواہش مند رہا۔ اس نے 11 رفروری 1529ء کو خواجہ کلاں کو لکھا "جیسے ہی یہ معاملات اس حالت پر پہنچے (یعنی، پورے طور سے طے ہوئے) تو انشاء اللہ ایک لمحہ وقت ضائع کیے بغیر تمہاری سمت روانہ ہو جاؤں گا۔ اس سرزمین کی مسرّتیں کیا کبھی اس دل سے مٹ سکتی ہیں؟ ..... ابھی چند دن پہلے وہ میرے لیے ایک مشکیں خربوزہ لائے۔ اسے کاٹتے وقت میرے اندر شدید تنہائی اور اپنے اصلی وطن سے جلاوطن ہونے کا احساس جاگ اُٹھا اور اسے کھاتے وقت

Marfat.com

میں اپنے آنسو نہ روک سکا۔"[32] ہندوستان کا کوئی پھل مشکیں خربوزے کے معیار تک نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس نے لکھا "بہت سے لوگ آم کی اتنی زیادہ تعریف کرتے ہیں گویا اسے مشکیں خربوزے کے علاوہ ہر قسم کے پھلوں پر فوقیت حاصل ہو۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ اتنی زیادہ تعریف بجا نہیں ہے۔"[33] لیکن بابر کے پڑپوتے جہانگیر نے جو ہمیشہ ہندوستان سے ہی وابستہ رہا تھا، کابل میں یہ مشاہدہ کیا تھا کہ "کابل کے پھل لاکھ خوش ذائقہ صحیح، لیکن مجھے ایک بھی پھل آم جیسا خوش ذائقہ نہ معلوم ہوا۔"[34] بابر کے جانشینوں نے جہانگیر کے دَور سے بہت پہلے ہی ہندوستان کو اپنا وطن سمجھ لیا تھا، اور انھیں اپنی آبائی سرزمین میں دوبارہ جا بسنے کا خیال بھی نہ آتا تھا، پھر بھی، ہر شہزادے اور ہر بادشاہِ وقت کے لیے بابر ایک مثال بنا رہا اور ان کی شدید خواہش رہی کہ قولاً اور فعلاً اس کی تقلید کریں۔

Marfat.com

حوالہ جات

1. Memoirs of Zahir-ed-Din Mohammed Babar
tr. Leyden and Erskine (London 1921) Vol. II,
pp. 316 — 317 مندرجہ بالا کتاب کو اب جب کبھی حوالے کے طور پر پیش کیا گیا
تو صرف Memoirs لکھا جائے گا۔

2. Stanley Lane-Poole, Rulers of India
Babar, p. 13.

3. اس ضمن میں سب سے زیادہ اہم وہ رویّہ ہے جو اس نے شیبانی کے بارے میں
اختیار کیا، اور اس حقیقت کی پردہ پوشی کی کہ اسے اپنی بہن کو اسی خوفناک حریف کے
سپرد کرنا پڑا تھا۔ صفحہ

4. H. Beveridge, Calcutta Review, 1897.

5. Memoirs Vol. II, pp 32—33.

6. ایضاً Vol. I صفحہ 288

7. ایضاً Vol. II صفحات 408 — 409

8. ایضاً Vol. I صفحہ 1

9. ایضاً صفحہ 78

Marfat.com

10۔ ایضاً صفحہ 83

11۔ ایضاً صفحہ 84

12۔ ایضاً صفحہ 220

13۔ ایضاً Vol.II صفحہ 178

14۔ ایضاً صفحہ 193

15۔ ایضاً صفحہ 195

16۔ ایضاً صفحہ 194

17۔ ایضاً صفحہ 201

18۔ ایضاً صفحہ 208

19۔ ایضاً صفحہ 242

20۔ ایضاً صفحہ 247

21۔ ایضاً صفحہ 248

22۔ ایضاً صفحہ 241

23۔ ایضاً صفحہ 244

24۔ ایضاً II صفحہ 245

25۔ ایضاً I صفحہ 11

26۔ ایضاً I صفحہ 161

27۔ ایضاً Vol.II صفحہ 90

28۔ ایضاً صفحہ 347

29۔ ایضاً صفحہ 352

30۔ ایضاً صفحہ 257

Marfat.com

31. ایضاً صفحات 58–257

32. ایضاً صفحہ 372

33. ایضاً صفحہ 225

34. Memoirs of Jahangir, Vol. I, p. 116.

Marfat.com

بدایونی

محمد مجیب

بدایونی اپنی کتاب کے مختصر تعارفی بیان میں کہتا ہے کہ "مجھے ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں جو شریعت کے پابند نہیں اور جزوی نیز اصولی طور سے اس کے منکر ہیں، کیونکہ یہ لوگ اس کے مستحق نہیں کہ انھیں اس صورت سے مخاطب کیا جائے۔ وہ اس لائق نہیں کہ انھیں معتبر، صاحب نظر اور معاملہ فہم لوگوں میں شمار کیا جائے۔"[2] اس سے ذرا پہلے اس نے یہ لکھا ہے کہ "ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے۔ . . . کہ علم کی اس شاخ — یعنی تاریخ — کا مطالعہ و تحقیق، ان ضعیف العقیدہ لوگوں کے لیے جو شک و شبہ میں مبتلا رہتے ہیں، ممتاز شریعتِ محمدی کے سیدھے راستے سے گمراہ ہو جانے کا سبب بنتا رہا ہے۔ اسی علم کی وجہ سے اس طرح کے لوگ مختلف نظریات قائم کر لیتے ہیں اور بدعت و تشکک کے مبہم طریقے اپنا لیتے ہیں۔ اور اسی بنا پر یہ علم سرچشمۂ مایوسی بن گیا ہے۔ ایسے لوگ جو فطرتاً ایمان کی طرف مائل نہیں ہوتے وہ اور زیادہ شدت اختیار کر لیتے ہیں اور مستقل شبہ میں گرفتار رہنے لگے ہیں، (حتیٰ کہ) کلام الٰہی پڑھتے وقت بھی شک میں مبتلا رہتے ہیں۔ . . . ایسے لوگ کس طرح تاریخ کا صحیح علم حاصل کر سکتے ہیں؟"[3]

تو سوال یہ پیدا ہوتا کہ بدایونی نے لکھا ہی کیوں؟ تاریخ اتنی اہم چیز ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ "علم کی اس شاخ کی قدر و قیمت سے کوئی کس طرح قطعاً انکار کر سکتا ہے، جو ہفت سبع (مراد پورے قرآن سے) کا ساتواں حصہ ہے، اور جس کی بنیاد پر ایمان اور یقین کو

Marfat.com

قوت ملتی ہے؟" "تاریخ بذات خود علم کی ایک شاخ اور ایک نفیس فن ہے کیونکہ ان لوگوں سے لیے جو واقف کار ہیں یہ تنبیہ کا ایک وسیلہ ہے اور ان لوگوں کے لیے جو ذہین اور صاحب نظر ہیں یہ تجربے کا ایک ذریعہ ہے۔"[4] اور بہر حال ہر شخص مائل بہ خطا نہیں ہوتا۔ اسی لیے بدایونی نے یہ کہا کہ "میں اُن لوگوں سے مخاطب ہوں جو صحیح المزاج اور زود فہم ہیں اور جو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کے عادی ہیں۔"[5] اور یہ کہہ کر وہ جو کچھ لکھنا چاہتا تھا اور جس طرح لکھنا چاہتا تھا اس کی ابتدا کر دی۔

وہ اپنے زمانے کے اعتبار سے واقعی بڑا خوش نصیب تھا۔ وہ 1540ء میں پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مہدی قائدوں کی قسمت کا فیصلہ کیا جا رہا تھا، اور کوئی طالب علم علما کے درمیان پیدا ہو جانے والے اس گہرے شگاف سے واقف ہوئے بنا مشکل ہی سے تعلیم حاصل کر پاتا تھا، جو شگاف سید محمد جونپوری کی تعلیمات اور ان تعلیمات کی مخالفت کرنے والی ہستیوں اور عقیدوں سے متاثر ہونے والے مختلف گروہوں کے سبب پڑ گیا تھا صوفیوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو دولت مند اور بااثر تھے اور ایسے لوگ بھی تھے جو دولت اور شہرت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اور دونوں طرح کے صوفیوں کے چاہنے اور ماننے والے موجود تھے۔ افغانوں اور مغلوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش نے بہتوں کی وفاداری کا امتحان لیا، اور یقیناً بہت سے لوگوں نے خود وفاداری کی ماہیت اور افادیت پر غور کیا۔ اور آخر کار، عین ان دنوں جب بدایونی اپنی تعلیم مکمل کر چکا تھا اور اس قدر پختہ ذہن ہو گیا تھا کہ کوئی ادبی کام کر سکے، تو اکبر کا ذہنی تجسس بھی تسکین کے لیے بیتاب ہو چکا تھا اور وہ اشخاص خیالات اور کتابیں جمع کر رہا تھا۔ جب بدایونی سرکاری عہدیداروں کے خاندانوں میں مطلوبہ آزمائشی مدت گزار چکا تو جمال خاں قرچی اور حکیم عین الملک نے اسے اکبر کے رو برو پیش کیا۔ تقریباً اسی زمانے میں ابوالفضل بھی دربار شاہی میں پہنچا تھا۔ شیخ عبدالنبی صدر تھا، اور اکبر ان کے اور دوسرے علما کے غلبے سے پریشان رہتا تھا۔ بدایونی کہتا ہے

Marfat.com

"چونکہ علم ایک ایسی جنس تھی جس کی بڑی مانگ تھی اس لیے جونہی میں وہاں (بادشاہ کے رُوبرو) پہنچا (عالی جاہ سے) گفتگو کا شرف حاصل ہوگیا۔ مجھے ارکانِ مجلس میں شامل کرکے اس بحث میں حصہ لینے کے لیے کہا گیا جو علما کے درمیان ہو رہی تھی، اور جس بحث میں علما کسی کو خاطر میں لائے بغیر اپنے علم فضل کی ڈینگیں مار رہے تھے۔ . . . . اللہ کے فضل سے اپنی ذہنی صلاحیت، تیز فہمی اور اس جرأت کی بنا پر جو نوجوانی کا خاصہ ہوتی ہے، میں اکثر ان پر سبقت لے گیا۔"[6] اس کے بعد سے بدایونی گھمسان کی جنگ میں شامل ہوگیا۔ وہی شریعت کی حمایت میں لڑ رہا تھا اور جو بھی زخمی ہوتا وہی اس کا دشمن تھا! اکبر، فیضی، ابوالفضل، سارے دانشور، سارے کافر، سارے مردود شیعہ، سارے کٹر سُنّی، سارے بہروپیے۔ کیا کوئی شخص اس بہتر شکار گاہ اور انواع و اقسام کے اتنے بہت سے شکاروں سے زیادہ کی خواہش کرسکتا تھا؟

لیکن ہمیں اس کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی تعلیم ایسے اشخاص کے ہاتھوں ہوئی جیسے سنبھل کے میاں حاتم، جو خواہ ہمارے تصور کے آزاد خیال شخص سے میل نہ کھاتے ہوں، دوسروں کی بھلائی چاہتے تھے اور تعصب نیز عالموں کی خود پسندی سے آزاد تھے۔ یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ اس نے فیضی اور ابوالفضل کے والد اور مہدویوں کے حامی، شیخ مبارک ناگوری سے بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے والد صوفیوں اور درویشوں سے ملنے جاتے تو اسے ساتھ لے جاتے اور اس طرح اس کے اندر حرمت کے احترام کا رُجحان بنا دیا تھا۔ وہ علم دین اور فقہ کا اتنا عالم تھا کہ علما سے مقابلہ کرسکتا تھا اور ان ہی کی دلیلوں سے انھیں ہرا سکتا تھا۔ دراصل اکبر اس کی ادبی لیاقت اور دربار کے علما کے خلاف اس کی کامیاب دلیلوں کے سبب ہی اس پر مہربان ہوا۔ اس نے لڑائی میں شامل ہونے کا ارادہ کرلیا کیونکہ وہ ان علما کی خود پسندی، تعصب، ذہنی بھونڈے پن اور ناقص طور و طریق سے ناراض تھا۔ اس نے مولانا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اور اس سے کہیں زیادہ ہمدردی کے ساتھ ہدوی قائدین، میاں

Marfat.com

عبداللہ نیازی اور شیخ علائی کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے، اس سے ہمیں یقین کلی ہو جانا چاہیے کہ وہ راسخ العقیدہ تو تھا، لیکن بے حس اور تنگ نظر نہ تھا۔ وہ ان مکاروں کے بارے میں بڑے طنز اور حقارت کے ساتھ لکھتا ہے جو صوفیائے کرام کی نیک نامی سے فائدہ اُٹھانے کی خاطر صوفی بن بیٹھتے تاکہ بادشاہ اور درباریوں کی عنایات حاصل ہو جائیں۔ وہ ان صوفیوں کو بالکل خاطر میں نہیں لاتا جنھوں نے مال و دولت اکٹھی کر لی تھی۔ لیکن وہ ان صوفیوں کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں کہتا جن کی زندگی اور برتاؤ کھلے طور پر ایک خاص مزاج کے غماز تھے اور اس مزاجِ ظاہری کی بنا پر انھیں بہ آسانی بدعتی کہا جا سکتا تھا۔ وہ شیخ مبارک ناگوری کے بارے میں ہمیشہ تعظیم کے ساتھ لکھتا ہے، حالانکہ شیخ ہی نے پہلے پہل یہ خیال پیش کیا تھا کہ امامِ عادل علما سے برتر ہے اور انھوں نے خود ہی یہ فتوا تحریر کیا تھا، نہ صرف یہ، بلکہ شیخ ہی نے ایک موقع پر شہنشاہ کی موجودگی میں بیربل سے ـــــ جسے بدایونی سخت ناپسند کرتا تھا ـــــ یہ کہا تھا کہ ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں اضافے کیے گئے ہیں اور ہمارے مذہب کی (اسلام کی) نشوونما کے دوران بہت سی زائد چیزیں بھی شامل ہو گئی ہیں، اور کسی چیز پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔[7] اس نے شیخ کی تاریخِ وفات "شیخ کامل"[8] سے نکالی جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے آخر دم تک ان کی تعظیم کرتا رہا۔

بدایونی کو اپنی ادبی لیاقت اور قوتِ مناظرہ پر خاصہ فخر ہے، لیکن اپنی پارسائی کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ اس کا خود کو بار بار گنہگار کہنا یہ سمجھ کر رد کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب محض رسمیات ہیں، لیکن وہ اپنی معصیت کی اہمیت کم کیے بغیر، اس واقعے کا ذکر بھی کر دیتا ہے جب ایک غلط عورت سے غلط مقام پر پیار و محبت کرتے وقت فسادیوں نے اسے زخمی کر دیا تھا، اور ہو سکتا تھا کہ جان سے مار دیتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا احساسِ صداقت بگڑا ہوا ہے، تو اس بگاڑ کا اثر جتنا دوسروں پر پڑا ہے اتنا ہی خود اس پر پڑا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ اس بات سے واقف تھا کہ جہاں دوسروں میں عیب ہیں وہاں وہ

Marfat.com

دلیر اور دو ٹوک بات کرنے والا ہے اور اپنے ایذا رسانی کے جذبے کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔

پھر ایسا کیوں ہوا کہ اکبر اور بدایونی نے ایک دوسرے کے بارے میں اپنی رائے بدل دی، اور جہاں اکبر کو یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ بدایونی دراصل اندر سے کٹر مذہبی ہے، وہاں بدایونی شدت اور بغض کے ساتھ اکبر، اس کے خیالات اور اس کی پالیسیوں پر تنقید کرنے لگا۔ بدایونی بیان کرتا ہے کہ اکبر نے ایک دفعہ اسے اپنے سامنے بلایا اور ابوالفضل سے کہا: ”میں سوچتا تھا کہ یہ نوجوان فنا کی منزل پر پہنچ چکا ہے اور صوفیوں کے نقشِ قدم پر گامزن ہے، لیکن یہ تو ایسا کٹر عالم دین نکلا کہ اس کے کٹرپن کی شہ رگ کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی۔“[9] اکبر ایک شعر کا مفہوم غلط سمجھا جو بدایونی نے مہابھارت کے ایک ترجمے میں شامل کر دیا تھا، اور بدایونی، ابوالفضل کی مدد سے اپنا نقطۂ نظر واضح کر سکا۔ لیکن اکبر کو جو شک پیدا ہو گیا تھا اس سے ایسا ظاہر ہوتا ہے، اور بدایونی برابر اس کی تصدیق کرتا ہے، کہ خود اس کا رویہ قدرے سخت ہو گیا تھا، اور خواہ عملاً نہ سہی لیکن اصولاً وہ اس کے لیے تیار نہ تھا کہ اپنے مسلمان درباریوں اور مصاحبوں کو عقیدے کے معاملے میں زیادہ آزادی دے۔ لہٰذا، اکبر کے مصاحبین اور اس کی مذہبی اصلاحات پر بدایونی نے جو سخت تنقید کی ہے اسے ہمیں یہ سمجھ کر رد نہیں کرنا چاہیے کہ اس کی وجہ بدایونی کا مذہبی کٹرپن، احسان فراموشی یا محض خود سری تھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ بدایونی شیخ عبدالنبی، مولانا عبداللہ سلطان پوری اور عام طور پر ان سارے علما کے بارے میں کیا رائے رکھتا تھا جو اکبر یا اسلام شاہ کے دربار میں اکثر حاضر رہا کرتے تھے۔ لیکن کیا یہ سبب سارے علما کی مذمت کرنے اور علم دین کے مطالعے کی افادیت سے منکر ہو جانے کے لیے کافی تھا؟ کیا یہ سبب اس قدر معقول تھا کہ شریعت سے منہ موڑ لیا جائے؟ اگر کچھ مخصوص علما کے رویے اور برتاؤ کو سارے علما کے خلاف دلیل کے طور پر پیش

Marfat.com

کیا جا سکتا تھا، تو درباریوں کے بارے میں، اور خصوصاً ان درباریوں کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جو اکبر کے نزدیک تھے؟ بدایونی یہ سوچ سکتا تھا کہ وہ نرم برتاؤ کے مستحق نہیں، اور اگر دونوں کے عیوب کا موازنہ کیا جائے، تو وہ سرکاری علما سے چنداں بہتر نہ تھے۔ دونوں نے ہی اپنے اپنے انداز سے شریعت کی خلاف ورزی کی، اور بدایونی کے نزدیک شریعت ہی وہ معیارِ آخر تھی جس کی بنا پر فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔

لیکن کیا شریعت کی کوئی ایسی واضح تعریف کی جا سکتی تھی جو معیار کا کام دے سکے؟ بدایونی کا یہی پہلو کمزور ہے۔ کوئی شخص کس طرح یہ طے کر سکتا ہے کہ ان بداعمال احمقوں کا ساتھ دے جو شریعت کی نمائندگی کرنے کا دعوا کرتے ہیں یا ان عیار دانشوروں کا ساتھ دے جنھوں نے اس کی تضحیک کو اپنا شیوہ بنا رکھا ہے۔ بدایونی اتنا پریشان ہو جاتا ہے کہ اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے، اور فیضی اور ابوالفضل پر، جو درباری ترقی کے پورے دَور میں اس کے مربّی رہے تھے، تہمتیں لگاتے وقت تنگ ظرفی کی حد کر دیتا ہے۔ لیکن وہ حقیقتاً تنگ ظرف نہیں تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس نے اسی انداز سے سوچا جیسے اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمان سوچنے لگے تھے کہ جہاں علما کی حمایت کرنا بے سود ہے وہاں ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے رہن سہن کے معاملے میں آزاد خیال ہونا اشد ضروری ہے، لیکن شریعت کا احترام ہر قیمت پر کرنا چاہیے۔ اور یہ بات محض ہندوستانی مسلمانوں ہی میں نہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ 1934ء میں مصر کے ڈاکٹر بہجت وہبی جامعہ ملیہ میں لیکچر دینے آئے تو انھوں نے یہ کہا تھا کہ اگر کسی شخص نے نماز نہ پڑھی تو بجائے اس کے کہ نماز نہ پڑھنے کو اصولاً درست ثابت کرے، اسے یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس سے ایک غلطی سرزد ہو گئی۔ بدایونی نے اپنے زمانے میں یہ دیکھا کہ دیانت دار علما پر جبر کیا جا رہا ہے، اور عیار لوگ کرسیِ انصاف پر متمکن ہیں، اور پھر اسے ضرور یہ احساس ہوا ہو گا کہ ایسے غیر یقینی حالات میں، اگر دربار کی مثال اور اس کی قوتِ اثر سے سرکاری علما اور ان کی نافذ کردہ شریعت سے

Marfat.com

خلاف عوام کے جذبات اور زیادہ بھڑکتے تو خود شریعت، جس پر مسلم طرزِ زندگی کا دارومدار ہوتا ہے، تباہ ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ اپنی جھلاہٹ کے اظہار میں اپنا سارا زورِ قلم ان لوگوں کے خلاف صرف کرتا ہے، جن کا رویہ شریعت کے بارے میں بڑا گستاخانہ اور حقارت آمیز تھا، اور جو لوگ بالآخر شہنشاہ کے دل سے شریعت کا احترام ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

بدایونی کو نہ تحقیق و تفتیش کا ذوق تھا نہ تاریخ علم میں اضافہ کرنے کی خواہش۔ وہ بڑی سادگی سے یہ تحریر کرتا ہے کہ دہلی سلطنت کے قیام کے ابتدائی دور سے اس کے اپنے زمانے تک کا حال محض انتخابِ تواریخ ہے۔ جو اس نے تاریخِ مبارک شاہی اور نظام الدین احمد بخشی کی کتاب جسے وہ نظام التواریخ کہتا ہے، اور طبقاتِ اکبری سے کیا ہے۔ لیکن اس نے کچھ اضافے اپنی طرف سے بھی کیے ہیں۔"[10] جب ہم اپنے "اس کے کچھ" کی جانچ کرتے ہیں تو یہ پتہ لگتا ہے کہ بدایونی کو سیاسی تاریخ سے دلچسپی نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دلچسپی کی یہ کمی اس دلچسپی سے کہیں کم ہے جس کا اظہار تعارفی بیان کے اس جملے سے ہوتا ہے کہ وہ ہر بادشاہ کے بارے میں مختصراً کچھ تحریر کرے گا۔ ہمیں اس کے بیان میں نہ صرف یہ کہ جگہ جگہ اشعار، قطعے، قصیدے اور مادہ تاریخ ملتے ہیں، بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے وہ یہ سمجھتا ہو کہ شاعری سیاسی واقعات کے مقابلے میں اگر زیادہ اہم نہیں تو برابر ضرور ہے۔ وہ رضیہ کی تخت نشینی اور اس کے دورِ حکومت کے بیان کے درمیان ایک شاعر پر بحث کرتا ہے اور اس کی شاعری کے نمونے پیش کرتا ہے، اور لگتا یہ ہے کہ ان دونوں میں شاعر کی شخصیت کہیں زیادہ افضل ہے۔ ناصر الدین کا دورِ حکومت چار صفحات پر مشتمل ہے جب کہ اس کے دور میں لکھے جانے والے قصیدوں پر اکتیس صفحات صرف کیے گئے ہیں بلبن کے ولی عہد سلطان محمد کی وفات سے اسے موقع مل گیا اور کئی طویل مرثیے شامل کر دیے۔ وہ سیاسی واقعات اور پالیسیوں کتنا وزن دیتا ہے یہ اس سے ظاہر ہے کہ بلبن کی اس نصیحت کے بارے میں جو اس نے اپنے بیٹے کو دی تھی یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے کہ نصیحت دہلی کی تاریخوں میں درج ہوئی ہے اور بلبن کے مقابلے میں کیقباد پر زیادہ لکھتا ہے۔ اہم انتظامی

Marfat.com

فیصلوں کو وہ محض اس مختصر حوالے کے لائق سمجھتا ہے کہ "اور اس سال عالی جاہ نے شہباز خاں کمبوہ کی زیرِ نگرانی داغ (گھوڑوں کو داغنا) اور حاضری (فوج وغیرہ کی) کے محکمے کے لیے حکم صادر فرمایا، اپنے زیرِ اختیار سارے علاقے میں کروریوں کے تقرر کا حکم جاری کیا اور ساری زمین کو بیک جنبشِ قلم پھر سے خالصہ کر دیا"[11]

بدایونی نے اپنے دونوں مآخذوں سے منتخب کیے ہوئے واقعات میں جو "کچھ اور زیادہ" اضافے کیے ہیں ان میں وہ حوالے بھی شامل ہیں جو صوفیوں اور شاعروں کے بارے میں متواتر دیے گئے ہیں۔ یہ حوالے کچھ زیادہ مددگار ثابت نہیں ہوتے۔ بجز اس کے کہ شاید ان سے بعض تاریخوں کے تعین میں مدد مل سکتی ہے، کیونکہ شاید ہی کوئی ایسی موت ہو جس کا ذکر قطعہ تاریخ کے بغیر کیا گیا ہو۔ بدایونی کو قصے سنانے کا شوق بھی تھا۔ لیکن اس کا تخیل کسی قصہ گو کی طرح آوارہ نہ تھا، اور وہ یہ سمجھتا ہوگا کہ قصہ کوئی دفع الوقتی ہوتی ہے۔ وہ مافوق الفطرت ہستیوں کا ذرا بھی شائق نہ تھا۔ فیروز خلجی کے ہاتھوں سیّدی مولا کے قتل کے بعد جو قدرتی شگون اور آفات سماوی دیکھنے میں آئیں ان کا حال بیان کرتے وقت وہ برنی کے مقابلے میں زیادہ ضبط سے کام لیتا ہے، اور خشک سالی کے بیان میں اپنی یہ رائے شامل کرتا ہے کہ ایسا قدرتی اسباب کی بنا پر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن قصّوں نے واقعی اس کے بیان کا لطف دوبالا کر دیا ہے۔ ایک کہانی التمش کی کسی کنیز کی ہے۔ جس کے متعلق بعد میں یہ پتہ لگتا ہے کہ اس کی بہن تھی۔ پھر سیّد موسیٰ اور سُنار کی لڑکی موہنی کی داستانِ محبت ہے۔ یہ وہ واقعہ ہے جو خود اس کے زمانے میں گزرا۔ بدایونی اپنا بیان روک کر بڑی تفصیل سے یہ کہانی سُناتا ہے۔ اس کہانی کے دوران یہ احساس ہوتا ہے کہ یہاں بالآخر اس نے اشخاص اور افعال کو شریعت کی عینک سے دیکھنا بند کر کے خود کو پورے طور پر ان لوگوں سے وابستہ کر لیا ہے جن کے مقدرات کا ذکر کر رہا ہے۔ یہ کہانی ادب کا ایک اعلا نمونہ ہے۔

لیکن بدایونی کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے لطیفے اور طنزیہ جملے ہیں محمد بن تغلق

Marfat.com

کے دَورِ حکومت کے بارے میں بدایونی سے زیادہ دُرست، جامع اور چبھتا ہوا جملہ شاید ہی کہیں اور مِل سکے: "سلطان کو لوگوں سے اور لوگوں کو سلطان سے نجات مِل گئی۔"[12] ذیل میں اس کی شوخی کے چند مخصوص نمونے دیے جا رہے ہیں۔

"اور اس سال اس دَور کے علما، میر مرتضیٰ شریفی شیرازی اس سرائے فانی سے کوچ کر گئے۔ پہلے انھیں امیر خسرو (خدا ان پر رحم فرمائے) کے مزار کے نزدیک دفنایا گیا۔ پھر، چونکہ صدر اور قاضی الاسلام نے (عالی جاہ سے) عرض کیا کہ امیر خسرو ہندوستانی اور سُنّی تھے اور میر مرتضیٰ عراقی اور رافضی، اس لیے امیر خسرو کو بلاشبہ ان کی معیت سے اذیت پہنچے گی۔۔۔۔ عالی جاہ نے حکم صادر فرمایا کہ ان کی نعش وہاں سے نکال لی جائے اور کہیں اور دفنائی جائے۔"[13]

"اور اس برس شیخ ابراہیم چشتی فتح پور میں اپنی طبعی موت مرے۔ انھوں نے سونے کے انبار وں کو الوداع کہا اور خالقِ حیات کے سامنے اپنا حساب پیش کیا۔ ان کے مال و دولت سے پچیس کروڑ زرِ نقد کے علاوہ ہاتھی، گھوڑے اور دوسری اشیا شاہی خزانے کی تحویل میں آئے، بقیہ ان کے دُشمنوں ــــ بیٹوں اور وارثوں ــــ کے ہاتھ لگا۔"[14]

"مخدوم الملک سن ۹۹۵ ھ میں بمقام احمد آباد فوت ہو گئے۔ ان کی جائداد اور املاک فہرست تیار کرنے کے لیے قاضی علی فتح پور سے لاہور بھیجے گئے۔ انھوں نے اتنا زیادہ مال و زر اور دفینہ ڈھونڈ نکالا کہ جس کا قفل انسانی تخیل کی کوئی کُنجی نہ کھول سکتی تھی۔ اس خزانے کا ایک حصّہ مخدوم الملک کے خاندانی قبرستان میں طلائی اینٹوں سے بھرے بکسوں میں تھا، اور اس طرح دفن کیا گیا تھا جیسے لاشیں دفن ہوں۔ انسانوں کی نظر جو کچھ پڑا وہ اتنا زیادہ تھا کہ خالقِ باری تعالیٰ ہی اس کا حساب کر سکتا تھا۔ وہ ساری اینٹیں اور ان کے ساتھ وہ کتابیں جن کی قیمت معمولی اینٹوں سے زیادہ نہ تھی، ضبط کر کے شاہی خزانے میں داخل کر دی گئیں۔"[15]

Marfat.com

بعض ایسے مادۂ تاریخ ہیں جو نہ صرف شرارت آمیز ہیں بلکہ فحش ہیں، جیسے شیخ ابراہیم چشتی کے لیے "شیخ بخیل"[16] اور شیخ گدائی کے لیے "جسم خنزیر"[17] لکھا ہے۔

اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ بدایونی کی منتخب التواریخ میں نمایاں اور شدید طور پر داخلیت ملتی ہے۔ اسے تاریخوں میں نہیں توزکوں کے خانے میں رکھنا چاہیے، اور واقعتاً اسے پڑھ کر اکثر سنیٹ سائمن کی توزک کا خیال آتا ہے۔ اور شاید بدایونی کی کتاب کی افادیت اسی میں مضمر بھی ہے۔ وہ کوئی بہروپ نہیں بھرتا، وہ جو محسوس کرتا ہے وہی لکھتا ہے۔ اسے نہ کسی فائدے کی فکر ہے، نہ کسی طبقے سے تعلق، وہ ایک آزاد رو مصنف ہے۔ اسے نہ کسی کو خوش کرنے کا خیال ہے، اور نہ منصب مورخ کا کوئی ایسا تصور جس کی بنا پر جھجک پیدا ہو جائے۔ اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ شریعت سے محض اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا، رسول اور الہام کے تئیں عزت و احترام کا رویہ ہونا چاہیے، تو ہم یہ مان لیں گے کہ اس نے اختلاف رائے اور اپنی پسند کی زندگی گزارنے کی آزادی خود بھی لی ہے۔ اور دوسروں کو بھی دی ہے۔ اس کے باوجود ہم بعض اوقات جھلا سکتے ہیں، لیکن ہمیں یہ احساس بھی ہوگا کہ یہ وہ شخص ہے جو زندگی کو ہر سمت سے دیکھنے کا لطف اٹھا رہا ہے، جو شوق سے لکھتا ہے اور خوب لکھتا ہے، جس نے ان حقائق کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی جو پوشیدہ تھے اور دوسروں کی نظروں سے بچ گئے تھے، لیکن اس نے جو کچھ دیا ہے وہ زندہ اور متحرک ہے، خود اس کا اور اس کے زمانے کا آئینہ دار ہے۔

Marfat.com

حوالہ جات

1. Badauni, Muntakhab-ut-Tawarikh, ed. Lees (Calcutta 1865), Vol. I. p.3.

2. ایضاً، صفحات 3، 4

3. ایضاً، صفحہ 3

4. ایضاً، صفحات 2، 3

5. ایضاً، صفحہ 3

6. ایضاً، جلد دوم، صفحہ 172

7. ایضاً، صفحہ 312

8. ایضاً، صفحہ 388

9. ایضاً، صفحہ 399

10. ایضاً، صفحہ 6

11. ایضاً، صفحہ 137

12. ایضاً، صفحہ 238

13. ایضاً، صفحہ 99

Marfat.com

14۔ ایضاً، صفحہ 374

15۔ ایضاً، صفحہ 311

16۔ ایضاً، صفحہ 374

17۔ ایضاً، صفحہ 119

Marfat.com

ایس۔ اے۔ اے۔ رضوی

الف سعادت (ہزار سال کا زمانہ جس میں شیطان قید ہوگا اور اسلام کا بول بالا ہوگا) کی اہمیت صرف علما دین اور صوفیوں ہی کا موضوعِ بحث نہیں بلکہ صدیوں تک عوام اس موضوع پر بڑے شوق سے قیاس آرائی کرتے رہے۔ یہ مقبولیت اتنی زیادہ تھی کہ شعرا اس مضمون پر بڑے چاؤ سے شعر کہتے تھے۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں خاقانی (وفات 582ھ مطابق 1186ء) کا ذیل کا قطعہ نقل کیا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ دُنیا میں ہر ہزار سال کے بعد،
ایک سچّا انسان پیدا ہوتا ہے،
وہ پہلے بھی آیا تھا، ہمارے وجود میں آنے سے پہلے،
وہ بعد میں بھی آئے گا، جب ہم بارِ غم اُٹھائے رُخصت ہو چکے ہوں گے۔

اسی شاعر نے ایک اور جگہ لکھا ہے:

اکثر اوقات جب یہ دُنیا آفت زدوں سے بھر جاتی ہے،
تو ایک رُوحِ درخشاں فلک سے اُتر آتی ہے،
خاقانی، اس زمانے میں اسے تلاش نہ کر،
رہ گزر پہ نہ بیٹھ کیونکہ کارواں دیر سے آئے گا!

Marfat.com

ہندوستان میں اکبر کے دَورِ حکومت میں مہدوی تحریک گو پہلے ہی زوالِ پذیر ہو چکی تھی، لیکن مسلمانوں میں ایک بڑھتا ہوا تناؤ اس بنا پر موجود تھا کہ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد ہزار سال مکمل ہونے کے دن نزدیک آتے جا رہے تھے۔ 74-1573ء میں مُلّا عبدالقادر بدایونی شیخ داوَد (وفات 982ھ مطابق 5-1574ء) سے ملنے گئے اور شیخ کے ایک مقرب، میاں عبدالوہاب، کے ذریعے انھیں اطلاع دلوائی کہ ہندوستان کے مشائخ وارثِ سلطان علاالدّین بن محمد شاہ بن مبارک شاہ بن خضر خاں، جو سیّدوں کے سلسلہ حکومت کا آخری سلطان تھا، کے زیرِ قیادت بغاوت کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ انھوں نے دعوا کیا کہ انھیں غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی سے ہدایات موصول ہوئی ہیں۔ سرحدوں کے بعض امیر بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ گو یہ مجوزہ بغاوت ظہور میں نہ آئی، لیکن سیاسی جاں باز اپنے فائدے کی خاطر لوگوں کے خوف اور امیدوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ اکبر بظاہر ان تحریکوں سے پریشان نہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ کہا:

"حالانکہ میں اتنی بڑی سلطنت کا مالک ہوں، اور حکومت کے سارے وسائل میرے ہاتھ میں ہیں، پھر بھی چونکہ حقیقی عظمت رضائے الٰہی کے مطابق عمل کرنے میں مضمر ہوتی اس لیے فرقوں اور عقیدوں کی گوناگونی سے میرا دل بے چین ہے؛ اور حالات اس ظاہری شان و شوکت قطع نظر اپنی شکستہ دل کی وجہ سے مجھے وہ اطمینان کہاں نصیب ہے جس سے اپنی مملکت کو قابو میں رکھ سکوں۔ میں کسی ایسے محتاط با اصول انسان کی آمد کا منتظر ہوں جو میرے ضمیر کی گتھیاں حل کر دے گا۔"[3]

بہرحال اس نے اسلامی دَور کے ہزار سال منانے کے واسطے یہ حکم دیا کہ سکوں پر "دَورِ ہزار سالہ" ثبت کیا جائے اور ایک تاریخ الفی لکھی جائے جو رسول کی وفات سے شروع کی جائے۔ ان احکامات کا مقصد اسلام کے خاتمے کا اعلان یا اس کے ضابطوں کی تحقیر ہرگز نہ تھا، جیسا کہ مُلّا عبدالقادر بدایونی کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ "اور چونکہ عالی جاہ کی رائے

Marfat.com

میں، یہ ایک طے شدہ حقیقت تھی کہ رسول اللہ (صلی علیہ وسلم) کی رسالت کے زمانے کے بعد ہزار سال کا وہ دَور پورا ہو چکا، جس دَور میں اسلامی عقیدے کا قیام ضروری تھا، اس لیے اب ان پوشیدہ ارادوں کی اشاعت میں کوئی رُکاوٹ باقی نہ تھی، جن کو وہ دل میں پال رہا تھا۔ اور اس لیے اس نے یہ سمجھا کہ شیوخ اور علما (جو جھکنے اور مصالحت کرنے کے لیے تیار نہ تھے) کا مزید پاس اور لحاظ غیر ضروری ہے۔ اسے اختیار ہے کہ اسلام کے قوانین اور ضوابط کو مسترد کرنے کے اپنے ارادے کو بے خوف و خطر پورا کرے، اور (ان کی جگہ) اپنے اس مہلک عقیدے کو قائم کرے جیسے وہ پال رہا تھا۔"[5] بہر حال بدایونی نے، اکبر کے دَور کے بعض ان ضابطوں کا حال مختصراً بیان کرے، جو اس کے مطابق ۹۹۰ھ مطابق 83-1582ء میں جاری کیے گئے تھے، قدرے سنجیدہ انداز میں یہ تحریر کیا:

"سن ہجری، جو عام طور سے رائج ہے، اس کے ہزارویں برس کے تقریباً اختتام پر شہنشاہ نے حکم دیا کہ اسلام کے سارے بادشاہوں کی ایک تاریخ مرتب کی جائے، جو واقعیٰ ساری تاریخوں سے افضل ہو، اور یہ فرمایا کہ کتاب کا نام ایسا رکھا جائے کہ اس کا سالِ تالیف ظاہر ہو جائے۔ یہی سبب تھا کہ کتاب کا نام الفی رکھا گیا۔"[6]

یہ کتاب ان ہی وسیع البنیاد مقاصد کے حصول کے لیے لکھی جانی تھی جن کے حصول کے لیے ایک قسم کا دارالترجمہ قائم کیا گیا تھا۔ مُلّا احمد ٹھٹوی کی وفات کے بعد آصف خاں (جعفر بیگ)[7] نے تاریخ الفی مکمل کی، اس نے اپنے لکھے ہوئے حصوں کے مختصر پیش لفظ میں پہلے اکبر کے اس اعلا احساس عدل کی تعریف و توصیف کی ہے جسے وہ عام کرنا چاہتا تھا، اور پھر یہ لکھا کہ شہنشاہ ہمیشہ اپنی ساری قوتیں جمع کرکے اس بات کی سخت کوشش کرتا رہا کہ "علم کامل" سے ہر شخص واقف ہو جائے اور مختلف مذاہب اور عقائد کے لوگ اس بنیادی سچائی کو سمجھیں جو ہر مذہب اور عقیدے میں پائی جاتی ہے، اور اندرونی تعصب کو چھوڑ دیں۔ اس نظریے کی بنا پر شہنشاہ نے حکم دیا کہ مختلف مذاہب کے وہ اصول جو دلیل پر مبنی ہوں مختلف زبانوں

Marfat.com

میں ترجمہ کیے جائیں۔[9] اس نے یہ حکم بھی دیا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ہر مذہب کے روایتی علم کے گلستانِ اصول کو تعصب کے خاروں سے پاک کر دیا جائے، کیونکہ ہندوستان میں ہر مذہب کے اندر اختراعیں کی گئی ہیں اور ایسے ہزاروں ضابطے بنا لیے گئے ہیں جو ناپسندیدہ ہیں۔ اپنے اس دعوے کی حمایت میں اس نے اذان کا حوالہ دیا۔ اس نے یہ بتایا کہ حضرت محمدؐ کے زمانے سے ہر روز پانچ دفعہ اذان دی جا رہی ہے، لیکن شیعہ اور سُنّی اپنے عقیدوں کی روایتوں کی بنا پر طریقۂ اذان کے بارے میں ایک دوسرے سے سخت اختلاف کرتے ہیں۔ اسی طرح بدارادہ لوگوں کو ان واقعات کے بیان کے وقت اپنے مخصوص احساسات اور جذبات کے اظہار کی بڑی گنجائش نکل آتی ہے، جو واقعات سابقہ فرمانرواؤں اور ان کی پالیسیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔[9]

ابتدا میں سات عالموں پر مشتمل ایک مجلس بنائی گئی جسے تاریخِ الفی تالیف کرنا تھی، اور جس کی تالیف کا آغاز 993ھ مطابق 1585ء میں کیا گیا۔ پہلے برس کا بیان نقیب خاں کے سپرد کیا گیا،[10] دوسرے کا شاہ فتح اللہ کے،[11] تیسرے کا حکیم ہمام کے،[12] چوتھے کا حکیم علی کے،[13] پانچویں کا حاجی ابراہیم سرہندی کے،[14] چھٹے کا نظام الدین احمد کے[15] اور ساتویں کا مُلّا عبدالقادر بدایونی کے۔[16] یہ مجلس ہر نظریے کے علما پر مشتمل تھی۔ فی الحقیقت، اکبر نے یہ حکم دیا تھا کہ تاریخِ الفی کی تالیف معروضیت اور تکمیل کے اعتبار سے نہایت اعلا درجے کی ہونی چاہیے۔ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد کے پہلے پینتیس برسوں کا بیان تالیف کے واسطے مندرجہ بالا ارکانِ مجلس میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اکبر بذاتِ خود اس کتاب کی تیاری پر نظر رکھتا تھا۔

مُلّا عبدالقادر بدایونی کہتا ہے:

"جس دوران میں ساتویں برس کے واقعات قلم بند کر رہا تھا، اور دوسرے سچے خلیفہ (خدا اُن پر راضی رہے) کی حیات تحریر کرنے میں مصروف تھا، ایک رات جب شہنشاہ نے کوفہ کی تعمیر کا حال، قصر العمارات کی تعمیر اور تباہی کا حال جو اس کی تباہی کی

Marfat.com

تفصیلات کے ساتھ بیان کیا گیا تھا، اور امیر المومنین علی (خدا ان پر راضی رہے) کی دختر، ام کلثوم کی شادی کا حال، اور اس کے ساتھ پنج وقتہ نماز کی ابتدا، شہر نصیبین کا زوال، اور مرغ کے برابر بچھوؤں کا حال سنا جو شہر کو تسخیر کرنے کے لیے استعمال کیے گئے تھے، تو اس نے بڑے اعتراضات اُٹھائے اور اسے سچ ماننے سے انکار کر دیا۔ آصف خاں ثالث، جو مرزا جعفر ہی کا دوسرا نام ہے، میری مدد پر آیا لیکن بڑے کمزور انداز میں، لیکن دوسری طرف سے ابوالفضل اور غازی خاں بدخشی نے میرے دعوؤں کی تائید کی۔ جب یہ پوچھا گیا کہ مجھے یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئی، تو میں نے جواب دیا کہ میں نے کتابوں میں دیکھا ہے، اور جیسا دیکھا ہے ویسا لکھ دیا ہے، یہ کوئی میری اپنی اختراع نہیں ہے۔ فوراً ہی روضتہ الاحباب اور دوسری کتابیں کتب خانے سے منگوائی گئیں، اور نقیب خاں کو دی گئیں کہ وہ اس بیان کی درستی کی تصدیق کرے، جو خدا کے فضل سے درست نکلا اور میں اختراع کے الزام سے بری ہو گیا۔"[17]

ایسا لگتا ہے کہ یہ مجلس اطمینان بخش طور سے کام نہ کر سکی، اور حکیم ابوالفتح کی سفارش پر مُلا بن نصراللہ دائی بوئی ٹھٹوی کو حکم دیا گیا کہ چھتیسویں برس کے بیان کے بعد سے وہ کتاب کی تالیف کا کام کرے۔ اس سے کہا گیا کہ سادہ اور آسان زبان لکھے، اور حکم دیا گیا کہ کسی بانیِ سلطنت کا تعارف کراتے وقت یہ لکھنا ہرگز نہ بھولے کہ اس کے آباؤ اجداد کیا تھے نیز یہ کہ اسے کس طرح عروج حاصل ہوا۔[18] مُلا احمد نے تین سال کے عرصے میں 693ھ مطابق 1294ء (683 رحلت) تک کا حال مکمل کر دیا۔ اسے 996ھ مطابق 1588ء میں مرزا فولاد بیگ برلاس نے قتل کر دیا اور آصف خاں جعفر بیگ کو حکم دیا گیا کہ کتاب مکمل کرے۔ اس نے غازان خاں (694ھ مطابق 1295ء تا 713ھ مطابق 1304ء) کے دورِ حکومت سے کتاب کا بیان شروع کیا اور کتاب میں ایک مختصر پیشِ لفظ کا اضافہ کیا جس میں اس نے کتاب کی تالیف سے اکبر کے مقاصد، مُلا احمد کے قتل، اس کے قاتل کی سزا، نیز مکمل کرنے کے واسطے کتاب اس کے سپرد کیے جانے کا مختصر حال لکھا۔[19] اس نے یقیناً 1000ھ مطابق ... - ...

تک کا حال مکمل کر دیا ہوگا۔ لیکن جو نسخے موجود ہیں ان میں ۹۹۷ھ مطابق 89-1588ء کے بعد کا حال نہیں ملتا۔ بعد میں مُلا عبدالقادر بدایونی کو حکم دیا گیا کہ مُصطفےٰ کاتب لاہوری کے ساتھ مل کر کتاب کا مختلف نسخوں سے مقابلہ کرے اور اس پر نظرِ ثانی کرے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس نے کتاب کی پہلی جلد پر بڑی عجلت سے نظرِ ثانی کی اور اس کی کاوشوں کو خوب سراہا گیا۔ اس کے بعد اسے حکم دیا گیا کہ دوسری جلد پر بھی نظرِ ثانی کرے کیونکہ، بقول اس کے، اس میں خاصہ مواد انتہائی تعصبانہ تھا۔ بدایونی کہتا ہے:

"ایک سال کے عرصے میں، میں نے کتابوں سے مقابلے کا کام خاصہ کر ڈالا، لیکن خود اپنے اندر تعصب کا اثر موجود ہونے کی وجہ سے، میں نے رسالوں کی ترتیب کے علاوہ کتاب میں کوئی دخل نہیں دیا، اور اصل متن میں کوئی تبدیلی نہیں کی، اور ایسا کرنے کا الزام اپنی تندرستی پر رکھا، ویسے خدا کو جو منظور ہو، مگر میری دُعا یہ ہے کہ میرے اس عمل سے کوئی مزید زخم نہ لگے۔ ان کتابوں کے سلسلے میں میری حالت اس شخص کی سی تھی جو کھجوروں میں پتھر ملا کر کھا رہا ہو، اور جب کوئی اس سے یہ پوچھے کہ، تم پتھر نکال کر پھینک کیوں نہیں دیتے تو وہ جواب دے کہ انھوں نے میرے لیے یہ مقدار مقرر کر دی ہے۔"[20]

ابتدا میں یہ کتاب تین جلدوں میں تقسیم تھی۔ پہلی دو جلدیں جو مُلّا احمد نے لکھی تھیں ان میں غازان خاں تک کا بیان تھا، اور تیسری جلد آصف خاں نے مکمل کی تھی۔[21] لگتا ہے کہ بدایونی نے غازان خاں کو چنگیز خاں سے گڈمڈ کر دیا۔ جو نسخے اب موجود ہیں وہ ابتدائی خاکے کے عین مطابق نہیں ہیں، اور نقل نویسوں، جلد سازوں اور نسخوں کے مالکوں نے انھیں اپنی سہولتوں اور خیالوں کے مطابق جلدوں میں تقسیم کر دیا ہے۔[22] ابوالفضل، جو یہ دعوا کرتا ہے کہ کتاب کا پیشِ لفظ اس نے لکھا ہے، یہ کہتا ہے کہ " عالی جاہ جو خزینۂ تاریخ سے واقف ہو چکے ہیں، انھوں نے کئی صاحبِ علم مصنّفین کو ایک ایسی کتاب تیار کرنے کا حکم دیا جس میں وہ واقعات قلم بند کیے جائیں جو ہفت اقلیم میں پچھلے ایک ہزار برس میں وقوع پذیر

Marfat.com

ہوئے ہیں۔ نقیب خاں اور کئی دوسروں نے اس تاریخ کا آغاز کیا۔ اس میں ایک بہت بڑا حصّہ بعد میں مُلّا احمد ٹھٹوی نے شامل کیا' اور پوری کتاب جعفر بیگ آصف خاں نے ختم کی۔ اس کی تمہید میں نے لکھی ہے۔ کتاب کا عنوان تاریخِ الفی ہے' یعنی ہزار برسوں کی تاریخ"[23] کتاب کے چوتھے نسخے موجود ہیں۔ ان میں سے کسی میں ابوالفضل کا لکھا ہوا پیشِ لفظ نہیں ہے۔ اگر کبھی وہ مِلا تو مہابھارت پر اس کے پیشِ لفظ کی طرح' اس پیشِ لفظ سے بھی کتاب کے خاکے پر خاصی نئی روشنی پڑے گی۔

لگتا ہے کہ مرزا جعفر بیگ آصف خاں نے کتاب مکمّل کر لی تو فوراً بعد' اکبر ہی کے دورِ حکومت میں تاریخِ الفی کے وہ حِصّے جن میں تیمور' مرزا خلیل' مرزا شاہ رخ' اُلغ بیگ' ابوالقاسم بابر' سلطان حسین مرزا' بابر' ہمایوں اور اکبر (984ھ مطابق 1577ء) کی تاریخ ہے' ایک الگ مسلسل جلد میں مرتّب کر لیے گئے۔ شہنشاہ کے حکم سے ایک سو بارہ بڑی قلمی تصویریں شامل کی گئیں' جن میں سے بعض تصویریں دو مقابل صفحات پر بنی ہوئی ہیں۔ جو نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری' بانکی پور' پٹنہ میں محفوظ ہے اس کے شروع کے خالی ورق پر شاہ جہاں نے اپنی قلمی تحریر میں لکھا ہے کہ تیمور اور اس کے جانشینوں اور اکبر کے بائیسویں سال جلوس تک کا حال شاہ بابا (اکبر) کے زمانے میں لکھا گیا تھا۔[24] بعد میں کتاب کا نام تاریخ خاندانِ تیموریہ رکھ دیا گیا تھا۔

تاریخِ الفی ان بہترین مآخذوں پر مبنی ہے' جو اس وقت موجود تھے۔ اس کی طرزِ فکر میں معروضیت اور اسلوبِ بیان میں سادگی پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا۔ کتاب میں تاریخوں کی ترتیب کا سختی سے لحاظ رکھا گیا ہے۔ لاپرواہ نقل نویسوں نے اکثر اوقات رحلت کی تاریخ کو ہجری تاریخوں سے گڈمڈ کر دیا ہے۔ سر ایچ۔ ایم۔ ایلیٹ اور پروفیسر جون ڈاؤسن نے خاص طور سے اس طرف اشارہ کیا ہے: "لیکن تاریخِ الفی کی بابت جو ایک اور بڑا اعتراض کرنا ہے' وہ کتاب کے خاکے کے بارے میں ہے دا سے ڈیوڈورس کی ہسٹوریکل لائبریری

Marfat.com

کی طرح، سال وار واقعات کی شکل میں ترتیب دیا گیا ہے۔ لہٰذا اگر ہمارا موضوعِ تحقیق کسی مخصوص ملک سے متعلق ہے تو وہاں کے واقعات کے مابین تعلق معلوم کرنے کے لیے ہمیں مجبوراً اس ضخیم تاریخ کے صفحے کے صفحے پلٹنے پڑتے ہیں۔ ایک نہایت عمدہ فہرستِ مضامین ہی اس عیب کو دُور کر سکتی تھی۔[25] ایلیٹ اور ڈاؤسن نے بجا طور پر یہ تحریر کیا ہے کہ تالیف کرنے والوں نے بظاہر ان تمام بہترین مآخذوں سے معلومات حاصل کی جو انھیں میسّر آ سکے۔ انھوں نے نہایت قابلِ اعتبار دستاویزوں کا انتخاب کرتے وقت اور ان مَن گھڑت کہانیوں کو جن سے بہت سی دستاویزیں پُر تھیں رَد کرتے وقت بڑی مدبرانہ تنقید کی ہے۔[26] بدایونی نے اپنے مخصوص انداز میں تحریر کیا ہے کہ اکبر نے اس افسانوی مواد کو کتاب میں شامل کرنے کی اجازت نہ دی۔ کتاب کا ابتدائی حصّہ بحیثیتِ مجموعی زیادہ تر امیر جمال الدّین عطا اللہ بن فضل اللہ الحسینی الاشتکی الشیرازی (وفات 926ھ مطابق 1520ء) کی روضۃ الاحباب فی سیر النبی وال والاصحاب پر مبنی ہے۔[27] یہ ایک ممتاز عالمِ دین تھا جو سلطان حسین (873 تا 911ھ مطابق 1469ء تا 1506ء) کے دَورِ حکومت میں ہرات میں کامیاب زندگی بسر کر رہا تھا۔ کتاب کی تیسری جلد ہندوستان کے علاؤ الدّین میں کسی صورت سے مقبول نہ ہوئی۔ بدایونی کہتا ہے کہ جب وہ شیخ ابوالفضل اور حاجی سلطان تھانیسری کی معیت میں مخدوم الملک سے ملاقات کرنے گیا تو اس نے دیکھا کہ مخدوم الملک کے سامنے روضۃ الاحباب کی تیسری جلد تھی۔ انھوں نے ان لوگوں سے کہا، دیکھو، جن کی اس ملک میں لوگ اطاعت کرتے ہیں انھوں نے ایمان کو کتنا ضرر پہنچایا ہے، اور ذیل کا یہ شعر دکھایا جو حضرت علی کی شان میں لکھا گیا تھا:۔

خدا سے ان کی مشابہت کے لیے یہی ثبوت کافی ہے
کہ اُن پہ یہ شک کیا جاتا ہے کہ وہ خود خُدا ہیں۔[28]

انھوں نے کہا کہ مصنّف رفض[29] سے بڑھ گیا ہے، اور اس کی بے اعتقادی کا مسئلہ

Marfat.com

حلول[30] کی حد میں داخل ہوگیا ہے۔ انھوں نے انھیں بتایا کہ وہ قطعی طور پر یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ کتاب کو کسی شیعہ کی موجودگی میں جلا دیں۔ حالانکہ بدایونی پہلے کبھی مخدوم الملک سے نہیں ملا تھا، لیکن اس نے بڑی جرأت سے بتایا کہ یہ شعر ان اشعار کا ترجمہ ہے جو امام شافعی سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ مخدوم الملک اور بدایونی نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کی پُرجوش حمایت کی۔ مخدوم الملک نے مزید کہا کہ دوسرے جلد میں بھی ایسی عبارتیں موجود ہیں جن سے اس کتاب کے مصنّف کا بدعتی اور بد اعتقاد ہونا ثابت ہوتا ہے[31]۔

نزاعی معاملات سے بچنا اور کٹر مذہبی لوگوں کے تعصب کا سامنا کرنا ممکن نہ تھا۔ مُلّا احمد[32]، جو ابتدائی حصّوں کا خاص مصنّف تھا، ایک پُرجوش شیعہ تھا۔ غالباً کٹر مذہبی لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے خیال سے ہی مُلّا عبدالقادر بدایونی سے کہا گیا تھا کہ مُلّا احمد کے لکھے ہوئے حصّوں پر نظرِ ثانی کرے۔

سلطان محمد بن تغلق، افغانوں، پندرھویں صدی کی صوبائی حکومتوں کے سلسلے اور سور سلسلہ حکومت کی تاریخیں ہر سال کے تحت تاریخ وار نہیں دی گئی ہیں، بلکہ انھیں مختلف مقامات پر مُسلسل بیان کیا گیا ہے۔ دہلی کے سلطانوں کی تاریخ سے پورا انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ بابر سے اکبر تک ہندوستان کے تیموری بادشاہوں کی تاریخ قدرے تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ بابر کا بیان خاص طور سے تزکِ بابری پر مبنی ہے، لیکن ہمایوں اور اکبر نیز ایران، وسطِ ایشیا اور ترکی کے بیانات اس معلومات پر مبنی ہیں جو شاہی محافظ خانے سے حاصل ہوئی تھی اور ممتاز امرا نیز دوسرے لوگوں کی زبانی شہادتوں کی بنا پر جمع کی گئی تھی محض جوہر آفتابچی، بایزید بایات اور گُل بدن بیگم کی توزکیں، جن میں ان اہل فضل کو بڑی مفید باتیں ملیں جو ہمایوں کے ادوار میں دلچسپی رکھتے تھے، غالباً تاریخ الفی تالیف کرنے والوں کو دستیاب نہ ہوسکیں۔ ایسا لگتا ہے کہ تالیف کرنے والوں کو محمد عارف قندھاری اور میر علاالدولہ کامی قازوینی کی کتابیں دستیاب ہوگئی تھیں، لیکن تاریخ الفی کے آخری حصّوں میں اکبر کے

Marfat.com

دورِ حکومت کی پہلی سرکاری تاریخ دی گئی ہے' یہ حصے خود شہنشاہ کی نگرانی میں تالیف کیے گئے تھے۔ ہمایوں کے دورِ حکومت پر نظام الدین احمد کا بیان زیادہ تر تاریخ الفی پر مبنی ہے' اور اکبر کے دورِ حکومت پر بھی اس نے بہت کچھ مواد اسی سے اخذ کیا ہے۔ یہ کتاب اس تناؤ کا نتیجہ ہے جس کا عکس مُلّا عبد القادر بدایونی کی منتخب التواریخ میں پوری طرح نظر آتا ہے' لیکن اس میں ان معمولی جھگڑوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور لوگوں کو زندگی کی ان نئی قدروں سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے جو اکبر کی "صلحِ کل" کی پالیسی کی بنا پر برابر اہمیت حاصل کرتی جا رہی تھیں۔

بابر' ہمایوں اور اکبر سے تعلق رکھنے والے حصّوں میں ان بڑے بڑے واقعات کا تفصیلی ذکر ہے جو ایران' وسطِ ایشیا اور ترکی میں رونما ہوئے' اور اس طرح یہ کتاب ہمایوں اور اکبر کے درباروں کی سیاست اور پالیسیوں کو سمجھنے میں ایک نئے رُخ کا اضافہ کرتی ہے۔ ہندوستان کی اہمیت پر غیر ضروری زور نہیں دیا گیا ہے' لیکن ایران اور وسطِ ایشیا کی پالیسیوں میں اس ملک نے جو نمایاں رول ادا کرنا شروع کر دیا تھا وہ تاریخِ الفی کے بیانات سے خوب اچھی طرح جھلکتا ہے۔

Marfat.com

حوالہ جات

1. Abul Fazl : Akbar-nama, tr. Beveridge, (Calcutta 1897-1921) Vol. I, p. 142.
2. Badauni, Muntakhal-ut-Tawarikh, (Cal-cutta 1864-69), Vol III, p. 35.
3. Abul Fazl: Ain-i-Akbari, trans. Jarret, Vol. III, p. 380.
4. Muntakhab-ut-Tawarikh, Vol III, p. 380
5. Muntakhub-ut-Tawarikh, trans. Lowe, Vol II., p. 310.
6. Ibid, p. 326

7- مرزا بدیع الزماں قازوینی والے مرزا قیام الدین جعفر بیگ 985ھ مطابق 1577ء میں ہندوستان آئے اور ان کے چچا مرزا غیاث الدین علی آصف خاں بخشی نے انھیں اکبر کے سامنے پیش کیا۔ وہ خاصے ممتاز عالم اور آزاد خیال مفکر تھے۔ وہ 1012ھ مطابق 1612ء میں فوت ہوئے۔

8- ابوالفضل نے مہابھارت کے فارسی ترجمے کے پیش لفظ میں یہ لکھا کہ: "اکبر ا[پنی] رعایا کے سارے طبقوں میں اصلاحات کرنے کا آرزومند تھا اور اس معاملے میں

Marfat.com

وست اور دشمن میں تمیز نہیں کرتا تھا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں
ے اختلافات بہت زیادہ بڑھے ہوئے ہیں، اور ان کے درمیان محبت اور مخالفت
ی کوئی حد نہیں رہی ہے، تو اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر ایک مذہب کی مستند کتابوں کا
س کے حریفوں کی زبان میں ترجمہ کرائے، تاکہ دشمنی ختم کرکے وہ تلاشِ حق کی کوشش
کریں۔ اور اس طرح اپنی اپنی کمزوریوں سے واقف ہوکر اپنی اصلاح کی کوشش کریں۔
دوسری بات یہ ہے کہ ہر مذہب میں ایسے بہت سے لاعلم لوگ رہے ہیں جنھوں نے
اپنے آپ کو بڑا عالم فاضل سمجھا ہے اور اعلا مصنّفین کی اصل کتابوں کو غلط طریقے
سے پیش کیا ہے۔ عام لوگوں نے اس غلط بیانی کو مذہب کی اصل ترجمانی سمجھا اور
اکثر گمراہ ہوگئے۔ اکبر نے ضروری سمجھا کہ لوگوں کو ایسے مذہبی محافظین کے گندے
منصوبوں کا شکار ہونے سے بچائے اور یہ فیصلہ کیا کہ اگر مختلف مذاہب کی کتابیں
سادہ زبان میں ترجمہ کرلی جائیں تو لوگ خود ہی حق کو پہچان لیں گے۔" (ابوالفضل،
مہابھارت کے فارسی ترجمے کا پیشِ لفظ، ذخیرہ لٹن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی)، الف ۹، ب۔

Tarikh-i-Alfi (Bodlein 99/ousley 341), f. 333a

میر یحییٰ قازوینی (وفات 962ھ مطابق 1555ء) کا پوتا، میر غیاث الدین علی بن
عبدالطیف قازوینی، لب التواریخ کا مصنّف، اس وقت اپنے والد کے ساتھ
ہندوستان آیا جب اکبر تخت نشین ہوچکا تھا لیکن پنجاب سے رخصت نہیں ہوا
تھا۔ (اکبر نامہ، جلد دوم، صفحہ 230) وہ جلد ہی شہنشاہ کا قریبی دوست بن گیا۔ وہی
عموماً کتابیں پڑھ کر شہنشاہ کو سناتا تھا اور سنسکرت کی کتابوں کے فارسی ترجے
کے کام کی نگرانی کرتا تھا۔ وہ فن تاریخ نویسی کا ماہر تھا اور کہا جاتا ہے کہ اسے میر خواند
کی روضۃ الصفا کی ساتوں جلدیں ازبر تھیں۔ جہانگیر بھی نقیب خاں کی خوبیوں کا بڑا

Marfat.com

مداح تھا۔

11۔ میر فتح اللہ شیرازی نے ہندوستان آنے کے بعد، بیجاپور کے عادل شاہی سلسلے
پانچویں بادشاہ، علی عادل شاہ اول (1557ء تا 1580ء) کی ملازمت اختیار کی
ایک ممتاز ریاضی داں اور سائنسداں تھا۔ وہ ۹۹۱ھ مطابق 84-1583ء میں
کی دعوت پر دربار شاہی میں پہنچا۔ اس کا نام بہت سی کلوں کی ایجاد سے منسوب
گیا ہے۔ وہ ۹۹۷ھ مطابق 89-1588ء میں کشمیر میں فوت ہو گیا۔

12۔ میر عبدالرزاق گیلانی کے بیٹے حکیم جہان نے 974ھ مطابق 67-1566ء میں ایران چ
اور شہنشاہ کے دورِ حکومت کے بیسویں برس میں اپنے بھائی حکیم عبدالفتح کے ساتھ اکبر
دربار میں پہنچا۔ اسے اکبر کا بڑا قرب حاصل تھا، اور شہنشاہ کے دورِ حکومت کے اکتس
برس میں اسے بحیثیت سفیر صدر جہاں کے ساتھ توران بھیجا گیا تھا۔ وہ 6 ربیع الا

13۔ 1005ھ مطابق 9 نومبر 1595ء میں فوت ہوا۔
حکیم علی گیلانی اکبر کے دورِ حکومت میں ایران سے ہندوستان آیا۔ طب میں مہارت
ہونے کی وجہ سے اسے جلد ہی اعلا مقام حاصل ہو گیا۔ شہنشاہ کے دور کے اُنتالیسو
برس میں اس نے ایک حیرت انگیز تالاب بنوایا، اس کا منصب بڑھا کر سات سو کر
گیا اور جالینوس الزماں کا خطاب عطا کیا گیا۔ آخری علالت میں اس نے اکبر
تیمارداری کی۔ وہ 1018ھ مطابق 1609ء میں فوت ہوا۔

14۔ حاجی ابراہیم سرہندی اکبر کے دربار کے مشہور علمائے دین میں شمار ہوتا تھا۔ شہن
کے ابتدائی دورِ حکومت میں اکبر پر اس کا بڑا اثر تھا۔ اور وہ مناظرے میں بڑا طاق تھ
بعد میں اسے ان علماء کے ساتھ شریک رہنے کو کہا گیا جنھیں سنسکرت کتابوں کو فا
میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ وہ ۹۹۴ھ مطابق 1609ء میں رنتھمبور کے مقا
فوت ہوا۔

Marfat.com

۱۱۔ محمد مقیم ہروائی کا بیٹا نظام الدین احمد اکبر کے دورِ حکومت کے سینتیسویں برس میں گجرات کا بخشی مقرر کیا گیا اور 23 صفر 1003ھ مطابق 6 نومبر 1594ء کو فوت ہو گیا۔ وہ طبقاتِ اکبری کا مصنف تھا جو اس نے 1001ھ مطابق 93-1592ء میں مکمل کر لی تھی لیکن بعد میں اس نے 1002ھ مطابق 94-1593ء تک اکبر کے دورِ حکومت کا بیان اور قلم بند کر دیا۔

۱۔ عبدالقادر "قادری" بن ملوک شاہ بن حامد بدایونی منتخب التواریخ کا مشہور مصنف؛ اکبر کے دارالترجمہ کا ایک سرگرم رکن تھا اور بہت سی کتابوں کی تالیف اور ترجمے میں شریک تھا۔

۱. Muntakhab-ut-Tauarikh, trans. Lowe, Vol. II, p. 328.

۱. Tarikh-i-Alfi, (British Museum) Riu 1186 – 119a. Or 142f. 498d.

۱. Tarikh-i-Alfi, (Bodleian 99) ff. 332b – 33a; British Museum, Or. 465, f 97a.

۲. Muntakhab-ut-Tauarikh, trans. Lowe; Vol. II, p. 407.

۲. Ibid; pp. 328 – 406.

۲. C.A. Storey! Persian Litreture, A Bio-Bibliog-raphical Survey (London, 1935) pp. 120 – 121, A. Hal-im! "Some Indian Collections of the Tarikh-i-Alfi; Indian Historical Records Comm-ission Proceedings, Vol; 18 (1942),

Marfat.com

pp. 108—113.

مندرجہ بالا مقالے میں وہ دستاویزیں شامل نہیں کی گئی ہیں جو سرسالار جنگ لائبریری حیدرآباد میں موجود ہیں۔

H. Blochmaun, English Trauslation of Ain-i- .23
Akbari (Calcutta, 1927) Vol. I, p. 113.

Maulvi Abd-ul-Maqtadir, Catalogue .24
of the Arabic and Persian Maunseript
in the Oriental Public Library at Bankipore
(Patna, 1921) Vol. VII, pp. 40—48.

Elliot and Dowson, the History of India .25
as told by its own Historians, Vol. V, p. 156

Ibid, pp. 156—157. .26

27۔ یہ کتاب ۹۰۰ھ مطابق 95-1494ء میں مکمل ہو گئی تھی۔ یہ تین مقصدوں (جلدوں) میں تقسیم کی گئی ہے۔

(1) حضرت محمدؐ

(2) پہلے تین خلیفہ

(3) علی اور بارہ امام

28۔

ہمی بس بود حق نمائے رو
کہ کردند شک در خدائے رو

29۔ شیعہ ہونے کے ناطے

30۔ تناسخ الارواح کا عقیدہ

Marfat.com

31- Muntakhab-ut-Tawarikh, Vol. III, pp. 70-71, English trans. by Sir Wolseley Haig, pp. 114-116.

32- مُلّا احمد بن نصراللہ دائی ٹھٹوی اپنی ابتدائی عمر میں شیعہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے مشہد یزد اور شیراز میں تعلیم پائی۔ اکبر کے دربار میں (۹۸۹ھ مطابق) آنے سے پہلے وہ گولکنڈہ کے قطب شاہ کے دربار میں ملازم رہے۔ وہ ۹۹۶ھ مطابق 1588ء میں بمقام ' لاہور قتل کر دیے گئے۔

Marfat.com

شیخ ابوالفضل

نعمان احمد صدیقی

دورِ وسطیٰ کے ہندوستان میں فنِ تاریخ نگاری نے اربابِ علم و فضل کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی جن اربابِ علم و فضل نے اسے دوسروں سے الگ بذاتِ خود ایک مضمون سمجھ کر پسند کیا اور اس کی تربیت کی۔ ان میں سے بعض، جیسے ضیا الدین برنی، نظام الدین احمد، عبدالقادر بدایونی، محمد قاسم فرشتہ اور خفی خاں بڑے ممتاز مورخ تھے اور انھوں نے دورِ وسطیٰ کے فنِ تاریخ نگاری کو بہت کچھ دیا۔ وہ تاریخ نگاری کی پرانی روایتوں سے متاثر تھے، لیکن اپنی ذاتی تعلیمی تربیت اور کمالات، نیز اپنی سماجی حیثیت اور مذہب نیز سیاست کے بارے میں اپنے مخصوص نظریات، کی بنا پر، انھوں نے فنِ تاریخ نگاری میں اپنی راہ خود اختیار کی۔ ان سب میں ابوالفضل، بہر حال، ایک ممتاز حیثیت کا مالک ہے اور اس نے دورِ وسطیٰ کی تاریخ نگاری کی روایتوں پر اپنا ایک نقش چھوڑ دیا ہے۔

اس کو خاص طور سے ممتاز مورخ کا خطاب دینے کا اصل سبب یہ ہے کہ اس کی تحریروں پر عقلی عنصر غالب تھا، اس نے مذہبی اور تہذیبی روایتوں کی طرف نہیں، بلکہ بڑے نمایاں طور سے دلیلوں کی طرف توجہ مبذول کرائی، تاریخ کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر زیادہ وسیع تھا، اس نے اپنے زمانے کی تاریخ کی ترجمانی اس دور کی سیاسی اور انتظامی حقیقتوں کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی۔ اس نے تاریخ نگاری کے ایک نئے طریقے کو اپنایا جس کا اطلاق اس

Marfat.com

نے اپنی تحریروں پر کیا، اور اس کی نثر کا ادبی اسلوب سب سے جدا اور بڑے اعلا درجہ کا تھا۔ آخری اور بحیثیت مورخ اس کا سب سے نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ وہ اکبر نامہ اور آئینِ اکبری کے صفحات کے ذریعے اکبر کی عظمت کو ایک نمایاں اور ٹھوس شکل دینے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ برنی اور بدایونی اپنے زمانے کی اس رُوح، جس کو وہ ظاہر کرنا چاہتے تھے، کی گرفت کرنے میں اس پر سبقت لے گئے۔ اس طرح نظام الدین احمد اور فرشتہ زیادہ کامیاب مورخ مانے جا سکتے ہیں، کیونکہ انھوں نے اپنے موضوعات کے بارے میں غیر جانبدارانہ رویّہ اختیار کیا، اور حقائق کو زیادہ معروضی طور سے وضاحت کے ساتھ تحریر کیا۔ یہ ماننے میں بھی کسی کو جھجک نہیں ہونی چاہیے کہ خفی خاں بجا طور پر اس کی تعریف کا مستحق ہے "کہ اس نے ان حالات کو سمجھ لیا اور تحریر کر دیا جن کی بنا پر سماج میں یا انتظامی اداروں میں تبدیلی آئی، اور اس نے ان تعلقات کو بھی سمجھ لیا جو سماج اور انتظامی اداروں میں پائے جاتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ابوالفضل میں بحیثیت مورخ یہ خوبیاں نہ ہوں۔ لیکن اس کے علاوہ دورِ وسطیٰ کا کوئی مورخ یہ دعوا نہیں کر سکتا کہ تاریخ کی بابت اس کا رویّہ عقلی اور معروضی تھا، اور اس نے حقائق جمع کر کے تنقید و تحقیق کی بُنیاد پر انھیں ترتیب دینے کا نیا طریقہ اپنا لیا تھا۔ یہی باتیں ابوالفضل کی تاریخی تحریروں پر مہر تصدیق کی طرح ثبت ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس نے کثیر تعداد میں ایسے حقائق تحریر کرے، جن کا تعلق سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی زندگی سے تھا، اور انتظامی ضابطوں، نیز کارروائیوں اور مختلف صوبوں کے جغرافیائی حالات پر ابواب شامل کر کے، تاریخ کا دائرہ اور زیادہ وسیع کر دیا۔ اس نے بڑی جان فشانی سے مواد جمع کیا، اور بڑی احتیاط کے ساتھ تحقیق و تفتیش کرنے کے بعد وہ حقائق اکٹھے کیے جو اہم تھے، اور پھر انھیں واضح اور باضابطہ انداز میں پیش کیا۔ اس نے ہر مآخذ کے صحیح ہونے پر شک کیا، اور اُسی وقت اُسے تسلیم کیا جب وہ تاریخی تفتیش کے ان اصولوں پر پورے اُترے جو اصول خود اس نے وضع کیے تھے۔ دوسرے

Marfat.com

لفظوں میں یہ کہنا چاہیے کہ اس نے تاریخ کے ادراک اور اس کی ترجمانی کے لیے ایک نئی بولی تحقیق کی اس کی وسعت اور رسائی میں اضافہ کیا، اور تاریخی تحقیق کے اصول مرتب کیے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابوالفضل کی تحریروں میں ہمیں ایک فلسفۂ تاریخ ملتا ہے، یعنی تاریخ کے مزاج اور مقصد کے بارے میں ایک ٹھوس تصور ملتا ہے، تاریخ کی ترجمانی کے اصول ملتے ہیں اور تاریخی حقائق جمع کرنے اور انتخاب کرنے کا تنقیدی ساز و سامان ملتا ہے۔

بحیثیت مورخ ابوالفضل کے جن کارناموں کا خلاصہ مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے وہ کسی بھی معیار سے موثر ہیں۔ بہرحال جب ہم بحیثیت مورخ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کررہے ہوں تو ہمیں اس کی بعض محدودات کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ اس کی محدودات کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اکبر کا منہ لگا درباری اور لائقِ اعتبار معتمد تھا، اس کی تاریخ سرکاری نوعیت کی تھی۔ خواہ یہ دکھاوا ہو یا حقیقت لیکن وہ اکبر کو انسانِ کامل اور مثالی بادشاہ سمجھ کر اس کی تعظیم کرتا تھا۔ ایک ایسا درباری اور سرکاری مورخ ہونے کے ناطے جو اکبر کے لیے جذبات تعظیم رکھتا ہو، ابوالفضل اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا کہ اس کی سرگرمیوں، پالیسیوں اور اقدامات کی حمایت اور تعریف کرے۔ اس جوش میں کہ اپنے ہیرو کو کامل اور مثالی بادشاہ ظاہر کرے وہ اکثر دلیل، اعتدال اور ضبط کے احکامات نہیں سن پاتا۔ اسی بنا پر اس کا بیان نہ صرف جانبدارانہ ہو گیا ہے بلکہ بعض اوقات گھٹ کر قصیدہ گوئی بن گیا ہے۔

ابوالفضل شیخ مبارک کا بیٹا، 14 جنوری 1551ء کو بمقام آگرہ پیدا ہوا تھا۔ اسے غیر معمولی ذہانت عطا ہوئی تھی اور اوائل عمری ہی میں قبل از وقت دماغی نشو و نما کی علامتیں ظاہر ہو گئی تھیں۔ اس نے اپنے والد کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی جو اس زمانے کے نہایت باکمال علما میں ہوتے تھے۔ شیخ مبارک کے علم و فضل، ان کی وسیع النظری نیز آزاد خیالی اور صوفیانہ طریقۂ زندگی سے لگاؤ کے باعث ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ ابوالفضل پر شیخ مبارک کی شخصیت کی چھاپ بڑی گہری اور دائمی تھی۔ ابوالفضل نے پندرہ سال کی

Marfat.com

چھوٹی عمر میں علم کی ان ساری شاخوں پر قدرت حاصل کر لی تھی جنھیں منقول کہا جاتا تھا۔
سال کی عمر میں اس نے خود درس دینا شروع کر دیا تھا۔

سب اہم واقعہ جس نے ابوالفضل کے مذہبی اور سیاسی نظریے پر بڑا گہرا نقش چھو
وہ طویل اذیت تھی، جو اُسے اور اس کے خاندان کو طاقتور علماء کے ہاتھوں اُٹھانی پڑی۔ شیخ
مبارک پر مہدوی بلکہ شیعہ ہونے کا شبہ کیا گیا۔ لیکن ابوالفضل اپنے والد کے خلاف ان
الزامات کی تردید کرتا ہے! یہ اذیت تقریباً دو دھائیوں تک جاری رہی، اور اس کے خاندان
کو مفروروں کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا، جن سے نہ کوئی دوستی کرتا تھا نہ پناہ دیتا تھا
بہر حال، 1570ء کی دھائی کے ابتدائی برسوں میں تکلیف کے دن ختم ہوئے۔ 1574ء میں اکبر
نے اس خاندان کو بُلایا اور اپنی حفاظت اور سرپرستی میں رکھا۔ خود ابوالفضل کو 1974ء
میں فیضی کے بھائی کی حیثیت سے اکبر کے سامنے پیش کیا گیا، جس نے اسے عنایتِ خاص
سے نوازا۔ کچھ عرصے کے بعد ابوالفضل نے ایک درباری کی حیثیت سے شہنشاہ کی مُلازمت
اختیار کر لی۔

ایسا لگتا ہے کہ شہنشاہ کی مُلازمت اختیار کرنے کا فیصلہ کرنے سے پہلے ابوالفضل
ایک شدید اور گہری ذہنی کشمکش میں گرفتار رہا۔ وہ اس بات پر غور کرتا رہا کہ درباری بننے
میں کیا دانائی اور معقولیت ہے۔ اس زمانے میں صوفیوں اور دانشوروں کی روائتیں شاہی
ملازمت کے سخت خلاف تھیں۔ ابوالفضل کے ذہنی میلانات اور غور و فکر نیز مراقبے کے
ذریعے بُنیادی سچائی کے حصول کی آرزو نے اس کے اس عزم کو مزید تقویت پہنچائی کہ ایک
فلسفی اور تارک الدنیا کی طرح زندگی گزارے۔ ایک درباری کی زندگی ابوالفضل کی
رُوحانی آرزوؤں سے تعلق رکھنے والی روایت کے یکسر خلاف تھی۔ بہرکیف، شیخ مبارک اور
فیضی کے مستقل اصرار، اور ساتھ میں دُنیاوی ترقی کی توقعات اور امکانات، نے اس
کشمکش کو ختم کر دیا۔ ابوالفضل کو آمادہ کر لیا گیا کہ وہ ایک درباری کی غلامانہ زندگی

Marfat.com

...ول کرے۔[2] یہ اس کی زندگی اور ترقی میں نقطۂ انقلاب ثابت ہوا۔ اس کا شاہی منصب ...رفتار سے طویل مدت میں بڑھا۔ اس نے اپنی ترقی بیس کے منصب سے شروع کی اور ...15ء میں یہ منصب بڑھ کر ایک ہزار ہو گیا۔ آخر کار اسے پانچ ہزار کا منصب حاصل ہوا، ...ن اسی سال اگست 1602ء میں وہ شہزادہ سلیم کی شہ پر قتل کر دیا گیا۔

ابوالفضل کی ترقی کی خاص بات وہ منصب نہیں جو اسے حاصل ہوا، بلکہ وہ بڑھا ...ا اثر ہے جو اس نے پالیسیاں بنانے اور انہیں نافذ کرنے کے سلسلے میں شہنشاہ پر قائم کر لیا ...ا۔ ابوالفضل نے سب سے اہم رول یہ ادا کیا کہ مذہبی مباحثوں کو بڑے سلیقے سے کٹر علما ...خلاف استعمال کیا اور ان مباحثوں سے فائدہ اُٹھایا۔ علما نے شیخ مبارک کے خاندان کو ...ں اذیت میں مبتلا رکھا تھا۔ اس کا نقش شیخ اور اس کے بیٹوں پر ایسا لگا تھا جو کبھی ...ٹ سکتا تھا۔ اسی بنا پر وہ علما کے مخالف ہو گئے تھے۔ ابوالفضل اور فیضی نے بڑی ...رت کے ساتھ اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھایا، اپنی اعلا دلیلوں اور وسیع علم کی مدد ...علما کو اکبر کی نظروں سے گرا دیا۔ اور بالآخر انہیں مقامِ اقتدار سے گرا دیا۔ دوسری بات یہ ...لا بھی وہ مدرسہ آفات تھا جہاں ابوالفضل نے وفاداری نے وفاداری کا سبق ...ھا، جس کی وجہ سے اس کے سماجی اور مذہبی خیالات میں ایک گہری تبدیلی آ گئی۔ یہی اکبر ...دوستی کی بُنیاد بنی، اور اُس نے ابوالفضل کو ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں ایک نیا ...ر عطا کیا۔ مذہبی رواداری کا خیال اس کی تحریروں میں موجود ہے۔ مزید یہ کہ، اسی مدرسۂ آفات ...ے تحریک دلائی کہ اپنی تخلیقات کے سلسلے میں غیر معمولی کاوشیں کرے، جو بعد میں اس کے ...بڑی مفید ثابت ہوئیں، اور اپنی مخالفت کو کامیاب کرنے نیز کٹر علما کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے ...مددگار ثابت ہوئیں۔

1575ء اور 1586ء کی درمیانی دھائی اکبر کے دورِ حکومت کا نہایت ہنگامہ خیز، اور ...ے ساتھ، نہایت تشکیلی دور تھا۔ اکبر کے سامنے ایسے سیاسی، انتظامی اور مذہبی مسائل

Marfat.com

آئے جو نہایت اہم اور نتیجہ خیز تھے۔ مذہبی مسائل اور مسلم برادری میں فرمانروا کی حیثیت پر بڑے پُر جوش مباحثے ہوئے۔ عبادت خانے کے مذہبی مباحثوں نے تنقیدی تحقیق کی قوتوں کو آزاد کر دیا۔ ابوالفضل نے دلیل اور مذہبی رواداری کی حمایت کا بیڑا اُٹھایا۔ بالآخر اس مخالفت نے جس کی قیادت ابوالفضل اور حمایت اکبر کر رہا تھا، کٹر علما کو مکمل طور سے غیر مسلح کر دیا۔ وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ اکبر کی حیثیت مجتہد یا امامِ عادل کی ہے یعنی وہ مسلم برادری کا ایسا قائد ہے جس سے کوئی خطا سرزد نہیں ہو سکتی، اور وہ مسلم قانون اور مذہب کے نزاعی مسائل کی تشریح کے معاملے میں سند آخر ہے۔ کٹر علما کو با اثر عہدوں اور مقامات سے محروم کر دیا گیا۔ انھیں مذہبی معاملات کے انتظام میں جو کلیدی حیثیتیں حاصل تھیں وہ انھوں نے چھوڑ دیں۔ سخت اصلاحات کی وجہ سے صدر کی قوت اور وقار گھٹ گیا، اور مدد معاش پانے والے لوگ جو کٹر علما کے بڑے سرگرم حامی تھے' ان کا سیاسی اور اقتصادی استحکام بالکل ختم ہو گیا۔ اس طرح ابوالفضل بالآخر اپنے نظریاتی اور ذاتی مخالفین پر فتح یاب ہو گیا۔

کٹر لوگوں کے زوال میں اس نے جو رول ادا کیا اس کے محرکات میں ذاتی اسباب کے ساتھ اس کا یہ یقین بھی شامل تھا کہ کٹر لوگ متعصب ہوتے ہیں، روایت کی اندھی تقلید کرتے ہیں اور ان لوگوں پر جبر کرتے ہیں جو ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ جن اصولوں کی اس نے حمایت کی اور علماء سے لڑا، وہ اس کی تحریروں میں مختلف موقعوں پر کبھی اتفاقاً اور کبھی خصوصاً اور تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ جو چیز موجودہ مباحثے کے واسطے اہم ہے وہ یہ ہے کہ مذہبی مناظروں میں اس کی شرکت نے مذہب اور سیاست کے بارے میں اس کے نظریات کی وضاحت کر دی، اور بعد میں یہی نظریات بار بار اس کی تحریروں میں نظر آئے۔ ایک اور چیز اس کی تاریخی تحریروں پر اثر ڈالا، اس کی فاضلانہ تربیت و مزاج اور فلسفیانہ غور و فکر کو ترجیح دینے کی عادت تھی۔ اس نے اسے ترغیب دی کہ ان چیزوں کے مقابلے میں جو حقیر اور معمولی لگتی ہوں

Marfat.com

ان چیزوں کا انتخاب کرے جو اہم اور سنجیدہ ہوں۔ چنانچہ اس کی تحریریں تعلیمات اور فلسفیانہ خیالات سے بھری ہوئی ہیں، اور اس کے فنِ تاریخ نگاری کا ایک حصّہ ہیں۔ اس کے ذہنی میلان نے بھی بڑی حد تک اس کا اسلوبِ بیان بنایا اور اس کی ادبی قدر و قیمت طے کی۔ اس نے جیسا کہ اکبرنامے میں بیان کیا ہے، معدودے چند لوگوں کے لیے لکھا۔ اسے اس سے غرض نہ تھی کہ اس کے زمانے کے عقلا کی اکثریت اس کی زبان اور اسلوب نہ سمجھ سکے۔

ابوالفضل کے سیاسی اور مذہبی نظریات دو باتوں کی وجہ سے لائقِ توجہ ہیں۔ پہلی بات یہ کہ ان ہی کی بنا پر اس نے اہم تاریخی حقائق کا انتخاب کیا۔ دوسری بات یہ کہ انھوں نے مضامین کے اندازِ بیان پر اثر ڈالا۔ یہ سچ ہے کہ ابوالفضل نے ہر حقیقت کی بڑی احتیاط سے تصدیق کی لیکن حقائق کا انتخاب اور ان کی جانچ پرتال نیز پیش کرنے کا انداز، یہ دونوں ہی چیزیں اس نظریے کے رنگ میں رنگ گئیں جو نظریہ اس نے وقت کے سیاسی اور مذہبی مسائل کے بارے میں قائم کیا تھا۔

ابوالفضل یہ اصول مان کر چلتا ہے کہ بادشاہ بنیادی طور پر مقدّس ہوتا ہے۔ یہ وہ روشنی ہوتی ہے جو خود خدا سے پھوٹتی ہے۔ بادشاہ کو اپنا مقام بغیر کسی شفاعت اور استحقاق کے خدا کے فضل و کرم سے نصیب ہوتا ہے۔ سماج کی مخالف قوتوں کو قابو میں رکھنے کے لیے یہ ادارہ ضروری بھی ہے اور پسندیدہ بھی۔ اس ادارے کی غیر موجودگی میں سماج کی وہ قوتیں جو ایک دوسرے کی مخالف ہیں خود کو برباد کرنے والی جدوجہد میں پڑ کر تباہ ہو جائیں گی۔ لیکن بادشاہت بادشاہ کے ہاتھوں میں کھلونا نہ بننا چاہیے جس سے اُسے ذاتی تسکین، مادّی عیش اور ہوسِ قوت و وقار ملے۔ اس کے برخلاف بادشاہ کو چاہیے کہ خود کو اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دے [3] اُسے چاہیے کہ ایسی دُنیا میں جو مخالف قوتوں سے پُر ہے نظم و ضبط قائم کرے۔ بادشاہ کو منصب مزاج، عقل مند اور بہادر ہونا چاہیے، اور اس میں بڑی جسمانی قوت ہونی چاہیے۔ رواداری، وسیع النظری اور قوی احساسِ عدل وہ

Marfat.com

خوبیاں ہیں جو ایک مثالی بادشاہ میں ہونا ضروری ہیں۔ ابوالفضل کے لیے یہ بات بڑی باعث اطمینان تھی کہ اسے اکبر کی ذات میں ایسا مثالی بادشاہ مل گیا۔ اس سے زیادہ یہ کہ اکبر میں وہ خوبیاں بھی موجود تھیں جو لوگوں کی مذہبی اور دُنیاوی دونوں طرح کی حاجتیں پوری کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

اکبر جو اتحاد، استحکام اور اچھی حکومت کی ان قوتوں کا نمونہ تھا جو قوتیں معاشی خوشحالی، امن و سلامتی، مذہبی آزادی اور سب سے رواداری کی ضامن تھیں۔ اس اکبر کی قیادت میں مغل سلطنت کی قدر و قیمت کا جو اندازہ ابوالفضل نے کیا وہ فطری طور پر اس کے بنیادی، سیاسی نظریات کا نتیجہ تھا۔ مندرجہ بالا سطور سے فطری طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لوگوں کی مذہبی، سیاسی اور معاشی ضرورتوں کے پیشِ نظر توسیعِ سلطنت کی پالیسی نہ صرف ضروری تھی بلکہ امن پسند بھی تھی۔ لہٰذا ابوالفضل کے وہ سیاسی نظریات جو بار بار اس کی تحریروں میں بیان کیے گئے ہیں، مغلوں کی توسیعِ سلطنت کی پالیسی کا اخلاقی نیز عقلی جواز فراہم کرتے ہیں۔

ابوالفضل کے مذہبی نظریات اس کے ہمعصروں کی طرح مغل تاریخ کے طالب علموں کے لیے بھی ایک معمہ ہیں۔ ابوالفضل کے بارے میں اس کے ہمعصروں کے خیالات کا خلاصہ معاصر الامراء کے مصنف نے پیش کیا ہے۔[4] خانِ اعظم نے ایک مادۂ تاریخ میں اسے باغی رسول کہہ کر پکارا ہے۔ ابوالفضل کے بارے میں جہانگیر کی بھی یہی رائے تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ ابوالفضل ملحد تھا۔ اس پر الزامات تھے کہ وہ ہندو تھا، آتش پرست تھا، لادین تھا اور دہریہ تھا۔ بہرحال معاصر الامراء کے مصنف کے مطابق یہ کہنا زیادہ دُرست تھا کہ وہ "صلحِ کل" میں یقین رکھتا تھا اور آزاد مفکر تھا جو ہر مذہب کو اچھا مانتا تھا۔ الممارۂ عباسی کے مصنف نے اسے نقطوی کہا ہے۔[5] عرفی کے خیال میں یہ دونوں بھائی لوگوں کو ارتداد کی راہ پر ڈالنے کے ذمہ دار تھے۔ ابوالفضل خود یہ اعتراف کرتا ہے کہ اس نے "صلحِ کل" کی راہ اختیار کر لی تھی۔[6] آئین اکبری

Marfat.com

میں ایک جگہ اس نے اپنے بارے میں موافق اور مخالف دونوں طرح کے ہمعصروں کے اخلاقی نظریات کا حوالہ دیا ہے۔ یہ حوالہ اس لائق ہے کہ ذرا تفصیل سے نقل کیا جائے۔

"حالانکہ مبارک کا بیٹا آج کل سببِ آزردگی ہے اور اسے نوعِ انسانی کے لیے خطرہ سمجھا جاتا ہے، اور اس کے بارے میں محبت اور نفرت کے جھگڑے کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے، لیکن اللہ کے ماننے والے جو حق کے متلاشی ہیں اسے ابوالوحدت کا لقب دیتے ہیں اور رازقِ اعلیٰ کا خادم بے مثال سمجھتے ہیں۔ میدانِ شجاعت کے سورما اسے ابوالہمّت گردانتے ہیں اور دنیاوہ معاملات میں اس کی نفس کشی کو عجائبات میں شمار کرتے ہیں۔ دانائی اسے ابوالفطرت کہتی ہے اور اسے خانۂ برتر کا نادر نمونہ خیال کرتی ہے۔ بازاری ریوڑ کی ان تحریروں میں جو جہلا کے پرشور بازاری اڈّوں کے مصداق ہیں، کچھ لوگ اس سے دُنیاداری کو منسوب کرتے ہیں اور اسے ان لوگوں میں شمار کرتے ہیں جو اس گرداب میں پھنس چکے ہیں، جبکہ کچھ اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تشکک اور ارتداد کا شکار ہو چکا ہے، اور یہ سب لعنت ملامت کرتے وقت ایک ہو جاتے ہیں۔

"میرے بارے میں سینکڑوں افواہیں اُڑائی جاتی ہیں اور اگر میں جواب میں ایک لفظ بولتا ہوں تو ساری دُنیا تکنے لگتی ہے۔ بحمداللہ زندگی کے عجیب نشیب و فراز پر نظر رکھنے کی وجہ سے میں ان لائقِ تعظیم رُجحانات سے ذرا نہیں ہٹتا، نہ ان دونوں کے حق میں دُعائے خیر سے مُنہ موڑتا ہوں جو الزام دیتے ہیں اور جو تعریف کرتے ہیں، اور اپنی زبان تعریف یا ملامت سے آلودہ نہیں کرتا۔"[7]

اکبر نامہ اور آئینِ اکبری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ عقلیت پسند اور آزاد مفکر تھا۔ وہ بالآخر دلیل کی طرف توجہ مبذول کراتا تھا۔ وہ ان کا مذاق اُڑاتا ہے جو روایتوں یا رواجوں کی طرف توجہ دلاتے تھے یا ان رایوں کی طرف توجہ دلاتے تھے جو مذہبی کتابوں میں

Marfat.com

دی گئی ہیں۔ وہ انھیں تقلیدی کا لقب دینا یعنی پُرانی روایتوں اور نصیحتوں کو ماننے والے لوگ۔ وہ انھیں بے وقوف اور جاہل سمجھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کٹر علما، تقلیدی تھے، کیونکہ وہ پُرانی روایتوں اور مقدس قانون نیز عملِ رسول کی طرف توجہ مبذول کراتے تھے۔ وہ یہ نہیں سمجھ پائے کہ وقت کے ساتھ مذہب اور قانون کی کتابوں میں دی ہوئی سچائی فرسودہ اور متروک ہو چکی۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ لگتا ہے کہ ابوالفضل خاصہ مذہبی آدمی رہا۔ یہ بیان کرنا مشکل ہے کہ خدا اور دوسرے مذہبی تصوّرات کے بارے میں اس کے قطعی نظریات کیا تھے۔ لیکن اس کی تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک خدائے واحد میں یقین رکھتا تھا۔ اور صوفیوں نیز ان کے رُوحانی جوہروں کی قدر کرتا تھا۔ مذہبِ ظاہری اور اس کے قانون نیز مذہب کی بنیاد پر بننے والے سماجی رواجوں کی قدر وہ بادل ناخواستہ کرتا تھا، اور ایک طرح سے ان کا مذاق اُڑاتا تھا۔ لہٰذا مسلمان عام طور پر اور کٹر لوگ خاص طور پر یہ شبہ کرتے تھے کہ وہ اسلام پر ایمان نہیں رکھتا ہے۔ بہرکیف اس کے خلاف دہریہ ہونے کا الزام دلیلوں سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خدائے واحد میں یقین رکھتا تھا لیکن مذہبِ ظاہری کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا، اور مذہب کے روحانی عنصر پر زور دیتا تھا۔ مذہبی نظریات کی بنا پر کٹر لوگوں سے اس کا سیدھا ٹکراؤ لامحالہ ہو گیا۔ اس مقابلے میں بالآخر ابوالفضل جیتا۔ لیکن اس صورت سے کہ علما اور مسلمانوں کی اکثریت اس کے خلاف ہو گئی۔ وہ اسلام، رسول، روایت اور مسلم قانون کا دُشمن مشہور ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ سماج میں اس کی حیثیت ایسی نہ تھی جس پر لوگ رشک کرتے، چنانچہ وہ مجبور ہو گیا کہ آئینِ اکبری اور اکبر نامہ میں اپنے نظریاتی موقف کی تشریح و توضیح کرے اور اسے حق بجانب ثابت کرے۔ چنانچہ اس کی کتابوں میں مذہبی آزاد خیالی پر، "صلحِ کل" کے اصول پر، اور روایت کے مقابلے میں دلیل کی برتری پر مباحثے ملتے ہیں۔

مذہب کے بارے میں اس کی آزاد خیالی آئینِ اکبری کی ایک عبارت میں دی ہوئی

Marfat.com

ہے، جس کا عنوان ہندوستان کے لوگوں کی حالت ہے۔ اس عبارت کے خاص نکات کا مندرجہ ذیل خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

(۱) ہندو اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی تلخی اور مخالفت کا اصل منبع یہ خیال تھا کہ ہندو شرک کرتے تھے، یعنی خدا کی صفات انسانوں اور ان کے بتوں سے منسوب کرتے تھے۔ ابوالفضل پُر زور لفظوں میں کہتا ہے کہ ہندوؤں کے خلاف یہ الزام بے بنیاد تھا۔ بڑی احتیاط سے تحقیق و تفتیش کرنے پر یہ ظاہر ہوا کہ ہندو ایک خدا کے تصوّر کے حامی تھے۔

(2) اس کے باوجود غلط فہمی کی جڑیں بہت گہری تھیں اور اس بنا پر بڑی شدید مخالفت رہی بلکہ قتل و خون بھی ہوا۔

(3) اس غلط فہمی کے بہت سے اسباب تھے۔

(ا) ایک دوسرے کی زبان اور طریقۂ فکر کے بارے میں قطعی لاعلمی۔

(ب) تحقیق و تفتیش کے ذریعے اندرونی سچّائی کو پہچاننے کے بارے میں اکثریت کی بے دلی۔

(ج) مروّجہ روایتوں کے بارے میں زیادہ تر لوگوں کا عقلی طرزِ فکر اختیار کرنے کے بجائے انھیں محض تسلیم کر لینا، کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ پُر احتیاط تحقیق کے ذریعے حاصل کیا ہوا اِدراک کفر کے مترادف ہوتا ہے۔

(د) مختلف مذاہب کے عالموں اور داناؤں کو مل بیٹھنے کے موقعوں کی کمی، جہاں وہ ہمدردی اور معاملہ فہمی کے ماحول میں تبادلۂ خیالات کر سکیں اور نزاعی نظریات کے بارے میں ان کی خوبیوں اور بُرائیوں کے مطابق فیصلہ کر سکیں۔

(ر) وہ حالات پیدا کرنے کے لیے بادشاہ اوّل نے بھی کوئی پیش رفت نہ کی جو آزادانہ تبادلۂ خیالات کے واسطے لازمی تھے، جن حالات میں اہلِ علم حق

Marfat.com

کو صاف لفظوں میں بتا سکتے تھے۔

(س) عقل اور نیک مزاجی کی کمی کے باعث لوگ خود کو کمینگی اور درندگی کی حد میں داخل ہونے سے نہ روک سکے انھوں نے دوسروں کے مذہب میں دخل دیا، انھیں قتل کیا اور انھیں بے عزت کیا۔ وہ یہ محسوس نہ کر سکے کہ مذہبی جبر خلافِ عقل اور فضول تھا۔ اگر مخالفین غلط راہ پر بھی تھے، تو ایسا لاعلمی کی بنا پر تھا، اور اس لیے وہ لحاظ اور ہمدردی کے مستحق تھے نہ کہ نفرت اور قتل و خون کے۔[8]

جن نظریات کا خلاصہ مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے ان سے پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے کہ ابوالفضل مکمل مذہبی رواداری میں یقین رکھتا تھا اور ہندوؤں کو ایک خدا پجاری سمجھتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ، وہ اس وقت تک تسلیم شدہ نظریات اور روایتی عقیدوں کو ماننے کے تیار نہ تھا جب تک وہ دلیل کے تقاضے پورے نہ کر دیں۔ اندرونی سچائی دلیل کی بنا پر کی جانے والی تحقیق کے ذریعے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ مذہبی اختلافات کے لیے جبر کرنا فضول اور خلافِ عقل تھا، کیونکہ وہ لوگ بھی شرک کے مجرم تھے لاعلمی کی بنا پر گناہ کے مرتکب ہوئے اور اس لیے لاحق ہمدردی تھے۔ اس نے بادشاہ کے ایسے سیاسی اقدامات کی تائید کی جن کی مدد سے مختلف مذاہب کے عقلا اور فضلا کے درمیان آزادانہ تبادلۂ خیالات کے واسطے ضروری حالات پیدا ہو سکیں۔ اور تاکہ وہ غلط فہمیاں دُور ہوں جن کی بنا پر نفرت اور مخالفت پیدا ہوتی ہے۔

مذہب کے بارے میں ابوالفضل کے عقل اور بے تعصب نظریے نے اس کے تاریخی کاموں پر خاصہ اثر ڈالا۔

تاریخ کے بارے میں نظریات

ابوالفضل نے اکبر نامہ کی دوسری جلد میں تاریخ اور فنِ تاریخ نگاری کے بارے

Marfat.com

میں اپنے خیالات کا قدرے تفصیل سے اظہار کیا ہے۔ اس کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب اور فلسفہ طویل عرصے تک اس کی ذہنی کاوشوں کا مرکز رہے۔ تاریخ میں اس کے لیے کوئی جاذبیت نہ تھی، اور وہ اسے معمولی قدر کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ وہ اس کے نزدیک دیومائی کہانیوں سے زیادہ بہتر نہ تھی۔ تاریخ کا مطالعہ لاحاصل تھا اور اس کے وقت ضائع ہوتا تھا۔ اس کے مطالعے سے حق تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ مزید برآں، ماضی میں جو تاریخیں لکھی گئیں تھیں ان میں بہت سے عیب تھے۔ وہ اُن خود غرض اور مطلبی لوگوں نے تصنیف کیں جنھوں نے ذاتی فائدوں کی خاطر غلط بیانات تحریر کیے اور جھوٹ کو سچ میں گڈمڈ کر دیا۔ وہ مصنفین جو ایماندار اور دیانت دار تھے، نیک نیت لیکن سادہ لوح تھے اور اُن کو دُرست معلومات نہ تھی۔ لہٰذا اُن کے بیانات احمقانہ اور مضحکہ خیز تھے۔ مزید یہ کہ، وقت کے ساتھ اصل ماخذ غائب ہوتے گئے۔ تاریخ نگاری کے لیے خصوصاً اس صورت میں جب مورخین میں تنقیدی تحقیق کا جوہر بھی کم ہو، یہ ایک بڑی روکاوٹ تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ بعض مورخین نے کچھ اپنی طرف سے بھی جوڑ دیا۔ چنانچہ وہ باتیں جو غیر معتبر اور غلط تھیں انھیں تاریخ سمجھ لیا گیا غلط بیانات پر مشتمل تاریخوں نے قاریوں کی ایک بڑی تعداد کو گمراہ کر دیا۔ تنقیدی نظر کی کمی کے باعث ماضی کی بابت ان میں ایک ایسا رویّہ بن گیا جو گمراہ کُن تھا اور جس نے لوگوں کو بڑا نقصان پہنچایا۔

تاریخی کتابوں کے بارے میں عام انداز کی یہ تنقید صریحاً تاریخ اسلام اور ہندوستان کے مسلم فرمانرواؤں کے ضمن میں کی گئی ہے۔ اس تنقید کا یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ ابوالفضل اپنے سے پہلے کے ان مصنفین سے بالکل متفق نہ تھا۔ جنھوں نے مسلمانوں کی فتحِ ہندوستان کا حال لکھا اور مسلم فرمانرواؤں کی سرگرمیوں کا ذکر کیا۔ انھوں نے تاریخِ ہندوستان کو اس تصادم کی حیثیت دی جو ہندوؤں اور اسلام کے حامیوں کے درمیان ہوا۔ تاریخِ ہندوستان کی اسی تشریح کی بنا پر سابقہ مورخین نے لوگوں کو گمراہ کیا تھا، اور ہندوستانی سماج

Marfat.com

کو بہت بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ لگتا ہے کہ ابوالفضل کی تنقید اسلامی تاریخ اور اسلامی اداروں سے تعلّق رکھنے والے ان حقائق کے خلاف بھی تھی جو اس کی نظر میں خلافِ عقل تھے۔

یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ایک خاص زمانے میں ابوالفضل تاریخ کے بارے میں خود اپنے اپنے نظریات پر شبہ کرنے لگا تھا۔ اس نے پورے مسئلے پر اچھی طرح غور کیا اور پھر اس غور و فکر کے نتیجے میں اس کی جانب اپنا رویّہ بدل دیا۔ آہستہ آہستہ اسے یہ یقین ہونے لگا کہ انسان کے سابقہ تجربات اور کارنامے، جو تاریخ کی کتابوں میں دبے ہوئے ہیں، واقعی روشن خیالی اور دانائی کا منبع تھے۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ تاریخوں میں عارفوں اور فلسفیوں کا علم اور دانائی تحریر کی گئی اور اس طرح انھیں آنے والی نسلوں کے سُپرد کر دیا گیا۔ لہٰذا تاریخ اپنی کُھلی ہوئی محدودات کے باوجود لائقِ ذوق ہے۔

مزید برآں، ابوالفضل کے مطابق، تاریخ دلیل کی غذا اور قوت کا ذریعہ ہے۔ اسے معقول اور منقول کے درمیان ایک حقیقی رشتہ نظر آتا ہے۔ وہ یہ اصول مان کر چلتا ہے کہ عرفان یعنی حصولِ حق، انسان کی زندگی کا بنیادی مقصد ہے۔ یہ محض دلیل کی روشنی سے ممکن ہے۔ لیکن خود دلیل حسوں کے ذریعے روشنی حاصل کرتی ہے، خاص طور پر آنکھ اور کان کے ذریعے یعنی دیکھ کر اور سُن کر۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے حالات دیکھ اور سُن کر، جنھوں نے ماضی میں زندگی بسر کی، دلیل کو تقویت ملتی ہے۔

آخری بات یہ کہ، تاریخ کے مطالعے سے افراد کو احساسِ رنج والم پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے۔ ابوالفضل تاریخ کا مقابلہ شفاخانے سے کرتا ہے۔ جہاں کوئی بھی شخص اپنے دُکھ کی دوا اور غم کا مداوا حاصل کر سکتا ہے۔ اس دُنیا میں جہاں روابطِ باہمی عام طور سے درد والم کا سبب بن جاتے ہیں، وہ بدنصیبوں اور دُکھ کے ماروں کو تسلّی دیتی ہے۔

Marfat.com

تاریخ کے بارے میں ابوالفضل نے جو نظریات پہلے قائم کیے تھے اور جن کا خلاصہ دیا جا چکا ہے، ان کا جائزہ لیا جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کے معاملے میں عقلی طرزِ فکر کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ اس کا ذہن اس بارے میں بھی صاف تھا کہ جو حقائق اور بیانات کسی تاریخی کتاب میں شامل کیے جائیں وہ اصل مآخذوں پر مبنی ہونے چاہئیں، اور حقائق کو نہایت احتیاط کے ساتھ تحقیق و تفتیش کرنے کے بعد ہی تحریر کرنا چاہیے۔ اگر کوئی عقلی رُجحان اور تنقیدی صلاحیت کی کمی کی بنا پر حقیقت اور افسانے میں تمیز نہ کر سکے، تو اس کی کتاب ناقص ہوگی اور کسی حالت میں کہانیوں کے اس مجموعے سے زیادہ اہمیت نہ ہوگی۔ جس میں فرضی باتوں کا ذکر کیا گیا ہو۔ جن تحریروں میں حقائق اور قصّوں کی آمیزش کر دی گئی ہے۔ انھیں تاریخ کہنا مشکل ہے۔

دوسرے درجے پر اہم ہونے کی وجہ سے یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ وہ تاریخ کو تفسیر یا فقہ سے تعلّق رکھنے والی ایک اور شاخ نہیں سمجھتا۔ درحقیقت وہ تاریخ اور فلسفے میں قریبی تعلق قائم کرنے کی جانب مائل ہے۔ اس کے نزدیک یہ دونوں نہ صرف متعلقہ مضامین ہیں، بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل اور ایک میں اضافہ کرتے ہیں۔ تاریخ کی ماہیّت کے بارے میں یہ خیال برنی اور بدایونی کے خیال سے نمایاں طور پر مختلف ہے۔ مزید برآں، ابوالفضل اس نظریے کی طرف ذرا بھی اشارہ نہیں کرتا جو مسلم مورخین عام طور پر تسلیم کرتے تھے کہ تاریخ سے محض 'ایمان والوں کو' روشنی ملتی ہے اور ان ہی کو یہ تنبیہ کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تاریخ کے بارے میں اس کا تصور دینوی نہیں بلکہ دُنیاوی ہے۔

ابوالفضل کے مطابق تاریخ میں جشن اور تقریبات نیز جنگیں اور مہمیں درج کی جاتی ہیں۔ وہ سنجیدہ اور غیر سنجیدہ دونوں طرح کی باتیں قبول کر لیتی ہے (لیکن ابوالفضل نے غیر سنجیدہ باتوں کا ذکر نہیں کیا) اس میں رحم اور ظلم، فیاضی اور بخل

Marfat.com

شجاعت اور بزدلی، ہر طرح کے افعال کا ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ لوگوں کی حالت اور حکومت کی حکمتِ عملی بیان کرتی ہے، اور اس میں داناؤں کی دانائی اور عالموں کا علم شامل ہوتا ہے ابوالفضل کے مطابق، تاریخ ان ساری تبدیلیوں کا احاطہ کر لیتی ہے جو دنیا بھر میں کہیں واقع ہوتی ہیں۔

اکبر نامہ اور آئینِ اکبری ایک ہی کتاب کے دو جُز ہیں۔ اکبر نامہ کے پہلے حصے میں اکبر کے آباؤ اجداد کا ذکر ہے اور اس کے والد ہمایوں کا ذکر بھی شامل ہے۔ دوسرے حصے میں اکبر کے دور کے چھیالیسویں سال تک کا نہایت مکمل بیان سال وار ترتیب میں دیا ہوا ہے۔ یہ کتاب 1595ء میں لکھنا شروع کی گئی، اور پانچ مرتبہ نظرِ ثانی کرنے کے بعد 1602ء میں مکمل کر دی گئی۔ آئینِ اکبری کتاب کا تیسرا حصہ ہے۔ یہ ایک بے مثل تالیف ہے جس میں ایک عظیم سلطنت کے مختلف شعبوں کے انتظام اور جانچ پڑتال کے نظام کے بارے میں معمولی ترین تفصیلات بڑی دیانت داری اور باریک بینی کے ساتھ دی گئی ہیں۔ اور اس میں سلطنت کی حدود، وسائل، حالت، آبادی، صنعت اور دولت کی وضاحت کے لیے اتنے بہت سے حقائق پیش کیے گئے ہیں کہ اتنے حقائق سرکاری ذرائع سے ہی حاصل کیے جا سکتے تھے۔[10] اس میں ہندوؤں کے دھرم اور فلسفے کے نظاموں کا بیان بھی شامل ہے، جو ان کی قدیم کتابوں میں بیان کیا گیا ہے اور ان کے سماج ریتوں اور رواجوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح، ابوالفضل نے تاریخ کی وسعت اور رسائی میں اتنا اضافہ کر دیا۔ جتنا اس سے پہلے دورِ وسطیٰ کے کسی اور مورخ نے نہ کیا تھا۔

ابوالفضل دورِ وسطیٰ کا پہلا مورخ ہے۔ جس نے اصل مآخذوں کی اہمیت کو جانا اور مانا اور بڑی غور و فکر کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا۔ کسی ایک حقیقت کی تصدیق کے لیے اس نے صرف ایک مآخذ یا صرف ایک بیان پر بھروسہ نہیں بلکہ جتنی ہو سکتی تھیں۔ وہ ساری روایتیں جمع کیں۔ انھیں تسلیم کرنے سے پہلے تنقیدی طور پر جانچا پرکھا۔ وہ

Marfat.com

کہتا ہے کہ اس نے بہت سے سوال بنا لیے تھے جنھیں وہ کسی واقعے یا حقیقت کی رواداری سے پوچھتا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ طریقۂ کار حق کی تصدیق میں مورخ کی بڑی مدد کرتا ہے"۔[11]

اس کا مآخذی مواد ان لوگوں کے بیانات پر مبنی ہے جنھوں نے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ افسران کی تیار کی ہوئی رپورٹوں، عرضداشتوں، رودادوں، شاہی فرمانوں اور دوسری دستاویزوں سے بڑی احتیاط کے ساتھ استفادہ کیا گیا۔ واقعہ نویس دربار کی کارروائی روزانہ تحریر کرتے تھے، اکبر کے دَور کے اُنیسویں برس سے اس نے ان تحریروں سے بڑا مواد حاصل کیا۔[12]

اسے جنگی مہموں، انتظامی اقدامات اور دوسرے واقعات کے بارے میں مختلف ذریعوں سے معلومات، تحریری بیانات اور رپورٹیں ملیں[13] اس نے اہم عہدیداروں، بلند مرتبہ لوگوں، صاحبِ علم معززین اور شاہی خاندان کے بوڑھے افراد سے معلومات حاصل کی۔ زبانی بیانات چونکہ متضاد تھے اس لیے اس نے ان سے درخواست کی کہ بیانات تحریر کر دیں۔ چنانچہ اس نے ایسے اشخاص سے تحریری بیانات حاصل کر لیے جو اپنی سنجیدگی، اعتدال اور دیانت داری کے لیے مشہور تھے۔ اس نے ان بیانات کو بڑی احتیاط کے ساتھ جانچا اور انھیں دلیل کی کسوٹی پر کسا۔ ممتاز اشخاص نے جو متضاد بیانات دیے تھے وہ شہنشاہ کو سُنائے گئے۔ جس نے بعض مخصوص بیانات کی تصدیق کی اور بعض میں ضروری اصلاح کے مشورے دیے۔ اسی طرح وہ بیانات بھی بادشاہ کے سامنے رکھے گئے جو خود مصنّف کے ذاتی علم اور تجربے کی تردید کرتے تھے۔ تاریخی تفتیش کے اِسی عمل کے ذریعے حق کی تصدیق کی گئی اور اسے تحریر کیا گیا۔[14]

مورخ کی حیثیت سے ابوالفضل کی کامیابی اور ناکامی کا معیار بڑی حد تک ان حالات کی مدد سے طے کیا گیا ہے جن حالات میں اس نے اپنا کام کیا۔ اس کی محدودات اور کارناموں دونوں کی جڑیں اس کی سماجی حیثیت، اس کی تعلیمی تربیت اور کمالات،

Marfat.com

نوعمری میں اس کے تجربات اور اس کے مذہبی نیز سیاسی نظریات میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ اس نے اپنے دور کے سیاسی اور مذہبی مسائل میں سرگرمی کے ساتھ دلچسپی لی، اور اُن مسائل کے بارے میں اس نے جو نظریہ قائم کیا تھا اس کی بنا پر اس نے اپنی عظیم کتاب کے مواد کو ایک خاص شکل میں پیش کیا۔

پہلی بات جس کی طرف پہلے توجہ دلائی جا چکی ہے، یہ ہے کہ وہ اکبر کا نہایت منظورِ نظر درباری اور دوست تھا، اور ان قوتوں کے خلاف اکبر کا حامی تھا جنھوں نے مغل سلطنت کے نئے تصوّر کو چنوتی دی تھی۔ وہ اکبر کا لائقِ اعتبار معتمد اور راز دار تھا۔ اسی کے ساتھ، جیسا کہ زوردار لفظوں میں اس کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے، اس کے دل میں واقعی اکبر کے کردار اور شخصیت کے بارے میں تعظیم اور تکریم کا جذبہ موجود تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ رویّہ جزوی طور پر ذاتی ترقّی کے خیال سے بنا ہو، لیکن لائقِ توجّہ اہم بات یہ ہے کہ سیاست اور مذہب کے بارے میں اس کے نظریات اکبر کے نظریات سے ملتے جلتے تھے۔ مذہبی رواداری میں اس کے یقینِ کامل کی ابتدا عمر کے ان تشکیلی برسوں ہی میں ہو گئی تھی، جب وہ اور اس کا خاندان کٹّر علما کے ہاتھوں بدترین قسم کے جبر کا شکار تھے۔ یہی یقین اکبر کے ساتھ دائمی دوستی کی بُنیاد ثابت ہوا۔ مزید برآں، چند ہی لوگوں کو یہ شک ہو گا کہ اکبر دل و دماغ کی اعلاترین اور نفیس ترین خوبیوں سے مزین نہ تھا۔ کوئی تعجّب نہیں کہ ابوالفضل کو اکبر کی ذات میں ایک بادشاہ، ایک فلسفی اور ایک ہیرو کی خوبیاں ایک ساتھ مل گئیں۔ اکبر کے لیے ابوالفضل کی تعظیم کے اسباب کچھ بھی رہے ہوں، حقیقت یہ ہے کہ اکبر نے حکومت کی جو پالیسیاں اور اصول بنائے ان سے اس نے اپنے آپ کو پورے طور سے وابستہ کر لیا۔ مذہب کے بارے میں بھی اس نے اکبر کے نظریات کی تائید کی۔ اگر عصری مآخذوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو لگتا ہے کہ اکبر کی مذہبی اور انتظامی پالیسیاں بنانے کی اصل ذمّہ داری شاید ابوالفضل پر نہ تھی ہاں یہ درست ہے کہ اسی نے اخلاقی اور عقلی طور سے شہنشاہ کی حمایت کی تاکہ

Marfat.com

وہ سختی کے ساتھ ان پالیسیوں پر کاربند رہے جو تعصب سے خاصی پاک تھیں۔ اس کے سرکاری رُتبے، نیز مذہب اور سیاست پر اس کے اپنے نظریات کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ اکبر اور اس کی سرگرمیوں کی حمایت کرے، انھیں حق بہ جانب ثابت کرے اور ان کی تعریف و توصیف کرے۔ اس مثالی بادشاہ کی سرگرمیوں اور کارناموں کو تحریر کرنا اس کے لیے عبادت کا درجہ رکھتے تھے۔[16] اس لیے یہ بیان کہ ہر چند تفصیلات کے لحاظ سے دُرست ہے، پھر بھی جانب داری کے انداز میں لکھا گیا ہے، اور اس کا مقصد اکبر کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا اور اس کی خامیوں اور ناکامیوں کی لیپ پوت کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنی بے پناہ ذہانت، قوتِ استدلال، علم اور زبان پر اپنی قدرت کو بروئے کار لایا ہے۔ موضوعِ سخن کی وسعت، وہ بڑے مسائل جن کی وجہ سے اس زمانے کے لوگ بے چین تھے، اور اکبر کی غیر معمولی شخصیت، اُن سب نے اسے ایک ایسا موضوع اور ایسا مضمون فراہم کر دیا جو کسی طویل رزمیہ داستان کے لیے خوب موزوں تھا۔ ابوالفضل نے، زبان پر غیر معمولی قدرت کی مدد سے تاریخ اور رزمیہ داستان کو ایک ہی ادبی تخلیق میں یک جان کرنے کی کوشش کی۔ چند ہی لوگوں کو شبہ کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مورخ کی کامیابی اور ناکامی کو ناپنے کے واسطے یہی اس کا معیار تھا۔

اس ادبی کاوش کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں اکبر کے دَور کا ایک نہایت مکمل اور تفصیلی بیان مل گیا ہے۔ بحیثیت مورخ ابوالفضل کا یہ ایک نہایت غیر معمولی کارنامہ ہے کہ اس نے تاریخ کی ایک ایسی کتاب لکھی ہے جو رزمیہ داستان لگتی ہے۔ وہ ایک عجیب معمارانہ عظمت کی حامل ہے، اور اس بڑی عمارت کے اُوپر اکبر کی شخصیت چھجّے کے پتھر کی طرح جمی ہوئی ہے۔ اکبر نامہ اور آئینِ اکبری کے صفحات میں اکبر کی عظمت کو ایک ٹھوس شکل دے دی گئی ہے۔ اس میں اکبر کی غیر معمولی اخلاقی جرأت اس کی رُوحانی آرزوئیں، اس کی عظیم بصیرت، اور گہری ذکاوت کا عکس نظر آتا ہے۔ قاری اکبر کی جسمانی قوت اور دلیری، اس کے رحم

Marfat.com

اور سخت احساسِ عدل نیز بلند اقبال کی بنا پر اس کی شان و شوکت سے مرعوب ہو کر رہ جاتا ہے۔

سلطنت کے بارے میں اکبر کا ایک نیا تصور، سخت اور موزوں انتظامی اقدامات کے ذریعے لوگوں کی حالت سدھارنے کے واسطے اس کا بے انتہا شوق، اور مکمل مذہبی رواداری کے بارے میں اس کا اعلا تصور اور اس تصور پر عمل، یہ ساری چیزیں اتنے جوش کے ساتھ ایسی زبان میں تحریر کی گئی ہیں کہ اکبر زندہ جاوید ہو گیا ہے۔ اسے ہندوستانی لوگ ان روایتی بادشاہوں میں شمار کرتے ہیں جو نہایت کریم النفس اور کامیاب تھے اور جنھوں نے خود کو رعایا کی بہبودی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ چند ہی مورّخین اس خوش نصیبی کا دعوا کر سکتے ہیں۔ ابوالفضل نمایاں طور پر اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوا ہے، جو اس نے اکبر پر اپنی عظیم کتاب کے دیباچے میں تحریر کیا ہے۔

میری نظر میں یہی ابوالفضل کا سب سے نمایاں کارنامہ ہے جو اس نے اکبر کے مورّخ کی حیثیت سے انجام دیا۔ اتنا ہی اہم اس کا وہ طریقِ عمل ہے جو اس نے عصری تاریخ لکھنے کے لیے اختیار کیا۔ اس نے جانی اور مانی ہوئی تاریخی روایتوں میں کئی اعتبار سے جدّت کی وہ اس کا قائل نہ تھا کہ ہندوستانی تاریخ میں صرف ہندوستان کے مسلم فرماں رواؤں کے کارناموں کا ذکر ہو۔ نہ اس نے اسلام کے ماضی سے تعلّق قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے سابقہ مورخوں کے برعکس اس نظریے سے اتفاق نہ کیا کہ ہندوستانی تاریخ بنیادی طور پر ایک ایسی کشمکش کا احوال ہے جو اسلام اور ہندو دھرم کی قوتوں کے درمیان ہوئی۔ ابوالفضل کے نزدیک یہ تصادم مغل سلطنت اور ہندوستانی حکمرانوں کے درمیان ہوا۔ جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ دراصل اس تصادم میں ایک طرف قیام، استحکام اور اچھی سرکار کی قوتیں ایک ایسے مثالی فرماں روا کے تحت

Marfat.com

بروئے کار تھیں جو دینوی اور دُنیاوی معاملات میں لوگوں کی قیادت کرنے کا اہل تھا اور دوسری طرف بری سرکار اور انتشار کی قوتیں تھیں جن کی قیادت "زمیندار" کر رہے تھے۔ اکبر اور ابوالفضل کے نزدیک مُغل سلطنت صحیح معنوں میں ہندوستانی سلطنت تھی، کیونکہ اب اس کا تعلق محض کسی ایک نسلی گروہ، یا کئی نسلی گروہوں کے مجموعے سے نہ تھا اور نہ محض ان سے تھا جو اہلِ ایمان کہلاتے تھے۔ ہندو اور راجپوت جاگیرداروں کے مذہبی، سیاسی اور اقتصادی دعوؤں کو پوری طرح مان کیا گیا تھا۔ ان بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر ہندوستانی فرمانرواؤں کے لیے اب جائز نہ تھا کہ وہ اس شاہی ریاستی اتحاد میں شامل نہ ہوں جو ملک میں اتحاد، استحکام اور معاشی خوش حالی لائے گا۔ ابوالفضل نے راجپوتوں کے خلاف چلائی جانے والی اہم فوجی مہموں کا جس انداز سے ذکر کیا ہے اس سے وہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے جو مندرجہ بالا سطور میں بیان کیا گیا ہے۔

ہندوستانی تاریخ کے بارے میں جو نیا تصوّر قائم کیا گیا اس کا سب سے عمدہ اظہار ان بدلی ہوئی اصطلاحات سے ہوتا ہے جو شاہی سورماؤں کے لیے استعمال کی گئی ہیں۔ ابوالفضل انھیں مجاہدینِ اقبال اور سمازیانِ دولت کہتا ہے۔ انھیں مجاہدینِ اسلام اور سمازیان اسلام یعنی فاتح سپاہی، جو اسلام کی راہ میں اپنی جانیں لڑا رہے ہوں، نہیں کہا گیا۔ عصری تاریخ کو ان اصطلاحات کے ساتھ پیش کرنے کی وجہ سے دَورِ وسطیٰ کے فنِ تاریخ نگاری میں ایک نیا عنصر اُبھرا۔ یہ چیز تصوّرِ تاریخ کے لیے واقعی ایک نئی دین تھی۔ یہ بلاشبہ دُرست ہے کہ تاریخ کے بارے میں ابوالفضل کے لیے تصوّر سے زیادہ تر لوگوں کے ذہن کچھ عرصے تک نہیں بدلے۔ اس کے باوجود ہندوستانی تاریخ کے بارے میں اس کے نئے نظریے کی اہمیت دائمی ثابت ہوئی۔ اس نے مغل حکومت کی غیر مذہبی نوعیت کو مقبولِ عام کرنے میں بڑی مدد دی، اور سرکاری عہدیداروں نیز ہندو جاگیرداروں کے رویّے اور نظریے کو بھی خاص حد تک متاثر کیا۔ ہندوستانی تاریخ کے بارے میں

Marfat.com

ابوالفضل کی ترجمانی مستقبل میں پسند کی جانے لگی، اور بعد کے مغلوں کے مورخین، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمانوں، ملک کے سیاسی حالات کو اسی نظر سے دیکھنے لگے کہ یہ تصادم مغل سلطنت اور اُن لوگوں کے درمیان تھا جو اس سلطنت کے مخالف تھے۔

ہندوؤں کے قدیم فلسفے اور دھرم نیز ان کے سماجی ریت رواجوں سے ابوالفضل کو جو گہری دلچسپی تھی وہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ اس نے ہندو سماج کے ان پہلوؤں کا بڑے غور اور ہمدردی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اس کے یہ مطالعے اس کی تحریروں میں غیر جانبداری اور تاریخی معروفیت کی بہترین مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ہندو دھرم اور سماج کو صحیح تاریخی پس منظر کے ساتھ باقاعدہ طور سے سمجھنے کی کوشش البیرونی کے بعد ابوالفضل نے ہی کی۔ مزید برآں، اس نے اس زمانے کے ہندو سماج کو ہندوؤں کے خیالات کی تاریخ کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ طریقِ کار بالکل نیا تھا اور اس طریقۂ تحقیق سے ملتا جلتا ہے جو آج کل عمرانیات میں اپنایا جاتا ہے۔

ان کارناموں کی بنا پر ابوالفضل کو ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے بہترین مصنفوں میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ بہرحال جب مورخ کی حیثیت سے ابوالفضل کی صحیح قدر کا اندازہ کرنا ہو، تو جائزہ یہ ہوگا کہ اس کی کچھ محدودات بھی نظر میں رکھی جائیں۔ یہ درست ہے کہ جہاں تک منفرد واقعات کی تفصیلات کا تعلق ہے وہ قابلِ اعتبار ہے کیونکہ ان کی اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ تفتیش اور تصدیق کی۔ لیکن مضامین کو پیش کرنے کا انداز اتنا معروضی نہیں، بلکہ داخلی ہے۔ اس کے محاوروں اور اصنافِ صفت، نیز جملوں کی ساخت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مخصوص واقعے یا صورتِ حال کا اس نے اپنے طور پر جائزہ لیا اور اندازہ لگایا۔ کہ کسی فرد یا کسی واقعے یا کسی صورتِ حال کے بیں اس کا بیان اس کے اپنے فیصلے پر مبنی ہے۔ وہ ہمیشہ ان مقاصد کی تشریح کرتا ہے جن کے تحت اکبر نے کسی راجپوت فرمانروا یا کسی مسلمان بادشاہ کے خلاف فوجی اقدام کیا، اور یہ مقاصد

Marfat.com

اس طرح بیان کیے گئے ہیں جیسے وہ جائز اور قابلِ تعریف ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ اندازِ فکر تاریخی معروضیت کی شرائط کو پورا نہیں کرتا۔

اسی طرح، گو ابوالفضل دلیل کو اپنا واحد رہنما اور اصول مانتا ہے، اور ان لوگوں کا مذاق اُڑاتا ہے جو دلیل کے مقابلے میں روایت کی راہ اختیار کرتے ہیں، لیکن وہ اس اصول کا اطلاق اکبر پر نہیں کرتا۔ اکبر غیر معمولی رُوحانی خوبیوں کا ذکر کرتے وقت، یا پیش بینی سے تعلق رکھنے والی اس کی اس خوبیوں کا حوالہ دیتے وقت جو الہام کے اور مافوق الفطرت قوتوں کے مترادف تھیں، یا "اقبال مندی" کی بنا پر اکبر کے کارنامے تحریر کرتے وقت، ابوالفضل کے کان دلیل کی صدا کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔ ان کمزور لمحوں میں ابوالفضل کا ساتھ دینا واقعی تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ یہ لگنے لگتا ہے کہ پیغمبرِ دلیل خوش اعتقادی اور اوہام پرستی کا شکار ہو گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے، کہ ایسے ثبوت بھی موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بعض ایسے حقائق اور واقعات کی لیپا پوتی کرتا ہے جو اکبر کی لیاقت اور اس کی دانائی پر داغ لگا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اکبرنامہ اس منصوبے کی سخت ناکامی کے بارے میں چپ ہے جس کے تحت زمین جاگیریں خالصہ میں بدل دی گئیں اور کروریوں کا انتظام حکومت کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قابلِ زراعت زمینوں کے علاقے کے علاقے تباہ ہو گئے اور ان کے ساتھ کسان بھی تباہ ہو گئے، اور آخر کار اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کروریوں کی کوشش کے بارے میں چند جملے بھی نہیں لکھتا ہے نہ وہ یہ لکھتا ہے کہ شہنشاہ کے دَور کے چوبیسویں برس سے زمین جاگیریں پھر سے دی جانے لگیں کیونکہ یہ تجربہ ناکام ہو گیا تھا۔ بہر حال یہ حقائق بدایونی نے تحریر کیے ہیں اور نظام الدین احمد نے ان میں سے خاص خاص باتوں کی تصدیق کی ہے۔ ٹوڈرمل اور شاہ فتح اللہ شیرازی کی رپورٹ سے جو اندرونی ثبوت ملتا ہے، اور جو رپورٹ اکبرنامہ میں جُوں کے تُوں شامل کر دی گئی ہے، وہ اندرونی ثبوت بدایونی اور

Marfat.com

نظام الدین کے بیانات کی بالواسطہ تصدیق و توثیق کرتا ہے۔

اسی طرح وہ اصلاحات جو دیوانِ صدر میں کی گئیں اور لمبی مدت تک نافذ رہیں، ان کا اکبر نامہ میں شاہی فرمان کے اس خلاصے کے سوا کوئی اور ذکر نہیں ہے جو فرمان مدد معاش والی زمینوں کو جاگیر اور خالصہ کی زمینوں سے جدا کرنے کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ابوالفضل نے کیا سوچ کر آئینِ اکبری میں ان اصلاحات کا ایک مختصر بیان شامل کر دیا۔ اس بیان میں بھی اس نے بڑے عام انداز سے ان بدعنوانیوں کا ذکر کیا ہے جو دیوانِ صدر میں پائی جاتی تھیں، اور ان بڑے بڑے مسائل کا ذکر نہیں کیا ہے جن کی وجہ سے یہ سخت اصلاحات کی گئیں، جن کا مقصد یہ تھا کہ صدر کی طاقت کم کر دی جائے۔ اس بارے میں کہ ان اقدامات سے مسلمانوں کے ایک حصے کے اقتصادی اور سماجی حالات پر برے اثرات پڑے ابوالفضل جان بوجھ کر چپ رہا ہے۔ ان اقدامات کی وجہ سے مدد معاش والے طبقے کی اقتصادی حالت پر جو برے اثرات پڑے، اور جو سخت ردِ عمل ظاہر ہوا، اس کا ذکر بدایونی نے اس طبقے کے ترجمان کی حیثیت سے بڑے مدلل اور جامع انداز میں کیا ہے۔

مزید یہ کہ، عبادت خانے میں ہونے والے مذہبی مباحثے علماے اکبر کے متنفر کی ابتدا، ان سے قطع تعلق اور پھر اکبر کے مجتہد یا امامِ عادل ہونے کا اعلان، ان سارے بیانات کو درست اور مکمل سمجھنا مشکل ہے۔ ان سارے مذہبی مباحثوں میں ابوالفضل خود ایک جانب سے شریک رہا، اور دلیلوں کی اس جنگ میں علما کو بدنام کرنے اور انھیں لاجواب کرنے اور بالآخر ان کی قوت اور اثر زائل کرنے میں اسی نے خاص کردار ادا کیا۔ اس لیے اس نے شاید مذہبی تنازعوں کی بابت جو بیان دیا ہے وہ یقیناً غیر جانبدارانہ اور معروضی نہیں مانا جا سکتا۔ مزید برآں اس موضوع سے تعلق رکھنے والی عبارتیں علما کے تئیں حقارت اور تضحیک سے پُر ہیں۔ حالانکہ یہ ساری باتیں بڑی پُر تصنع اور پُر وقار زبان میں کہی گئی ہیں۔ اس کے باوجود، علما اور ان کے اصول نیز قدروں کے بارے میں

Marfat.com

گہری نفرت کا اظہار بڑے زور شور سے خطیبانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ گو یہ درست ہے کہ ابوالفضل اشخاص اور افراد پر ذاتی حملے کرنے سے احتیاطاً پرہیز کرتا ہے، لیکن طبقۂ علما کے خلاف اپنی پرانی رنجش کا بدلہ وہ اپنے زورِ قلم کی مدد سے خوب لیتا ہے۔ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس نئے سیاسی مقابلے میں وہ اصول، جو علما کو عزیز تھے، اپنی قوت کھو چکے تھے اور جائز نہ رہ گئے تھے، بلکہ ان کے بعض عقائد روشن خیالی اور دلیل کے عین منافی بھی لگتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا تھا، تو ابوالفضل ہی کی زبان میں، وہ لاعلمی کا شکار تھے اور اس لیے صفحاتِ تاریخ میں جبر اور دائمی تضحیک کے مستحق نہیں بلکہ لحاظ اور ہمدردی کے مستحق تھے۔ ایسی عبارتوں میں ابوالفضل رواداری اور وسیع النظری کے ان ہی اصولوں کی اعلانیہ خلاف ورزی کرتا ہے جن اصولوں کو وہ کسی اور نیز مختلف سیاق میں بڑی کاوش سے منواتا ہے اور مشتہری کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علما کے درمیان یہ تصادم جتنا نظریاتی تھا اتنا ہی حصولِ طاقت کے لیے بھی تھا، جس میں ایک طرف وہ علما تھے جو صاحبِ قوت و اثر تھے اور دوسری طرف وہ سابقہ گداگر تھے جو دنیا ترک کر کے عسرت کی حالت میں گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جب آخرالذکر نے طاقت پکڑی تو انھوں نے اول الذکر علما کے خلاف قلم اور تلوار کو اسی بے دردی سے استعمال کیا جس بے دردی سے کبھی اول الذکر، آخرالذکر کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کر دیا تھا کہ علما کی طاقت مکمل طور سے ختم کر دیں اور تاریخ میں ان کو جاہل، خود غرض، تنگ ظرف اور مطلبی کے ناموں سے پکارا جائے۔

بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوالفضل نے بحیثیت مورخ اپنے منصب سے انصاف نہیں کیا۔ شیر شاہ کا بیان اس نکتے کی حمایت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے کارناموں کو چھوٹا کر کے دکھایا گیا ہے اور اس کی کامیابی کو دغا، فریب، اور جھوٹ سے منسوب کیا گیا ہے۔ شیر شاہ کے بارے میں اس رائے سے کوئی جدید مورخ

Marfat.com

متفق نہ ہوگا۔ اس کی بعض اصلاحات کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن ان کی اہمیت کم کرنے کے خیال سے، ابوالفضل فوراً ہی یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ اصلاحات علاالدین خلجی یا بنگال کے فرمانرواؤں کی نقل میں کی گئی تھیں۔

ابوالفضل اکبر اور اس کی سرگرمیوں میں اتنا محو رہتا ہے کہ بہت سے ایسے حقائق لکھنا بھول جاتا ہے جن کی مدد سے سکّے کا دوسرا رُخ بھی سامنے آتا ہے اور اس کے بیان کا دُرست پسِ منظر ہم تک پہنچ سکتا تھا۔ ہمیں اس کا تقریباً کوئی علم نہیں کہ افغانوں یا راجپوتوں نے اپنی کہانی کس انداز سے پیش کی، ان لوگوں نے کیا موقف اختیار کیا، اور اس سہ رُخی تصادم کی کیا نوعیت تھی جس میں گو اکبر فتح یاب ضرور ہوا، لیکن اسے لازمی فوجی اقدامات کے ساتھ بڑی سخت سفارتی کوشش بھی کرنا پڑیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکبر نامہ میں پیش کیا جانے والا سیاسی بیان اس شدید جدوجہد کو رنگین اور جاندار بنانے میں ناکام رہا ہے جو ہندوستان کی سلطنت حاصل کرنے کے لیے کی گئی۔ وہ اپنے بیان سے ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ اکبر کے بلند اقبال اور اس کی عظیم الشان فوجی طاقت نے ان مخالف فوجوں کو روند ڈالا جنھوں نے تقریباً کوئی مزاحمت نہیں کی، اور مغل فوجوں کی کامیاب فوجی نقل و حرکت میں محض پسِ منظر کا کردار ادا کیا۔ ایسا تاثر جو اکبر نامہ کے بیان سے مستقل بنتا رہتا ہے، اسی سیاسی صورتِ حال کی حقیقتوں کو سمجھنے میں مدد نہیں دیتا جن کا سامنا اکبر کو کرنا پڑا، کیونکہ دراصل وہ اپنی دُور اندیشی، سفارت کاری کی مہارت اور فوجی مہموں کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی صلاحیت ہی کی بنا پر کامیاب ہوا، نہ کہ محض اپنے بلند اقبال کی وجہ سے، جو ابوالفضل کا خیال ہے اور جیسے وہ ہمیں باور کرانا چاہتا ہے۔

یہ بات بھی اہم ہونے کی وجہ سے قابلِ توجہ ہے کہ ابوالفضل ان سیاسی اور سماجی قوتوں کا ذکر پوری دیانت داری سے نہیں کرتا جو علاقائی وفاداریوں، علاقائی حب الوطنی اور خود مختاری نیز نسلی جھگڑوں کی نمائندگی کرتی تھیں اور جن قوتوں نے اکبر کے اس

Marfat.com

دعوے کو چیلنج کیا تھا کہ وہ ہندوستان کا جائز شہنشاہ ہے۔ لہٰذا اس کی تحریروں میں اس دور کے مختلف اقسام کے تصادموں کی گہرائی پھیلاؤ اور شدت کی جھلک نظر نہیں آتی۔

مزید برآں، شہنشاہوں، امیروں، عالموں اور عارفوں کی سرگرمیوں میں غرق رہنے کی وجہ سے زندگی کے بارے میں اس کا نظریہ قدرے محدود ہو گیا تھا۔ اس نے شاید ہی کبھی ایسے واقعات یا حقائق کی طرف توجہ دی ہو جو ابوالفضل کے اندر چھپے ہوئے عقلی انسان کو غیر اہم اور حقیر معلوم ہوتے ہوں۔ وہ اگر یہ حقائق تحریر کرتا تو عام آدمیوں کی زندگی کے بارے میں غیر معمولی بصیرت حاصل ہوتی اور وقت کی رُوح کو مقید کرنے میں مدد ملتی۔ عقلی میلان اور عالمانہ تربیت نے اسے زندگی کی ہر غیر سنجیدہ، معمولی اور ادنا بات سے لاتعلق اور متنفر کر دیا۔ لہٰذا وہ عام طور سے محض ان حقائق میں دلچسپی لینے لگا جو کسی بادشاہ، کسی امیر اور فلسفیانہ انداز میں غور و فکر کرنے والے کسی صاحبِ کمال عالم کے نقطۂ نظر سے سنجیدہ اور نتیجہ خیز لگتے تھے اور جب ان حقائق کا انتخاب کر لیا تو پھر اتنی ہی سنجیدہ، پرشوکت، مختصر اور جامع زبان میں انھیں پیش کیا اور وہ انداز اختیار کیا جو ایک ایسے فلسفی کو زیب دیتا ہے جس نے طے کر لیا ہو کہ زندگی کی اعلا اور عمیق حقیقتوں کو ہی تحریر کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور کی پوری زندگی، جس میں سنجیدہ اور غیر سنجیدہ، اعلا اور ادنا، تلخ اور بد مذاق، سادہ اور رنگین، ہر طرح کی چیزیں ہوں، اکبر نامہ اور آئینِ اکبری کے صفحات میں متحرک نظر نہیں آتی۔ یہ دُرست ہے کہ آئینِ اکبری میں ایسے اعداد و شمار کی بھرمار ہے جو اقتصادی صورتِ حال سے تعلق رکھتے تھے، لیکن یہ تفصیلات ریلوے کے نظام الاوقات یا کسی محکمے کی رپورٹ جیسی لگتی ہیں، اور ہر اس بات سے مبرا ہیں جن سے ہمیں لوگوں کے اصل حالات کے بارے میں کچھ علم ہو سکے اور ان کی زندگی کے معنی، مقصد اور موضوعات کے بارے میں بصیرت حاصل ہو سکے۔ ابوالفضل افراد اور جماعتوں کی انسانی ضرورتوں کو نظر میں رکھ کر اُجرتوں، قیمتوں اور سلطنت کے مالی مطالبوں کے بارے میں کبھی کچھ نہیں کہتا۔ آئینِ اکبری ہمیں بعض ایسے اعداد و شمار فراہم کر دیتی ہے جن کا تعلق

Marfat.com

مشکل ہی سے لوگوں کے حالات زندگی سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح، وہ اس کو ایک دانشور کی سطح سے گرا ہوا کام سمجھتا ہے کہ عام آدمیوں اور عورتوں کے عادات و خصائل، ریت رواج، عقیدوں، سماجی فعلوں اور توہمات کے بارے میں تحریر کرے۔ وہ حد جو اس کی شخصیت، مزاج اور عقلی میلان نے قائم کر دی تھی، اُسی حد کی وجہ سے اس کا فسانہ دَوران یک طرفہ اور نامکمل رہ گیا۔ اکبر نامہ اکبر اور ابوالفضل کے دور اور سماج کی کہانی سے زیادہ اکبر کی کہانی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ابوالفضل اپنے دَور کی رُوح کو مقید کرنے میں اور اپنی کتاب میں اس دَور کے سماج کو ایک مسلم اتحاد کی کہانی کے طور پر پیش کرنے میں ناکام ہو گیا ہے۔

Marfat.com

حوالہ جات

1. Abul Fazal, Ain-e-Akbari, (Lucknow 1893) Vol. III, pp. 207-216.

2. Abul Fazl, Akbar-nama, (Bib Ind.), Vol. II, pp. 387-382.

Ain-i-Akbari, Vol. III, p. 217.

3. Ibid; Vol. I, pp. 2-3; Ibid, Vol. I, pp. 201-202.

4. Maasir-ul-Umara, Beveridge, Vol. I, pp. 117-128.

5. نقطوی:

یہ سمجھتے تھے کہ دُنیا کبھی فنا نہ ہوگی۔ یہ آخرت اور حشر کے دن سے اور جزا و سزا سے منکر تھے، اور کہتے تھے کہ جنت اور دوزخ دُنیا ہی میں راحت اور تکلیف کی شکل میں مل جاتی ہیں۔

6. آئینِ اکبری، جلد سوئم، صفحہ 218۔

7. ایضاً صفحات 4-2۔ اکبر نامہ، جلد سوئم، صفحات 660-659۔

8. ایضاً صفحات 524-523۔

9. ایضاً جلد دوئم، صفحات 392-376

10. Ain-i-Akbari Jarrett, Introduction.

11. اکبر نامہ، جلد دوئم، صفحات 392-367

12. ایضاً، جلد اوّل، صفحات 10-9

Marfat.com

13۔ آئینِ اکبری، جلد سوئم، صفحات ۲۰۰–۱۹۹، اکبرنامہ، جلد اوّل، صفحات ۱۰-۹۔

14۔ آئینِ اکبری، جلد سوئم، صفحات ۲۰۰-۱۹۹

15۔ اکبرنامہ، تعارف۔

Marfat.com

اٹھارھویں صدی کے دوران ہندوستان میں فارسی فنِ تاریخ نگاری

ظہیر الدین ملک

اٹھارھویں صدی کے دوران تاریخی مضامین عام علمی تربیت کا ایک لازمی جُز تھے۔ گو تاریخ کو اعلا تعلیم کے نظام میں باقاعدہ شامل نہیں کیا گیا تھا، لیکن فطرتِ انسانی سے تعلق رکھنے والے مضامین پر اس کا بڑا اثر تھا، کیونکہ اس کا مطالعہ ذہن کے لیے بڑا محرک ثابت ہوتا تھا[1] چنانچہ اس دَور میں مورخین نے بہت کچھ لکھا۔ باقاعدہ سیاسی تاریخوں کے علاوہ بہت سے انتظامی رسالے نیز کاروبار اور تجارت پر کتابیں تالیف کی گئیں[2] دستاویزوں میں دلچسپی کے باعث بہت سے مکتوبات اور تاریخی اہمیت کے دیگر مجموعے تالیف کیے گئے[3] یہاں تک کہ مورخین نے صنفِ نظم کو بھی نہ چھوڑا اور منظوم تاریخیں بڑی تعداد میں لکھی گئیں[4] اس ادب کے علاوہ امیروں اور صوفیوں کی سوانحیں اس دَور کی عظیم الشان اور فاضلانہ دین ہیں[5] اہم ترین چیز، جس کی وجہ سے اٹھارھویں صدی خاص طور سے باعثِ دلچسپی بن گئی، وہ عظیم مذہبی ادب ہے جس میں قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف پر نامی گرامی کتابیں شامل ہیں[6] سماجی زندگی کے مختلف پہلو اور تہذیب کے مختلف رُخ سمجھنے کے لیے شاعروں کے دیوانوں اور تذکروں سے بڑی مفید معلومات ملتی ہے۔ لہٰذا اس دَور کی تحریریں تنوع اور پھیلاؤ کے اعتبار سے بڑی پُراثر ہیں۔ ہندوستانی تاریخ کے شاید کسی اور دَور میں مذہبی، سیاسی اور سماجی پہلوؤں پر

Marfat.com

اتنا زیادہ ادب تیار نہیں ہوا جتنا اٹھارھویں صدی میں ہوا؟

زیرِ نظر دَور میں مورّخین کا خاص موضوع سیاست تھا، اور غیر مذہبی انداز کے مضامین کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ وہ اپنی کتابوں میں فوجی مہموں، میدانِ جنگ کے کارناموں اور شاہی دربار کی رنگارنگ سرگرمیوں پر خاصہ وقت صرف کرتے تھے۔ انتظامی کام افعالِ جود و کرم نیز فن اور ادب کی سرپرستی کی تفصیلات بھی ان کے لیے جاذبِ توجہ تھے۔

خفی خاں نے سرتاپا ایک سیاسی تاریخ لکھی، اور معلومات فراہم کرنے کے لیے وہ دربارِ شاہی کے چکّر کاٹتا رہا۔ اس کی کتاب واقعات کی ایک نمایاں تخلیقِ نو ہے، جو اسلوبِ بیان کے اعتبار سے واضح اور تاریخ وار ترتیب کے لحاظ سے بڑی منظّم ہے۔ اسے واقعات کا بڑا علم ہے، اور اس کے پاس موضوعات بھی بہت ہیں۔ مغل تاریخ کے تسلسل کی بابت اس کا ایک تصوّر ہے اس کے علم و فضل کے علاوہ، اُس کی ترتیبِ الفاظ اور اظہارِ بیان میں غیر معمولی حُسن ہے۔ واقعات کو ایک وسیع سیاق سے وابستہ کرنے اور ماضی سے اسی انداز اور اسی قسم کی مثالیں دینے کا اسے ملکہ ہے۔ شاید وہی اکیلا مصنّف ہے جو مختلف زبانوں میں کی جانے والی ان اصلاحات کا ایک جامع اور مربوط بیان دیتا ہے، جو اصلاحات منصب داری نظام کو ازسرِ نو منظّم کرنے کے لیے کی گئی تھیں، جو نظام اپنے ہی وسیع ڈھانچے کے بوجھ تلے دب کر ٹوٹ رہا تھا۔[9] مرکزی انتظامیہ، مرہٹوں کے معاملات اور جاگیرداروں کی حالت پر اس کی تحریریں بے مثل ہیں۔ ان میں نہ صرف نئی معلومات شامل ہے، بلکہ اُن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان معاملات پر مصنّف کی کتنی گہری نظر تھی۔

بہادر شاہ کے دَور میں مغل انتظامیہ کے اندر زوال کا جو عمل شروع ہو گیا تھا اس کا تجزیہ کرتے ہوئے خفی خاں لکھتا ہے کہ "ہندوستان میں تیموری حکومت کے قیام کے بعد سے ایک خطاب دو اشخاص کو نہیں دیا گیا، ہاں ایک دو صروف کے ردّ و بدل کی اجازت تھی۔ صفدر خاں بابی، جو اورنگ آباد میں تعینات تھا، اورنگ زیب کے

Marfat.com

زمانے سے ایک موروثی خطاب کا مالک تھا۔ لیکن بہادر شاہ نے یہی خطاب اپنے ایک پرانے ملازم کو عطا کر دیا۔ صفدر خاں نے اس خطاب کو برقرار رکھے جانے کی عرضداشت پیش کی جو اس سے بنا کسی نافرمانی کے چھن گیا تھا۔ شہنشاہ نے اس کی درخواست پر عطا کیا، عطا کیا، عطا کیا، لکھ دیا۔ حالانکہ وہی خطاب پہلے ہی ایک دوسرے شخص کو عطا کیا جا چکا تھا۔ اسی دن سے یہ بُرا رواج بن گیا کہ ایک ہی خطاب دو یا تین اشخاص کو دے دیا جاتا ہے۔ اسی طرح، منصب، ہاتھی، جبغا، اور سرپیچ کی بخشش پانے والے کے رُتبے اور وقار کے مطابق نہیں کی جاتی۔[9]

افسرانِ خزانہ یہ دیکھ کر پریشان ہوئے کہ انتظامِ مال تیزی سے انحطاط پذیر ہے اور انھوں نے ایسی اصلاحات کی ضرورت محسوس کی جن کے ذریعے منصب داری نظام کو معیاری اور اثر آفریں بنایا جا سکے۔ انھیں توقع تھی کہ اصلاح کے بعد یہ نظام اس صورتِ حال پر قابو پالے گا۔ جس میں خرچہ آمدنی سے بڑھ گیا تھا، اور شہنشاہ بے سوچے سمجھے جاگیریں عطا کر رہا تھا۔ حالانکہ اس مقصد کے لیے زمینیں کم تھیں۔ اخلاص خاں، اراض مکرر، جو اپنی دیانت داری اور محنت کی وجہ سے مشہور تھا، اس نے منعم خاں وزیر کی توجہ اس مالی بحران کی طرف مبذول کرائی جو ان مسائل کے باعث پیدا ہوا تھا۔[10] اس نے مشورہ دیا کہ منظوری سے پہلے تقرری یا ترقی کے لیے دی جانے والی درخواست کی جانچ پڑتال پہلے وزیر خود کرے۔

یہ یقینی تھا کہ اس انداز کی اصلاح کی مخالفت دربار کے وہ لوگ کریں گے جن کے حقوق اور اختیارات پر چوٹ پڑتی ہوگی۔ منعم خاں نے اس ڈر سے کہ عہدوں کے متلاشی لوگوں میں اس کی مقبولیت کم ہو جائے گی، یہ ناخوشگوار فرض ادا کرنا منظور نہ کیا اور اخلاص خاں سے کہا کہ اصلاح کا کام خود کرے۔ اخلاص خاں کو جب اپنے سے اعلا عہدیدار کی مدد اور اشتراک نہ ملا تو اسے لگا کہ یہ کام اس کے قابو سے باہر ہے۔ اس نے خود بھی ان

Marfat.com

اشخاص کے جذبات کو روندنے سے انکار کر دیا جو حکومت میں مرتبے حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔

آخر میں ہر منصب دار کی ابتدا، منصب اور وقار کی تفتیش کا کام مستعد خاں کے سپرد کیا گیا، جو معاصرِ عالمگیری کا مصنّف تھا۔ اس سے پہلے کہ ارض مکرر اور وزیر منصب داروں کی درخواستیں آخری منظوری کے لیے شہنشاہ کو بھیجیں مستعد خاں کو یہ ساری درخواستیں جانچنا اور تصدیق کرنا ہوتی تھیں۔ لیکن اس کی ساری محنت رائیگاں گئی۔ اصلاح کا یہ منصوبہ نہ صرف ان لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے ناکام ہوا جو دولت کے متلاشی تھے بلکہ بہادر شاہ کی بے تکلفی کی وجہ سے بھی ہوا۔ امیدواروں کی جو درخواستیں مستعد خاں کے سامنے پیش ہونے سے پہلے شہنشاہ کی دو بیگمات، مہر پرور اور امتہ الحبیب شہنشاہ کے سامنے پیش کر دیتی تھیں وہ ان پر دستخط کر دیتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ کے دستخطوں کی اہمیت ختم ہو گئی۔ عالی جاہ اپنے افسروں سے کہتے کہ ان کے پاس سوائے اس کے دوسرا راستہ نہیں رہ گیا کہ ہر امیدوار کے لیے جاگیر عطا کرنے کا فرمان جاری کر دیں۔ اس کے افسران بہرحال، آزاد تھے کہ موقع کی مناسبت سے جو بہتر سمجھیں وہ کریں۔[11]

مقامی سطح پر انتظام مال کی بابت خفی خاں کا علم معتبر لگتا ہے، کیونکہ تحصیل وحصول کا معاملہ اس کے عملی تجربے پر مبنی تھا۔ وہ عامل کی حیثیت سے خاصے عرصے تک حکومت کا ملازم رہا، حالانکہ اسے اس عہدے سے سخت متنفر تھا۔ وہ عاملوں بدخو، بدکردار اور ظالم کہتا ہے۔ افسرِ مال حکومت کی رقم پر ناجائز تصرف کرتا ہے اور مجبور کاشتکاروں کو لوٹتا ہے۔ مصنّف خود یہ اعتراف کرتا ہے کہ اس نے کسانوں پر ظلم کیا اور مسلمانوں کی جائداد و املاک تباہ کی۔ اس کے نزدیک کتے ہانکنا اور سور چرانا تحصیل وصول سے بہتر کام ہیں۔[12]

افسرانِ مال کی زیادتیوں پر لعنت بھیجنے کے علاوہ، خفی خاں دوسروں افسروں کو بھی موردِ الزام ٹھہراتا ہے، جنھوں نے بگڑتی ہوئی سیاسی صورتِ حال پر، کاشتکاروں کی حالت

Marfat.com

بہتر بنانے پر، نئی آبادیاں بسانے پر، اور زمینوں سے آمدنی بڑھانے پر سنجیدگی سے غور کیا۔ اس نے صاف لفظوں میں اجارہ داری یا زراعت برائے آمدنی کی وہ لعنتیں بتائی ہیں جن کی وجہ سے رعیت پریشانی میں مبتلا ہو کر پٹی میں ہل گئی اور دیہات ویران ہو گئے۔ وہ بڑے تیکھے انداز میں امیروں پر تنقید کرتا ہے جو ضرورت مندوں کی ذرا مدد نہیں کرتے، بس اپنی ذات میں محبوس رہتے ہیں اور عیش و عشرت کی زندگی گزارتے ہیں۔[13]

انتظامی تفصیلات نیز کاروبار اور تجارت کے بیانات پر مشتمل ایک کتاب مرات الحقائق ہے۔[14] اس کا مصنف اعتماد علی خاں بن اعتماد خاں عالمگیری، احمد آباد کا باشندہ تھا، جہاں اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا تھا۔ یہ ضخیم کتاب مرات احمدی کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ یہ روزمرہ کے ان واقعات اور خبروں کی بیاض ہے جن کا تعلق گجرات اور دارالسلطنت دہلی سے تھا۔ یہ کتاب ایسی تفصیلات کی ایک کان ہے جن کا تعلق ملک کے مختلف حصوں میں رائج قیمتوں سے، اور بعد کے مغلوں کے دور میں حکومت کے عائد کردہ ٹیکسوں سے ہے۔ مرات احمدی کے برعکس، اس کتاب میں نہ صرف گجرات کے اقتصادی حالات کا ذکر ہے، بلکہ دہلی، آگرہ اور الہ آباد کا ذکر بھی ہے۔ اس کا مصنف مختلف ابواب میں ان اسباب کی تشریح کرتا ہے جن کے باعث منصب داری نظام ٹوٹ گیا۔ ان منصب داروں کے حالات کا بڑی وضاحت کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے جن کے پاس یا تو جاگیریں نہ تھیں یا جو اپنی زمینوں پر اپنا اختیار قائم نہ رکھ سکے۔

اس دور کے مورخین کو خیال تھا کہ وقت کی راہ سفر چند منتخب لوگوں کی تعریف و ستائش کرکے اور ان کی تصویروں پر مبالغے کی رنگ آمیزی کرکے بیان کی جا سکتی تھی۔ ان کے نزدیک قفلِ تاریخ کی کنجی اُن افراد کے عروج و زوال میں پوشیدہ تھی جنھوں نے سیاسی معاملات کی راہ متعین کرنے میں ایک واضح کردار ادا کیا تھا۔ بادشاہ یا امیر سارے واقعات کا مرکز اور سرچشمہ تھا۔ سماج کے مختلف طبقے وقت کے اندھیرے میں پھینک دیے گئے تھے۔ حالانکہ

Marfat.com

یہ محققین مغل تمدّن کی مادی بُنیاد سے خوب اچھی طرح واقف تھے، پھر بھی یہ ان اقتصادی اور سماجی عنصروں کا تجزیہ نہ کر سکے جو مغل انحطاط کے اسباب میں شامل تھے۔

مغل قوت کے زوال کی تشریح کرتے وقت ان مورخین نے عام طور پر ان چند امرا کی اخلاقی اور سماجی پستی پر زور دیا جو کاہل اور مطمئن بالذات ہو گئے تھے اور اپنے فرائضِ منصبی سے غفلت برتتے تھے۔ مثال کے طور پر، شاہ نامہ دکن کا مصنف احسن ایجاد[16] طبقۂ امرا کے کردار پر تنقید کرتا ہے اور اس کے زوال کا تعلق سیاسی قوت کے انحطاط سے قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شاہ نامہ دکن میں انتظامیہ اور جنگوں کے بارے میں اس کا بیان گو سرسری ہے لیکن بے لاگ اور دُرست ہے۔ وہ اورنگ زیب کے جانشیوں کی بداطواری اور عیش پسندانہ زندگی پر، امرا کی گٹھ بندی اور رقابت پر، اور مغل حکومت کے دُشمنوں سے نپٹتے وقت ان کے بُزدلانہ برتاؤ پر طیش میں آجاتا ہے۔ وہ سپاہیوں، چھوٹے منصب داروں اور کم تنخواہ والے ملازموں کی مفلسی اور مصائب کی بھیانک تصویر پیش کرتا ہے، اور وہ باعزت اور تعلیم یافتہ لوگ اس تصویر میں شامل ہیں جو اپنی روزی کے واسطے حکومت کی سرپرستی پر تکیہ کرتے تھے۔

جب مرہٹوں نے دو اہم اور زرخیز صوبوں، گجرات اور مالوہ، پر قبضہ کر لیا، تو تحصیل وصول کرنے والے چھوٹے افسران اور ملازمین کی ایک بڑی تعداد بے روزگار ہو گئی۔ سیاسی مسائل پر بحث کرتے وقت احسن ایجاد مرہٹوں اور اندرونِ سلطنت دوسری تفرقہ انگیز قوتوں کے خلاف ایک نمایاں اور موثر حکمتِ عملی کی حمایت کرتا ہے۔ دوسرے مصنّفین کی طرح، یہ بھی راجہ جے سنگھ کے رول پر ملامت کرتا ہے جس نے مرہٹوں کی بات مان لی، اور جو خاصے وسائل کے باوجود شاہی مقبوضات کو مرہٹوں کی یورشوں سے بچانے میں ناکام رہا۔

لیکن سیاسی، سماجی اقتصادی قسم کے پیچیدہ مسائل کا اس نے جو تجزیہ کیا ہے اس تجزیے میں بصیرت اور گہرائی کم ہے۔ جو کچھ گزرا اس کے اسباب وہ بڑی سادگی سے

Marfat.com

دے دیتا ہے، لیکن اس کی تفتیش سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ جو تاریخی عمل رونما ہوئے ان کے پیچھے کیا مقصد تھا یا کیا معقولیت تھی۔ وہ کاشتکاروں کی حالت پر بحث کرنے سے گریز کرتا ہے اور ان بُرائیوں کی تشریح نہیں کرتا جو مغلوں کے فوجی نظام میں داخل ہو گئی تھیں۔

چونکہ یہ زمانہ سیاسی انحطاط اور اقتصادی پریشانی کا زمانہ تھا، اس لیے تاریخ کی ساری عصری تحریروں پر افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ اس دور کے مورّخ شاذ ہی ایسا اسلوب اختیار کرتے ہیں جو خطیبانہ اور آراستہ پیراستہ ہو۔ وضاحت اور سادگی اس مقصد کے حصول میں ان کی مدد کر سکتے تھے جو اُن کے ذہن میں تھا۔ اُن کا تصورِ تاریخ ان اخلاقی نصیحتوں پر مبنی تھا جس نے لوگوں کی تہذیب اور نظریات پر اثر ڈالا تھا۔ یہ مورّخین ماضی سے منتخب کر کے ایسی مثالیں دینا پسند کرتے تھے جن کا مقابلہ اس صورتِ حال سے کیا جا سکے جس کا سامنا بادشاہ اور امرا کر رہے تھے۔ واقعاتِ ماضی سے اخذ کیے ہوئے اخلاقی سبق شاہوں اور سیاسی مدبّروں کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔[16] وہ تاریخ کی تشریح اس انداز سے کرنا چاہتے تھے جیسے تاریخ نیک و بد کے درمیان ہونے والی کشمکش ہو۔ یہ گویا فلسفہ بالمثال کی تدریس تھی، کیونکہ جن لوگوں نے انصاف اور عوامی بہبود کے بُنیادی اصولوں کی پیروی کی انھیں قوت اور ترقّی ملی، اور جو لوگ اس راہِ مستقیم سے بھٹک گئے انھیں اذیت اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔

بیشتر مورّخوں نے اپنے زمانے کے واقعات خاص طور پر تحریر کیے۔ وہ یا تو دربارِ شاہی کے حاضر باش تھے یا پھر دارالسلطنت میں رہنے والے وزرا کے ملازم تھے۔ ان میں چند مورّخ دُور افتادہ صوبوں کے عہدیداروں اور صوبہداروں کے بھی ملازم تھے۔ اس طرح ان کے پاس وہ عمدہ ذرائع موجود تھے جن کی مدد سے مختلف واقعات کی بابت مناسب اور دُرست معلومات حاصل کر سکیں۔ جن واقعات کا انھیں براہِ راست طور سے علم نہ تھا، ان کی بابت ان لوگوں سے معلومات حاصل کی جو عینی شاہد تھے۔ تاریخ ارادت خاں

Marfat.com

کا مصنف، 'ارادت خاں' اورنگ زیب کے زمانے میں پہلے جگنا کا اور پھر اورنگ آباد کا اور مانڈو کا فوجدار رہا۔ بعد میں شاہ عالم بہادر شاہ کے دور میں اسے دوآب کا صوبیدار مقرر کر دیا گیا۔ وہ اپنے دیباچہ میں لکھتا ہے: "اپنے عہدے کے سبب، اور چونکہ میں خود ان معاملات میں شامل رہا ہوں۔ اس لیے بیشتر واقعات کے ذرائع کا مجھے مکمل ہو گیا ہے، اور جن واقعات کی اطلاع بھی دوسروں کو بڑی مشکل سے ملے گی، ان کے منصوبے میرے سامنے بنے اور ان پر میری نظروں کے سامنے عمل درآمد ہوا۔ اور چونکہ میں سارے خطروں اور مصیبتوں میں شریک رہا اور دیکھتا رہا، اس لیے میں نے انھیں درج کر لیا۔"[17] ان مورخوں کے پاس جو تاریخی مواد موجود تھا اسے تحریر کرتے وقت انھیں اپنے سے پیشتر کے مورخین کی کتابوں سے بڑی ہدایت ملی۔ سابق مورخین کی کتابیں بڑی تعداد میں ان مورخین کے کتب خانوں میں موجود تھیں۔ خفی خاں سچائی کا چونکہ پُرجوش حامی تھا اس لیے اس نے زور دیا کہ ہر شہادت کی مکمل تحقیق کرنا ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر مورخین کا یہ فرض ہے کہ وہ حقائق کو دیانت داری اور خلوص کے ساتھ تحریر کرے" اسے (مورخ کو) یہ نہیں کرنا چاہیے کہ ایک کا پاس کرے اور دوسرے سے دشمنی۔"[18] مراتِ وریدات کا مصنف، شفیع ورید، دعوا کرتا ہے کہ اس نے وہ واقعات اور حادثات تحریر کیے ہیں جو یا تو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے یا دوسروں سے سنے۔ اس نے بڑی کاوش سے دوسروں کے بیانات کی تفتیش کی اور جو بیانات پوری اور گہری چھان بین کے بعد غلط ثابت ہوئے انھیں رد کر دیا۔[19]

ان مورخین نے جن طریقوں سے مواد اکٹھا کیا وہ طریقے عام طور پر دوسروں سے مختلف اور ان کے اپنے طریقے تھے، اور ہر چند کہ حقائق ایک ہی تھے لیکن ان کی ترجمانی مختلف تھی۔ یہ اختلافات مختلف صورتِ حال، مختلف سماجی پس منظر اور مختلف سیاسی مفاد کے باعث رونما ہوئے درباریوں اور امیروں کے گروہی جھگڑوں میں وہ کسی نہ کسی

Marfat.com

فریق سے وابستہ ہوگئے۔ اپنے سرپرستوں کے مفاد سے وابستہ ہو جانے کے سبب اُن کا اندازِ فکر متاثر ہوگیا۔ لہٰذا، سیاسی قوتوں کے جوڑ توڑ کے بارے میں ان کی تشریحات اسی عنصرِ داخلیت سے متاثر ہوگئیں۔

ان سب مصنّفین کا عقیدہ یہ تھا کہ تاجِ مغل ایک مقدّس ادارہ تھا، جو ملک پر ہمیشہ حکومت کرنے کے لیے مقدر ہو چکا تھا، اور اسی بنا پر وہ حکمراں طبقے کی قوت اور استحکام کی علامت تھا، اور زمانہ سازوں نیز قوت فروشوں کی غارت گری سے لوگوں کو محفوظ رکھنے کی آخری ڈھال تھا۔ لیکن جس دَور کی ہم بات کر رہے ہیں، اس دَور میں بادشاہ کی حیثیت گروہی سیاست کی بساط پر گھٹ کر ایک بے زور پیدل کی سی ہوگئی تھی۔ فرخ سیر کی معزولی اور وفات نے دِکھا دیا کہ بالآخر وزیروں اور امیروں کو شہنشاہ پر فتح حاصل ہوئی۔ بعد کے مغل تاج داروں کو فن حکومت کی پوری تعلیم نہ ملی تھی۔ وہ اس خطرناک بحران کا مقابلہ نہ کر سکے جس سے مغل حکومت برابر دوچار رہی۔

جن عصری مصنّفین نے اپنی نظروں سے دیکھا کہ سلطنت ملکی جھگڑوں کا شکار ہو رہی ہے، اور اس کا عظیم ڈھانچہ بغاوتوں اور باہری حملوں کی لہروں کا سامنا کرتے کرتے بالآخر ٹوٹ رہا ہے، انھوں نے شہنشاہوں کی غیر دانشمندانہ پالیسیوں اور ان کے بُرے ملکی انتظام پر لعنت ملامت کرتے وقت جھجک سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے فوجی مہموں اور ملکی انتظام کے بارے میں بادشاہوں کے نامناسب اور بے موقع اقدامات پر کُھلم کُھلا تنقید کی۔ حتیٰ کہ ان معاملات پر بھی سخت تنقید کی جن کا تعلق ان کی نجی زندگی سے تھا۔ بہادر شاہ پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ مستحق اشخاص کو قوت و اقتدار کے عہدے اور تحائف دینے میں بڑی فیاضی برتتا ہے۔[20] جہاں دار شاہ کو ایک اوباش شرابی کی تصویر میں پیش کیا گیا۔[21] اور فرخ سیر کو تلون کا غلام کہا گیا۔[22] محمد شاہ پر یہ الزام لگایا کہ آرام طلبی اور بے اعتدالی کی وجہ سے وہ اس لائق نہیں رہ گیا کہ مطلبی امرا کو قابو میں

Marfat.com

رکھ سکے۔[23]

اس کے باوجود مورخین کو امرا کا کوئی ایسا کام برداشت نہ تھا جسے نافرمانی کہا جا سکے۔ انھوں نے ان مقامی قائدوں کے خلاف کھل کر اپنی خفگی کا اظہار کیا ہے جنھوں نے اپنی قوت کے بل بوتے پر ان فوائد میں حصہ بٹانا چاہا جو سلطنت کے نام پر انھیں حاصل ہو سکتے تھے۔[24] مرکز اور صوبوں کے درمیان ہونے والی برتری کی جدوجہد میں مورخین دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ کچھ مورخین مرکزِ سلطنت کے پُرجوش حامی ہیں اور کچھ دوسرے مورخین مقامی سرداروں اور صوبیداروں کی حمایت کرتے ہیں۔ جن مورخین نے اپنی تاریخیں دکن میں تالیف کی ہیں جیسے قاسم اورنگ آبادی، معاصر نظامی کا مصنف، منسارام، تاریخِ فتیحہ کا مصنف، یوسف محمد خاں، نیز کچھ اور مورخین، انھوں نے مرکز سے تصادم کے معاملے میں نظام الملک کی حمایت کی۔ لیکن آشوب، رستم علی، شفیع جاوید، مرزا محمد جیسے مصنفین نے مرکزی نقطۂ نظر کی تائید کی۔ بہرحال ایسا لگتا ہے کہ وہ تاجِ مغل کے وفادار تھے، اس شخص کے نہیں جو اسے پہنتا تھا۔

حکمراں طبقے نے ذہنی تھکاوٹ اور تخلیقی قوت کی کمی کا اظہار کیا۔ شاہانِ مغلیہ کی خدمت کے پرانے جذبے کی جگہ ریاست کے خودغرضانہ استحصال نے لے لی۔ بڑے بڑے امرا نے سارے اعلا سرکاری عہدوں پر قبضہ کر لیا، بڑی بڑی زمینیں جاگیروں کی شکل میں اپنا لیں اور شاہی قوت کی جڑ کاٹ دی۔[25] چھوٹے منصب دار ذلت اور تنگ دستی کی زندگی گزارنے لگے۔[26] امرا کا ایک نیا طبقہ، جو خاندان یا لیاقت کی بنیاد پر کوئی حقوق طلب نہ کر سکتا تھا، عروج پا کر قوت اور امتیاز کے مقامات پر پہنچ گیا۔[27] جتھے بند اور بد اطوار امرا وقت کی چنوتیوں کا سامنا کرنے میں سخت ناکام رہے۔ سماج کے وہ منتخب حضرات جو سیاسی ذہن رکھتے تھے غفلت کی نیند سوتے رہے اور پورے دور حالتِ جمود میں رہے۔ ان کا ذہن مریض، نظر کوتاہ اور اخلاقی کیفیت برباد ہو گئی اور پورے طبقے کی ساری انفرادیت ختم سی ہو گئی۔ طبقہ امرا کا گروہوں میں تقسیم ہو جانا، عوام سے علاحدگی اختیار کر لینا، اور فلاحِ عام سے لاپرواہی برتنا، ان

Marfat.com

سب باتوں کی وجہ سے پورے طبقہ امراے زوال کے واسطے زمین ہموار ہو گئی۔

طبقہ امراے اس تنزل کو عصری مصنفین نے بڑی صاف گوئی کے ساتھ پیش کیا ہے، اور بعض اوقات بڑی سخت زبان استعمال کی ہے۔ مرہٹوں کے معاملات پر بحث کرتے وقت، شفیع وارید تحریر کرتا ہے کہ صوبۂ آگرہ میں پانچ سے سات ہزار ایسے منصب دار رہتے تھے جن کے پاس بڑی فوجیں تھیں۔ اسی علاقے میں بہت بڑی تعداد ایسے زمینداروں کی تھی جن کے پاس خاصے لوگ اور ساز و سامان تھا۔ لیکن یہ سارے منصب دار اور زمیندار صوبۂ آگرہ کے گاؤں اور شہروں کو مرہٹوں کی لوٹ مار سے نہ بچا سکے۔[28] حدیقۂ نادر شاہ کا مصنف لکھتا ہے کہ "حکومت کے معاملات بگاڑ دیے گئے تھے۔ شہنشاہ کے وزیروں نے، جیسے قمر الدین خاں اور خانِ دوراں جو اعلا رتبوں اور دولت کی فراوانی کے باعث غرور کے نشے میں چور تھے، حکومت کے معاملات کو نظرانداز کیا تھا۔ وہ آرام طلب تھے، کوئی ان کی عزت نہ کرتا تھا۔ نہ خود وہ بادشاہ سے خائف تھے، اور بُرے کاموں میں ملوث رہنے کے علاوہ ان کا کوئی کام نہ تھا۔"[29]

ایک ایسے ماحول میں جو گروہی جھگڑوں سے پُر تھا، مورخین مجبور ہو گئے کہ اپنے گروہ کے قائدوں پر نظر رکھیں، اپنے سرپرستوں کی طرف داری کریں اور ان کے دعووں کی تائید کریں۔ اس جانبدارانہ سیاست نے ان کا صحیح ادراک ختم کر دیا اور ان کے اُفقِ خیالات پر پردہ ڈال دیا۔ تاریخ کا کینوس سمٹ کر اس معمولی مباحثے تک محدود ہو گیا کہ حکمراں معاملات میں کون سا گروہ کسی شخص یا گروہ کے ساتھ ہے۔ اس مباحثے کا پوری سماجی زندگی کے وسیع پہلوؤں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ تاریخ گھٹ کر محض مجموعۂ حقائق بن گئی جس کو سیاسی رسالوں کی طرح پڑھا جاتا اور اُسے امراے کسی ایک گروہ کے مفاد میں حکمراں طبقے کے کسی دوسرے گروہ کے خلاف ایک موثر حربے کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ حق کی چھان بین اور تاریخی مواد کی فراہمی اور استعمال کی اہمیت سمجھنے کے واسطے جس تنقیدی شعور کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں کم تھا۔

Marfat.com

اس مشاہدے کی وضاحت کے لیے تین مخصوص مثالوں کا انتخاب کیا گیا ہے' ان مثالوں سے ظاہر ہوگا کہ نزاعی مسائل کی ترجمانی کتنے مختلف انداز میں کی گئی ہے۔ یہ مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

(i) فرخ سیر اور سید برادران کے درمیان تصادم

(ii) مغلوں اور سادات بارہا کے درمیان حصولِ قوت کے واسطے مقابلہ

(iii) ہندوستان پر نادر شاہ کے حملے کے وقت مختلف امرا کا رول

ان مخصوص مسائل تنقیدی مطالعہ ہمیں یہ طے کرنے میں مدد دے سکتا ہے کہ ہمعصر مورخین کے ذہن کن تعصبات سے متاثر ہوئے۔

(i) فرخ سیر اور سیّد برادران کے درمیان جو طویل تصادم ہوا' اس کے باعث شاہی دربار پر تقریباً مستقل خوف اور بے چینی چھائی رہی۔ اپنی بقاکے واسطے سخت مقابلے میں مصروف رہنے کے باعث شہنشاہ اور اس کے وزیروں نے ملکی انتظام کی طرف توجہ نہ دی اور ایک دوسرے کے خلاف منصوبے بنانے میں منہمک رہے۔[30] ہوشیاری اور استقلال کی ملی جلی حکمت عملی کی بنا پر سیّد برادران نے اپنا اثر قائم کرلیا اور سارے معاملات کو پورے طور سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اٹھارہویں صدی کے مورخین جب ان عظیم واقعات کو تحریر کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ انتخاب حقائق اور ان کی ترجمانی کے معاملے میں ان کے رویے جدا جدا ہیں۔ مُصنّفین کی ایک جماعت سیّد برادران کے بُرے کاموں پر سخت تنقید کرتی ہے' اور اس کے برعکس بعض دوسرے مُصنّفین حکومت کی ساری برائیوں کی مکمل ذمہ داری فرخ سیر کے کاندھوں پر ڈالتے ہیں۔ سیّد برادران کی نافرمانیوں کے باعث' نیز حصولِ قوت کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش اور انتظامی فرائض کی ادائیگی سے لاپرواہی کے باعث' اُن کا ذکر بڑی حقارت سے کیا جاتا ہے۔[31] اسی طرح فرخ سیر پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اپنے طاقتور وزیروں سے نپٹتے وقت اس نے کمزور اور ناپائیدار حکمت عملی اپنائی۔[32]

Marfat.com

خفی خاں واضح طور پر یہ لکھتا ہے کہ سید عبداللہ اور حسین علی کو اعلا فوجی اور مالی عہدے دے کر فرخ سیر نے سخت غلطی کی کیونکہ ان دونوں کو انتظامی امور کی نہ کوئی تربیت ملی تھی نہ اس کا انھیں تجربہ تھا۔[33] اس کے برخلاف، قاسم لاہوری، جو خود کو سادات کا غلام کہتا ہے، سیدوں کا پُرجوش حامی ہے اور شہنشاہ کو مورد الزام ٹھہراتا ہے جس نے سیدوں کے خلاف سازشیں کرکے اور ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر انھیں اپنا سخت مخالف بنا لیا۔[34] مرزا محمد[35] اور شفیع وارد[36] کا بیان یہ ہے کہ سیدوں کے عروج پر جب ایسے امرا کو حسد ہونے لگا جیسے میر جملہ جو مغل تھا اور خانِ دوراں جو ہندی نژاد مسلمان تھا تو انھوں نے پسِ پردہ سازشیں کرنے اور اپنے اختیارات برقرار رکھنے کا تہیہ کرلیا۔ ان امرا نے شہنشاہ کو وزیر اور میر بخشی کے خلاف اُکسایا، اور اس طرح دربار میں جھگڑے پیدا کر دیے۔

فرخ سیر کا میر منشی، یحییٰ خاں، کچھ اور باتیں بھی تحریر کرتا ہے جن کی وجہ سے بادشاہ اور وزیروں کے درمیان خلیج اور گہری ہوگئی۔ وہ لکھتا ہے کہ وزارت، صدارت اور دیوان کے عہدوں پر تقرری کے جو جھگڑے ہوئے ان کے علاوہ فرخ سیر اجارہ داری شروع کرنے اور جزیہ ختم کرنے کے سخت خلاف تھا۔[37] محمد آشوب پوری صورتِ حال کو ایک فرقہ پرست کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اس تصادم کا سبب وہ پُرانی دُشمنی تھی جو مغلوں اور بارہا کے سیدوں کے درمیان رہی تھی۔ اس کے بموجب سیدوں نے سارے اعلا سرکاری عہدوں پر قبضہ کر رکھا تھا اور مغل جو سلطنت کی پشت پناہ تھے، بے روزگاری اور مالی مُصیبتوں کے شکار تھے۔[38]

تاریخِ ہند جو نہایت مختصر اور جامع کتاب ہے، اس کا مصنف رُستم علی خاں دلیری کے اُن قابلِ دید کارناموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے جو حسین علی خاں نے انجام دیے۔ اس کی سخاوت اور صوفیوں نیز اہلِ علم کی کُھلے دل سے سرپرستی کی بھی بڑی تعریف و توصیف کی ہے۔[39] لیکن آشوب، حسین علی خاں کی خوبیوں اور کارناموں کو نظر انداز کرنا بہتر

Marfat.com

سمجھتا ہے۔ وہ بڑی کاوش کے ساتھ اس کے کردار کی خامیاں سامنے لاتا ہے[40] ایک قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ تقریباً سارے ہی مورخین مرہٹوں، راجپوتوں اور جاٹوں کے معاملے میں حسین علی کی اس مصالحانہ پالیسی کے بارے میں کچھ نہیں لکھتے جس پر وہ عمل پیرا رہا۔ ان کی تحریروں سے سیدوں کے خلاف تعصب ظاہر ہوتا ہے، اور سیدوں نے زمینداروں اور علاقائی سرداروں کے معاملے میں جو طریقِ کار اختیار کیا وہ اسے غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ یہ درست سہی کہ انھوں نے مقامی حکمرانوں سے جس انداز سے روابط قائم کیے تھے اُن کا مقصد یہ تھا کہ فرخ سیر سے کسی کا کوئی تعلق نہ رہے، لیکن اس حکمتِ عملی کی بنا پر بالواسطہ طور سے ان علاقوں میں شاہی اقتدار کا بول بالا ہوا، جن علاقوں میں جھگڑے فساد کا دَور دورہ تھا۔

جب فرخ سیر کو شرمناک انداز میں معزول کیا گیا اور اس کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا گیا تو سیدوں کے خلاف غم و غصے کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ بادشاہ کے ساتھ جو زیادتیاں کی گئیں ان پر نہ صرف غیر مطمئن امرا برہم ہوئے بلکہ سماج کے ادنا طبقے بھی طیش میں آگئے۔[41] فاتح وزیروں نے مغل تاج کی بے عزتی کی، سرکاری عہدے اپنے عزیزوں اور رفیقوں سے بھر دیے، اور معزول بادشاہ کی ذات پر سختیاں ڈھائیں۔ اُن مورخین کے رویے بھی یک لخت بدل گئے جو اس سے پہلے تک سیدوں کو حق بجانب ٹھہراتے تھے، اور وہ ان کے بُرے افعال پر لعنت ملامت کرنے کے لیے سخت زبان استعمال کرنے لگے۔ یہ بات میر قاسم لاہوری[42] اور محمد قاسم اورنگ آبادی[43] پر خاص طور سے صادق آتی ہے۔ فرخ سیر کی کمزور اور غیر مستقل حکمتِ عملی کے بارے میں اپنے سابقہ مشاہدات کے برخلاف، اُن مصنفین نے ان طریقوں کی مذمت کرنا شروع کر دی جو سیدوں نے اختیار کیے تھے۔

(ii) ایک اور اہم معاملہ جس پر راویانِ واقعات ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں، اقتدارِ اعلا کے واسطے وہ سخت جدوجہد ہے جو مغلوں اور سیدوں کے درمیان ہوئی۔ حکمراں جماعت کے دو گروہوں کے درمیان مفادات کے اس ٹکراؤ کی وجہ سے

Marfat.com

تسمینہ' اس کی وسعت اور نوعیت سمجھنے کے لیے' اس بات کی تشریح کرنا ضروری ہے کہ مورخ خود کن گروہوں سے وابستہ تھے' ان کے تعلقات اور تحریک ذہنی کے ذرائع کیا تھے جن سے ان کے نظریات متاثر ہوئے۔ بیشتر کتابیں محمد شاہ یا نظام الملک کی سرپرستی میں لکھی گئیں' جو مغلوں کے تسلیم شدہ قائد تھے۔ مثال کے طور پر خفی خاں نے محمد شاہ کے دور میں اپنی کتاب مکمل کی' اور وہ لمبے عرصے تک نظام الملک کے تحت ملازم رہا۔ محمد بخش آشوب مغل تھا، اور اقتدار کی جدوجہد کا بیان مغل نقطۂ نظر سے پیش کرتا ہے۔ محمد قاسم اورنگ آبادی احسن ایجاد' یوسف محمد خاں' منیم خاں اورنگ آبادی[44] خنسارام اور دوسرے لوگوں نے اپنے روزنامچے اس زمانے میں تالیف کیے جب نظام الملک کا آفتابِ اقتدار نصف النہار پر تھا۔

یہ مصنّفین' دکن میں حکومت کے ملازم ہونے کے ناتے' اس نظام الملک سے ذاتی وفاداری کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے' جو ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ سیدوں کے پاس ایسے چند ہی مورخین ہیں جو اُن کے معاملے کی وکالت کر سکیں۔ سیدوں کے حمایتوں کی فہرست میں شاید رستم علی خاں اور غلام حسین طباطبائی[45] آسکتے ہیں۔ ان مختلف رایوں پر غور کرتے ہوئے خفی خاں لکھتا ہے:

"فرخ سیئر کے زمانے میں لوگوں نے ایک یا دوسری جانب وہ جانبداری یا دشمنی دکھائی ہے جس کا کوئی حد و حساب نہیں' ان کی نظر اپنے فائدے یا نقصان پر رہی ہے' اور اپنے اسپِ تصور کو اسی کے مطابق موڑ دیا ہے۔ ایک جانب کی ساری خوبیوں کو غلطیوں میں بدل دیا ہے' اور دوسری جانب کی غلطیوں سے آنکھیں موند لی ہیں۔"[46]

خفی خاں یہ لمبے چوڑے دعوے کرتا ہے کہ واقعات تحریر کرتے وقت اس نے دیانت داری اور صاف گوئی سے کام لیا ہے' پھر بھی نظام الملک کے واسطے اپنی ہمدردیوں کو چھپا نہیں پاتا۔ وہ اپنے سرپرست کی غلطیوں کی بے جا تاویلیں کرتا ہے اور اس

Marfat.com

کے دشمنوں کو قصور وار ٹھہراتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نظام الملک اس خیال کا مخالف تھا کہ سید برادران کو نمک بحرام اور حرام نمک کہا جائے۔[47] لیکن نظام الملک نے شہنشاہ اور اپنے دوستوں نیز ماتحتوں کو جو عرضداشتیں اور خطوط بھیجے ان میں سے ہر ایک میں اس نے ان دونوں بھائیوں کے لیے خود یہ کلماتِ نازیبا استعمال کیے۔[48]

(iii) یہ مورخین اس بات پر بالکل متفق نہیں ہیں کہ نادر شاہ نے 1738ء میں ہندوستان پر جو حملہ کیا اس کی دعوت آیا سادات خاں اور نظام الملک نے دی تھی یا یہ کہ خانِ دوراں نے صورتِ حال بگاڑ دی اور ایرانی حملے کے سیلاب کی روک تھام کے لیے جو تیاریاں ضروری تھیں ان کی طرف سے سخت غفلت برتی۔ رسالہ محمد شاہ و خانِ دوراں کے گمنام مصنف اور جوہر سمسام کا مصنف ان دونوں اعلا مغل امیروں پر کھلے طور سے غداری کا الزام لگاتے ہیں کہ اس نے کابل اور لاہور کے صوبیداروں کی مالی امداد نہ کی جس کی وجہ سے شمالی مغربی سرحد کے دفاعی مورچے مضبوط نہ کیے جاسکے۔ اس نے ناصر خاں اور ذکریا خاں سے لاتعلقی برتی جس کے سبب بے حسی اور بیجا اطمینان کا ماحول بن گیا، شہنشاہ ایک غلط قسم کے احساسِ سلامتی سے مطمئن ہو گیا اور سرکاری عہدیدار باہری حملے کا سامنا کرنے کے واسطے جو کوششیں کر رہے تھے وہ ختم ہو گئیں۔[50]

رسالہ محمد شاہ و خانِ دوراں اور جوہر سمسام بڑے رنگین اور مبالغہ آمیز انداز میں لکھی گئی تھیں، اور لگتا ہے کہ ان کے مصنفین نے اپنے سرپرست، خانِ دوراں، کی حیثیت بڑھانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اس کے مخالفین نظام الملک اور سادات خاں نے کرنال کے میدانِ جنگ میں جو رول ادا کیا، وہ اس پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ قمر الدین خاں جو نظام الملک کا بھتیجہ اور وزیر تھا، اس کا دیوان آنند رام مخلص اور آشوب، جو مغل موقف کا سرگرم حمایتی تھا، یہ دونوں میر بخشی پر تہمتیں لگاتے ہیں اور

Marfat.com

لے باہری حملے سے تباہ کن نتائج کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ امراء کے درمیان جو باہمی عداوتیں تھیں ان کے پیشِ نظر مورخین کے ان سارے بیانات کی بڑے غور سے جانچ کی جانی چاہیے۔ ہمارے پاس کوئی ایسی براہِ راست یا اتفاقی شہادت نہیں ہے جو سادات خاں اور نظام الملک پر لگائے جانے والے غدّاری کے الزامات کی تائید کر سکے۔

اٹھارہویں صدی کا تاریخی ادب اتنا کثیر ہے کہ ایک مقالے میں پورے طور سے اس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہرکیف' اس ادب کی جانچ فنِ تاریخ نویسی کے جدید معیاروں سے نہیں کرنی چاہیے۔ مورخین نے سطح سے نیچے دیکھے بغیر وہ سب باتیں لکھ دی ہیں جو پیش آئی تھیں۔ وہ باتیں جن کی تشریح یا تو کی نہ جا سکی یا جنھیں کسی مصلحت کے تحت چھپایا گیا ان کو مورخین نے اتفاق یا مرضیِ خدا پر یہ کہہ کر محمول کر دیا کہ اس معاملے کی اصلیت اللہ ہی جانتا ہوگا۔ ان افواہوں کے بارے میں کہ نظام الملک کے اشارے پر سیّد عبداللہ کو زہر دے کر مارا گیا' خفی خاں نے اپنے سرپرست کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت کی چھان بین اور معاملے کی تہہ میں جائے بغیر اس نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اصل حقیقت سے اللہ ہی واقف ہے۔ یہ مصنّفین اپنے زمانے کی پیداوار تھے' اور ان کی تحریروں سے اس حکمراں طبقے کے رویّوں اور روایتوں کی عکاسی ہوتی ہے' جو اس دور کے سیاسی حالات پر فیصلہ کن انداز میں اثر ڈالتا ہے۔

Marfat.com

حوالہ جات

۱۔ نواب شاکر خاں، گلشنِ صادق، پٹنہ دستاویز فولیو ۴۴۸ از نواب صدر الدین محمد خاں فیض، کلیات فیض۔ بوڑلیان دستاویز۔ علی گڑھ روٹوگراف، فولیو ۱۲۲ تا 125۔

2۔ اعتماد علی، مرات حقائق۔ بوڑلیان دستاویز۔ مرزا محمد علی خاں، مراتِ احمدی، گیکواڑ اورنٹل سیریز، 1927، آنند رام، سیاق نامہ، سینٹرل ریکارڈ آفس، حیدرآباد۔ لچھمی نرائن شفیق، حقیقتِ ہندوستان، آصفیہ دستاویز، حیدرآباد۔ جواہر مل بیکس، دستور العمل بیکس، علی گڑھ دستاویز۔

3۔ موسوی خاں جرأت، منشاتِ موسوی خاں، آصفیہ لائبریری دستاویز، حیدرآباد، منشی دیا رام، بالمکند نامہ، پٹنہ دستاویز۔ صائب رائے، جحستہ کلام۔ بھگوان داس، عزیز القلوب، علی گڑھ دستاویز۔

۴۔ نظام الدین، نادر نامہ، آصفیہ دستاویز۔ احسن ایجاد۔ شاہ نامہ دکن، آصفیہ دستاویز۔ میر رضا ذوالفقار، شرف نامہ محمد شاہ، بی۔ ایم۔ دستاویز۔

5۔ کیول رام، تذکرۃ الامرا، علی گڑھ دستاویز۔ مرزا محمد، تاریخ محمدی، رام دستاویز۔ شاہ نواز خاں، معاصر الامرا۔ رستم علی خاں، تاریخِ ہندی بی۔ ایم دستاویز، خواجہ گل محمد، تکملہ سیر الاولیا۔

6۔ شاہ ولی اللہ کی کتابوں کی تفصیلات کے لیے دیکھیے، الفرقان، بریلی، اسلامک کلچر،

Marfat.com

1951 - خلیق احمد نظامی، تاریخِ مشائخ چشت، دہلی 1953 -

محمد بخش آشوب نے 1781 میں لکھا تھا کہ اس دور میں فن تاریخ نویسی متروک ہو چکا ہے۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے کثیر تاریخی ادب کی روشنی میں یہ بیان غلط لگتا ہے۔ تاریخِ شہادتِ فرخ سیر و جلوسِ محمد شاہ، بی۔ ایم۔ دستاویز، فولیو 13 -

8- خفی خاں، منتخب اللباب، ببُ انڈکا کلکتہ 1874 جلد دوم، صفحات 600، 769 -

9- ایضاً جلد دوم، صفحات 627 تا 628 -

10- معاصر الامرا، جلد اوّل، صفحات 350 تا 352 -

11- منتخب اللباب، جلد دوم، صفحہ 630

12- ایضاً جلد دوم صفحہ 677 -

13- ایضاً جلد اوّل، صفحات 157 تا 158 - ایضاً جلد دوم، صفحات 600 تا 769 -

14- اعتماد علی خاں، مراتِ حقائق، بوڈلین دستاویز سیتا متو روٹوگراف -

15- احسن ایجاد فرخ سیر نامہ کا بھی مصنف ہے، جس میں محض فرخ سیر کے زمانے کی سیاسی تاریخ کا ذکر ہے، بی۔ ایم دستاویز گر۔ 25 (ریو 1273a)

16- میر محمد قاسم اورنگ آبادی، احوالِ خواتین، بی۔ ایم دستاویز، فولیو 103 تا 105 -

17- ارادت خاں، تاریخِ ارادت خاں، علی گڑھ دستاویز، فولیو 2 ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن، جلد ہفتم، صفحہ 535 -

خفی خاں اورنگ زیب کے دور میں سرکاری ملازم تھا۔ جب فرخ سیر تخت نشین ہوا تو اسے نظام الملک کا دیوان مقرر کر دیا گیا۔ وہ اپنے ذریعہ معلومات کی بابت یہ الفاظ لکھتا ہے:

"جو میں نے خود دیکھا، جو اُن لوگوں کی زبان سے سُنا جو وقتاً فوقتاً فرخ سیر سے وابستہ رہے تھے، اور جو سپاہیوں سے سُنا جو جنگ اور ضیافت میں اس کے شریک رہے تھے،

Marfat.com

اسے بڑی دیانت داری سے سپردِ قلم کر دیا ہے۔ اور جب بیانات میں اختلاف معلوم ہوا تو حق تک پہنچنے کی سخت کاوش کی ہے۔"

منتخب اللباب، جلد دوم، صفحہ 727۔ ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن، جلد ہفتم، صفحہ 44۔

18- منتخب اللباب، صفحہ 726۔

19- مراتِ واردات، علی گڑھ دستاویز، صفحہ 10۔

20- منتخب اللباب، جلد دوم، صفحات 601 تا 602، 627 تا 628۔ کامراج بن نین سنگھ۔ عبرت نامہ، بی۔ ایم دستاویز، علی گڑھ روٹوگراف، فولیو 36a۔

21- نورالدین فاروقی، جہاندار نامہ، بی۔ ایم دستاویز، علی گڑھ روٹوگراف، فولیو 36 تا 38 شیخ محمد معین، فرخ نامہ، بی۔ ایم دستاویز، علی گڑھ روٹوگراف، فولیو 74 تا 75، 89۔

22- مرزا محمد، عبرت نامہ، پٹنہ دستاویز، فولیو 95 تا 96۔

23- یحییٰ خاں، تذکرۃ الممالک، بی۔ ایم دستاویز، علی گڑھ روٹوگراف، فولیو 132b۔

24- تاریخِ شہادت فرخ سیر و جلوسِ محمد شاہ، بی۔ ایم دستاویز، فولیو 43a، مراتِ واردات، صفحات 644 تا 645۔

25- اس پہلو پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے، اسٹڈیز ان اسلام، دہلی جنوری 1955، صفحہ 33۔

26- احوالِ خواتین، فولیو 181۔ مراتِ حقائق۔ فولیو 92a۔

27- منتخب اللباب، صفحہ 776۔ عبرت نامہ، کامراج، فولیو 46a، 54a۔

28- مراتِ واردات صفحہ 644۔

29- حدیثۂ نادرشاہ، (گمنام)، آصفیہ دستاویز، فولیو 4a۔

30- کامراج، عبرت نامہ، فولیو 54a۔

Marfat.com

31- احوالِ خواتین، فولیو 77a ۔ تاریخِ شہادتِ فرخ سیر و جلوسِ محمد شاہ، فولیو 42a ۔

32- مرزا محمد، عبرت نامہ، فولیو 102 تا 103 ۔ میر قاسم لاہوری، تاریخِ سلطنتِ فرخ سیر، بی۔ایم دستاویز، فولیو 62a ۔

33- منتخب اللباب، صفحہ 738 ۔

34- تاریخِ سلطنتِ فرخ سیر، فولیو 1b، 2a، 66b ۔

35- مرزا محمد، عبرت نامہ، فولیو 30 ۔

36- مراتِ واریدات، صفحہ 505 ۔

37- تذکرۃ الممالک، فولیو 122، 124 ۔

38- تاریخِ شہادتِ فرخ سیر و جلوسِ محمد شاہ، فولیو 70a، 43 ۔

39- تاریخِ ہندی، صفحہ 772

40- تاریخِ شہادتِ فرخ سیر و جلوسِ محمد شاہ، فولیو 38، 42، 43 ۔

41- شاہ نامہ منور کلام، فولیو 316 ۔

42- تاریخِ سلطنتِ فرخ سیر، فولیو 76، 77، 80 ۔

43- احوالِ خواتین، 88a، 145b، 152a ۔

44- منیم خاں اورنگ آبادی، سوانحِ دکن، سینٹرل ریکارڈ آفس، حیدر آباد دستاویز۔

45- غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، (متن) کلکتہ، II، 1836 ۔ صفحات 21، 22، 30، 37 تا 39 ۔

46- منتخب اللباب، صفحہ 726 ۔

47- منتخب اللباب، صفحہ 940 ۔

خفی خاں مصطفےٰ آباد دکن کے خالصہ محل میں فوجدار اور امین کے عہدوں پر فائز رہا۔ یہ محل برہان پور کے صوبیدار کے افسران نے تباہ کر دیا تھا۔ رعیت بھاگ

Marfat.com

گئی تھی اور کاشتکاری ختم ہوگئی تھی، خفی خاں نے بڑے جوش و خروش سے ساتھ محل دوبارہ بسایا اور تحصیل وصول کے لیے سپاہی بھرتی کرنے پر دولت صَرف کی۔ 1718 میں دکن کے صوبیدار حسین علی خاں نے دہلی کی سمت کوچ کا ارادہ کیا، جہاں اس کی موجودگی نہایت ضروری ہوگئی تھی کیونکہ وزیر سیّد عبداللہ خاں اور فرخ سیر کے درمیان تصادم ایک نازک مقام پر پہنچ گیا تھا۔ حسین علی خاں نے توپ خانے کے خرچ کے لیے خفی خاں سے بیس ہزار روپے طلب کیے۔ چونکہ خریف کی فصل ابھی کٹی نہیں تھی، اس لیے خفی خاں مطلوبہ رقم فراہم نہ کرسکا۔ صوبیدار نے یہ رقم دوسرے ذرائع سے حاصل کی اور مورّخ کو برخواست کر دیا۔ اس عہدے سے برطرفی جسے خفی خاں نے بڑی مشکلات کا سامنا کر کے حاصل کیا تھا، غالباً اس کے ذہن میں کھٹکتی رہی اور وہ حسین علی خاں سے بدظن ہوگیا۔ جلد دوم، صفحہ 798۔

48۔ منشات موسوی خاں، فولیو 48، 51۔

49۔ رسالہ محمد شاہ و خانِ دوراں، گمنام، بی۔ایم دستاویز، فولیو 100، 103 تا 105۔ محمد محسن، جوہر صمصام، بی۔ایم دستاویز یا 1898، ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن، جلد ہشتم، صفحہ 75۔

50۔ آنند رام مخلص، تذکرہ، علی گڑھ دستاویز، فولیو 119 تا 120۔ تاریخ شہادت فرخ سیر و جلوس محمد شاہ، فولیو 162، فولیو 162 تا 164۔

Marfat.com

محمد قاسم اور خفی خاں کے تاریخی اندازِ نظر کا ایک تقابلی مُطالعہ

محمّد عُمر

محمد قاسم اور خفی خاں اٹھارہویں صدی کے دو مورخ ہیں۔ یہ دَور شدید سیاسی سرگرمی، درباری سازشوں اور درباریوں کے پوشیدہ تعلقات، سیاسی گٹھ بندیوں تیز امرا اور گروہوں کی بدلتی ہوئی وفاداریوں، اور سب سے زیادہ یہ کہ مُغل سلطنت کے تیز رفتار سیاسی اور معاشی زوال کے لیے مشہور رہے۔

محمد قاسم اور خفی خاں نے اسی سیاسی منظر کا دو مختلف زاویوں سے مطالعہ کیا ہے۔ اسی لیے اگر ہم اُن کے نظریوں، رَویّوں اور تعصّبات تیز معلومات فراہم کرنے اور اسے پیش کرنے کے طریقوں کا مطالعہ کریں تو ہمیں اٹھارہویں صدی کی تاریخی تحریروں کا دُرست اندازہ لگانے میں مدد مل سکتی ہے۔

محمد قاسم کے بارے میں عصری ادب سے بہت کم معلومات حاصل ہوتی ہے۔ وہ غالباً اہلِ علم اور مورّخ کی حیثیت سے بہت مشہور نہ تھا۔ وہ ہمیں خود یہ بتاتا ہے کہ کچھ عرصے تک وہ شاہ عالم (بہادر شاہ) کے بیٹوں کے ساتھ بہار میں رہا، جہاں وہ شہنشاہ کے بھتیجوں، علی تبار اور بیدار کی خدمت پر مامور تھا۔ اس نے اس کی بہت خدمت کی اور ان کا منظورِ نظر بن گیا، اور آخر کار انھوں نے اس سے وعدہ کیا کہ اگر ان میں سے کوئی ہندوستان کا شہنشاہ بنا تو اسے اعلا عہدہ دیا جائے گا۔

۱

Marfat.com

محمد قاسم نے اورنگ آباد میں امیرالامرا حسین علی خاں سے ملاقات کے کئی موقعے نکالے، جہاں وہ اپنے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ لیکن پھر اسے اوّل الذکر کے غرور کی بنا پر اس سے تنفر پیدا ہو گیا۔

اس کے بعد ان دنوں جب نظام الملک مرہٹوں سے برسرِ پیکار تھا، وہ اس کی فوج میں بخشی بن گیا۔ اسے نظام الملک کی حمایت اور اعتماد حاصل ہو گیا تھا اور وہ اس کی ادبی محفلوں میں شریک رہنے لگا تھا۔ لہٰذا احوال الخواتین میں اس نے جو معلومات فراہم کی ہے وہ ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے۔ اس نے نظام الملک کے داماد، ملّا وصل خاں (وفات 1158ھ مطابق 44-1743ء) سے، جو بگلانہ کا فوجدار تھا، بڑی گہری دوستی پیدا کر لی تھی۔

احوال الخواتین 1151ھ مطابق 39-1738ء تک اورنگ زیب کے جانشینوں کی تاریخ ہے، اور یہی سال اس کتاب کا سالِ تکمیل بھی ہے۔ یہ دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصّہ جس میں اورنگ زیب کے دَور سے فرخ سیر کی معزولی تک کا ذکر ہے، 2 رمضان 1147ھ مطابق 35-1734ء کو مکمل ہو گیا تھا۔ دوسرا حصّہ رفیع الدرجات کی تخت نشینی سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں خاص طور سے نظام الملک اور سیّد برادران کا تصادم نیز نظام الملک اور مرہٹوں کی جنگوں کا ذکر ہے۔ اس کا بیان نادر شاہ کے حملے سے پہلے 1151ھ مطابق 39-1738ء کے واقعات پر ختم ہو جاتا ہے۔

محمد ہاشم خفی خاں، منتخب اللباب کا مصنّف ہے، دہلی کے ایک باعزت خاندان سے تعلّق رکھتا تھا۔ اس کا والد خواجہ میر بھی مورّخ تھا۔ وہ پہلے شہزادہ مراد بخش کے تحت اور پھر اورنگ زیب کی ملازمت سے اپنی ترقّی کی ابتدا کی۔ اورنگ زیب نے اسے سیاسی اور فوجی امور پر مامور کیا تھا۔ فرخ سیر کے دَور میں وہ نظام الملک کا دیوان بنا دیا گیا تھا۔

Marfat.com

منتخب اللباب نہایت اعلا درجے کی تاریخ ہے۔ اس میں بابر کے حملے سے محمد شاہ کے دور کے چودہویں برس تک کا بیان ہے۔ چونکہ اورنگ زیب نے ممانعت کرادی تھی کہ اس کے زمانے کے واقعات درج نہ کیے جائیں اس لیے خفی خاں نے اس دور کے سارے چھوٹے بڑے واقعات ایک رجسٹر میں درج کر لیے اور شہنشاہ کی وفات کے بعد اسے چھپوایا۔ اس کی کتاب بڑی قابلِ قدر ہے کیونکہ اس میں اورنگ زیب کے دور کا مکمل بیان ہے۔

خفی خاں شیعہ تھا، اور اسی بنا پر اس نے اپنی کتاب میں شیعہ امرا کی طرف داری کی ہے۔ وہ سوائے نظام الملک کے سارے تورانی امرا سے تعصب رکھتا ہے۔ نظام الملک کا وہ ملازم تھا، اور اس کی تعریفوں سے معمور ہے۔ اسی جانبداری کی وجہ سے اسے بعض اوقات نظام الملکی کا نام دیا جاتا ہے۔

خفی خاں ہمیں وہ اصول اور طریقے بتاتا ہے جو اس نے اپنی کتاب لکھتے وقت استعمال کیے۔ وہ کہتا ہے کہ مورخ پر لازم ہے کہ وہ دیانت داری سے کام لے۔ اسے انعام کی توقع اور نقصان کے خوف سے بالاتر ہونا چاہیے۔ وہ کہتا ہے کہ تاریخی تحریروں میں جانبداری کی ابتدا فرخ سیر کے دور سے ہوئی۔ جب مفاد پرستوں نے صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا اور جانبدارانہ بیانات تحریر کیے اور واقعات کا بیان اور ان کی اہمیت باہمی رقابت کی بنا پر طے کی گئی۔ ایسے لوگوں نے محض اپنے مفاد پر نظر رکھی اور حقیقت کے تقاضوں کو مسترد کر دیا۔ مخالف گروہوں کی خوبیوں کو برائی بنا کر پیش کیا گیا اور اپنے گروہ کی برائیوں کو خوبیاں بنا دیا گیا۔ اس کے بعد خفی خاں تاریخ کے بارے میں اپنے اندازِ نظر اور طریقِ کار کا ذکر کرتا ہے۔

"میں نے نقصان کے خوف سے نہ دوستوں کی حمایت کی ہے، نہ دشمنوں کو برا بھلا کہا ہے۔ میں نے کسی وزیر یا امیر کو محض خوش کرنے کے لیے کوئی بات نہیں کی ہے۔ میں نے صرف وہ تحریر کیا ہے جو یا تو خود دیکھا ہے یا اُن لوگوں سے سنا ہے جن کی فرخ سیر یا سید برادران

Marfat.com

کی محفلوں تک رسائی تھی، اور جو اُن کی سرگرمیوں سے پورے طور سے واقف تھے۔ مختلف ذریعوں سے حاصل کی ہوئی معلومات کی خوب اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد میں نے وہ تحریر کر دیا ہے جو مجھے سچ لگا۔"[2]

مندرجہ بالا سطور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد قاسم اور خفی خاں دونوں نظام الملک کے تحت ملازم رہے، اور اس حد تک دونوں کا پسِ منظر ایک جیسا ہے۔ اپنی کتابوں میں انھوں نے دوسری باتوں کے علاوہ اس زمانے کے سیاسی منظر کا ذکر کیا ہے۔ خفی خاں اپنا بیان مُغل سلطنت کی ابتدا سے شروع کر کے محمد شاہ کے دَورِ حکومت کے چودھویں برس پر ختم کرتا ہے۔ محمد قاسم اورنگ زیب کی وفات سے اپنے زمانے تک سیاسی واقعات کا جائزہ لیتا ہے۔ تاریخی اندازِ نظر، معلومات پیش کرنے کا انداز صورتِ حال کے تجزیے نیز دوسرے بہت سے معاملات میں یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ خفی خاں کے نزدیک تاریخ فہرست واقعات کے مترادف تھی، جن واقعات کو بڑے واضح انداز میں تاریخ وار ترتیب میں پیش کیا جانا چاہیے۔ محمد قاسم کا خیال تھا کہ صورتِ حال کا تجزیہ کرنا چاہیے، سببی تعلّقات تلاش کرنے چاہئیں، اور سارے جھگڑوں کا منبع درباری سیاست کو سمجھنا چاہیے۔ وہ شہنشاہوں کی زندگی، محل کی سازشوں، دربار کے سازشی گروہوں کی تفصیلات بیان کرتا ہے۔ اور پھر یہ بتاتا ہے کہ اُن کا عوام کی زندگی اور انتظامیہ پر کیا اثر پڑا۔ خفی خاں کہیں بھی خاص طور سے یہ اشارہ نہیں کرتا کہ سیاسی انتشار اور انتظامی افراتفری کو بڑھاوا دینے میں مغل شہنشاہوں نے کیا رول ادا کیا۔ اس کے نزدیک تاریخ محض حقائق کا انبار ہے۔ جس میں کوئی ربط اور یکسانیت نہیں ہے۔

ملک میں جو افراتفری اور انتشار پھیلا ہوا تھا اس کا ذمّے دار شہنشاہ کو ٹھہراتے ہوئے محمد قاسم کہتا ہے:

"بادشاہ عورتوں کی طرح چہار دیواری (محل کی) میں بیٹھا ہوا ہے۔ اگر بادشاہ

Marfat.com

عورتوں کے انداز اختیار کرلیں، اور نامردوں کے مشورے پر عمل کرنے لگیں تو پھر لازم یہ ہے کہ مسلمان ننگے اور مدینے کی راہ لیں اور اگر ان کے پاس سفر خرچ نہ ہو تو بہتر ہوگا کہ زہر کھا کر مر جائیں۔"[3]

یہاں وہ سخت کرب اور مایوسی کا اظہار کرتا ہے اور ہمیں یہ بتاتا ہے کہ لوگ کس کسمپرسی کے عالم میں تھے۔

محمد قاسم نے خفی خاں سمیت سارے ہمعصر مصنّفین کے مقابلے میں سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ طبقہ امراء کے کردار کا تجزیہ کیا ہے۔ اسے عام طور پر اس دَور کے سارے ہی امرا غدار، دغاباز اور مکّار لگے۔ ان کی وفاداری سطحی تھی اور وہ ضمیر کی آواز پر ذرا بھی کان دھرے بغیر اپنا دل بدل لیتے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ اس دَور کے امرا نہ صرف محض تدبّر سے مبرّا تھے بلکہ ہمت سے بھی عاری تھے، حالانکہ اس سے پہلے کے دَور میں ہمت ہی طبقہ امرا کا امتیاز تھی۔ محمد قاسم کا خیال تھا کہ سماج میں انتشار، اختلافات اور عدم استحکام کا اصل منبع درباری جھگڑے اور سازشیں تھیں جو محل سے پھوٹ کر جھونپڑیوں تک پہ آ گئی تھیں اور سارے ماحول کو تصادم اور تناؤ سے بھر دیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"وہ بادشاہ جس کے امرا ایک دوسرے کے جانی دشمن اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، زیادہ دن بچ نہیں سکتا۔ بادشاہوں کو لازم ہے کہ عیش و عشرت سے پرہیز کریں۔ انھیں اپنا وقت امور سلطنت پر صرف کرنا چاہیے۔ انھیں چاہیے کہ سلطنت کے اہم اور غیر اہم معاملات کی چھان بین کریں۔ کسی امیر کو یہ اجازت نہیں دینی چاہیے کہ وہ ان پر حاوی رہے۔ ان کی تقرری اور ترقی کا معیار لیاقت اور قابلیت ہونا چاہیے، چاپلوسی نہیں۔ انھیں یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ کوئی بادشاہ کی ذات کا وفادار ہے یا وفادار نہیں ہے، وہ اس گروہ سے تعلق رکھتا ہے یا اُس گروہ سے۔ اسی صورت میں بادشاہ ان مصیبتوں اور آفتوں سے بچ سکتا ہے جو چاپلوسوں کی درباری سازشوں اور جعل سازیوں کے جلو

Marfat.com

ہیں آتی ہیں۔"[4]

محمد قاسم بادشاہوں کے اُن فرائض کی بھی تشریح کرتا ہے جنہیں وہ ترک کر چکے تھے اور جس کے نتیجے میں ایک طرف تو خود اُن پر اور ان کے عوام پر ناقابلِ بیان مصائب ٹوٹے تھے اور دوسری طرف ملک ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا۔ اس کا مشاہدہ یہ ہے:

"شہنشاہوں کے لیے یہ اور بھی زیادہ لازم ہے کہ خود کو مصروف رکھیں (انتظامی معاملات میں) اور اَدنا معاملات پر اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ خصوصاً انھیں اپنا زیادہ وقت سپاہیانہ مشاغل اور تاریخ کی کتابوں کے مطالعے پر صرف کرنا چاہیے اور اس مقولے سے ایک انچ نہ ہٹنا چاہیے، کہ انہی مثالوں سے سپاہیوں کو سبق ملتا ہے۔ اس سے فوج کی قوت اور استحکام بڑھتا ہے۔ یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ ایک آدمی دس آدمیوں کا کام کرسکتا ہے۔ تاریخ مطالعے سے انسان کی رسائی سابقہ تجربات و مسائل نیز (گزرے ہوئے شہنشاہوں کے) قابلِ قدر اقدامات تک ہوجاتی ہے۔ کیونکہ ایک طرف وفاداری اور دوسری طرف دولت، عزت و وقار نیز اعلا مرتبے کے درمیان ہمیشہ دشمنی رہتی ہے۔ یہ چیزیں اس وقت تک بُری نہیں ہوتیں جب تک کوئی شخص اندازِ شاہانہ اختیار نہ کرنے لگے۔ اگر وہ غرور اور غلط کاری کی راہ اختیار کرتا ہے تو خود خُدا اُسے سزا دیتا ہے۔ اسے انصاف اور مساوات کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ ان ہی سے دائمی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور بُرے خیالات کو اپنے دِل میں جگہ نہ دینی چاہیے۔"[5]

محمد قاسم نے جہاندار شاہ کے زمانے میں پُرانے اور نئے امرا کے درمیان جو تصادم اور جھگڑے تھے ان پر بھی خوب روشنی ڈالی ہے۔ خفی خاں ہمیں محض یہ بتاتا ہے کہ امرا دو گروہوں ایرانیوں اور تورانیوں میں تقسیم تھے۔ لیکن محمد قاسم طبقۂ امرا اور ان کے جھگڑوں کو یوں تقسیم کرتا ہے کہ ایک طرف پُرانے باعزت مغل امرا تھے اور دوسری طرف نو دولتوں کے نئے طبقے جن کو وہ نو دولتاں کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"وہ خواہ جو بھی ہوں، انھوں نے سیاہ رُخ، بے مغز چاپلوسیوں اور چغل خوروں

Marfat.com

کی رائے پر عمل کیا اور دین و دُنیا دونوں سے ہاتھ دھوئے۔ کیا ہمیں نظر نہیں آتا کہ کتنے ملک اور (انتظامی ادارے) ایسے ہی رُسوائی کرنے والے بداعمال لوگوں کے باعث تباہ ہوگئے؟ انھوں نے اپنے فرمان (وہ جگہ جہاں فصلیں کاٹ کر ڈھیر کر دی جاتی ہیں) بھرنے کے لیے بادشاہ کی فصل (فصلیں) تباہ کر دی۔"[6]

خفی خاں کے مطابق اس دَور کے جھگڑوں کی تشریح یہی کہہ کر کی جا سکتی ہے کہ یہ جھگڑے ایرانیوں (شیعہ) اور تورانیوں (سُنّی) کے درمیان تھے۔ لیکن محمد قاسم کی رائے میں اس طبقے نے سیاسی توازن بگاڑا تھا جو گُمنامی اور خراب سماجی پسِ منظر سے اُبھر کر نیا نیا اُوپر آیا تھا۔ اپنے اس دعوے کی حمایت میں وہ ذیل کی مثال دیتا ہے:

"وزیر مقرر کیے جانے کے بعد، نظام الملک نے، جو انتظامیہ کی خامیوں سے خوب واقف تھا، محمد شاہ کو چند ایسے اقدامات کرنے کا مشورہ دیا جن کی مدد سے وہ خرابیاں دُور کی جا سکتی تھیں جو ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی تھیں۔ اور جن اقدامات کی مدد سے انتظامی اور مالی شعبوں میں نظم اور کارکردگی بحال کی جا سکتی تھی۔ لیکن نو دولتیوں نے ہر اُس کوشش کی سختی اور ضد سے مخالفت کی جو اصلاح کے لیے کی گئی۔ محمد قاسم نے اس مخالفت کے اسباب اور اس کی نوعیت کا بڑے تنقیدی طور سے جائزہ لیا ہے۔" وہ لکھتا ہے:

"وہ یہ کیونکر مان سکتے تھے کہ گھوڑے کے بجائے گدھے کی سواری کریں؟ وہ نو دولتیاں جو اپنے احساسِ کمتری کے باعث ضرورت سے زیادہ اطمینانِ ذاتی میں گرفتار تھے، جنھوں نے تصویر میں یا پردے پر گدھا بھی نہیں دیکھا تھا، اب یک لخت گھوڑوں، دولت اور سماجی رُتبے کے مالک بن گئے تھے۔ یہ گروہ اپنے منصوبوں میں کسی کمی کو کیسے برداشت کر سکتا تھا اور کیوں کر یہ مان سکتے تھے کہ گھوڑے کے بجائے گدھے کی سواری کریں؟"[7]

Marfat.com

لیکن خفی خاں بٹی ہوئی وفاداری کی ایک دوسری ہی تصویر پیش کرتا ہے کیونکر نظام الملک سے اس کے تعلقات تھے اور سید برادران کے لیے اس کے دل میں عزت تھی۔ سیدوں سے اس کا تعلق کسی حد تک مشترکہ مذہبی رشتوں کے باعث تھا۔ اسی لیے وہ سید برادران کے افعال کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے تورانی گروہ کو مورد الزام ٹھہراتا ہے۔ ان حالات پر محمد قاسم اور خفی خاں دونوں نے بحث کی ہے جن حالات کے تحت نظام الملک دکن روانہ ہوگیا۔ جو اسباب خفی خاں نے دیے ہیں ان سے نظام الملک کے شمالی ہند چھوڑ دینے کے فیصلے کا پس منظر بالکل بدل جاتا ہے۔ اس بیان سے پڑھنے والے کے ذہن پر یہ تاثر بنتا ہے کہ خفی خاں ثابت کرنا چاہتا ہے کہ نظام الملک کی شمالی ہند میں مسلسل موجودگی عوام کے مفاد میں نہ تھی۔ وہ کہتا ہے کہ کئی ایسی باتیں تھیں جن کے باعث وزیر اور شہنشاہ محمد شاہ میں کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ باتیں یہ ہیں:

(1) یہی وہ دور تھا جب مغل دربار میں یہ خبر پہنچی کہ ایران میں سیاسی بے چینی ہے، اور محمد خاں، افغان نے سلطان حسین شاہ پر قابو پالیا ہے اور اسے قید کر دیا ہے۔ اس نے ایران کا خاصہ علاقہ اپنے تحت کر لیا ہے اور عوام ناقابل بیان مصائب کا شکار ہیں۔ نظام الملک نے محمد شاہ کے سامنے وہ سارے گزرے ہوئے واقعات دُہرائے جب سلاطین ایران نے بابر اور ہمایوں کی بڑی مدد کی تھی اس نے شہنشاہ کو مشورہ دیا کہ اپنی فوجیں بھیج کر شاہ ایران کی مدد کرے۔ اس کام کے لیے اُس نے اپنی خدمات پیش کیں۔ لیکن جب شہنشاہ نے نو دولتیے مشیروں سے مشورہ کیا تو انھوں نے نظام الملک کی نیت پر شبہ ظاہر کیا، لہٰذا فوجیں ایران بھیجنے کا منصوبہ ترک کر دیا گیا۔

(2) نظام الملک نے شہنشاہ کو مشورہ دیا کہ نظام اجارہ داری ختم کر دے اور خالصہ زمینوں کو جاگیروں کی شکل میں دینا بند کر دے یہ تجویز بھی مسترد کر دی گئی۔

(3) اس نے شہنشاہ کو مشورہ دیا کہ اس کے منھ لگے لوگ اس کے نام سے

Marfat.com

جو تحائف دیتے ہیں انھیں وہ قبول نہ کرے، کیونکہ اس سے وہ بدنام ہوتا ہے۔ لیکن یہ رواج بند نہ کیا گیا۔

(۴) وہ چاہتا تھا کہ شہنشاہ جزیہ پھر سے نافذ کرنے پر رضامند نہ ہوجائے۔ لیکن شہنشاہ نے اس تجویز پر ذرا کان نہ دھرا۔[8]

اس کے برخلاف، محمد قاسم ایک بالکل مختلف بیان دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے: کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ محمد شاہ کے رُوبرو بے تکلّفی سے یہ کیسے کہہ سکتا تھا اس نے یہ علاقہ اپنی تلوار کے زور سے فتح کیا تھا، اور اسی لیے شہنشاہ یہ علاقہ اپنے اُدنا خام کے لیے چھوڑ دے۔ اس کے بجائے اس نے یہ کہا:

"جو عالی جاہ کی مرضی"۔ لیکن اسے بڑا دھکا لگا اور وہ تفکّرات کے گرداب میں گھر گیا، اور پھر اس نے اپنے آپ کو یوں سمجھایا کہ دکن کے مقابلے میں وزارت مہنگا اور بے معنی سودا ہے، اور پھر کون جانتا ہے کہ میں کتنے عرصے اس عہدے پر فائز ہوں۔ "اگر دکن بھی میرے ہاتھ سے جاتا رہا تو میں کہیں کا نہ رہوں گا"۔ خود کو یوں سمجھا کر اس نے سیاسی چالیں اور ترکیبیں شروع کر دیں اور دربار سے علاحدگی اختیار کرکے دکن واپس ہوگیا۔[9]

فرّخ سیر کی وفات کے بارے میں خفی خاں اور محمد قاسم نے جو مختلف نوعیت کی معلومات فراہم کیں ان میں دو تین ایسے واقعات بیان کیے گئے جن پر غور کرنے سے دونوں کے نقطۂ نظر کا فرق واضح ہوجاتا ہے۔ ان دونوں ہمعصر مصنّفین کے بیانات بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ ان کی تحریروں میں صرف اس بات پر اتّفاق ہے کہ فرّخ سیر کو نہایت ظالمانہ اور خبیثانہ طور پر گرفتار کیا گیا، لیکن بعد میں سیّد برادران نے شہنشاہ سے جو سلوک کیا اس کی بابت دونوں کے بیانات مختلف ہیں۔

محمد قاسم کہتا ہے کہ سیّدوں نے شہنشاہ کو قید کرنے کے فوراً بعد مروا ڈالا۔ خفی خاں وہ ماحول بنانے کی کوشش کرتا ہے جس ماحول میں فرّخ سیر کا قتل ناگزیر ہوجاتا ہے

Marfat.com

اوراس المیے کا منطقی نتیجہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قید کے دوران فرخ سیر نے ان اشخاص کو رشوت دے کر قید خانے سے بچ نکلنا چاہا جن کی تحویل میں اسے دیا گیا تھا۔ اس نے عبداللہ خاں کو پیش کش کی کہ اگر وہ کسی ترکیب سے اسے قید خانے سے نکال کر راجہ جے سنگھ سوائے کے پاس پہنچا دے تو وہ اسے سات ہزار کا منصب عطا کرے گا۔ اُسے خیال تھا کہ راجہ جے سنگھ سوائے کی مدد سے وہ دوبارہ تخت حاصل کرے گا۔

جن حالات میں رفیع الدولہ اور الدرجات کی موت واقع ہوئی وہ بھی بحث طلب ہیں۔ خفی خاں کہتا ہے کہ وہ طبعی موت مرے۔ دوسری طرف محمد قاسم کہتا ہے کہ ان کی موت دیر اثر زہر کے نتیجے میں واقع ہوئی۔ وہ کئی ایسے اسباب دیتا ہے جن کے باعث سیّد برادران کو ارتکاب جرم کی ترغیب ملی۔

چونکہ دونوں شہزادے عقل سے کورے، جرأت سے خالی اور جاہل تھے۔ اس لیے سیّد برادران کو لگا کہ شہزادے اس طرح انتظام نہیں چلا سکتے جس طرح وہ چاہتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے انھیں دیر اثر زہر کی مدد سے ہٹا دیا۔

اس وقت تک انھیں ہر معاملے میں کامیابی ہوئی تھی، لیکن اب خوف پیدا ہوا کہ کہیں انھیں کوئی ہزیمت نہ اُٹھانی پڑے اور ذِلّت کا مُنھ دیکھنا پڑے۔ اس لیے شہزادے راہ سے ہٹا دیے گئے۔

محمد قاسم کے بیان سے ایسا لگتا ہے کہ اس دَور میں رائے عامّہ نے بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔ سیدوں کو خوف ہوا کہ اگر انھوں نے کُھلم کُھلا یا پوشیدہ طور سے شہزادوں کو قتل کیا تو لوگ بڑے ناراض ہوں گے اور واویلا مچائیں گے، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے مقصد حاصل نہ کر سکیں گے۔ اُن کا قیاس تھا کہ جب تیمور کی نسل کا کوئی فرد باقی نہ رہے گا تو وہ خود بخود تخت کے مالک بن جائیں گے۔ انھوں نے ذیل کا انتظام کیا تھا۔ قطب الملک شمالی ہندوستان پر حکومت کرے گا اور دکن نیز مالوہ امیر الامرا کے زیرِ انتظام رہے گا۔ ان کے دو علاحدہ صدر

Marfat.com

مقام ہوں گے اور دونوں خود مختار ہوں گے۔ یہ مصنفین ہمیں یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ سید برادران تیمور کی نسل برباد کرنا اور مغل تخت پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ ان دونوں مورخین نے حسین علی خاں کے قتل کے بارے میں جو بیانات دیے ہیں وہ بھی اس طرح کے ہیں۔

اختتام

محمد قاسم اور خفی خاں نے بڑے تنقیدی طور سے ان عناصر کا جائزہ لیا ہے جن کے باعث مغل سلطنت کا زوال ہوا۔ دونوں اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ درباری گٹھ بندی اس زوال کا سبب تھی۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ محمد قاسم سید برادران کو فرخ سیر کے قتل کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور خفی خاں اس کے بیان سے اتفاق کرتا ہے۔ حالانکہ محمد قاسم بہت تفصیل کے ساتھ سید برادران کے ان مقاصد کی تشریح کرتا ہے جن کے تحت رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کو دیر اثر زہر کے ذریعے مروادیا گیا، لیکن خفی خاں کہتا ہے کہ وہ طبعی موت مرے۔

محمد قاسم نے جنگوں وغیرہ کی تفصیلات دینے کے بجائے صرف ان مسائل کا انتخاب کر لیا ہے جو مغل فرمانروا اور سلطنت کی سالمیت پر برا اثر ڈال رہے تھے، اور اس نے چند بار بڑی تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ انتشار کی قوتوں کو روکنے کے لیے شہنشاہوں کو کیا تدابیر اور اقدامات کرنے چاہیے تھے۔ وہ زیادہ تنقیدی اور صاف گو ہے، اور اس نے دربار کی سازشوں، جعل بٹوں نیز گروہی سیاست اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ، مغل سلطنت کے تیز رفتار اقتصادی نیز سیاسی زوال پر بڑی روشنی ڈالی ہے۔ دوسری طرف تاریخ کے روایتی انداز کی تقلید میں، خفی خاں نے جنگوں اور مہموں کی ذرا ذرا سی تفصیلات بیان کرنے پر زیادہ وقت صرف کیا ہے۔ اس نے اس بیماری کی دوا تجویز کرنے سے گریز کیا ہے جو مغل مملکت کو گھن کی طرح کھا رہی تھی۔

بعد کی مغل سلطنت کے ان دو ہمعصر مستند مورخوں کے تقابلی مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی اور گروہی جھگڑوں نے مورخین کے نقطۂ نظر کو متاثر کیا تھا۔ اس لیے کسی

Marfat.com

شخص کا کسی خاص واقعے کے دوران یا زمانے میں محض موجود ہونا ہی کافی نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ اگر اٹھارہویں صدی کے سیاسی حالات کا دُرست طور سے جائزہ لیتا ہے تو ضروری ہوگا کہ ان تعصبات کا تجزیہ کیا جائے جو سماجی، سیاسی اور مذہبی سرچشموں سے اُبھرے تھے۔ اور اسی صورت میں یہ طے کیا جاسکتا ہے کہ اس دور کی تاریخ کو دوبارہ ترتیب دیتے وقت کسی مورّخ کا بیان کس حد تک دُرست یا اہم سمجھا جائے۔

Marfat.com

حوالہ جات

1- C. A. Storay: Persian dilerature, Section II, P. 464

2- خفی خاں: منتخب اللباب، جلد دوم، صفحات 727 تا 737، بب، انڈیا، کلکتہ، 1874ء۔

3- محمد قاسم اورنگ آبادی، احوال الخواتین (برٹش میوزیم روٹوگراف، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) فولیو 1966ء۔

4- احوال الخواتین، فولیو 74a تا 75a۔

5- ایضاً فولیو 105 ab

6- ایضاً فولیو 183a

7- ایضاً

8- منتخب اللباب، دوم، صفحات 947 تا 949، 974 تا 978۔

9- احوال الخواتین، فولیو، 186a

10- ایضاً، فولیو 172 a

11- ایضاً، فولیو 176a تا 176b، منتخب اللباب، دوم، صفحات 904 تا 909۔

Marfat.com

دورِ وسطیٰ کے کچھ مورّخین کی نجی تاریخ اور اُن کی تحریریں

جگدیش نرائن سرکار

ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے مُسلم مورّخین کے اصولوں اور کارناموں کو سمجھنے کے لیے کئی باتوں پر نظر رکھنی ہوگی۔ ان باتوں میں تاریخ کی نوعیت، دورِ وسطیٰ کے مورّخین کا عام رویّہ، مصنّف نجی تاریخ کا اثر، اس کی تکنیک اور اسلوبِ بیان نیز مورّخ کے مقصد میں کامیابی کی حد، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنّف کی نجی تاریخ (یعنی اس کا خاندانی پسِ منظر، تربیت، تعلیم، سرکاری تعلّقات، کردار، طبیعت کا خاصّہ اور مزاج) عام طور سے اس کے نظریے اور اس کی تحریر کے مزاج پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ وہ تاریخ کے رویّے پر اثر ڈالتی ہے، اور ہمیں مورّخ کے خیالات، رویّہ اور نظریہ سمجھنے میں نیز یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ آیا مورّخ شوق سے مشاہدہ کرتا تھا یا اس میں مشاہدے کا کوئی شوق نہ تھا۔ اس مقابلے میں کچھ مخصوص مثالوں کی مدد سے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مورّخ جو تاریخ لکھتا ہے اس پر اس کی نجی تاریخ کا کتنا اثر پڑتا ہے۔

ہمیں ابوریحان محمد بن احمد البرونی الخوازمی تقریباً 7-970 تا 39-1238 اے۔ڈی) (جو یورپ میں علی بورون کہلاتا ہے) کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہے۔ وہ واقعی ایک نہایت دانشور شخص تھا۔ یہ مشہور قاموسی عالم، فلسفہ، ریاضی، نجوم، جغرافیہ، طب، منطق، دینیات اور مذہب سے خوب اچھی طرح واقف تھا، اور اُسے پہلا نیز عظیم ترین ماہر ہندوستانیات

Marfat.com

کہنا جائز ہے۔ ہندوستان اور ہندو علوم میں البیرونی کے شوق کی بنیاد کیا ہے؟ کیا یہ تحقیق سے لگاؤ کے باعث تھا یا کوئی اور وجہ تھی؟

اس کا سب سے پہلا سوانح نگار (شمس الدین محمد شہرازوری) اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اسے مطالعے کی بڑی عادت تھی اور ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ وہ سال میں صرف دو دفعہ کتاب اور قلم چھوڑتا تھا، ایک نوروز (موسم بہار میں سالِ نو کا پہلا دِن) پر اور دوسرے مہراجن (موسم خزاں) پر، "جب رسولِ خدا کے احکام کے مطابق، بس اس قدر ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے میں مصروف رہتا تھا جو قیامِ حیات اور تن پوشی کے لیے کافی ہوں"۔ یہ واضح نہیں ہے کہ کہیں یہ بات زمانۂ طالب علمی کے دوران مفلسی کی حالت کے بارے میں تو نہیں کہی گئی ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ علم اور ادب میں ممتاز ہونے کے بعد وہ ترقی کر کے خاندانی ممانی کے خوارزمی فرمانرواؤں کا مشیر بن گیا۔ اپنے اس رتبے کی وجہ سے وہ غزنہ کے سلطان محمود اور اس کے وزیر احمد بن حسن میمندی (1007 تا 25) کا مخالف بن گیا کیونکہ سلطان آزاد خوارزم کے معاملات میں دخل انداز ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ سلطان محمد نے جب خوارزم فتح کیا تو اسے جنگی قیدیوں اور یرغمال بنائے ہوئے افراد کے ساتھ بطور یرغمال غزنہ لے جایا گیا (1017)۔ وہ محمود کے پیچھے پیچھے ہندوستان میں بہت گھوما پھرا اور ہندوؤں کے فلسفے، عوام اور زبان کا بڑا مطالعہ کیا اور اس زمانے کے ہندوؤں کے سماجی اداروں نیز مذہبی حالات کے بارے میں جو مشاہدے کیے ان کو قلم بند کر لیا۔ (1017 تا 30) لیکن نہ سرکاری طور پر اس کی حوصلہ افزائی کی گئی یا تحریک دلائی گئی اور نہ سلطان محمود نے اسے انعام کی توقع دلائی۔ رشید الدین کے بموجب "البیرونی نے محمود بن کر سبکتگین کی ملازمت اختیار کی، اور ملازمت کے دوران اس نے لمبا عرصہ ہندوستان میں گزارا اور اس ملک کی زبان سیکھی"۔ لیکن سچاؤ لکھتا ہے کہ "ہمیں کسی بات سے یہ پتہ نہیں لگتا کہ البرونی کبھی غزنہ کی سلطنت یا دربار میں ملازم رہا ہو"۔ اور "شاید عظیم منجم یعنی نجومی اور جیوتشی مشہور ہونے

Marfat.com

کے باعث اس کے تعلقاتِ دربار اور حاکمِ وقت سے ہو گئے تھے۔" وہ جس انداز سے سلطان محمود کا ذکر کرتا ہے اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اس کا ملازم تھا اور اسے اپنا محسن خیال کرتا تھا۔ "محمود نے خوشحالی ختم کر کے ملک کو تباہ و برباد کر ڈالا' اور بڑے حیرت انگیز کارنامے انجام دیے جس کی وجہ سے ہندو خاک کے ذرّوں کی طرح ہر سمت بکھر گئے' اور ان کی باتیں پرانی کہانیوں کی طرح لوگوں کو یاد رہ گئیں۔"[2]

اس کے برعکس البرونی نے سلطان مسعود کی بڑی تعریف کی اور اپنی قانونِ مسعودی اس کے نام معنون کی، کیونکہ مسعود نے مصنف (جو اس وقت 61 برس کا تھا) کو ایک خاص انعام (پنشن ؟) عطا کر کے اس لائق کر دیا تھا کہ وہ اپنا وقت علمی کاموں میں صرف کر سکے۔ اس لیے وہ بڑے فخر سے لکھتا ہے کہ مسعود نے اس پر عنایات کیں اور اس کو اور اس کی تحقیقات کو مدد بہم پہنچائی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ البرونی جیسے شخص کا نظریہ بھی ذاتی مفاد سے متاثر ہو گیا تھا۔

ہندوستان' ہندوؤں اور اُن کی دُنیائے خیال کے بارے میں البرونی کے شوق کا سبب بڑی حد تک وہ چیز تھی جس کو ڈاکٹر سچاؤ "آفت زدوں کی ایک جماعت" کہتے ہیں یہ مبالغہ ہو سکتا ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ البرونی اور اس کے ہم وطن محمود کے جبر کا اسی قدر شکار تھے جس قدر ہندوستان کے ہندو' اور شاید اسی بات سے البرونی کے دل میں ان کے لیے ہمدردی پیدا کر دی تھی۔ اگر محمود کے لیے ہندو کافر تھے اور لوٹ مار کو روکنے کی وجہ سے موجبِ قتل تھے' تو البرونی کے لیے۔ یہی لوگ "نہایت عمدہ فلسفی' اچھے ریاضی داں اور نجومی . . . تھے۔" وہ "مسلمان قاری کو یہ اشارہ کرتا ہے کہ وہ اس غریب اور پریشان حال ہندو کو بہت حقارت کی نظر سے نہ دیکھے' جسے سلطان محمود کے وحشی جرگوں نے روند ڈالا ہے۔"

ہندوستان پر کتاب لکھنے کا خیال اس وقت البرونی کے ذہن میں گزرا جب وہ

Marfat.com

اپنے ایک دوست سے ساتھ اپنے زمانے کے مذہبی اور فلسفیانہ ادب پر بحث کر رہا تھا۔ یہ کتاب اس نے عربی ادب کا ایک خلا پورا کرنے کے لیے لکھی تھی کیونکہ اس زمانے کے عربی ادب میں "ہندوؤں کے عقائد کے بارے میں ایک نہایت غیر تنقیدی اور دوسرے درجے کا بیان" ملتا ہے۔ اس کی کتاب کوئی باضابطہ تاریخ نہیں ہے۔ یہ ایک گہری عمرانی تحقیق ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک نادر جوہر تحقیق، جدید سائنسی رویّہ اور ہمدردانہ بصیرت ملتی ہے۔ البرونی خود کہتا ہے "یہ کتاب مباحثے پر مشتمل نہیں ہے میں اس میں اپنے مخالفوں کی دلیلیں اس خیال سے ہرگز نہ دوں گا جو دلیلیں غلط سمجھتا ہوں انھیں رد کروں میری کتاب حقائق کے سیدھے سادے تاریخی بیان پر مبنی ہے۔ میں قاری کے سامنے ہندوؤں کے نظریات جوں کے توں پیش کر دوں گا، اور اس ضمن میں اسی نوع کے یونانیوں کے نظریات پیش کروں گا تاکہ دونوں کے درمیان جو تعلق ہے وہ ظاہر ہو جائے . . . ."[4]

اس کے بارے میں میکس ملر نے کہا ہے: "ہندوستانی ادب اور مذہب کا پہلا درست اور جامع بیان پیش کرنے کی وجہ سے دنیا اس کی ممنون ہے۔" البرونی نے ماحول سے عدم تاثر اور غیر جانبداری کے ایک نادر جوہر کا مظاہرہ کیا ہے۔ البرونی کی کتاب اس اعتبار سے مسلم ادب میں بے مثل حیثیت کی مالک ہے کہ اس میں دیانت داری کے ساتھ بت پرستوں کی دنیائے خیال کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوشش اس دنیائے خیال پر حملہ کرنے یا اسے جھٹلانے کی نیت سے نہیں کی گئی ہے، بلکہ تحریر سے برابر ظاہر ہوتا رہتا ہے کہ مصنف اس صورت میں بھی انصاف پسند اور غیر جانبدار رہنا چاہتا ہے جب کسی مخالف کے نظریات اس کے نزدیک اعلانیہ ناقابلِ قبول ہوتے ہیں۔" مزید برآں، البرونی نے جس طرح مآخذوں سے استفادہ کیا ہے وہ اس کے سائنسی ذہن کا غماز ہے۔ اس نے تقریباً ہر باب کے ساتھ سنسکرت مآخذ دیے ہیں، اور بچاؤ پیش لفظ میں ان بہت سے مصنفوں کی فہرست دی گئی ہے جن کا حوالہ اس نے نجوم، تاریخ، جغرافیہ اور جیوتش کے ضمن میں

Marfat.com

دیا ہے۔ اس نے عربی ترجموں کے ذریعے یونانی ادب سے بھی واقفیت پیدا کر لی تھی' اور ہندو مابعد الطبیعیات سے یونانی زبان اور یونانی فکر کا مقابلہ کرتے وقت جن حوالوں کا انتخاب کرتا ہے . . . ان سے اس کی بصیرت اور غیر معمولی لیاقت ظاہر ہوتی ہے" اور وہ شاذ ہی ماخذوں کے حوالے دینا بھولتا ہے . . .' البرونی بڑی آزادی سے ماخذوں کے حوالے دیتا ہے' اور جہاں وہ غلط یا مبالغہ آمیز لگتے ہیں' وہاں حوالوں کے بعد مختصر اور چبھتی ہوئی تفسیر دے دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی تحریریں دلچسپی قائم رہتی ہے۔ وہ ان موضوعات پر نہایت عالمانہ طور سے لکھتا ہے' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علوم یقینی کے مطالعے سے اس میں وسعتِ علم اور درستی فکر کی خوبیاں پیدا ہو گئی تھیں۔" "ماہرانہ تنقید" کی بنا پر اسے "مشرق کے مصنّفین میں ایک بے مثال مقام" حاصل ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ البرونی کی کتاب "اس دُنیا میں' جہاں تلواریں ٹکرا رہی تھیں' شہر جل رہے تھے' اور مندر لُوٹے جا رہے تھے' ایک ایسی طلسماتی دُنیا کی مانند تھی جہاں سکون اور غیر جانبدارانہ تحقیق کا دَور دورہ تھا۔ یہ محمود کے ظلم اور بُت شکنی کا روحانی بدل تھی۔"[5]

ابوالنصر محمد بن محمد الجبار العتبی خاندانِ عتبی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس خاندان کے بہت سے افراد سامانی فرمانرواؤں کے تحت اہم عہدوں کے مالک تھے۔ سلطان محمود کا معتمد ہونے کی وجہ سے عتبی اس کی سرگرمیوں سے پورے طور سے واقف ہو گیا تھا' لیکن وہ اپنے آقا کی مہموں میں شریک نہ رہا تھا۔ اس کی کتاب تاریخِ یمنی یا کتابِ یمنی' جو سبکتگین کے پورے دَور اور محمود کے دَور کے ایک حصّے (1020 تک) کا احاطہ کرتی ہے' محمود کی مہموں کی معلومات کے واسطے اصل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس میں ہندوستان کی دُرست جغرافیائی معلومات کم ہے۔ اس کا رویہ راسخ العقیدہ مصنّفوں کا سا ہے' جیسے سبکتگین اور محمود کے افعال میں حکمِ خدا نظر آتا ہے' جیسے کہ یہ بیانات "اکثر اوقات حکمِ خدا سے ایک چھوٹی فوج' بڑی فوج پر غالب رہتی ہے۔" "خدا کے دوست

Marfat.com

کذب اور بُت پرستی کے آقاؤں کے خلاف آگے بڑھ رہے تھے"۔ "خدا کے دوستوں نے ہر کوہ اور وادی میں قتلِ عام مچا دیا"۔ "خدا اپنے مذہب کو عزت بخشتا ہے اور کفر کو ذلیل و خوار کرتا ہے"۔ وغیرہ۔

خواجہ ابوالفضل بن الحسن البیہاقی (سی 996 تا 1077 اے۔ڈی) نے "کئی (30) جلدوں میں غزنویوں کی ایک بڑی جامع تاریخ لکھی ہے" جس کا نام تاریخِ بیہاقی یا مجلدات بیہاقی ہے۔ اس کی مختلف جلدوں کے کئی کئی نام ہیں جیسے تاریخِ سبکتگین یا تاریخ السبکتگین یا تاریخِ ناصری، تاج الفتوح (محمود کے واسطے)، تاریخِ مسعودی (مسعود کے واسطے) وغیرہ۔

لگتا ہے دربار سے اور اس زمانے کے طبقاتِ امراء سے بیہاقی کا بہت نزدیکی تعلق تھا تاریخِ السبکتگین اپنی ظاہری شکل میں تفصیلی تاریخ نہیں بلکہ افواہات پر مبنی ایک توزک لگتی ہے۔ مصنف برابر اپنے بارے میں، اپنے تعلقات کے بارے میں، اپنی کارروائیوں کے بارے میں اور اپنے تجربات کے بارے میں حوالے دیتا ہے۔ وہ اپنے ہمعصر امرا کا حال بڑی وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ شہنشاہ مسعود بن محمود کے مشاغل، مسعود کا اپنے معتمدوں کو فرمان تحریر کرنا، اس کی شراب خوری کی عادت، ہندوستان میں اس نے جو دورے کیے ان میں سے ایک دوسرے کے دوران اس کا نادم ہونا اور شراب چھوڑ دینے کی قسم کھانا اور شراب اور شراب کے پیالے دریائے جیلم میں پھنکوا دینا، جس سے ہمیں بعد کے زمانے میں بابر کی ایک ایسی ہی ترنگ کا خیال شدت سے آتا ہے، یہ سب بیانات بھی وہ ہمیں بڑی وضاحت سے دیتا ہے۔ ہمیں دربار، اس کی کارروائی کا طریقِ کار، کارروائی میں شریک ہونے والے افراد اور غزنہ کی مجلس میں زیرِ بحث رہنے والے موضوعات کی نوعیت کے بارے میں ایک نہایت واضح خاکہ ملتا ہے۔ (ان سب کے ساتھ اتنی زیادہ باتیں اور تفصیلات جوڑی گئی ہیں کہ ان بیانات پر بیجا طول کا الزام لگایا جا سکتا ہے، اس الزام کا خطرہ خود مصنف کو بھی تھا۔ لیکن

Marfat.com

تھکا دینے والی تفصیلات کے باوجود یہ کتاب نمایاں طور پر خلقی ہے اور اس زمانے کے طور و طریق نیز کاموں کی ایسی جھلک پیش کرتی ہے کہ اوقات یہی جزئیات اور ادنا باتیں اس کی خاص خوبی جاتی ہیں۔ مصنّف کو مشرق کا مسٹر پیپیز کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔"[8]

ہمیں تاج المعاصر (کارناموں کا سرتاج) کے مصنّف حسن نظامی کے بارے میں سوائے ان حوالوں کے کچھ نہیں معلوم جو اس نے خود اپنی کتاب میں دیے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو "غلام ابنِ غلام حسن نظامی" کہتا ہے اور اپنے سرپرستوں میں "ابوالمظفر محمد بن سام بن حسین" (یعنی محمد غوری) اور "قطب الدنیا والدین ابوالحارث ایبک" کے نام لیتا ہے۔ حسن نظامی نیشاپور میں پیدا ہوا تھا اور اسے صدرالدین محمد بن حسن نظامی بھی کہا جاتا ہے۔ پروفیسر عسکری کے مطابق اس کا باپ غالباً ابوالحسن نظامی عروضی تھا جو سمرقند کا رہنے والا تھا۔ گو لاہور نہ اس کی جائے پیدائش تھی اور نہ مستقل مسکن پھر بھی ہمیں اس کا تعلق اسی شہر سے بتاتا ہے۔ اسے خراسان کے سیاسی ہنگاموں کے باعث اپنا آبائی وطن چھوڑ کر غزنہ کے راستے دہلی آنا پڑا۔ اس زمانے کے خراسان میں نہ لیاقت کو سراہا جاتا تھا اور نہ اس کا اجر ملتا۔ تحریر کرتے وقت وہ گہرے احساسِ محرومی کا شکار تھا۔ حسن نظامی کے تعلقات اور واقفیت (صوفی محمد شیرازی اور غزنہ کے قاضی القضاۃ مجدالملک، اور دِلّی کے قاضی القضاۃ شرف الملک) سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف نہایت اہلِ علم تھا اور دانشوروں میں شمار کیا جاتا تھا بلکہ سماجی نظام میں خاصی اُونچی حیثیت کا مالک تھا۔ اس نے اپنی اس فارسی کتاب کی ابتدا 602ھ مطابق 1205ء نہ صرف اپنے دہلی کے (جہاں عربی قلم کی بظاہر قدر نہ تھی) دوستوں کی درخواست پر کی تھی بلکہ اس شاہی حکم کو پورا کرنے کے لیے بھی کی تھی جس میں اس سے کہا گیا تھا کہ فاتح حکومت (فرمانروا کا نام نہیں دیا گیا ہے) کے واقعات کی تفصیلات قلم بند کرے۔ اس میں جزوی طور سے محمد غوری (1191ء سے) کی اور خاص طور سے قطب الدین ایبک اور التمش کی تاریخ دی گئی ہے۔ مصنّف نے ہر ہر قدم پر اپنے رنگین اور طولانی انداز میں،

Marfat.com

تشبیہوں اور استعاروں وغیرہ کے ذریعے "نثر اور نظم" میں اپنے علم کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن وہ یہ ثبوت کہیں نہیں دیتا کہ فرمانرواؤں کے کارناموں میں خود شریک رہا تھا یا انھیں اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ سوائے اس تعریف کے جو مصنف اپنے دیوتا صفت انسانوں پر نچھاور کرتا ہے کسی بات سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ ان واقعات کے زمانے میں خود موجود تھا جنھیں وہ بیان کرتا ہے، اور چند تاریخوں کے بارے میں جو گنجلک اور بے ربطی ہے۔ نیز ان کی ساری تفصیلات غائب ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے سرپرست کی مہموں میں وہ خود شریک نہ رہا تھا۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ وہ قطب الدین کے اصل دور کے معاملات کے بارے میں کچھ نہیں کہتا، حالانکہ اسی چھوٹے سے باب میں اس کی تخت نشینی اور وفات کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے۔"[9] حسن نظامی ایک مدح خواں تھا، اور دوسرے بہت سے مؤرخوں کی طرح تعصبات کا شکار تھا، وہ ترائن کی پہلی جنگ میں محمد غوری کی شکست کا ذکر نہیں کرتا لیکن دوسری جنگ میں اسی کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن وہ انہلواڑہ کے بھیم دیو دوم کے ہاتھوں غوری فرمانروا کی اس سے پہلے کی ایک شکستِ فاش کی طرف اشارہ ضرور کرتا ہے۔ "حسن نظامی ہمیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ ابتدائی مُسلم فاتح اچھے مسلمان اور حامی مذہب تھے اور جنگ و فتح نیز حکومت و انتظام کی بابت اُن کا مقصد اور نیت سیاسی یا معاشی نہیں بلکہ مذہبی تھی اور انھوں نے جو شہر اور مقامات فتح کیے اُن میں مشکل ہی سے کوئی مورتی مندر یا مذہبی پناہ گاہ باقی بچی ہوگی جسے مُسلم ادارے میں تبدیل نہ کر دیا گیا ہو۔" (جیسے اجمیر میں فولیو 48 الف)[10]

منہاج الدین بن سراج الدین پیدائش اور شادی دونوں کے اعتبار سے طبقۂ امرا سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد بڑے ممتاز لوگ تھے۔ اس کے سگڑ دادا امام عبدالخالق جوزجانی (جوزجان مرو اور بلخ کے درمیان واقع ہے) کی شادی غزنہ کے سلطان ابراہیم کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اس کا والد محمد غوری کی کمان میں ہندوستان آنے والی فوج کا قاضی تھا (1186ء) منہاج

Marfat.com

خود بڑا عالم تھا۔ اسے اُچ کے فیروزی مدرسے کا نگراں (1227ء) افسرِ قانون نیز مذہبی، اخلاقی اور قانونی امور کی تبلیغ کا ناظم (1232ء) دہلی کا قاضی (1241ء)، دہلی کے ناصریہ مدرسے کا نگراں اور اس کی جائیداد و املاک کا منتظم، گوالیار کا قاضی، ام البلاد کی مسجد میں مبلّغ (45-1244ء) صدرِ جہاں، ناصرالدین کے تحت سلطنت کا قاضی اور دارالسلطنت کا حاکمِ فوجداری (1246ء) مقرر کیا گیا تھا۔ بنگال کے صدر مقام لکھنوتی میں تقریباً تین سال (42-1241ء تا 44-1243ء) قیام کے باعث اسے مُسلمانوں کے دُور دراز کے علاقوں کے بارے میں درست معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔

ان سب باتوں نے اس کی کتاب پر، جو بڑی فاضلانہ اور مداحانہ تصنیف ہے، اثر ڈالا۔ اس نے اپنے سرپرست ناصرالدین کی تعظیم میں اپنی کتاب کا نام اس کے نام پر رکھا اور تحریر کرتے وقت بڑا مداحانہ انداز اختیار کیا۔ اس میں ناصرالدین کے دَور کے جاری رہنے کے واسطے بعض بے ساختہ قسم کی دُعائیں ہیں۔ اس کے باوجود لایق نقادوں کا خیال ہے کہ وہ "شاذو نادر ہی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف کرتا ہے، اور سیدھے سچے انداز میں حقایق بیان کردیتا ہے جس سے اس کے بیانات کی سچائی اور اس کے علم کی دُرستی پر اعتماد بڑھ جاتا ہے"۔
لگتا ہے کہ اس کے قانونی پیشے اور علمی نقطۂ نظر نے اس کے طریق کار پر اثر ڈالا۔ اس نے لایقِ اعتماد اشخاص سے معلومات فراہم کرنے کی بڑی کاوشیں کیں، اور اکثر اپنے حقایق کی اسناد کا حوالہ دیا۔"

امیر خسرو یا میر خسرو (1253ء تا 1325ء) اس زمانے کے طبقۂ امرا کے رکن تھے۔ ان کے والد التمش کے دَور میں ایک امیر تھے۔ ان کی والدہ ایک ہندوستانی خاتون تھیں، اور بلبن کے ایک اعلا عہدیدار عمادالملک کی بیٹی تھیں۔ انھوں نے اپنے والدین کے بل بُوتے پر دہلی کے درباری حلقوں میں بڑا نمایاں مقام حاصل کرلیا تھا۔ انھوں نے خود دہلی کے چھ سلطانوں کے تحت ملازمت کی۔ سلطانوں سے تعلّقات کے باعث، اور امیروں، فوجی کارکنوں اور صوفی

Marfat.com

نظام الدین اولیا سے نزدیکی تعلقات کے باعث انھیں اپنے زمانے کے دُرست سیاسی تعلقات اور سماجی حالات کا علم حاصل کرنے کا ایک نادر موقعہ ملا تھا۔ لیکن انھوں نے اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھایا۔ ان کی تاریخی کتابیں 35 برسوں (1289ء تا 1325ء) کی مدت میں تحریر کی گئی ہیں، لیکن یہ کتابیں موقع موقع سے لکھی گئی ہیں اور کسی ایک موضوع کے متعلق نہیں ہیں۔ موقع موقع سے لکھی جانے والی ان کتابوں سے بعض سلطانوں اور شہزادوں کی درخواست پر لکھی گئی ہیں، اور بعض انعام کی توقع پر یا اظہار تشکر کے واسطے یا پھر ادبی شہرت حاصل کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ امیر خسرو مورخ سے زیادہ شاعر اور جانبدار مصنف سے زیادہ مدح خواں تھے۔ اس سب نے ان کی ادبی اور نیم تاریخی تصنیفوں پر اثر ڈالا۔ قرآن السعدین (دو سیاروں کا اجتماع 1289ء) کئی بیانی نظموں پر مشتمل ہے، جس کا نقطۂ عروج وہ سوال و جواب ہیں جو باپ (بغرا خاں، حاکم لکھنوتی) اور بیٹے (سلطان معز الدین کیقباد) کے درمیان ہوئے۔ خزائن فتوح یا تاریخ علائی (نثر میں)، علاالدین کے دور کے پہلے سولہ برسوں (دیوگری کی فتح سے لے کر ورنگل کی فتح تک) کی نہایت مستند اور دُرست تاریخ ہے۔ اس پر مصنف کے شاعرانہ مزاج، ادبی مہارت، سیاسی موقع پرستی اور ہندوستانی نیز ہر ہندوستانی چیز سے لگاؤ کی چھاپ پڑی ہوتی ہے۔ اس میں پیراگراف کے پیراگراف "نسبت" (وہ استعارے، تشبیہیں یا تلمیحیں جو کسی شے سے اخذ کی گئی ہوں) پر مبنی ہیں، قرآن کی آیات کثرت سے استعمال کی گئی ہیں۔ (تحریر میں قوت اور وقار پیدا کرنے کے لیے) اور مادۂ تواریخ اور ہندی الفاظ کی کثرت ہے۔ جیسا کہ واحد مرزا لکھتے ہیں: "خسرو کو اپنے شاہی سرپرست کے دور کے محض سال وار واقعات لکھنے کی ہی فکر نہ تھی، وہ اسے ادبی شہ پارہ بھی بنانا چاہتے تھے"۔ وہ واقعات کو جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، افعال تاثر کے زیر نگیں ہیں۔ وہ نہ صرف علاالدین کی فوجی فتوحات بیان کرتے ہیں بلکہ اس کے وہ کارنامے بھی بیان کرتے ہیں جن کا تعلق استحکام سلطنت، قیام سلطنت، نظم و ضبط اور ایسے متعدد اقدامات سے تھا جو

Marfat.com

عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اُٹھائے گئے۔ لیکن امیر خسرو کی موقع پرستی نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ علاالدین کی اس دغابازی کو نظرانداز کریں جو اس نے تخت حاصل کرنے کے لیے اپنے چچا سے کی تھی۔ امیر خسرو علاالدین کے چچا کے قتل کا حوالہ دیے بغیر سلطان کی تخت نشینی کو خدا کی مرضی سے تعبیر کرتے ہیں۔

امیر خسرو کی افضل الفوائد نظام الدین اولیا کے صوفیانہ کردار ان سے شاعر کے نزدیکی تعلق پر بڑی لایقِ قدر روشنی ڈالتی ہے۔

امیر خسرو کی آخری تاریخی نظم تغلق نامہ جو یہ کہانی بتاتی ہے کہ غیاث الدین تغلق نے دہلی پر کس طرح قبضہ کیا، ایک مذہبی اور اخلاقی رنگ کی نظم ہے۔ سلطان نیکی کا نمونہ تھا جو اسلام کی خاطر اندھیرے کی ان قوتوں سے لڑ رہا تھا جن کی نمائندگی خسرو خاں (کافر) کر رہا تھا۔

انھوں نے واقعات کے ثبوت باقاعدہ طور سے اور نقادانہ انداز میں استعمال نہیں کیے۔ وہ اپنے ذرائع معلومات ظاہر نہیں کرتے (سوائے دیول رانی کے)۔ وہ برنی اور عصیف کی طرح (جو کسی حد تک کرتے ہیں) راسخ العقیدہ لوگوں کو نقل نہیں کرتے۔ قاری اُن کی بات دُرست ماننے پر مجبور ہے۔ یہ مذہبی اور اخلاقی اصطلاحات کی زبان میں لکھی گئی ہے۔ تجزیے کے آخری درجے پر یہ پتہ لگتا ہے کہ اگر تاریخ کو مقدر یا حکمِ خدا پر محمول نہ کیا گیا تو وہ ناقابلِ فہم بن جائے گی۔[12]

ہندوستان کی تاریخ تصنیف کرنے والے پہلے مسلمان، ضیاالدین برنی (پیدائش 85ء12ء) کے تعلقات دہلی کے حکمراں طبقوں میں خوب تھے۔ چونکہ دربار تک اس کی رسائی آسان تھی۔ اس لیے صحیح تفصیلات جاننے کا اسے خوب موقعہ تھا۔ محمد بن تغلق کا رہینِ منت ہونے کی وجہ سے اس نے تغلق کی زندگی میں اس پر تنقید نہ کی۔ جب اسے دربار سے نکال دیا گیا اور بدبختی نشـ ـری کرنے لگی تو اس نے احساسِ ظُلم اور یاس کے تحت

Marfat.com

لکھنا شروع کیا۔ اگر فیروز اسے نہ بچاتا تو جیسا وہ خود کہتا ہے، وہ "مادرِ گیتی کی آغوش میں سو گیا ہوتا۔" چونکہ وہ باطنی طبیعت کا شخص تھا اس لیے اس کا ضمیر کچوکے لگاتا تھا۔ اور وہ اپنی بدبختی کو اپنی اخلاقی ناکامی سے منسوب کرتا تھا۔ اس لیے اس کی کتاب کا ایک عملی مقصد تھا، کتاب دوہری نذر ثابت ہو سکے ـــــ خدا کی نذر، تاکہ اس کے گناہ معاف ہو جائیں اور ان کا ازالہ ہو جائے ـــــ سلطان کی نذر، تاکہ اس کی سرپرستی حاصل ہو جائے اور تنگ دستی سے چھٹکارا مل جائے نیز دشمنوں کی افترا پردازی سے محفوظ ہو جائے۔ لہٰذا اس کا نام فیروز شاہ کے نام پر رکھا گیا۔

ایک شیخ والد اور سید والدہ کا بیٹا اور شیخ نظام الدین اولیا کا گہرا دوست ہونے کی وجہ سے برنی پر مذہب اور تصوف کا بڑا گہرا اثر پڑا تھا۔ وہ الحادی علم سے نفرت کرتا تھا۔ اس سے ہمیں اس کا مذہبی نظریہ تاریخ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ برنی کے نزدیک تاریخ دینیات تھی، خدا اور اس کی صفات اور احکامات کا مطالعہ، نہ کہ انسان کی سرگرمیوں کا، جو خدا کی مرضی کے اظہار کا ایک ذریعہ تھا۔

برنی دراصل ایک عالمی تاریخ لکھنا چاہتا تھا جو آدم سے شروع ہوتی۔ لیکن بعد میں اس نے ارادہ بدل دیا ـــــ تاریخِ فیروز شاہی (جو 1358ء میں لکھی گئی) میں وہ اس دور کے کل آٹھ بادشاہوں کا تذکرہ کرتا ہے، جو بلبن سے فیروز شاہ کے پہلے چھ برسوں تک کا دور ہے، اور یہ تذکرہ تقریباً اس جگہ سے شروع ہوتا ہے جہاں منہاج نے اپنی تاریخ ختم کی تھی۔ یہ درحقیقت "منہاج کے روزنامچے سے پیوستہ ہے۔" اس کا سبب کہ اس نے سابقہ موضوعات کا احاطہ نہیں کیا غالباً ایک جذباتی کمزوری ہے جو کسی مورخ کو زیب نہیں دیتی، لیکن اس سے اس زمانے کے مورخوں کی ذہنیت پر روشنی پڑتی ہے۔ "اگر میں وہ نقل کر دوں جو اس مشہور و معروف قابلِ تعظیم مصنف نے لکھا ہے، تو وہ لوگ جنہوں نے ان کی تاریخ پڑھی ہے میری تاریخ سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ اور اگر میں کوئی ایسی

Marfat.com

بات کہوں جو اس اُستادِ فن کی تحریر کے خلاف ہو یا اس کے بیانات کی تلخیص کروں یا انھیں طول دوں تو مجھے گستاخ اور بے دھڑک سمجھا جائے گا۔ اس کے علاوہ میں قاریوں کے ذہن میں دُشواریاں اور شکوک پیدا کر دوں گا۔" اس بات سے اس منطق کا بودا پن یاد آتا ہے جو سکندریہ کے مشہور کتب خانے کو جلانے کے سلسلے میں الزام کے طور پر خلیفہ عمرؓ سے منسوب کی جاتی ہے۔ کیونکہ تاریخ کے ایک صاحبِ ادراک اور تنقیدی ذہن رکھنے والے طالبِ علم کے نزدیک اتفاقِ رائے یا تکرارِ بیان اور اختلافِ رائے یا تشکک کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔

حالانکہ برنی نے اُستاد کی تکنیک استعمال نہیں کی، لیکن وہ تسلیم شدہ حقیقت پر اعتبار کرتا تھا۔ تاریخی حقایق کی تصدیق تنقیدی شکوک و تجسس کے ساتھ نہیں بلکہ مذہبی یا بزرگ صفت لوگوں کی شہادت پر کی گئی۔ اس نے منہاج سے اختلاف نہ کیا جو ایک مذہبی شخص تھا۔ اس نے اپنی یادداشت پر اعتبار نہ کیا، لیکن امیر خسرو، امیر حسن اور اپنے رشتے داروں پر اعتبار کیا۔ باوجود اس کے، اس نے اسناد کا لحاظ کیے بغیر تاریخ ایک قصّہ گو کی طرح لکھی۔ لہٰذا اس کے کام میں "گہری تحقیق، عظیم شعور اور سعی مسلسل" کی کمی رہی۔

برنی خود اعتراف کرتا ہے کہ اس کی کتاب کچھ سُنے سُنائے بیانات پر اور کچھ ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے۔ بلبن کے بارے میں اسے اپنے والد، دادا اور بلبن کے افسران سے معلوم ہوا اور کیقباد کے دَور کے بارے میں "اپنے والد سے اور اپنے اساتذہ سے معلوم ہوا جو اس زمانے کے قابلِ ذکر حضرات تھے۔" اس نے ان بیانات میں اپنے مشاہدے کی بنا پر اضافے کیے۔ جلال الدّین کے دَور کے سارے واقعات اور معاملات اس کتاب کے خاتمے تک خود اس کی نظروں سے گزرے۔ ان واقعات کی گہری تفصیلات میں جائے بغیر وہ سارے معاملے کو بحیثیت مجموعی دیکھتا ہے۔ جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے: "اس کتاب میں، مَیں نے سلطنت

Marfat.com

کے سارے سفارتی انتظامی معاملات تحریر کر دیے ہیں اور فتوحات کے بیان میں ہر واقعے اور سانحے کا ذکر نہیں کیا ہے نہ ان رعایتوں کا ذکر کیا ہے جو مخصوص لوگوں کو دی گئی تھیں، کیونکہ عقل مند لوگ انتظامی معاملات کے مطالعے سے ان چیزوں کو خود ہی جان لیں گے۔" وہ ایک ایسا شخص ہے جو کچھ چیزوں کا انتخاب کر لیتا ہے۔

اگر برنی کو اس کے مذہبی نظریے اور اُن عیوب کے واسطے جو مورخین کے جدید معیاروں کے مطابق اس میں پائے جاتے ہیں، ایک جائز انداز کی رعایت دے دی جائے، تو اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں رہتا ہے کہ تاریخِ فیروز شاہی (357ء) "تاریخ کے ایک شعوری فلسفے کا نہایت پُرزور اور موثر اظہار تھی جو برنی کو ان معمولی مصنفوں کی صفوں سے اُوپر لے جاتی ہے جنھوں نے روزنامچے اور وقائع تصنیف کیے۔" اسے تاریخ سے ایک جذباتی لگاؤ تھا، اور وہ اسے ایک علم بلکہ "ملکۂ غلام" سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ تاریخ کے مطالعے کے فوائد کا بھی ذکر کرتا ہے۔

شمس الدین سراج عفیف، گو عہدیداروں کے خاندان میں پیدا ہوا تھا (پیدائش 342ء) لیکن خود کوئی عہدیدار نہ تھا۔ لیکن برنی اور عصامی کے برخلاف وہ کہیں یہ اشارہ نہیں دیتا کہ اس نے شکستِ آرزو یا پامال لیاقت کے احساس کے تحت لکھا۔ اس نے اپنے قاریوں کے اخلاق کی اصلاح کے لیے لکھا۔ اس کی تاریخِ فیروز شاہی (پندرہویں صدی میں لکھی گئی) ایک بڑی تاریخی کتاب کا حصہ تھی جس میں تین تغلق فرمانرواؤں (غیاث الدین، محمد اور فیروز) کی خوبیوں (مناقب) اور تیمور کے ہاتھوں دلّی کی تباہی کا ذکر تھا۔ وہ سوانح عمری کی ایک مثال تھی۔ چونکہ مناقب کی اصطلاح سلطانوں کے لیے نہیں بلکہ بزرگ لوگوں کے لیے استعمال ہوتی ہے، اس لیے اس کتاب میں ایک زیریں قسم کی تصوفانہ موج تھی۔

عفیف نے اسناد کی مدد سے لکھا، اور قابلِ اعتماد واقعہ گو اشخاص کی شہادتیں

Marfat.com

قبول کرلیں، لیکن اس نے نزاعی معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے اپنے ثبوت اور شہادت دلیل کے طور پر پیش نہیں کیے۔ تاریخی حقائق کی تصدیق کے واسطے برنی کی غصبف کا آخری معیار بھی مذہبی ہی تھا۔ جب وہ اپنی کتاب کے بیانات کی حمایت میں دوسرے مصنفین کی کوئی عام خبر یا مخصوص سند نہیں دیتا ہے، تو عینی شواہد پر تکیہ کرتا ہے۔ وہ تاریخ میں غیر تاریخی حقائق کی مدد سے فہم و بصیرت تلاش کرتا ہے۔ اور یہ تلاش تاریخ سے ماورا اس پورے نظام میں کی جاتی ہے جو پوشیدہ ہے اور جسے خدا نے تخلیق کیا ہے۔ مانی ایک منظرِ نیچی تھا، مدرسہ مذہب صادق نہ تھا۔ وہ اس کی ترجمانی کے واسطے نہیں کرتا کہ لوگوں کو مخصوص اصول اور افعال کے اسباب کا صحیح سبق مل جائے۔[14]

یحییٰ بن احمد سرہندی حکومتِ دہلی کا درباری نہ تھا۔ لیکن بن جانے کی توقع تھی۔ کہ جب وہ سلطان سید مبارک شاہ کو اپنی کتاب پیش کرے گا تو اسے شاہی سرپرستی حاصل ہو جائے گی۔ تاریخِ مبارک شاہی (سالِ تصنیف 35-1434ء) میں یحییٰ بن احمد سرہندی نے منہاج، برنی اور امیر خسرو جیسے سابقہ مصنفین سے 1351ء تک کے واقعات مستعار لیے ہیں۔ لیکن وہ محض ایک نقل نگار نہ تھا۔ انتخاب حقایق کے بارے میں اس نے اپنے اصول وضع کیے تھے جیسے سلطانوں، امیروں اور سپاہیوں کے کام بہ اعتبار ادوارِ حکومت اور تاریخ وار ترتیب یعنی تخت نشینی، تقررات، جنگیں اور فوجی حرکات، بغاوتیں وغیرہ تحریر کرنا۔ 1351ء کے واقعات کے سلسلے میں اس نے تحریری چیزوں پر نہیں بلکہ قابلِ اعتبار لوگوں کی شہادت پر بھروسہ کیا۔ لیکن دونوں صورتوں میں اس کی زبان ایک ہی رہی۔ لگتا ہے کہ وہ واقعات کو محض اوپری طور سے دیکھتا ہے اور افعال کی محض شکلِ ظاہری تحریر کر دیتا ہے۔ اس کی کتاب درحقیقت ایک علاقائی روزنامچہ تھی اور وہ افعال ہیں روزنامچے میں قلم بند کرتا تھا۔ وہ تاریخ کو یوں ظاہر کرتا جیسے وہ محض پے بہ پے ہونے والے فوجی اور سیاسی واقعات کا مجموعہ ہو، مثال کے طور پر وہ علاالدین کے اقتصادی اقدامات نظرانداز

Marfat.com

کر دیتا ہے۔

تاریخ نویسی کی بابت اس کا طرز نظر گو بے قاعدہ اور بے پرواہ انداز کا تھا پھر بھی وہ تاریخ کی ترجمانی روحانی انداز میں کرتا ہے۔ وہ ہر دورِ حکومت کو اس جملے پر ختم کرتا ہے۔ "اصل حقیقت خدا ہی جانتا ہے"۔ محمد غوری کے زمانے سے ہندوستان میں اسلام کی بدلتی ہوئی تقدیر کو وہ خدا کی مرضی سے تعبیر کرتا ہے۔ جب وہ محمد بن تغلق کی دشواریوں کے اسباب کا تجزیہ کرتا ہے تو واقعات کو انسانی افعال اور انسانی فیصلوں سے منسوب کرتا ہے۔[15]

عصامی (1350ء تصنیف) نے اپنی طویل تاریخی رزمیہ نظم، فتوح السلاطین ایک ایسے شخص کی طرح لکھی جو سرپرست کی تلاش سے مایوس ہو چکا ہو۔ وہ محمد بن تغلق کے ظلم کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے اپنے نوّے سالہ بوڑھے دادا کے ساتھ دہلی سے دیوگری (دولت آباد) جانے پر مجبور کیا گیا جو راستے میں فوت ہو گیا۔ یہاں نہ اس کی بیوی تھی نہ بچے، نہ دوست، نہ رشتے دار اس لیے وہ ایک دوست یا سرپرست کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس نے ہندوستان میں ادب کے نیچے معیار اس غیر دوستانہ دنیا میں ان مصنفوں کی بُری حالت کی شکایت بڑی تلخی سے کی ہے جو کینہ ور نقادوں کے رحم و کرم کے محتاج تھے۔ سخت تنفر کے باعث وہ ہندوستان چھوڑ کر مکہ چلا جانا چاہتا تھا۔ اس کے خوابوں کا سرپرست علاالدین بہمن شاہ کی ذات میں ظاہر ہوا۔ اس نے دولت آباد میں قیام کر لیا اور اس کی سرپرستی میں اس طرح لکھنا شروع کیا کہ بہمنی سلطان کے واسطے وہ فردوسی بن گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی فتوح السلاطین شاہ نامہ ثابت ہو۔ اس نے فتوح کو اسی کے نام معنون کیا تاکہ اس کی سرپرستی حاصل رہے اور ایک دائمی ادبی شہرت حاصل ہو۔ اس نے محمد تغلق کو جو سخت لعنت ملامت کی ہے اس کا جزوی سبب اس کے اپنے مصائب تھے۔ تغلق دور کے مورخ کی حیثیت سے عصامی ایک یکتا حیثیت کا حامل ہے، کیونکہ

Marfat.com

وہی ایک اکیلا مصنّف ہے جو سلطان کے خوف یا عنایت سے بالاتر ہے۔

عصامی کی فتوح السلاطین (50 - 1349ء میں تصنیف کی گئی) ہندوستان میں محمود غزنوی کے زمانے سے لے کر کتاب کی تصنیف کے زمانے تک، مسلمانوں کے کارناموں کا ایک سرسری جائزہ تھی جو طویل رزمیہ نظم کی صورت میں تھی۔ اسے گو پرانے ماخذوں پر تکیہ کرنا پڑا لیکن اس نے آنکھیں بند کر کے اُستاد کی تقلید نہ کی۔ اسے جو روداد یں یا روایتیں ملیں ان کو اس نے محض نقل نہیں کیا۔ اس نے معلومات کو اپنے خیالات کی روشنی میں بدلا اور اپنے انداز سے پیش کیا اور اس میں اپنے دوستوں اور رفیقوں سے جمع کی ہوئی عام قسم کی روداد یں، واقعات، روایتیں اور کہانیاں (سُنی سُنائی باتیں) شامل کر دیں۔ وہ ان حقایق کا اصل ماخذ نہیں بتاتا ہے اور محض یہ کہہ دیتا ہے: "میں نے سُنا ہے" مواد کا انتخاب جمالیاتی اسباب کی بنا پر نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تنقیدی تاریخ نہیں بلکہ محض تاریخی ثبوت پیش کرتا ہے۔ وہ دَورِ وُسطیٰ کے مُسلم مصنّفین کے روایتی انداز کی تقلید کرتا ہے جس میں خدا کے حکم کے پُراسرار نفاذ کا اور تقدیر کے ناقابلِ فہم ہونے کا زور دیا جاتا ہے۔ حالانکہ بعض اوقات وہ واقعات کو انسانی افعال سے منسوب کرتا ہے کیخسرو کو کیقباد کے مقابلے میں اس لیے مسترد کر دیا گیا کہ اُمرا کا یہی فیصلہ تھا۔

ابتدائی دَورِ وُسطیٰ کی زیادہ تر ہندوستانی تاریخی کتابوں پر تاریخ نویسی کی عربی روایت کی نہیں بلکہ فارسی روایت کی چھاپ پڑی ہوئی ہے کیونکہ مصنّفین یا تو شاہی دربار سے متعلّق تھے یا شاہی سرپرستی کے خواستگار تھے۔ ہند مُسلم مورّخین نے تاریخ کو اپنے "عظیم اشخاص" کے گرد گھمانا شروع کر دیا۔ تاریخ کا جو تصور امیر خسرو (1253ء تا 1325ء) عصامی (تصنیف 1350ء) ضیا الدین برنی (1358ء میں تحریر کی) شمس سراج عفیف (پیدائش 1342ء تصنیف پندرہویں صدی) اور یحییٰ بن احمد سرہندی (تصنیف

Marfat.com

1434ء تا 35) نے دیاوہ بڑے آدمیوں، فرمانرواؤں، شہزادوں اور امیروں کی تاریخ تھی، نیچے اور کمتر اشخاص کی نہیں، اور نہ عوام کی تاریخ تھی۔ برنی کے نزدیک تاریخ پیغمبروں، خلفا، سلطانوں اور حکومت اور مذہب کے دوسرے بڑے لوگوں کے واقعات اور روایات کا علم ہے۔ اگر وہ کمتر اور نااہل لوگوں کے کام بیان کرنے لگتی ہے تو اس کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ حقیقتاً ایسے اشخاص کو عموماً اس علم کا ذوق نہیں ہوتا اور اس کے مطالعے سے انھیں کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا۔[17] لہٰذا کچھ مصنّفین نے فرمانرواؤں اور افراد کی شان میں قصیدے لکھے۔ جیسے العتبی (تاریخ یمنی 1020ء تا 1021ء)، عفیف (تاریخ فیروز شاہی، تصنیف 1398ء تا 1399ء) یہ کتابیں فرمانرواؤں یا افراد کے مناقب یا تاریخ فضائل یا نثریہ قصیدے کے درجے میں شمار کی جاتی ہیں۔

مزید براں، ابتدائی دورِ وسطیٰ کے ہندوستانی مورخین اپنے یورپین ہمعصروں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ تاریخ خدا کے حکم سے ہونے والا ایک تماشا ہے، انسانی افعال کی نہیں بلکہ فعلِ خدا کی ایک کہانی ہے جس میں انسان محض معمولی کارکنوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تیسرے، انھوں نے کوشش کی کہ تاریخ کی ترجمانی روایتی قسم کے مذہبی و اخلاقی پس منظر کے ساتھ کی جائے، جس میں اس ظالم دُنیا کی بے حقیقت چیزوں سے گریز کیا جائے۔ (جیسے یحییٰ اور عصامی)۔

چوتھے، انھوں نے تاریخ کو مذہب کا مقصد حاصل کرنے اور اسلام کی عظمت بڑھانے کے لیے استعمال کیا۔ اسلام کی عظمت بڑھانے کا یہ رویّہ ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں اس دَور کے بیانات کی تشریح کرنے میں مدد دیتا ہے۔ (جنگیں، لڑائیاں وغیرہ) اور ان بیانات میں جس مبالغے سے کام لیا گیا ہے اس کا سبب بہت کچھ سمجھ میں آجاتا ہے۔

پانچویں یہ کہ، ابتدائی ہند و مسلم مورخین (برنی، یحییٰ، امیر خسرو اور دوسرے مصنّفین)

Marfat.com

نے تاریخ میں ناصحانہ عنصر پر زور دیا ہے' کیونکہ تاریخ اخلاقیات کی ایک شاخ اور اخلاقی اصولوں کا ذخیرہ سمجھی جاتی ہے۔

مُغل دَور

مغل زمانے کے تاریخی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو تاریخ کی قسم اور مصنّفین کے رُتبے میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔

اپنی سوانح عمری لکھنے والے بادشاہ (تیمور' بابر' جہانگیر)' توزک نگار (مرزا حیدر دغلت' گلبدن' جواہر اور دوسرے لوگ)' سرکاری تاریخ نگاری (ابوالفضل' عبدالحامد لاہوری' محمد کاظم اور محمد ساقی مستعد خاں)' غیر سرکاری مورّخین (نظام الدّین' عبدالقادر بدایونی' خفی خاں' مرزا محمد حسن اور دوسرے) دَورِ سلطنت کے مصنّفین سے سماجی رُتبے' نظریے' زبان اور طرزِ نظر کے اعتبار سے مختلف تھے۔ ذاتی فائدے کا عنصر' انعام کا حصول یا قرض احسان کی ادائیگی' یہ سب باتیں یا تو پسِ منظر میں چلی گئی تھیں یا اتنی اہم رہی تھیں جتنی سابقہ دَور میں تھیں سب سے اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ مغل زمانے میں تاریخ نے غیر مذہبی انداز اختیار کر لیا۔

دوسرے' گو مغل دَور کی تاریخ میں مرضیِ خدا کا رویّہ نظر آتا ہے' لیکن ترک افغان دَور کے مقابلے' مُغل دَور میں تاریخ کا انسانی پہلو زیادہ نمایاں اور اسباب رُوحانی کم نمایاں لگتے ہیں۔

تیسرے' مُغل دَور میں تاریخ سے ناصحانہ عنصر کم ہونے لگتا ہے اور مورّخین سیاسی' انتظامی یا فوجی واقعات' افعال اور اقدامات پر' اور عام اخلاقی اصولوں یا مبہم انداز کی تنبیہوں کے مقابلے میں علت و اسباب پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔

(۱) شاہان خود سوانح نگار

Marfat.com

تیمور:

شاہانِ تیموا اعلا تعلیم یافتہ اور تعلیم و ادب کے بڑے سرپرست تھے۔ ملفوظاتِ تیموری یا توزکِ تیموری تیمور کی خود نوشت سوانح عمری تھی جو چغتائی ترکی زبان میں لکھی گئی تھی اور جس میں اس کی زندگی کے اکتالیس برسوں کا ذکر تھا۔ میجر ڈیوی کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس کتاب کے اصل ہونے پر جو شبہ تھا وہ اب دُور ہو گیا ہے۔ وہ طریقہ جس کے ذریعے تیمور کی زندگی کے واقعات کا ذکر اور حال تحریر کیا گیا، تیمور کی وفات کے تیس سال بعد ملفوظات کی نقل ظفر نامہ کے مصنّف شرف الدین یزدی نے یوں بیان کی ہے: وہ اشخاص جو اپنے علم و فضل اور نیکیوں کے باعث اعلا کردار کے نمونے تھے اور الغور عہدیداران اور فارسی معتمد، تیمور کے دربار میں حاضر رہتے تھے اور اُن کے تحت جو عملہ تھا وہ شہنشاہ کے حکم سے ہر اس واقعے کا حال درج کرتا تھا جو رونما ہوتا تھا۔ تیمور کی نقل و حرکت، افعال اور اقوال، مختلف معمولی واقعات اور سلطنت، مذہب نیز وزرا کے سارے معاملات درج کیے جاتے اور نہایت احتیاط کے ساتھ تحریر کیے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں نہایت سخت احکامات دیے گئے تھے کہ ذرا بھی کمی بیشی یا ترمیم کیے بغیر واقعات کو بالکل اسی شکل میں درج کیا جائے جس شکل میں وہ رونما ہوئے ہوں۔ ذاتی طرزِ عمل اور ہمت کے معاملے میں، اس اصول پر خاص طور سے کاربند رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جب اہلِ علم اور خوش بیان لوگوں نے یہ واقعات قلم بند کر لیے تو ان کی تحریروں پر جلا کی گئی اور انھیں نظم اور نثر میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ تحریریں وقتاً فوقتاً شہنشاہ کے سامنے پیش کی گئیں اور پڑھی گئیں تاکہ اس کی منظوری کی چھاپ پڑ جائے اور اعتمادِ کامل حاصل ہو جائے۔ اس صورت سے تیمور کی زندگی کے افعال اور مختلف معمولی واقعات کے ان اندراجات پر، جو چاہے ترکی نظم کی شکل میں ہوں یا فارسی نثر کی صورت میں، نظرِ ثانی کی گئی اور بالآخر انھیں نظم اور نثر میں تحریر کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ دربار کے کچھ عہدیداروں نے تیمور کے دَور کے واقعات

Marfat.com

قلم بند کیے اور جو کچھ تحریر کیا تھا اس کی صداقت کی تصدیق بڑی سخت کاوش سے کی۔ اور پھر باکمال مصنفوں نے ان تحریروں کو ترکی نظم اور فارسی نثر میں ڈھال دیا"[18] اس طریقے نے غالباً ابوالفضل کو متاثر کیا اور اس نے بھی اپنی شاہکار کتاب لکھتے وقت اسی طریقے کا استعمال کیا۔

تیمور نے خود اپنی خود نوشت سوانح عمری میں ہندوستان پر حملے کرنے کے جو محرکات بیان کیے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مہم کے پیچھے مذہبی، اقتصادی، مادّی اور سیاسی عناصر کام کر رہے تھے۔ ایک جگہ تیمور دو مقاصد کا ذکر کرتا ہے جو مذہبی اور سیاسی تھے:
میرے ہندوستان آنے اور تکالیف و مصائب اُٹھانے کا خاص مقصد دو باتوں کی تکمیل کرنا ہے، ایک یہ تھا کہ کافروں سے اور دینِ محمد کے دُشمنوں سے جنگ کروں، تاکہ اس کے بعد والی زندگی میں اس مذہبی جنگ کے عوض اجر کا طالب ہو سکوں۔ دوسرا ایک دُنیاوی مقصد تھا کہ افواجِ اسلام کافروں کا مال و دولت لُوٹ کر کچھ حاصل کر لیں۔ جنگ میں لُوٹ مار اتنی ہی جائز ہے جتنا ان مُسلمانوں کو اپنی ماں کا دُودھ جو ایمان کی خاطر جنگ کرتے ہیں، اور جائز مال خرچ کرنا باعثِ فضل و کرم ہوتا ہے۔"[19]

(1) مذہبی

(ا) کافروں کے خلاف مہم کی قیادت اور غازی کہلانے کی آرزو، کیونکہ میرے کانوں نے سُنا ہے کہ کافروں کو مارنے والا غازی ہوتا ہے، اور اگر وہ خود کام آجائے تو شہید ہوتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ میں نے یہ تہیّہ کیا، لیکن میرا ذہن یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ چین کے کافروں کے خلاف مہم شروع کروں یا ہندوستان کے کافروں اور اصنام پرستوں کے خلاف۔ اس معاملے میں مَیں نے قرآن سے فال نکالی اور جو آیت کھُلی وہ یہ تھی! "اے پیغمبر، کافروں اور منکروں سے جنگ کرو، اور اُن سے سختی سے پیش آؤ۔"[20]

Marfat.com

(ب) "ہندوستان پر حملہ کرنے میں میرا مقصدِ اعظم کافر ہندوؤں کے خلاف ایک مذہبی جنگ لڑنا تھا . . ."[21]

(ج) جب تیمور افغانستان پہنچا تو "امرا اور عوام، اعلا اور کمتر" دونوں طرح کے مُسلم باشندوں (اندراب کے) نے مشترکہ طور پر شکایت کی اور ظلم کے خلاف اس کی حمایت اور انصاف طلب کیا۔ "کافر کستور اور سیاہ پوش ہر سال ہم سے، جو خدا کے ماننے والے ہیں، خراج وصول کرتے ہیں اور دھمکی دے کر روپیہ حاصل کر لیتے ہیں، اور اگر ہم مقررہ رقم میں ذرا بھی کمی کرتے ہیں تو ہمارے مردوں کو مار ڈالتے ہیں اور عورتوں اور بچوں کو لے جاکر غلام بنا لیتے ہیں، اس لیے ہم بے یار و مددگار مُسلمان، دوڑ کر عظیم بادشاہ کے سایہ عاطفت میں آئے ہیں تاکہ ان کافروں کے خلاف وہ ہم مظلوموں کی دلی خواہش پوری کر دے۔ یہ الفاظ سُن کر میرے اندر جوشِ اسلام اور اپنے مذہب سے لگاؤ کی جوت جل اُٹھی۔"[22]

(2) اقتصادی

ہندوستان کی دولت نے تیمور کو ترغیب دی۔ شہزادہ محمد سلطان نے بتایا "ہندوستان کا پورا ملک سونے اور جواہرت سے بھرا ہوا ہے، اور اس میں سونے اور چاندی، ہیرے اور لعل اور زُمرد اور ٹین اور لوہا اور تانبہ اور سیماب وغیرہ کی سترہ کانیں ہیں اور اس میں ایسے پودے اور پیڑ اُگتے ہیں جن سے پہننے کے کپڑے بنائے جا سکتے ہیں، اور خوشبودار پودے اور گنّے اُگتے ہیں، اور وہ ایک ایسا ملک ہے جو ہمیشہ سرسبز و شاداب رہتا ہے، اور اس ملک کا ہر انداز خوشگوار اور مسرت افزا ہے۔"[23] لیکن ہندوستان کی صرف اس دولت کے باعث نہیں بلکہ اس دولت کے باعث حملہ آور کو اپنا حملہ خصوصاً جائز لگا جو کافروں اور بُت پرستوں کے پاس تھی۔ "چونکہ ہندوستان کے زیادہ تر باشندے اصنام پرست اور کافر اور بُت پرست اور آفتاب کی پُوجا کرنے والے ہیں، اس لیے خدا

Marfat.com

اور اس کے پیغمبر کے حکم سے اب یہ جائز ہو گیا ہے کہ ہم انھیں مفتوح بنا لیں۔"[24]

(3) سیاسی

مذہبی اور اقتصادی عناصر کے علاوہ ایک سیاسی محرک بھی تھا۔ ہندوستان پر ایران اور وسطِ ایشیا کا جو غلبہ رہا ہے تیمور کا حملہ اسی پرانے غلبے کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

(ا) اس وقت شہزادہ شاہ رخ نے بتایا: "ہندوستان ایک وسیع ملک ہے، جو کوئی سلطان اسے فتح کر لیتا ہے وہ کرۂ ارض کے چاروں کونوں کا حکمِ اعلا بن جاتا ہے۔ اگر ہم اپنے امیر کی قیادت میں ہندوستان کو فتح کر لیں تو ہفت اقلیم کے فرمانروا بن جائیں گے۔" اس کے بعد اس نے کہا: "میں نے ایران کی تاریخ میں دیکھا ہے کہ ایرانی سلطانوں کے زمانے میں ہندوستان کا بادشاہ پوری تعظیم اور تکریم کے ساتھ دارا کہلاتا تھا۔ اس وقار کے باعث اس کا کوئی اور نام نہ ہوتا تھا۔ اور روم کا شہنشاہ سیزر کہلاتا تھا، اور ایران کا سلطان کسریٰ کہلاتا تھا، اور تاتاریوں کا سلطان خاقان، اور چین کا شہنشاہ فغفور لیکن ایران اور توران کے بادشاہ کا لقب شہنشاہِ ایران و توران تھا، اور بڑی افسوسناک بات ہو گی اگر ہم ہندوستان کے ملک کے حاکمِ اعلا نہ بن سکے۔ میں شہزادہ شاہ رخ کے ان الفاظ سے نہایت خوش ہوا۔"[25]

(ب) امیر تیمور سلطان محمود سے کسی طرح کمتر نہیں تھا بلکہ برتر تھا: اوّل الذکر نے تیس ہزار گھوڑوں سے ہندوستان فتح کیا تھا، جبکہ تیمور کے ساتھ ایک لاکھ بہادر تاتاری شہسوار تھے . . . . "اگر وہ اس مہم کا فیصلہ کر لیتا ہے تو خداوند تعالیٰ اسے فتح نصیب کرے گا، اور وہ خدا کے حضور غازی اور مجاہد بن جائے گا، اور فوج مطمئن اور خزانہ مالا مال ہو جائے گا، اور ہندوستان کے سونے سے ہمارا امیر فاتحِ عالم بن جائے اور روئے زمین کے بادشاہوں میں مشہور ہو جائے گا۔"[26]

Marfat.com

(ج) تیمور مسافروں کو جاٹوں سے محفوظ کرکے امن اور اندرونی سلامتی بھی قائم کرنا چاہتا تھا۔ "وہ محض نام کے مسلمان، نیز مسافروں کے لیے سخت خطرہ تھے۔ وہ اب گاؤں چھوڑ کر گئے تھے کھیتوں، وادیوں اور جنگلوں میں بھاگ گئے تھے۔ جب یہ حقایق میرے کانوں تک پہنچے تو میں نے ایک فوج تیار کی اور اس کی کمان ہندو کرکرا کے بیٹے کو کل بہادر کے سپرد کی، اور اسے جاٹوں کے خلاف روانہ کر دیا۔"[27] "..... یہ سرکش جاٹ اتنی بڑی تعداد میں تھے جیسے چیونٹیاں یا ٹڈیاں، اور کوئی مسافر یا سوداگر ان کے ہاتھوں ضرر اٹھائے بغیر گزر نہیں سکتا تھا۔"[28] یہ مقصد مرضی خدا سے نمایاں طور پر مختلف لگتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ گو مذہبی عناصر بالکل غائب نہیں ہوئے تھے، پھر بھی ان پر غیر مذہبی عناصر کا غلبہ ہو گیا تھا۔

مہم چلائے جانے سے پہلے ابتدائی بحث کے دوران بہت سے لوگوں نے اس بات کی مخالفت کی کہ ہندوستان پر ہمیشہ کے لیے قبضہ کر لیا جائے، لیکن تیمور نے ان کے اعتراضات رد کر دیے۔ "بعض امرا نے کہا: خداوند تعالیٰ کی عنایت سے ہم ہندوستان فتح کر سکتے ہیں، لیکن اگر ہم نے وہاں مستقل قیام کیا تو ہماری نسل بگڑ جائے گی اور ہمارے بچے ان علاقوں کے باشندوں کی مانند ہو جائیں گے، اور چند ہی نسلوں کے بعد ان کی قوت اور شجاعت کم ہو جائے گی۔" فوجی دستوں (کشونت) کے امیر ان الفاظ سے پریشان ہو گئے۔ "لیکن میں نے ان سے کہا! "ہندوستان پر حملہ کرنے سے میرا مقصد کافروں کے خلاف مہم کی قیادت کرنا ہے، تاکہ ہم اس ملک کے لوگوں کو قانونِ محمد (خدا ان پر اور ان کی آل اولاد پر اپنا فضل و کرم قائم رکھے) کے مطابق، دین حق پر لا سکیں، اور اس ملک کو کفر اور اصنام پرستی کی گندگی سے پاک کر سکیں، اور تاکہ ہم ان کے مندروں اور مورتیوں کو تباہ کر سکیں اور خدا کے روبرو نمازی اور مجاہد بن سکیں۔"[29]

بابر کی خود نوشت سوانح عمری محض ایک سیاسی تحریر ہی نہیں، ایک ماہر حیوانیات

Marfat.com

و نباتات کا رسالہ بھی ہے۔ اپنے تجربوں اور جوہروں کی بنا پر اس میں اپنی توزک جیسی بیش بہا کتاب لکھنے کی لیاقت بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ ایک عظیم سپہ سالار اور جید سیاستداں تھا۔ گو وہ ایک سپاہی تھا جو قسمت آزمانے کے لیے ہر دم تیار رہتا تھا، پھر بھی تعلیم یافتہ اور باہنر شخص تھا۔ وہ عربی، فارسی (تہذیب کی زبان) کا ایک ممتاز عالم تھا، اور اپنی مادری زبان ترکی کا صاحب طرز استاد نثر تھا۔ وہ ایک نفیس شاعر (اس کے دیوان کے لیے دیکھیے، جے۔اے۔ایس۔بی، 1910ء، صفحات 875) تھا۔ وہ ایک ایسا باریک بین اور نازک مذاق نقاد تھا جس کی زبان میں ساری لطافت اور نفاست موجود تھی۔ وہ جس علاقے میں گیا وہاں چیزوں کو گنتی کے اعتبار سے بڑے پُر تجسس انداز میں ٹھیک طور سے دیکھا۔ وہ خوبصورت نظاروں اور عمدہ پھولوں کا بڑا شیدائی تھا۔[30] اسے "حسن فطرت سے بڑا پیار تھا، اس کی آنکھ حسن کو ہر شکل میں دیکھ لیتی تھی، اور وہ ایک سائنس داں کی طرح گہرا مشاہدہ کرتا تھا"۔[31]

جہانگیر کی خودنوشت سوانح عمری پر نہ صرف اس کے کردار، علم و فضل اور اس کی زندگی کے نشیب و فراز کی چھاپ پڑی ہوئی ہے، بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی معمولی لیاقت کا آدمی نہیں تھا۔ وہ اپنی کمزوریاں تحریر کرتا ہے، بڑی صاف دلی سے غلطیوں کا اعتراف کرتا ہے، اور اگر محض اس کی کتاب پڑھ لی جائے تو اس کی صلاحیتوں اور رونوں کی بابت بڑا اچھا اثر پڑتا ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی جواہرات کا شایق تھا، اور ایک سچے نقاد کی طرح ان کی قیمت کا اندازہ لگا لیتا تھا۔ وہ ایک زبردست شکاری تھا اور اپنی زندگی کے آخری برسوں تک اسے اس کھیل میں مزہ ملتا رہا۔ وہ فطرت کا شیدائی تھا، خواہ وہ جاندار کی شکل میں ہو یا بے جان شکل میں، اور اسے بڑی تیز اور مشتاق نظروں سے دیکھتا تھا۔ وہ بہت سے جانوروں اور پرندوں کی

Marfat.com

خصوصیات کا ذکر کرتا ہے، اور تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑی سرگرمی اور مستقل مزاجی سے ان کی عادتوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ درخت، پھل اور پھول بھی اس کے مشاہدے میں رہے، اور وہ اس انداز سے فنِ تعمیر اور باغبانی پر رائے زنی کرتا جیسے اس نے ان چیزوں پہ بڑا وقت صرف کیا ہو اور غور کیا ہو۔[32]

جہانگیر کی توزک بابر کی توزک سے کم دلچسپ نہیں ہے۔ اگر بابر ہمیں اپنی عیاشی کی خلوتوں میں شامل کر لیتا ہے تو جہانگیر بھی بڑے پُرسکون انداز میں ہمیں یہ بتا دیتا ہے کہ اس نے ابوالفضل کو کس طرح قتل کروایا۔ لیکن وہ نورجہاں سے اپنی شادی کا ذکر نہیں کرتا۔[33]

گلبدن بیگم، بابر کی بڑی تعلیم یافتہ بیٹی (1523ء تا 1603ء) اور ایک چغتائی مغل خواجہ خضر خاں کی بیٹی تھی۔ اس نے اکبر کی درخواست پر ہمایوں نامہ لکھا تھا۔ (سترہ سال کی عمر میں)۔ وہ جب آٹھ برس کی تھی تو بابر فوت ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس نے اس کا بہت مختصر طور پر ذکر کیا ہے، اور یہ ذکر ان رُودادوں کی بُنیاد پر کیا ہے جو اسے دوسروں سے وصول ہوئی تھیں۔ ہمایوں نے 1530ء کے بعد اس سے بڑا اچھا سلوک کیا۔ 1540ء کے بعد اس نے کابل میں قیام کر لیا۔ ہمایوں کی فتوحات، شکستوں، دُشواریوں اور مصائب (جو اسے بے وفا کامران کے ہاتھوں اُٹھانے پڑے) کی وہ تقریباً عینی شاہد تھی۔ جہاں وہ ذاتی مشاہدہ پورے طور سے نہ کر سکی وہاں اُسے دوسروں، خصوصاً حرم کی بزرگ خواتین پر بھروسہ کرنا پڑا جیسے خانزادہ، ماہم اور حمیدہ بانو بیگم پر، جن کی وہ عزت کرتی تھی اور جن کا اعتماد اُسے حاصل تھا۔ یہ کتاب فطری طور پر مغلوں کے سماجی اور تہذیبی پہلو پر زیادہ روشنی ڈالتی ہے اور فوجی تفصیلات (جیسے چوسہ اور قنوج) پر کم۔ بعض اوقات واقعات کی ترتیب غلط ہو جاتی ہے۔[34]

تاریخِ رشیدی کے مصنف مرزا حیدر دغلت (پیدائش 1499ء یا 1500ء وفات 1551ء) کے آبا و اجداد بڑے ممتاز لوگ تھے۔ وہ محمد حسین مرزا (امیرِ کاشغر کا بیٹا) اور بابر کی

Marfat.com

خالہ کالڑکا تھا' اور اس لیے بابر کا خالزاد بھائی تھا۔ لہٰذا اسے ورثے میں بڑی جسمانی قوت اور لیاقت ملی تھی۔ جب ہرات سے شیبانی خاں نے اس کے باپ کو مار ڈالا (1508ء) تو بابر کی "پدرانہ شفقت اور نگرانی" نے اس نقصان کا ازالہ کر دیا۔ وہ بابر کے تحائف کی تعریف کرتا ہے اور اس کے احسانوں کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ وہ بابر ہی کی طرح جری اور جاں باز تھا اور اس نے مختلف مقامات پر بڑی غیر معمولی فوجی سرگرمی دکھائی۔ خاصی ادبی صلاحیتوں اور تیز قوتِ مشاہدہ کا مالک ہونے کی وجہ سے اس نے اپنے ممیرے بھائی کی طرح جو کچھ دیکھا اور چھان بین کے بعد سُنا' اسے تحریر کر دیا۔ ارسکائن کے مطابق' تاریخِ رشید ایک صاحبِ ہنر اور صاحبِ علم شخص کی کاوشوں کا نتیجہ ہے' اور بعد کے دو حصے ایک ایسے ہمعصر کے ہیں جو بیان کیے جانے والے واقعات اور افراد سے خوب اچھی طرح واقف تھا۔"[35] مغل خانوں اور امرائے کاشغر کی تاریخ کے واسطے یہ ایک قابلِ قدر کتاب ہے۔ اسے کاشغر کے سلطان سعید کے نام معنون کیا گیا تھا۔ ہندوستان کی خبریں کہیں کہیں ہیں اور خاص طور پر ان واقعات سے متعلق ہیں جن میں وہ خود شریک رہا' جیسے کامران کے تحت اس کی لاہور کی صوبیداری اور ہمایوں کو مدد کی پیش کش اور کشمیر کی فتح (1540ء) اور اس وقت تک کشمیر پر اس کی حکمرانی جب تک 1551ء میں وہ سازشوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ قنوج کی جنگ کا بیان اس کی عینی شہادت پر مبنی ہے کیونکہ ہمایوں کی فوج کا ایک بازو اس کی کمان میں تھا۔ وہ ہمایوں کا جانثار تھا اور اس نے ہمایوں سے کہا تھا کہ سلطنت کے دوبارہ حصول کے لیے کشمیر کو تختۂ چھلانگ کی طرح استعمال کرے۔[36]

جوہر تذکرۃ الواقعات کا مصنف تھا۔ آفتابچی یا آب دار ہونے کی وجہ سے وہ پچیس برس سے زیادہ ہمایوں کا مستقل خدمت گار رہا۔ لہٰذا وہ ایک ہمعصر مورخ تھا۔ یہ نہیں معلوم کہ کتاب لکھتے وقت اس کی اصل حیثیت کیا تھی۔ جوہر خود یہ لکھتا ہے کہ ہمایوں نے پرگنہ ہیبت پور کی آمدنی وصول کرنے کا کام اُس کے سپرد کیا تھا۔ ابوالفضل بھی اسے

Marfat.com

پہلے ضلع ہیبت پور کا محصل اور بعد میں مہتر جوہر، خازن پنجاب لکھتا ہے۔[37] اس لیے یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ اُسے کوئی مرتبہ مل گیا تھا۔

کتاب کا مقصد ہمایوں کی زندگی و ترقی کا ایک "حقیقی اور واقعی بیان پیش کرتا ہے"۔ ایک معمولی ملازم ہونے کے باعث جوہر کوئی صاحب علم شخص نہ تھا۔ اس کی کتاب علم و فضل سے خالی ہے اور سادہ انداز میں لکھی ہوئی ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے اس شخص نے لکھا ہے جو عینی شاہد اور معتبر شخص تھا اور اسی لیے الفنسٹن کا خیال ہے کہ وہ ہمایوں کے ہر فعل کو درست بنانے کے لیے مضطرب رہتا تھا۔ لیکن اس کی تحریر مبالغے سے اور قصیدہ گو لوگوں کی روایتی مدح و ثنا سے اکثر اوقات آزاد نظر آتی ہے۔ وہ اس شہنشاہ کی ایک "واضح اور زندہ تصویر" پیش کرتی ہے جو دُنیاوی معاملات میں اُلجھا ہوا ہے — جیسے اس کا فرار، ایران میں اس کی دُشواریاں اور اس کی ایسی خوبیاں بتاتی ہے جیسے جرات، تحمل، حلم، رحم دلی، انکساری، تقدس اور قناعت۔ ڈاکٹر ایس۔ رے کے الفاظ میں "ایران میں ہمایوں کے قیام کا اتنا تفصیل بیان کسی دوسرے مورخ نے نہیں دیا جتنا جوہر نے دیا ہے۔ کوئی دوسرا مورخ جو مغل نقطۂ نظر سے لکھ رہا ہو، ان مصائب اور بے قدریوں کو ظاہر نہیں ہونے دیتا جو ہمایوں کو صفوی دربار میں اُٹھانی پڑیں"۔

جوہر نے اکبر کی حکم کی تعمیل میں تاکہ اکبرنامہ کو مواد فراہم ہوسکے، اسے لکھنا شروع کیا (1587ء) یعنی ہمایوں کی وفات کے تیس سال بعد۔ لہٰذا اس کی وہ ایمانداری اور حق گوئی جو شبہات سے بالاتر تھی بگڑتی ہوئی یادداشت کے باعث یقیناً کم ہوگئی ہوگی۔ "دیر میں سوچنا اور اس کے بعد لکھنا" یہ بات واقعات کا درست خاکہ بناتے وقت اور صحیح بیان لکھتے آڑے آئی ہوگی۔ ہاں، ڈی۔ اسمتھ ضرور یہ سوچتا ہے کہ جوہر نے "واقعات بیان کرتے وقت ضرور ان یادداشتوں سے مدد لی ہوگی جو اس نے کبھی درج کرلی تھیں"۔[38] لیکن بعض دوسرے اہل علم اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ڈاؤسن لکھتا ہے، "یہ اس انداز کی

Marfat.com

تحریں نہیں کہ جس زمانے میں واقعات رونما ہوتے اسی زمانے میں انھیں لکھ لیا گیا، بلکہ یہ تیس سال سے زیادہ پہلے کی یادیں ہیں، اس لیے مصنف خواہ کتنا ہی پُر خلوص اور صاف دل رہا ہو، وقت نے اس کے تاثرات کا رنگ ہلکا کر دیا ہوگا اور بلاشبہ یادداشت نے ان یادوں پر جو ایک نہایت محبوب آقا کی یادیں تھیں، طرف داری کا رنگ چڑھا دیا ہوگا۔ اس کی توزک میں جن اشخاص سے جو مکالمے منسوب کیے گئے ہیں ان مکالموں میں ضرور بہ ضرور اتنی ہی باتیں اور شامل ہو گئی ہیں جتنی واقعی کہی گئی ہوں گی، یہ اضافہ وہ ہے جس کی بابت مصنف نے سوچا ہوگا کہ شاید ان لوگوں نے کہی ہوں گی یا انھیں کہنی چاہیے تھیں۔" ڈاکٹر بنرجی نے بعض سادہ غلطیوں کا حوالہ دیا ہے جو گرتی ہوئی یادداشت کی بنا پر سرزد ہوئیں۔[39]

دوسرے، اس توزک میں ایک بہت بڑی کمی ہے۔ بابر اور جہانگیر کی توزکوں کے برعکس یہ ذاتی اوصاف اور قصوں پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی جس سے قاری یہ اندازہ نہیں لگا پاتا کہ ہمایوں بحیثیت انسان کیسا شخص تھا۔ تیسرے، یہ ہمایوں کی ابتدائی اور شہزادگی کی زندگی (23 سال) کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔ چوتھے، اس میں تاریخیں بہت کم دی گئی ہیں، اور جو چند دی گئی ہیں ان میں سے بھی بعض غلط ہیں۔ پانچویں، دکن کی جغرافیائی خصوصیات کے بارے میں مصنف کا علم بہت کم ہے —— ہمایوں اور بہادر شاہ کی جنگ برہان پور کے مقام پر بتاتی ہے۔ چھٹے، اس میں احساسِ تناسب کی کمی ہے، اور یہ صلاحیت کہ وہ "اہم اور معمولی میں فرق کر سکے" کم ہے۔

پھر بھی بعض اوقات جوہر ایک سچے مورخ کی سطح پر آجاتا ہے۔[40]

(ج) مغل دور کے سرکاری مورخین

مغل دور سرکاری تاریخوں یا نامہ کے اعتبار سے بڑا ممتاز زمانہ تھا۔ تاریخ کی اس نئی قسم کو ایرانی اثر سے تحریک ملی تھی، اور ایک پردیسی دربار میں ایرانیوں کے اثر

Marfat.com

سے اس تحریک میں جان پڑ گئی تھی۔ یہ رواج کہ سلطنت کی سرکاری تاریخ ایک شاہی تاریخ نگار لکھے اکبر نے شروع کیا، جو اورنگ زیب سے دور تک جاری رہا، پھر اورنگ زیب نے یہ رواج بند کر دیا۔ جب تجربے کار عہدیداروں اور درباریوں، مشاق محرروں اور معتمدوں نے واقعات قلم بند کرنے شروع کیے تو تاریخ کی "شکل، مضمون اور انداز سب میں ایک تبدیلی آگئی۔" تاریخ ایک مسلسل روزنامچہ بننے لگی۔ یہ سرکاری تاریخیں عصری دستاویزوں پر مبنی تھیں جن کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود رہتا تھا۔ صوبوں کی سرکاری دستاویزات اور اخبارات دربارِ معلیٰ یا دربار کی سرکاری اطلاعات یا خبر نامے شاہی ہدایتوں کے تحت درست کیے جاتے تھے۔ لہٰذا یہ کتابیں کسی بادشاہ کے دور کے واقعات فراہم کر دیتی تھیں جو عموماً قابلِ اعتبار ہوتے تھے۔ (کسی بیان کی یہی درست بنیاد ہوتی ہے)۔ اس معلومات کی مدد سے کرداروں اور سیاسی قوتوں کے بارے میں ہم خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف، تاریخ کو پیش کرنے کا انداز لامحالہ طور پر دربار کے سماجی، سیاسی اور مذہبی رجحان کی غمازی کرتا نظر آتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ابوالفضل، عبدالحمید لاہوری، محمد کاظم اور محمد ساقی مستعد خاں جیسے سرکاری مورخین، فرمانرواؤں اور وزیروں کے افعال کے بارے میں کوئی آزاد اور تنقیدی رویہ نہیں اپنا سکتے تھے۔ وہ بڑی دانائی سے ان تفصیلات کو ٹال گئے جن کا تعلق ہمایوں کے قیام ایران و افغانستان سے تھا، کیونکہ شاہ طہماسپ نے اس کے ساتھ بڑا شرمناک سلوک کیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ شاہی گھرانے کو جو دائمی گرہن لگا تھا اسے نظر انداز کر دیں۔

جب پرانا دینیاتی تصور مسترد کر دیا گیا، تو تاریخ کی توجہ زیادہ سے زیادہ دربار اور بادشاہ کی سرگرمیوں پر مرکوز ہونے لگی۔ تاریخ غیر مذہبی بننے لگی۔ مورخین جو پہلے اس کے مطالعے کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے دینیاتی جواز پیش کرتے تھے، اب اس کی اخلاقی

Marfat.com

افادیت کی وکالت کرنے لگے۔ درباری روزنامچے اپنے سرپرستوں کی نفرت انگیز خوشامد" اور طولانی تفصیلات کے عادی بننے لگے۔ لیکن خوشامد کے "اس عیب کا تعلق جتنا انداز بیان سے تھا اتنا حقایق سے نہ تھا" (سرکار)۔ ان سرکاری تاریخوں میں دی ہوئی کوئی حقیقت غلط ثابت نہیں ہوئی' اور اکثر اوقات اس کا سہرا شہنشاہ ہی کے سر باندھا جاتا ہے گو بعض اوقات وہ اس کا مستحق نہیں ہوتا۔ ابوالفضل جب اکبر کے دَور کی مالی اصلاحات کا ذکر کرتا ہے تو ایک دفعہ بھی ٹوڈرمل کا نام نہیں لیتا اور شہنشاہ کو آئینِ دہ سالہ کا موجد بنا دیتا ہے[41]

اکبر کا وزیر اور دوست' مصنف' سیاسی مدبر' سفارت کار اور فوجی کمان دار' شیخ ابوالفضل (1551ء تا 1602ء) حجاز کے ایک عربی خاندان سے تعلق رکھتا تھا' جو ہجرت کر کے سندھ آگیا تھا اور پھر اجمیر کے شمال مغرب ناگور میں مُقیم ہو گیا تھا۔ اسے تصوّف' علم اور وسیع المشربی کی روایتیں اپنے والد مبارک اور اپنے دادا خضر سے ورثے میں ملی تھیں' اور برداشت کا سبق اُس نے مدرسۂ جبر و مصائب میں سیکھا تھا' کیونکہ مہدوی رُجحانات کی وجہ سے اس کے والدِ مبارک کو مصائب اُٹھانے پڑے تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں مختلف علوم پر قدرت حاصل کرکے' اور بیس برس کی عمر سے پہلے ہی خود اُستاد بن کر اس نے اپنی قبل از وقت غیر معمولی ذہنی نشوونما اور وسعتِ علم ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا۔ رشتے داروں کی ملامتوں کے باعث اُسے زاہد علی کی خلوت کو خیرآباد کہنا پڑا۔ 1573ء میں وہ اپنے بڑے بھائی فیضی کے ذریعے شہنشاہ سے متعارف ہوا' اور چونکہ علم و فضل نیز مخلصانہ وفاداری کے باعث اسے تیزی سے ترقی ملی' اس لیے حریفوں اور دشمنوں کو جلن پیدا ہونے لگی۔ اس کا رتبہ' انتظامی تربیت' ہر معاملے سے ذاتی تعلق' سرکاری کاغذات تک رسائی' علم و فضل اور حیرت خیز ادبی اسلوب' ان سب باتوں نے مل کر اس کی دونوں کتابوں کو انمول کتابیں بنا دیا ہے۔

Marfat.com

ابوالفضل ہمیں تاریخ کی اپنی تجربہ گاہ میں لے جاتا ہے اور اکبرنامہ نیز آئینِ اکبری میں استعمال کیے جانے والے اپنے طریقوں کی وضاحت کرتا ہے، جو ہمیں ان طریقوں کی یاد دِلانے میں جن کا استعمال تیمور کی خودنوشت سوانح عمری میں کیا گیا ہے۔ اس نے خام اشیا حاصل کیں اور ذیل کے طریقوں سے ان کے اجزا ملا کر مرکب بنایا:

(i) روداروں اور واقعات کو محنت سے جمع کرنا۔

(ii) خاص عہدیداروں، بلند مرتبہ آدمیوں، ذی حیثیت، واقف کاروں اور شاہی خاندان کے پُرانے لوگوں سے شہادتیں جمع کرنا۔

(iii) شہادت حاصل کرنے کے واسطے شاہی تلاش۔ صوبوں کو شاہی فرمان جاری کیے گئے کہ پُرانے ملازمین اپنی تحریری سرگزشتیں روانہ کر دیں۔ یہ سرگزشتیں چھان بین کے واسطے شہنشاہ کے سامنے پڑھی گئیں۔

(iv) شاہی محافظ خانہ سے اشیا حاصل کی گئیں۔

(v) وزیروں اور عہدیداروں کی رودادیں۔

(vi) شہادتوں کی جانچ (شہنشاہ سے بار بار مُنہ در مُنہ بات چیت کے ذریعے)۔

(vii) "اعلاترین اصولی ماہرین" کی مدد سے حقایق کو ترتیب دینا۔

(viii) سات سال کی محنتِ شاقہ اور بار بار نظرِ ثانی (پانچ مرتبہ) کرنے کے بعد اکبرنامہ مکمل ہوا۔[42]

اپنے دادا کی طرح شاہ جہاں نے بھی اپنے دَور کی تاریخ لکھوائی، جو پہلے مرزا امنیائی قازوینی اور پھر جلال الدّین طباطبائی اور عبدالحمید لاہوری نے تصنیف کی۔ قازوینی افضل خاں کا آوردہ اور ایک شاہی ملازم تھا۔ اس نے پہلے دس برسوں (1627ء تا 1637ء) کی بابت لکھا، لیکن وہ ابوالفضل کے تک نہ پہنچ سکا۔ چنانچہ شاہ جہاں نے اسے بدل دیا اور

Marfat.com

تاریخ لکھنے کا یہ کام عبدالحمید (وفات 1654ء) کے سپرد کیا، جو سعیداللہ خاں کی سرپرستی میں تھا۔ ابوالفضل کو نمونہ مان کر، اس نے پہلے بیس برسوں کا تفصیلی حال لکھا، اور پھر اپنی کہنہ سالی کی وجہ سے بقیہ دور (اکیس تا تیس برس) کا کام اپنے شاگرد، وارث کے سپرد کر دیا۔ قازوینی اور لاہوری دونوں نے جب خرّم کی بغاوت کا ذکر کیا تو نور جہاں پر بڑی تنقید کی۔ لاہوری کی اس کتاب کے بارے میں کہا گیا ہے: "اس میں ان کارروائیوں کی نہایت معمولی تفصیلات دی گئی ہیں جن میں شہنشاہ مصروف رہتا تھا، وظائف اور اعزازات جو شاہی خاندان کے مختلف افراد کو عطا کرتا تھا، امرا کو جو خطابات بخشتا تھا، ان کے عہدے میں جو تبدیلیاں کرتا تھا، ان کے منصوبوں میں جو اضافہ کرتا تھا، اور اس کتاب میں مختلف قسم ان سارے تحائف کی فہرست دی ہوئی ہے جو سرکاری موقعوں، جیسے نوروز، شاہی سالگرہ، تخت نشینی وغیرہ، پر دیے پا لیے گئے تھے۔ لہٰذا یہ کتاب ایسے بہت سے معاملات پر مشتمل ہے جن میں اس زمانے کے امرا اور درباریوں کے علاوہ کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ کہنا جائز نہ ہوگا کہ یہ کتاب ان ہی ادنا باتوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں ایسی باتیں واقعی بہت زیادہ ہیں، پھر بھی اس میں تاریخ مواد کی ٹھوس بنیاد موجود ہے جس کی مدد سے بعد کے مصنفین نے اس دورِ حکومت کی تاریخ اخذ کی ہے۔"[43]

اکبر کی قائم کی ہوئی روایت کی تقلید میں، اورنگ زیب نے پہلے پہل محمد امین منشی کے بیٹے محمد کاظم کو حکم دیا کہ اس کے دور کی تاریخ لکھے (عالمگیر نامہ 1688ء)۔" جب اس کا اسلوب بیان بادشاہ نے پسند کر لیا تو اُسے حکم دیا گیا کہ سے تعلق رکھنے والے سارے غیر معمولی واقعات کے بارے میں معلومات اور اس کی انجام دی ہوئی شاندار فتوحات ــــ کا احوال ایک کتاب میں جمع کرے۔ اور اسی کے ساتھ شاہی دستاویزات کے ذمہ دار عہدیداران کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ بڑے بڑے واقعات کے بارے میں پرچہ نویسوں اور مختلف ممالک کے اعلا عہدیداروں سے حاصل ہونے والے سارے کاغذات ہر قسم کے

Marfat.com

حادثوں نیز حیرت انگیز واقعات کے بارے میں ماہوار اور سالانہ چٹھے' اور مختلف صوبوں نیز ممالک کے تفصیلی بیانات' مورخ کے حوالے کر دیں۔"[44] عالمگیر نامہ ایک درباری قصیدہ ہے جو "خوشامد کرنے میں نفرت انگیز حد تک' اور ملامت کرنے میں بیہودگی کی حد تک، بڑھا ہوا ہے۔ اورنگ زیب کی تعریف میں القاب ستائش کی بھرمار ہے' اور اس کے بدقسمت بھائیوں کو نہ صرف بُرا بھلا کہا گیا ہے اور ہنسی اُڑائی گئی ہے' بلکہ ان کے نام تک بگاڑ دیے گئے ہیں۔ دارشکوہ کو بار بار بے شکوہ (بے وقار)' اور شجاع کو نہ شجاع (غیر مردانہ) کہا گیا ہے۔"[45] لیکن گیارہ سال کے بعد شہنشاہ نے تاریخ نویسی اس خیال کی بنیاد پر ممنوع کر دی کہ "اپنے کارناموں کی زرق برق نمائش سے اندرونی پاکیزگی کی سعی کہیں بہتر ہے۔"

محمد ساقی مستعد خاں' (عنایت اللہ خاں کا منشی' بہادر شاہ کا وزیر) جو چالیس برس تک شاہی ملازم رہا تھا اور بہت سے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے' وہ شخص تھا جس نے اپنے سرپرست کی درخواست پر' اس کی وفات کے تین سال بعد (1710 میں)' سرکاری کاغذات اور اپنی یادداشتوں کی مدد سے اورنگ زیب کے پورے دور کی سرکاری تاریخ مرتب کی۔ پہلے دس سال عالمگیر نامہ کی تلخیص ہیں بقیہ کتاب اس کی اپنی تخلیق ہے۔ اورنگ زیب کی ممانعت کے باعث اس نے دکن کی مہم کا "ایک تلخیص بیان پوشیدہ طور سے لکھا" جس میں اس مہم کی مصیبتوں کا ذرا بھی حوالہ دیے بغیر محض قلعوں اور ممالک کی فتوحات کی تفصیلات لکھ دی ہیں۔"[46]

(د) غیر سرکاری تاریخیں

اس دور میں ادب کی شاہی سرپرستی سے تحریک پا کر جو غیر سرکاری تاریخیں لکھی گئیں انھوں نے معلومات میں اضافہ کیا اور بعض اوقات اس معلومات کی تصحیح بھی کر دی جو اس دور کی مداحانہ تاریخی تحریروں سے اخذ کی گئی تھی۔

ہمیں (مرزا یا) خواجہ نظام الدین (سی 1551ء تا 94ء) کے بارے میں بہت کم

Marfat.com

معلومات ہے۔ اس کے والد، احمد خواجہ مُقیم ہراوی (ہرات کے باشندے) نے بابر، ہمایوں اور اکبر کے تحت ملازمت کی ــــ پہلے کے تحت بحیثیت دلوانِ بیوتات (دیوان خانہ)، دوسرے کے تحت گجرات میں عسکری کے وزیر کی حیثیت سے (1535ء) اور تیسرے کے تحت کسی اور سرکاری منصب پر (1567ء)۔ بابر کی وفات کے بعد ہمایوں کو تخت سے بے دخل کرنے کی سازش ختم کرنے میں بھی اس نے فیصلہ کن رول ادا کیا تھا۔ وہ ہمایوں کے ساتھ آگرہ گیا اور جب شیر خاں نے اُسے چوسہ (1534ء) میں شکست دی تب بھی وہ اس کے ساتھ تھا۔ خواجہ نظام الدین مُلّا علی شیر کا شاگرد تھا، جو ایک عالم فاضل شخص تھا اور شیخ اللہ داد، فیض سرہندی (اکبر نامہ کا مصنّف) کا والد تھا۔ نظام الدین بڑا تعلیم یافتہ تھا اور اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ تاریخ اور ادب کا طالبِ علم تھا۔ "تاریخ نویسی کی قدر" اس نے اپنے والد سے سیکھی تھی، تاریخی کتابوں کے مطالعے کی بابت انہی کی ہدایتوں پر عمل کیا تھا اور ان کی یادداشتیں بھی اسے مل گئی تھیں۔ طبقات لکھتے وقت بھکّر کا میر معصوم اس کا شریکِ کار بن گیا تھا، جو ایک مورّخ اور عالم فاضل شخص تھا۔ نظام الدین ان سات مصنّفوں میں سے ایک تھا جن کو اکبر نے تاریخ الفی (1582ء) مرتّب کرنے کا حکم دیا تھا۔ بدایونی اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ " وہ ایک رحم دل اور با اخلاق صاحبِ ثروت شخص تھا، جو راسخ العقیدہ تھا اور مذہبی رُجحانات کا حامل تھا"۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے تعلّقات صوفیوں، شیخوں اور عموماً مذہبی لوگوں ہی سے تھے"۔

لیکن نظام الدین زمانہ سازی کا فن خوب جانتا تھا، کیونکہ اسی فن کے سہارے اس پارسا مسلمان نے اپنا مذہبی نظریہ اپنے ہی تک محدود رکھا اور شاہی عنایتوں کی سیڑھیوں پر چڑھتا چلا گیا۔ 1589ء میں اسے گجرات سے دوبارہ واپس بُلا لیا گیا۔ یہاں کے ماحول میں اس کی راسخ العقیدگی کا رنگ دھیما پڑنے لگا۔ لہٰذا نظام الدین نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ اکبر کی مذہبی اختراعات کے خلاف احتجاج نہ کرے۔ جیسا کہ ڈاکٹر بینی پرشاد لکھتے ہیں ــــ "نظام الدین کی یہ چال کہ جب دربارِ شاہی میں کچھ راسخ العقیدہ قائدین طلب کیے گئے تو

Marfat.com

اس نے شیخ حسین کا نام بتادیا، اس شاطرانہ طریقے کا اظہار بھی کرتی ہے جس کی مدد سے وہ اپنے مذہبی عقائد کی تشریح کرنے سے بچا رہا۔"[47]

نظام الدین ایک سپاسی اور منتظم بھی تھا۔ وہ محتاط قسم کا دیانت دار شخص تھا۔ اور انتظامی علم کے معاملے میں اپنے ہمعصروں سے کہیں بہتر تھا۔ وہ بڑی مدت تک گجرات کا بخشی رہا تھا۔ اپنی ذمہ داریاں اچھی طرح انجام دینے کے باعث اسے بعد میں دربار میں واپس بلالیا گیا، اور وہ بخشی اوّل کے اعلا عہدے پر بھی فائز رہا (1591ء تا 1592ء)۔ بدایونی نے اسے یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے: "خواجہ نظام الدین نے اپنے پیچھے بڑی نیک نامی چھوڑی.... کوئی آنکھ اس کی موت پر خشک نہ تھی اور کوئی شخص ایسا نہ تھا جس نے اس کے جنازے کے دن اس کی اعلا خوبیوں کو یاد نہ کیا ہو۔" اس کی کتاب جو 1592ء تا 93ء میں لکھی گئی تھی، ہمعصر مورّخوں کے واسطے ایک معیاری تاریخ کی حیثیت رکھتی تھی، اور بعد کے مصنّفوں نے بھی اس کتاب سے پورے اعتماد کے ساتھ معلومات حاصل کی۔[48]

مُلّا عبدالقادر، بدایونی (1540ء تا 1615ء) کے نام سے زیادہ جانا جاتا ہے، بدایوں میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے والد شیخ ملوک شاہ، سنبھل کے صوفی بیچوے شاگرد تھے۔ خود بدایونی نے پہلے شیخ حاتم سنبھلی سے، اور پھر فیضی اور ابوالفضل کے ساتھ، شیخ مبارک سے تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے کے نہایت معروف اور دیندار لوگوں کے تحت بہت سے علم کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ بڑا عالم فاضل شخص بن گیا اور موسیقی تاریخ اور نجوم کا ماہر ہوگیا۔ اسے بچپن ہی سے تاریخ سے بڑا لگاؤ تھا، اور وہ گھنٹوں کسی تاریخ کو ایسے پڑھتا لکھتا رہتا۔ جیسے وہ اسی کی لکھی ہوئی ہو۔[49] 1573ء یا 1574ء میں اسے اکبر سے متعارف کرایا گیا، جو اس کے علم دینیات کی وسعت اور مُلّاؤں کو لاجواب کر دینے کی لیاقت سے بڑا متاثر ہوا، اور اچھی قرأت کی بنا پر اسے درباری امام مقرر کر دیا اور ایک ہزار بیگھا زمین کی مددِ معاش دی۔ اکبر اکثر اس سے عربی اور سنسکرت کتابوں (جیسے مہابھارت) کا ترجمہ فارسی میں کراتا تھا۔ لیکن وہ اکبر پر معاندانہ تنقید کرنے

Marfat.com

لگا، فیضی اور ابوالفضل سے رشک کرنے لگا۔ (جنہوں نے اسے پسِ منظر میں پھینک دیا تھا) اور اکبر کی آزاد خیالی اور لامحدود مذہبی نظریات، انتظامی اصلاحات اور غیر مسلموں کی سرپرستی (مسلمانوں کے اس دعوے کے خلاف کہ سارے عہدوں اور اعزازوں پر ان کا قبضہ ہونا چاہیے) سے غیر مطمئن رہنے لگا۔ جب توقعات کے مطابق شاہی ملازمت میں اسے برتری اور ترقی نہ ملی اور اس کا ذہن شہنشاہ کی طرف سے کھٹا ہو گیا، تو اس نے احساسِ محرومی کے تحت اپنی کتاب لکھنی شروع کی اور اکبر کی پریشانیوں پر بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ بدایونی نے اکبر کے دور کے ہنگاموں، جیسے بہار اور بنگال کے افغانوں کی بغاوتیں، مرزا حکیم کی بغاوت وغیرہ کو عتابِ الٰہی سے منسوب کیا، کیونکہ اس کی انتظامی حکمت عملی کی بنا پر صدر کی یہ قوت، کہ وہ لوگوں کو زمین عطا کر سکتا تھا، ختم کر دی گئی تھی۔ "بادشاہ نے ہماری مددِ معاش زمینوں میں گڑبڑ کی تھی اور اب خدا نے اس کے ملک میں گڑبڑ پھیلا دی ہے" [50] اس کی کتاب ابوالفضل کی مدحیہ لفاظی پر روک کا کام دیتی ہے۔ گو یہ واقعی ایک دلچسپ کتاب تھی، لیکن اس میں اکبر پر اتنی معاندانہ تنقید کی گئی تھی کہ اس کی زندگی میں اسے پوشیدہ رکھا گیا، اور جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد ہی شائع کیا جا سکا۔ پروفیسر ایس۔ آر۔ شرما کے مطابق "یہ سوائے ان واقعات کے بیانات کے جن میں بدایونی خود شریک رہا، کوئی بہت قابلِ قدر کتاب نہیں ہے۔" [51] مورلینڈ کہتا ہے کہ یہ تاریخ سے زیادہ صحافیانہ یادوں کی کتاب ہے۔ [52] موضوعات کا انتخاب ان کی اصل اہمیت کی بنا پر کم مصنف کی بنا پر زیادہ کیا گیا تھا، اور جب اس طرح حقائق کا انتخاب کر لیا تو ان پر ذاتی احساسات اور تعصبات کا رنگ چڑھا کر طنز و مزاح کی ایسی زبان میں پیش کیا۔ چنانچہ اس سے استفادہ کرتے وقت ان اثرات کو ہٹا کر اصلیت کا پتہ لگانا پڑتا ہے۔ مصنف نہ صرف یہ کہ بعض غیر مستعمل الفاظ استعمال کرتا ہے بلکہ مذہبی تنازعے، طعن و تشنیع، مدح و ثنا، خواب، سوانحیں اور ذاتی نیز خاندانی تاریخ کی تفصیلیں خوب مزے لے کر بیان کرتا ہے جس سے بیان کے تسلسل میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے . . . لیکن اصل

Marfat.com

موضوعات سے ہونے والے یہی انحرافات اس کی کتاب کا نہایت دلچسپ حصّہ ہیں۔۔۔۔ عصری تاریخ کے بارے میں اس کی وسعت علم بھی اکثر اسے یہ فرض کر لینے پر آمادہ کر لیتی ہے کہ قاری بھی اس سے لاعلم نہ ہوں گے۔ اس لیے وہ اکثر اوقات بہت سے حقایق یا تو نظر انداز کر دیتا ہے یا پھر غیر واضح طور سے محض ان کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔[53]

اس کے باوجود، اس میں کوئی شک نہیں کہ بدایونی ایک تخلیقی ذہن کا مالک تھا۔ اس کا عکس اسلام شاہ کے ان انتظامی اعلانات میں نظر آتا ہے جو اس نے تحریر کیے ہیں، اور جن سے یہ لگتا ہے کہ اس میں مذہب سے بالاتر ہونے کا احساس موجود تھا۔ وہ اپنے دیباچے میں لکھتا ہے: "چونکہ میری اُمنگوں کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ لکھوں دُرست لکھوں، اس لیے اگر میرے قلم سے جو میرے خیالات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے، اگر اتفاقاً کوئی لغزش ہو جائے یا خیالات میں جن کے باعث قلم حرکت میں آتا ہے، کوئی غلطی ہو جائے تو مجھے توقع ہے کہ وہ قادرِ مطلق جو ازل ہی سے رحمٰن اور رحیم ہے، اسے نظر انداز کر دے گا اور مجھے معاف کر دے گا۔"[54]

محمد ہاشم یا ہاشم علی خاں، جو خفی خاں کے نام سے مشہور ہے، ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو خاندان خواف (ضلع خراسان میں) سے ہجرت کر کے دہلی میں مقیم ہو گیا تھا۔ اس کا والد خواجہ میر بھی ایک مورخ تھا اور مراد بخش کے تحت ایک اعلا عہدیدار تھا۔ جب مراد بخش فوت ہو گیا تو اس نے اورنگ زیب کی ملازمت اختیار کر لی۔ ہاشم علی خاں نے بھی اورنگ زیب کی ملازمت کے ذریعے ترقی حاصل کی۔ اور مختلف سیاسی نیز فوجی عہدوں پر مامور رہا۔ خیال اغلب ہے کہ اس کا تعلق اپنے بعض ہم وطنوں (خواف کے) سے تھا جو سُورت میں محصول درآمدات کے محصل تھے۔ چونکہ وہ مغربی ہندوستان سے خوب واقف تھا اس لیے گجرات کے شاہی حاکم نے اسے ایک سفارتی مہم پر بمبئی بھیجا تھا۔ فرخ سیر کے دَور میں حیدر آباد کے نظام الملک نے اسے دیوان مقرر کر دیا تھا، اور اسی واسطے وہ نظام الملکی کہلاتا ہے۔[55]

Marfat.com

منتخب اللباب یا تاریخِ خفی خاں خاندانِ تیمور کی ایک مکمل تاریخ ہے، یہ بابر (1591ء اے۔ ڈی) سے لے کر محمد شاہ کے دَور کے چودھویں برس تک (1733ء) کی مغل تاریخ ہے۔ یہ شیواجی کی وفات کے ترپن برسوں کے بعد مرتب کی گئی تھی۔ تمہید میں حضرت نوح سے بابر تک مغلوں اور تاتاریوں کی تاریخ کا خاکہ دیا گیا ہے۔ پہلا حصّہ جس میں بابر سے اکبر تک کے دور کا ذکر ہے، مختصر لیکن واضح ہے۔ لیکن اس کے بڑے حصّے میں 1605ء سے 1733ء تک اس کے قابلِ قدر ہونے کا خاص سبب یہ ہے کہ اس میں اورنگ زیب کے دَور کا پورا بیان شامل ہے۔ شہنشاہ کی مشہورِ عالم ممانعت کی وجہ سے اس کے دَور کی پوری اور مسلسل تاریخ حاصل کرنا مشکل ہے۔ لیکن ہم اسی ممانعت کے ممنونِ احسان ہیں جس کے باعث جدید ہندوستان کی بہترین اور نہایت غیر جانبدار تاریخوں میں سے ایک ہمیں دستیاب ہوگئی۔[56] 1680ء تا 1733ء کا دَور، جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے، "ذاتی مشاہدوں اور ان لوگوں کے زبانی بیانات کے مدد سے لکھا گیا ہے جنہوں نے اس زمانے کے واقعات اپنی نظروں سے دیکھتے تھے" اس نے اورنگ زیب کے دَور کے "سارے واقعات کا نہایت تفصیلی چھپا پوشیدہ طور سے مرتب کیا تھا۔"

ایک مورّخ کے فرائض کی بابت خفی خاں کا نصب العین بہت اعلا تھا ــــ دیانت دار ہونا، فائدے کی توقع نہ رکھنا، ضرر کا خوف نہ کرنا، نہ کسی کا طرفدار ہونا نہ کسی سے دُشمنی برتنا، دوست اور اجنبی میں فرق نہ کرنا، اور خلوص کے علاوہ کسی اور نیت سے نہ لکھنا . . . " اس نے بڑے قابلِ ستائش انداز میں اس معلومات کا استعمال کیا جو سرکاری کاغذات (جو چند ہی لوگ دیکھ سکتے تھے لیکن جن تک اس کی رسائی تھی) سے اخذ کی گئی تھی۔ لیکن اس نے سرکاری نقطۂ نظر سے لکھا۔ وہ شیواجی کو سلطنت کا باغی اور افضل خاں بیجاپوری کا قاتل بتاتا ہے۔ شیواجی کی تاریخ وفات اس نے "کافر بہ جہنم رفت" سے نکالی تھی۔ اس کے باوجود اس نے شیواجی کی شجاعت کی بڑی تعریف کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ مرہٹہ قائد نے "مسجدوں، قرآن اور

Marfat.com

عورتوں" کو نقصان پہنچانے کی سختی سے ممانعت کردی تھی۔[57]

مرزا محمد حسن، مراتِ احمدی کا مصنف، ایرانی مہاجرین کے ایک خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ 1700ء میں برہان پور میں پیدا ہوا، جہاں اس کا والد اورنگ زیب کی دکنی فوج میں ایک عالی عہدیدار تھا۔ شہزادہ جہاندار شاہ کو گجرات کی جاگیر عطا کی گئی تو وہ 1708ء میں گجرات چلا گیا۔ اس نے احمد آباد میں تعلیم پائی جہاں اس کا والد شہزادے کے وزیر، سید عاقل خاں کا وقائع نگار یعنی نامہ نگارِ خصوصی مقرر کیا گیا تھا۔ اپنے والد کی وفات کے بعد وہ کپڑا بازار کا نگراں مقرر کر دیا گیا، اور بالآخر 1747ء سے 1755ء تک یعنی جب تک مرہٹوں نے صوبہ گجرات اپنی سلطنت میں شامل نہ کیا، وہ صوبہ گجرات کا دیوان بنا رہا۔ لہٰذا اسے خاتم الدیوان کہا جاتا تھا۔ مرزا محمد غیر معمولی ذہن اور چست تھا اور اس کی تربیت مدرسہ آفات و مصائب میں ہوئی تھی۔ دیوان کی حیثیت سے اس نے دیکھا کہ ایک ٹوٹتی ہوئی مملکت کی نراجی کیفیت، خانہ جنگیوں اور مرہٹہ یورشوں کے باعث انتظامیہ انتہائی غیر منظم ہو چکا تھا۔ اس نے اس طوائف الملوکی بارے میں اور صوبے کی اس معلومات کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے، جو معلومات اس نے بڑی سخت تلاش کے بعد حاصل کی تھی۔ گجرات کی یہ تاریخ (1000ء تا 1760ء) جس کے مرتب ہونے میں دس برس (1750ء تا 1760ء) صرف ہوئے، لکھتے وقت اس کا ایک ہندو نائب اس کی مدد کرتا رہا۔ اس کا نام متھالال کاتھ تھا اور وہ گجرات کا موروثی صوبہ نویس تھا۔[58]

مراتِ احمدی دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے اور ہر حصہ مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے دوسرے سے نمایاں طور پر مختلف ہے۔ اورنگ زیب تک کا دور مختصر اور اخذ کیا ہوا ہے، کیونکہ یہ سابقہ کتابوں پر، جیسے مرات سکندری اکبر نامہ، بادشاہ نامہ وغیرہ پر مبنی ہے۔ لیکن دوسرا حصہ (اور ضمیمہ) مصنف کا اپنا کام ہے اور اس زمانے کے ان واقعات کی بابت، جن واقعات میں وہ خود شریک رہا تھا، اس کے اپنے مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہے۔

Marfat.com

ضمیمے کا خاتمہ گجرات کی جغرافیائی کیفیات، صوفیا کی زندگی، سرکاری طبقوں اور عام انتظامی نظام کے تفصیلی بیانات کے اعتبار سے بڑا قابلِ قدر ہے۔[59]

مُغل ہندوستان کے ہندو مورّخین

مُسلم مصنّفین کے علاوہ ایسے بہت سے ہندو بھی تھے جو فارسی زبان پر قدرت حاصل کر کے ہند فارسی فنِ تاریخ نگاری کے اکھاڑے میں داخل ہو گئے۔

برندابن، لقب رائے، راجہ بھارامل (دارا کا دیوان) کا بیٹا، شروع ہی سے سرکاری معاملات کے علم سے واقف ہو گیا تھا۔ اس کی نیت ایک ایسی کتاب لکھنا تھی "جس میں مختصراً یہ بیان ہو کہ یہ فتوحات (یعنی خاندانِ تیموری کی فتوحات جن میں اورنگ زیب کی فتوحات بھی شامل ہیں) کیسے اور کتنی مدت میں حاصل ہوئیں۔ وہ سابقہ بادشاہوں کی تاریخ، ان کی ابتدا اور وہ اسباب دینا چاہتا تھا جن کے باعث انھیں عروج یا زوال ہوا . . ." وہ ایسا اس سبب سے کرنا چاہتا تھا کہ فرشتہ کی کتاب میں یہ عیب تھا کہ "باوجود یہ کہ وہ تاریخ کا خلاصہ ہے، پھر بھی اس کے بہت سے حصّے طولانی ہیں۔" اس کے خیال میں کی اپنی کتاب (1696ء میں لکھی گئی) دوسروں کی کتابوں سے افضل تھی کیونکہ اس نے اورنگ زیب کی "وسیع اور درخشاں فتوحات" بیان کی تھیں، اس اورنگ زیب کی فتوحات جس کی سلطنت کے برابر روم کے علاوہ کوئی اور سلطنت نہ تھی۔[60]

بھیم سین برہان پوری (پیدائش 1649ء) نے اپنے والد رگھونندن داس، جو ذات کا کائستھ تھا، کے پاس اورنگ آباد جانے کے لیے آٹھ برس کی عمر میں اپنی جائے پیدائش بُرہان پور کو چھوڑ دیا تھا۔ آخرالذکر کچھ عرصے تک دکن کا دیوان رہا تھا۔ مغلوں کا موروثی کائستھ سرکاری عہدیدار ہونے کے سبب، بھیم سین نے اپنی زندگی مغل شہروں اور دکن کے کوچ میدانوں میں گزاری تھی، اور راسِ کماری سے دہلی تک ہندوستان کے بہت سے مقامات دیکھے تھے۔ وہ بہت سے اعلا مغل عہدیداروں سے واقف تھا، اور واقعات میں خود بہت نُمایاں

Marfat.com

طور سے شریک رہا تھا۔ بندیلا عہدیدار ہونے کے باعث اس نے دتیا کے سردار، دلپت رائے کی ملازمت اختیار کرلی (دلپت رائے، بیر سنگھ دیو بندیلا کی نسل سے تھا)۔ دکن کی مہم میں بندیلا راجہ اورنگ زیب کے ممتاز سپہ سالار ذوالفقار خاں جس کا لقب نصرت جنگ تھا، کے نائب کی حیثیت سے شامل ہوا۔ اس کا رسالا نسخہ دلکشا (سال تصنیف 1708ء) تاو(ہ) معاصر عالمگیری کے ضمیمے کی حیثیت سے بڑا قابل قدر سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اورنگ زیب کے دور کو ایک ہمعصر ہندو کی نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ "مغل عہدیداروں کے اتنے نزدیک تھا کہ واقعات صحیح طور سے سمجھ سکے، لیکن تخت شاہی سے اتنا نزدیک نہ تھا کہ دروغ گو خوشامدیوں میں شامل ہو جائے۔" وہ "یہ جانتا تھا، سچ کیا ہے، اور سچ بولنے کی جرأت کرسکتا تھا۔" اس نے بہت سی ایسی باتیں فراہم کردی ہیں جو اورنگ زیب کے دور کی مکمل سرکاری تاریخ میں نہیں ملتی ہیں، جیسے ——

(1) واقعات کے اسباب و نتائج

(2) ملک کی حالت

(3) عوام کی حالت، ان کی تفریحات

(4) غذائی اشیا کی قیمتیں

(5) سڑکوں کی حالت

(6) سرکاری طبقے کی سماجی زندگی، اور

(7) دکن میں مغل جنگ و جدل کے واقعات

اس عیب کے باوجود کہ تاریخوں کا تسلسل قدرے غلط ہے یہ کتاب شیواجی کے دور کی مرہٹہ تاریخ کے واسطے بھی بڑی قابل قدر ہے۔ بھیم سین شیواجی کی تنظیمی صلاحیت پر اسے بلا اخراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

مندرجہ ذیل عبارتیں بہت کچھ بتاتی ہیں اور یہ دکھاتی ہیں کہ بھیم سین اس زمانے کا

Marfat.com

ایک سماجی مورّخ تھا:

"جب سے عالی جاہ تخت نشین ہوتے تھے ایک شہر میں نہ رہے تھے بلکہ انہی سب جنگوں اور اس تکلیف دہ فوجی کوچ کو اپنا رکھا تھا، اس لیے ان کی چھاؤنی کے مسکینوں نے طویل جدائی سے تنگ آکر، اپنے کُنبے چھاؤنی ہی میں بُلا لیے تھے اور وہیں زندگی گزارنے لگے تھے۔ لہٰذا ان ہی شامیانوں کے نیچے ایک نئی نسل پیدا ہوگئی تھی . . . . صرف یہ جانتے تھے کہ اس دُنیا میں خیمے کے علاوہ کوئی دوسری پناہ کی جگہ نہیں . . . . . . سارا انتظام ختم ہوچکا ہے . . . . ."

"اب یہ توقع ختم ہوچکی ہے کہ کوئی جاگیر کسی عہدیدار کے پاس اگلے سال بھی رہے گی . . . محصل لگان وصول کرتے وقت کوئی بھی ظُلم ڈھانے سے ذرا نہیں جھجکتا۔ کاشتکاروں نے کاشت کرنا چھوڑ دی ہے۔ جاگیرداروں کو ایک پیسہ نہیں ملتا۔"

"ایک حکومت کو دو قسم کے جاگیرداروں کی حمایت کرنا پڑتی ہے! . . . . . جو کسان اس دُہرے استحصال کا شکار تھے انھوں نے ہتھیار اور گھوڑے اِکٹھا کیے اور مرہٹوں میں جا ملے۔"

وہ کہتا ہے کہ مرہٹہ شورشوں کا سبب وہ انتظامی استحصال اور ظُلم تھا جو مہاراشٹر کے نزدیک علاقوں کے کسانوں پر کیا جارہا تھا اور اسی بنا پر کاشتکار مرہٹہ دیش مُکھوں اور سیناپتیوں کے ساتھ جا ملے۔[6]

پٹن گجرات کا ایک برہمن، ایشور داس ناگر، (پیدائش 1655ء) فتوحات عالمگیری (1731ء) کا مصنّف تھا۔ وہ شیخ الاسلام یعنی سلطنت کے سب سے بڑے قاضی کا 1685ء تک مُلازم رہا۔ چونکہ آخر الذکر چھاؤنی اور دربار دونوں جگہ شہنشاہ کے ساتھ رہتا تھا، اس لیے مصنّف کو خاص عہدیداروں یا ان کے ملازموں سے براہِ راست صحیح حقایق دریافت کرنے کا خاصہ موقع ملتا تھا۔ اس کے بعد وہ گجرات کے شاہی حاکم، شجاعت خاں کے تحت

Marfat.com

1684ء سے 1751ء تک ملازم رہا۔ اس کی تاریخ، فتوحاتِ عالمگیری (1731ء) میں لکھی گئی ہیں اورنگ زیب کے دور کے چونتیسویں برس تک کا حال موجود ہے۔[62]

دورِ وسطیٰ کے مسلم مورخین کو سماجی رتبوں اور طبقوں کے اعتبار سے خانوں میں بانٹنا شاید مشکل ہوگا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بہت سے مورخین کی نجی تاریخوں کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس زمانے کی سماجی تنظیم کے بارے میں پورا علم نہیں ہے۔ اشرف اور مورلینڈ دونوں نے اوپری، درمیانی اور نیچے طبقوں کی بات کی ہے۔ لیکن یہ اچھی طرح نہیں معلوم کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ یہ مشکل خاص طور سے ترک افغان دور میں پیش آتی ہے۔ اشرف نے مسلمانوں میں بعض سماجی طبقوں کی طرف اشارہ کیا ہے[63] لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ ہم اپنے مورخین کو کن طبقوں میں جگہ دیں۔ دربار یا فوج میں ترقی سماجی رتبے کے واسطے پروانہ راہداری کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن محض یہ کہہ دینا کہ مورخین درباری طبقے سے تعلق رکھتے تھے دراصل کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بہت سے لوگ نسبتاً گمنام حیثیت سے اٹھ کر درباری اور عہدیدار بن گئے، اور کسی طرح یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ وہ طبقۂ امرا یا اونچ طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض مورخین ضرور اعلا تعلیم یافتہ تھے اور اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جس کو طبقہ دانشوراں یا درمیانی طبقہ کہا جاسکتا ہے۔ فیروز تغلق، تیمور، بابر، جہانگیر، گلبدن بیگم اور مرزا حیدر دغلت ان مورخوں اور توزک نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جنھیں شاہی خاندان کے خانے میں رکھا جاسکتا ہے۔ منہاج الدین اور امیر خسرو کو ہم شاید طبقۂ امرا میں شامل کرسکتے ہیں۔ معاصر الامرا میں دوسرے امرا کے ساتھ ابوالفضل، محمد ساقی مستعد خاں، خواجہ نظام الدین اور محمد ہاشم علی خاں (خفی خاں) کے نام لیے گئے ہیں، اس لیے ہمیں یہ خواہش پیدا ہوسکتی ہے کہ انھیں طبقہ امرا میں داخل کرلیں۔ لیکن سماجی اعتبار سے شاید یہ کہنا جائز ہوگا کہ مغل زمانے کے بیشتر مورخین تعلیم یافتہ درمیانی طبقے کے دانشورو

Marfat.com

کی جماعت کے افراد تھے، اور ان کی حیثیت طبقہ امرا کے فرد کی سی نہ تھی۔ دورِ وسطیٰ کے بیشتر مورخین یا مصنف یا تو خود ہجرت کرکے آئے تھے، جیسے البیرونی (خوارزم سے)، حسن نظامی (نیشاپور سے) یا غیر ملکی مہاجر خاندانوں کی اولاد تھے، جیسے منہاج (جرجان سے، جو مرو اور بلخ کے درمیان ہے)، شیخ ابوالفضل (حجازی خاندان)، خواجہ نظام الدین (ہراتی خاندان)، مرزا امین القازوینی (قازوین) فرشتہ (استرآباد سے)، مرزا محمد حسن (ایرانی مہاجر خاندان)، خفی خاں (خراسانی مہاجر خاندان)۔ ان میں سے بہت سے واقعی ہندوستانی الاصل تھے جیسے اہلِ ہندوستان یعنی ضیا الدین برنی، امیر خسرو، یحییٰ، عبدالقادر بدایونی اور عبدالحمید لاہوری۔ ہمایوں کا آفتا ، جو ہر ایک ادنیٰ ملازم تھا جو ترقی کرکے عہدیدار بن گیا تھا۔

اختتام

تاریخی معروضیت کا مسئلہ فلسفۂ تاریخ کے واسطے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ عام طور پر مان لیا گیا ہے کہ تاریخی فکر میں داخلی عنصر ضرور شامل رہتا ہے، جس کے باعث متوقع معروضیت میں تبدیلی آجاتی ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ معروضیت محدود ہو جاتی ہے۔ یہ امید رکھنا کہ علمِ طبیعیات کی سی لاشخصیت تاریخ میں بھی ہو غلط ہوگا، کیونکہ تاریخ کی تعریف بعض اوقات یوں کی جاتی ہے کہ یہ علمِ اشخاص یا علمِ دماغِ انسانی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا دورِ وسطیٰ کے بعض مثالی مورخین معروضی تھے یا نہیں، اور اگر تھے تو کس معنی میں تھے۔ ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے بعض مثالی مورخوں کی نجی تاریخوں اور ان کی تحریروں کا یہ مختصر خاکہ ان کے نقطۂ نظر اور رتیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پہلی بات تو ذاتی میلان کے سوال سے تعلق رکھتی ہے۔ بعض ٹھوس مثالوں سے یہ بات تو ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے خیالات اور نقطۂ نظر پر ان کے ذاتی معاملات اور ان کی پسند و ناپسند کا رنگ چڑھ گیا تھا۔

Marfat.com

ترک افغان دَور کے بعض مورخوں نے اور مغل دَور کے سرکاری مورخوں نے بڑے لوگوں کی تعریف کی ہے۔ ایسی صورتوں میں تاریخ اِن دیوتا صفت لوگوں کے افعال اور خیالات کے گرد گھومتی رہی ہے۔ ان دِنوں بڑے لوگوں کے خلاف اپنے تنفر کا کھُل کر اظہار کرنا بیشتر مورخوں کے لیے مشکل تھا۔ لیکن بعض قابلِ ذکر لوگ ایسے بھی تھے جو اس سے مُستثنا تھے جیسے البیرونی اور ترک افغان دَور میں عصامی۔ مغل دَور میں بدایونی کی تاریخ اکبر کے زمانۂ حیات میں پوشیدہ رکھی گئی، کیونکہ اس میں اکبر کے خلاف شدید طعن و تشنیع تھے۔ دکن میں مرہٹوں کے خلاف اورنگ زیب کے طویل جنگ جدال پر ایک طرح سے بھیم سین نے تنقید کی ہے لیکن وہ اپنے حالات کی بنا پر ایسا کر سکتا تھا۔

دوسری بات گروہی تعصبات کے سوال سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے تحت مورخوں کے وہ تعصبات یا مفروضات آتے ہیں جن کا سبب کوئی خاص گروہ، قوم، نسل یا سماجی طبقہ یا مذہب ہوتا تھا۔ ان مفروضات کا دائرۂ عمل خالی خولی تعصب کے مقابلے میں کہیں زیادہ نازک یا وسیع ہوتا ہے اور ذاتی پسند یا ناپسند کے مقابلے میں اسے پہچاننا یا اس کا اثر زائل کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ مذہبی عقائد غیر معقول تعصب کا نتیجہ ہی نہیں بلکہ استدلال پر مبنی یقین کلی کا معاملہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے مورخین کے سوچ بچار پر مذہبی عقائد کے اثر کو ناگزیر اور پورے طور سے جائز سمجھا جا سکتا ہے۔ ان دِنوں مذہب ہی مورخین کے سوچ بچار کی ٹھوس بُنیاد ہوتا تھا اور وہ تاریخ کے ذریعے مذہب کی خدمت کرتے تھے۔ ابتدائی ہند مُسلم مورخین نظام عالم اسلامی کو مانتے تھے اور تاریخ کو مذہب اور دینیات کے مقصد کے تحت استعمال کرتے تھے تاکہ اسلام کا بول بالا ہو۔ وہ اپنی ساری توجہ مسلمانوں کے کاموں پر مرکوز رکھتے تھے اور ہندوؤں کو ان بے حرکت لوگوں کی سی حیثیت دیتے تھے جن کو ہر طرح استعمال کیا جا سکتا ہو، جیسے تلوار سے زیر کرکے، نو مسلم بنا کر یا جزیہ وصول کرکے۔ یہ لوگ اس انداز سے لکھتے تھے جیسے وہ سارے لوگوں کے نہیں بلکہ

Marfat.com

صرف ایک مذہبی گروہ کے مورّخ ہوں۔

لیکن یہ بات قابلِ شک ہے کہ مندرجہ بالا سطور میں جن گروہی تعصّبات اور ذاتی میلانات پر بحث کی گئی ہے کیا وہ واقعی تاریخی معروضیت میں مانع ہو سکتے ہیں، کیونکہ میلان یا تعصّب والی تحریریں بہرصورت اصلاح کی جا سکتی ہے، اسے نظر انداز کیا جا سکتا یا اس سے چوکنا رہا جا سکتا ہے۔

ذاتی خیالات یا گروہی تعصّبات سے زیادہ نازک وہ فلسفیانہ، اخلاقی یا مابعدالطبیعیاتی عقائد تھے جو ان تحریروں کے پیچھے کارفرما تھے، کیونکہ ان ہی عقائد کی بنا پر بالآخر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ماضی کو کس طرح سمجھا جائے، فطرت انسانی کا کیا تصور ہو اور انسان کو کائنات میں کیا مقام دیا جائے۔ ہندوستانی دَورِ وُسطیٰ کے مورّخین ماضی کو اپنے فلسفیانہ خیالات کی روشنی میں دیکھتے تھے، اور تاریخ کو پیش کرنے کا انداز ان خیالات سے پورے طور پر متاثر ہو جاتا تھا۔ تاریخ کے مفہوم کی بابت انؓ کے نظریات آج کے نظریات سے مختلف تھے۔ پہلی بات یہ تھی کہ دَورِ وُسطیٰ کے مورّخ کے واسطے تاریخ افعالِ انسانی کے باعث نہیں بلکہ مرضیٔ خدا کے باعث بنتی تھی۔ اگر واقعات حکم خدا کے پابند تھے تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ تاریخ کو پیچیدہ قسم کی سماجی یا اقتصادی قوتوں کے حوالے سے پیش کیا جائے۔ برنی، عفیف یحییٰ، امیر خسرو، عصامی، ان سارے مورّخوں کا عقیدہ تھا کہ تاریخ میں خدا کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ مغل دَور میں بھی حکم خدا کا رویّہ نظر آتا ہے، لیکن ترک افغان زمانے کے مقابلے اس دَور میں تاریخ کا انسانی پہلو زیادہ نمایاں ہونے لگا اور اسبابِ رُوحانی کی حیثیت کم ہونے لگی۔

دوسرے تاریخ روایتی انداز میں مذہبی و اخلاقی پسِ منظر کے ساتھ پیش کی جاتی تھی۔ عصامی اور یحییٰ جیسے مورّخوں نے اپنے قاریوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جو یہ چاہتے تھے کہ مقبولِ عام مذہبی اور اخلاقی احکامات کے تحت اس بُری دُنیا کی نمائشوں اور دِکھاوی سے

Marfat.com

گریز کیا جائے۔ ابوالفضل نے اکبر کے اس دعوے کی حمایت میں کہ وہ دینوی اور دُنیاوی معاملات میں سند آخر کی حیثیت رکھتا ہے[7] اکبر نامہ کو استعمال کیا۔ اس نے اکبر کے نظریہ بادشاہت کا ایک علمی جواز دینے اور عقلی پروپیگنڈا کرنے کی کوشش کی۔ بدایونی نے کٹر سُنی نقطہ نظر کی عکاسی کی۔

تیسرے، برنی، یحییٰ، امیر خسرو جیسے ہند مسلم مورخوں نے تاریخ کے ناصحانہ عنصر پر زور دیا۔ اور حالانکہ ابوالفضل اور نظام الدین جیسے مورخوں نے تاریخ کی اخلاقی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے، پھر بھی مغل دور میں ناصحانہ عنصر پر زور کم ہو گیا تھا۔

Marfat.com

حوالہ جات

1. Elliet and Dowson Vol. II pp2-3

2. Sachah's al Biruni Vol. I, p.22

3. Sachan's al Biruni, p p.17-19

4. Sachan's al Biruni : p.7

5. Jarrett's Preface to Ain-i-Akbari, Vol. IIIed. Sarkar Intro VIII-IX

6. Elliot and Dewson, Vol IV ; pp. 14 16.25.29.36.39.

7. Elliot and Dowson, V pp. 53-60

8. Patna University Journal July, 1963; p.57

9. Elliot and Dowson Vol. II pp.210, 204-12

10. Patna University Journal, op cit.

11. Elliot and Dowson. Vol. III pp. 259-66 ; Rawerty's Intre.

12. Elliot and Dowson Vol. III, pp 97-69 App. 52-3-

567 M.W. Mirza's ed. of Khazain-ul-Futah p.12 ; Harby,

Historians of Medieval India, Ch.5: Philips, Historians of

India, Pakistan and Ceylon, 146

Marfat.com

13. Elliot and Dowson, Vol. III pp. 93 97 : I Prasad Qurannah Turke, 344 7 Islamic Culture vol.XII and XV aste on Zia Barani R.C.Mazumdar,Delhi Sultanate ; Mohdi Hussain,Mohammad Tughtaq, 248 50.

14. Elliot and Dowson, Vol.III pp.269 271 ; Hardy Historians of Medieval ndia, Chapter 3

15. Elliot and Dowson, vol. IV.pp.6-7, Handy,Aistorsan of Medieval india, Chapter 4

16. Elliot and Dowson, vol IV Chapter 6

17. Elliot and Dowson pp.22

18. Elliot and Dowson vol. III pp 381 391.

19 Elliot and Dowson Vol III pp.461

20. Elliot and Dowson vol. III pp 394 5

21 Elliot and Dowson vol. III p.429

22. Elliot and Dowson Vol III p.400

23. Elliot and Dowson vol. III pp.369

24. Elliot and Dowson vol. III

25. Elliot and Dowson Vol III pp 396

26 Elliot and Dowson vol. III

27 Elliot and Dowson, Vol. III pp.428 9

28 Elliot and Dowson, Vol.III

Marfat.com

29. Elliot and Dewson Vol.III p.397

30. Elliot and Dowson Vo.III p.397

31. Elliot and Dowson Vol.III, IV,559-63 ;218-229

32. Elliot and Dowson Vol.VI' p.282

33. Elliot and Dowson Vol.III pp.251-5 ; Rogero and Beveridge vol.I : S.R.Sharma, Bibliography of Mughal India

34. Mrs.Beveridge, Tr. of Humayun-nama; I Prasad Life and time of Humayun.

35. Quoted in rskine i ,

36. Elliot and Dowson, vol.V pp 127 129

37. Beveridge, Akbar namo vol. I, pp.627

38. Smith, Akbar, 464

39 S. Banerju Banerji,Humayun Padshah, I 291; 123n. 3.

40. E.D. V. 136 138; S. Ray, Humayun in Persia ; I Prasad, Op. cit : S Banerji, Humâyun Padshah

41. J.N.Sarkar, Tr. of Maasir-i-Alamgiri Perface III

42. Blochmann Rev by Phillot Vol. I Aini Akbari Introduction Ain vol2 and 3 (Jarrett,rev. by J.N.Sarkar)

Marfat.com

43. Maasir-ul-Umara I, 4, 391. B.P Sexena III-V, Elliot and Dowson, Vol VII' p.4

44. Ibid, p. 175

45. Maasir-Ul-Umara I p. 177

46. Maasir ul-Umara pp. 181 183 ; J.N.Sarkar,Naasir-i-Alamgiri [Eng tr.] Intro : Studies in Mughal India Maasir ul-Umara Eng. ter I p. 4.,n 7, 666.

47. Badauni,Hiag III 137,138,151,Lowe II 309

48. Elliot and Dowson, Vol. V pp. 177 ft.B. De. Eng, tr. of Tabaqat Completed by B. Prasad [A S.B] Smith,Akbari Akbar [App.] : Maasir-ul Umara

49. Elliot and Dowson, Vol. V,pp.480

50. Badauni

51 Sharma, Bibliography of Mughal India, 38 39

52 Maoreland, Agrarian System of Moslem India

53 Elliot and Dowson, Vol V, p 481

54 M U Eng Gr I E D V,4777 ff. Eng.tr.by Rankind, Lowe and Haig, Presidental Address,Indian History Congress (1955) Sec IV by Sarkar

Marfat.com

55. Elliot and Dowson; Vol. VII, pp. 207. 210

56. Elliot and Dowson: Vol. VII, pp. 207

57. Khafi Khan, II 2 726 ; E.D. VII (S Gupta ect.)

53,54: M.U. Eng. Tr.I. 4,32,47,70,226 : II 139 468

58. J.N.Sarkar: Foreword Eng. of Miret-i-Ahmadi by Syed Nawat Ali (Gaekwad Oriental Sec Series

59. Supplement to Mirar Tr. Nawab Ali Seddon, Foreward

60 E.D. VII 168 170

61. J.N.Sarkar; Studies in Mughal India; Aurangzeb 377 m .449.

62. J.N.Sarkar ; Op. cit.

63. ان کے رتبوں کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے :-
سلطان، شاہی خاندان، خان اور اعلا رتبوں کے دوسرے لوگ، سید، علما، عام امرا، ذمہ دار افراد (مغلوں کے زمانے میں منصب دار) سلطنت کے بڑے عہدیدار، مختلف قبیلوں کے سردار، شاہی خدمت گاروں کے دستے، شاہی

Marfat.com

خزانے کے محافظ دستے (جرگہ ۹) کے افراد، سلطان کے خانگی خدمت گار، اور اس کے ادنا اور گھریلو ملازمین۔ انھیں مرتبوں کے لحاظ سے مزید اونچے، درمیانی اور نیچے طبقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

بہت سی صورتوں میں یہ تقسیم واضح نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ بے ضابطہ بھی ہے۔ لیکن زیر نظر دور میں اسی تقسیم کے حکمراں طبقوں پر ایک سرسری نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ (کے۔ ایم۔ اشرف۔ لائف اینڈ کنڈیشن وغیرہ 54)۔

Marfat.com

گجرات اور راجستھان کے حوالے سے علاقائی زبانوں کے تاریخی ماخذوں کی اہمیت کا ایک تخمینہ اور جائزہ

پی۔ سرن

ابتدائی زمانے میں جن برطانوی اور یورپی اہلِ علم نے ہندوستانی تاریخ کے دورِ وسطیٰ (جس کا مفہوم ان کے نزدیک محض مسلمانوں فرمانرواؤں کا دور تھا) کے مطالعے پر توجہ دی، انہوں نے تقریباً ساری تحقیقات فارسی روزنامچوں کی بنیاد پر کی تھی۔ اس قسم کا ماخذی مواد زیادہ تر روزنامچوں پر مشتمل تھا، اور ان روزنامچوں کا دائرہ عمل اِس بنا پر نہایت محدود تھا کہ اِن کے مصنّفین دراصل وہی باتیں تحریر کرنا چاہتے تھے جن کا تعلّق محض فاتحوں اور فرمانرواؤں کی زندگی اور سرگرمیوں نیز ان کے اچھے اور برے افعال سے ہو۔ ان کے خیال میں تاریخ کو عوام الناس یا انسانی سماج کی ترقّی و عروج کے مختلف پہلوؤں پر توجّہ دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اِن روزنامچوں نے بڑے قابل قدر طور سے اِن متذکرہ بالا مغربی مصنّفین کی مطلب برادری کی، جن کا خود کا تصوّرِ تاریخ بھی فارسی روزنامچوں سے بہت زیادہ جدا نہ تھا۔ لہٰذا تاریخ نگاری اپنے دائرہ عمل کے اعتبار سے نہایت محدود ہوکر رہ گئی۔ پھر اس بات پر کہ سماج کی جو تصویر پیش کی گئی وہ نہایت غیر مکمّل اور غیر متوازن تھی، کیوں تعجب کیا جائے۔

لیکن ٹوڈ کے اس نہایت جائز دشنام کے باوجود، جو اس نے بہت پہلے

Marfat.com

پچھلی صدی کی تیسری دہائی کے ابتدائی برسوں میں دیا تھا، یہ خیال اپنی جگہ قائم رہا کہ نہ ہندوستان کی اپنی کوئی قومی تاریخ ہے نہ قابلِ ذکر قسم کی تاریخی تصنیفیں ہیں۔ تسلسل تاریخ کے ساتھ جس طرح فارسی میں بیشتر کتابیں ملتی ہیں۔ ویسی کتابوں کی قلت کے دوسرے اسباب کے علاوہ ٹوڈ کا یہ کہنا بھی بڑا موزوں لگتا ہے کہ "ہندوؤں جیسے لوگوں سے ٹھیک اِس طرح کی تصانیف کے نمونوں کی توقع رکھنا جو روم اور یونان کی تاریخی کتابوں کے انداز کی ہوں، پرلے درجے کی غلطی ہوگی" کیونکہ یہ غلطی اسی سے سرزد ہوگی جو ہندوؤں کے رویّے اور نظریے پر بنی اس مخصوص روایت کو بھول جائے جس روایت کا اطلاق ان کی ساری ادبی تخلیقات کے معاملے میں ہوتا ہے۔ ہندوستانی تاریخ اور تہذیب کے طلبہ کو اکیلے ٹوڈ ہی نے خبردار نہیں کیا ہے۔ جی، بہلر، بھاؤ داجی، بھگوان لال اندراجی، سراورلِ اسٹائن، اے۔کے۔ فوربیز، ل۔پی۔ ٹیز ٹیوری، وغیرہ جیسے ممتاز عالم فاضل لوگ بھی وقتاً فوقتاً اس پر فریب خیال کی طرف کہ قبلِ مسلم ہندوستانی ادب میں تاریخی ادب نام کی چیز تقریباً ناپید ہے، توجہ دلاتے رہے ہیں۔

ٹوڈ کے بعد کویراج شیامل داس، بھاؤ داجی، بھگوان لال اندراجی، جی۔ایچ۔ اوجھا اور دوسرے لوگوں کا ایک پورا گروہ گزرا ہے جن کی تحریروں سے سنسکرت، ہندی اور ملک کی دوسری زبانوں میں تاریخی ادب کی کمی کا یہ مقبول عام خیال دور ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن پچھلی صدی کے دوران بڑی تعداد میں تاریخ کے ایسے ماخذی مواد پر روشنی پڑی ہے جو اس سے کہیں بڑے علاقے کا احاطہ کرتا ہے جس علاقے تک فارسی تاریخ نگاروں کی تحریریں عام طور پر محدود رہتی ہیں۔ یہ اس قسم کا تاریخی مواد ہے جو سرکاری اور نجی ذخیروں کی شکل میں واقعتاً سارے راجستھان (اور گجرات اور مالوہ میں بھی) میں بکھرا ہوا ہے اور جو لوگوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر، ان کی

Marfat.com

سماجی روایتوں پر ان کے عقیدوں اور ارادوں پر، اقتصادی، صنعتی اور کاروباری میدانوں میں ان کی ترقی پر، اور اس سے زیادہ سائنس اور ادب کے میدانوں میں ان کے لاجواب کارناموں پر جن میں طبعی اور وہ مافوق الطبعی کارنامے بھی شامل ہیں جو ہندوستانی تاریخی عمل کے سیاق میں سب سے زیادہ اہم ہیں، معلومات ـــــ کا ایک خزانہ پیش کرتا ہے۔

اِن خزانوں کی دریافت اور تحفظ کے بڑھتے ہوئے جوش کے ساتھ متعدد ادارے لائق تحسین خدمات انجام دے رہے ہیں اور بڑی تعداد میں سنسکرت نیز دوسری زبانوں کی جو وقت وقت سے ابتدائی تحریروں کی زبانیں رہ چکی ہیں، فاضلانہ اور نقادانہ مشرح اشاعتیں طبع کرا رہے ہیں۔ لیکن عظیم اطالوی فاضل، ڈاکٹر ایل۔ بی۔ ٹیز ٹیوری کے ممتاز اور غالباً اکیلے کارنامے کو اگر مستثنیٰ قرار دے دیا جائے، تو یہ کہنا جائز ہوگا کہ موجودہ مواد کو تقسیم کرنے اور خانوں میں باقاعدہ بانٹنے کی باقاعدہ کوشش اِن سے پہلے یا ان کے بعد کسی دوسرے نے نہیں کی۔ لیکن ٹیز ٹیوری نے بھی ایک محدود علاقے کا احاطہ کیا تھا۔ اس مقصد کے ساتھ راجستھان میں جو حالیہ جائزہ لیا گیا تھا اس سے دستاویزوں اور دوسری قابلِ قدر اشیا کے سینکڑوں ذخیروں کا پتہ لگا تھا۔ یہاں ہم ایک سرسری سا اشارہ اس نہایت وافر کتبیاتی مواد کی طرف بھی کر دیں جو محکمۂ آثار قدیمہ اور اس میدان میں کام کرنے والی دوسری تنظیموں کی نئی دریافتوں کی وجہ سے برابر بڑھ رہا ہے۔ ابتدائی دورِ وسطیٰ اور خصوصاً گجرات کے سلسلے میں ایک نہایت غیر معمولی شخص جی، بہلر ہے، جو بہت سی تاریخوں کے مصنّف اور عالمِ متبحر تھے اور جس نے کثیر التعداد کتابوں کی کھوج اور تلاش کر کے بیش بہا خدمت انجام دی، اور حقیقت یہ ہے کہ مغربی ہندوستان میں علمِ تاریخ ہندوستان کی ٹھوس بنیاد قائم کر دی۔ اس کی تقلید ساونت وادی کے بھاؤ واجی اور ایک گجراتی اہلِ علم بھگوان لال اندراجی نے کی۔

Marfat.com

ایک صدی کے پچھلے پچھتر برسوں میں بعد کے دور کے مواد کا استعمال چند ہی اہل علم نے کیا ہے۔ ٹوڈ کے بعد اس میدان میں ابتدائی نوعیت کا کام کوی راج شیامل داس نے کیا ہے، جو میواڑ کے مہارانا سجن سنگھ (1874ء تا 1884ء) کا درباری شاعر تھا۔ کوی راج شیامل داس نے اپنی ضخیم تاریخ میں، جس کا نام ویرونود تھا اور جو 2800 صفحات پر مشتمل تھی، پورے راجستھان کی تاریخ و جغرافیے کے نہایت وسیع میدان کا احاطہ کرلیا ہے۔ مصنف نے راجستھان کے سیاسی، اقتصادی اور انتظامی پہلوؤں پر بڑی تعداد میں اعداد و شمار بھی اکٹھا کیے ہیں۔ اس نے کتبے اور مغل بادشاہوں کے فرمان بھی نقل کیے ہیں۔ لہٰذا راجستھان کی سیاسی تاریخ پر حوالوں کے لیے اس عظیم تصنیف کی حیثیت ایک معیاری کتاب کی صورت میں ہمیشہ برقرار رہے گی۔ راجستھان کے جدید مورخوں میں دو اور نام جی۔ ایچ۔ اوجھا اور ہر بلاس ساردا کے ہیں۔ اوجھا کا کام واقعتاً زبردست ضخامت کا کام ہے۔ میواڑ، مارواڑ، سروہی اور راجستھان کی دوسری ریاستوں کی تاریخوں کے علاوہ، اوجھا نے ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی تہذیبی تاریخ کو جو کچھ دیا ہے وہ بھی نہایت قابلِ قدر ہے۔ انھوں نے بڑی تعداد میں مضامین (نبندھ) لکھے ہیں جن کو جمع کرکے کئی جلدوں میں شائع کرادیا گیا ہے۔ لیکن اس مضمون کا جامع بیان غالباً ان ہی لیکچروں پر مشتمل ہے جو انھوں نے ہندوستانی اکاڈمی، الٰہ آباد (1928ء) کے زیرِ انتظام دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی تہذیب — مدھ کالین بھارتیہ سنسکرتی — کے عنوان سے دیے تھے۔ دورِ قدیم اور دورِ وسطیٰ کے ہندوستان کے بارے میں ان کی سب سے بڑی دین بھارتیہ پراچین لپی مالا (ہندوستان کے قدیم کتبوں اور تحریروں کو پڑھنے کا فن) (1918ء کا نظرِ ثانی کے بعد والا ایڈیشن) ہے، جو ہندی یا کسی بھی دوسری زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ ہر بلاس ساردا، جو ایک ہمہ گیر قسم کے عالم اور قابلِ ذکر مصنف

Marfat.com

تھے، انہوں نے اپنی نہایت عمدہ کتاب تاریخ اجمیر اور رانا کمبھا، رانا سنگرام سنگھ اور دوسرے راناؤں کی سوانحوں کے سلسلے میں سنسکرت اور ہندی کے اصل ماخذوں کا بڑا وسیع مطالعہ کیا تھا۔ ان کی تقلید میں پچھلی دو دہائیوں کے دوران بہت بڑی اور بڑھتی ہوئی تعداد میں اہلِ علم لوگوں نے اِن ماخذوں پر توجّہ دینی شروع کر دی ہے۔ ڈاکٹر رگھوبیر سنگھ، پروفیسر دسرتھ سرما، نہاٹابر اور ان اور دوسرے بہت سے لوگوں نے ایسا تاریخی ادب تیار کیا ہے جو بڑا لائق تعریف ہے۔ انہی اہلِ علم کے کاموں کی بنا پر چند برسوں سے نئی نسلوں کے محققوں کی توجّہ یہ سمجھ کر ایک زیادہ وسیع میدان کی طرف مبذول ہو گئی ہے کہ اب تک جن ماخذی اشیا، سے فائدہ نہیں اُٹھایا گیا تھا ان کا استعمال ضروری اور اہم ہے۔ مثلاً یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوتا ہے کہ راجستھان کے تعلیمی اِداروں اور یونیورسٹیوں کے علاوہ علیگڑھ مُسلم یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ نے بھی اس سمت میں پیش قدمی شروع کر دی ہے۔

اس سب کے باوجود، اب تک جو کام ہوا ہے اس کی حیثیت سمندر میں قطرے کی سی ہے، کیونکہ اہلِ علم لوگوں کا ایک بہت بڑا حصّہ، جو ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی مدّت اور اس کے تاریخی ماخذ، دونوں اعتبار سے فرسودہ خیالات سے چپٹے ہوئے ہیں، ابھی تک ماخذی مواد کے اس ذخیرے سے نہایت لاعلم ہے۔ یہی لاعلمی، بڑے پیمانے پر پھیلے ہوئے اس غلط تصوّر کی بھی ذمہ دار ہے کہ جس زمانے کو ہم دورِ وسطیٰ کہتے ہیں وہ محض مُسلم حکومت کا کارنامہ تھا، یعنی تقریباً گیارھویں صدی سے اٹھارویں صدی کے وسط تک کا زمانہ۔ گیارھویں صدی سے پہلے ہماری تاریخ کی پانچ یا اس سے کچھ زیادہ صدیوں کا زمانہ، جو زمانۂ بعد کے کارناموں اور ہندوستانی سماج کے انحطاط و زوال دونوں چیزوں کے واسطے پودے کیاری کی حیثیت رکھتا تھا، محض یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اس دور میں تاریخی دلچسپی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ مدّت جو نصف ہزار برسوں سے کسی طرح

Marfat.com

کم نہیں ہے تاریخی خلا کہہ کر رد کر دی جاتی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ جو لوگ قبلِ ترک دور سے اب تک پرہیز کرتے رہے ہیں اور صرف فارسی نیز غیر ملکی ماخذوں تک محدود رہے ہیں، اور اس فائدے سے محروم رہے ہیں جو علاقائی زبانوں میں دیسی اشیاء کے وسیع خزانے سے حاصل ہو سکتا تھا، سنسکرت، ہندی اور اسی نژاد کی دوسری زبانوں سے واقفیت پیدا کریں تاکہ اِن بے شمار اشیا کا استعمال کر سکیں جو اِن زبانوں میں موجود ہیں۔ محدود نقطۂ نظر کی بنا پر اپنی تاریخ اور اپنے ورثے کے ادراک کے بارے میں لامحالہ ہمارا نظریہ مفلوج ہو گیا ہے اور نظر تنگ ہو گئی ہے۔

گرجرا پرتھی ہار، گہدوار، چوہان، چندیل اور پرماروں جیسی ابتدائی حکومتوں پر چند ایک رسالوں کے علاوہ اِس دور (ابتدائی ہندوستانی دورِ وسطیٰ) پر سب سے زیادہ قابلِ ذکر کام سی، وی، ویدیا اور ایچ، سی، رے نے کیا ہے[2]۔ لیکن روایتی خیالات کا اتنا غلبہ ہو چکا ہے اور نام نہاد دورِ وسطیٰ کے مطالعے کی بابت لوگوں کے عام طرزِ نظر کی جڑیں اتنی گہری ہو چکی ہیں کہ ویدیا اور رے کی پیش رفت کے بعد شاید ہی کسی نے اِس میں کوئی قابلِ قدر اضافہ کیا ہو۔

فارسی اور غیر فارسی ماخذوں کی اہمیّت کا مقابلہ :

دورِ وسطیٰ اور اس کے ماخذوں کی بابت جو بہت سے مفروضات رائج ہو کر ہر طرف پھیل گئے ہیں اور تقریباً ایک مصدقہ حقیقت کی طرح مان لیے ہیں، نیز جن کی بنا پر تاریخی تلاش و تحقیق کلام بڑی حد تک رُک گیا ہے، ان میں سے ایک مفروضہ یہ ہے کہ صرف فارسی روزنامچے ہی تاریخ نگاری کے معیاروں پر پورے اُترتے ہیں، اور علاقائی دیسی زبانوں میں شاید ہی کوئی ایسی تاریخی کتاب ہو جو اُن جیسی مستند اور معتبر ہو۔ فنِ تاریخ نگاری کے تصوّر اور اس کی خاصیّت کے بارے میں یہ بتانے کے لیے ہم ٹوڈ کا حوالہ دیا ہے (پیراپیرا ۲) کہ ہندو ادب میں اِس انداز کی تاریخ نگاری

Marfat.com

کی تلاش نہایت غلط ہوگی جس انداز کی تاریخ نگاری فارسی روزنامچوں میں ملتی ہے، کیونکہ فارسی روزنامچوں کے بیشتر مصنّف یہ سمجھتے ہیں کہ عوام کی زندگی کا کوئی بھی پہلو اس لائق نہیں ہوتا کہ اسے تاریخ میں جگہ دی جاتے۔ لہٰذا فارسی کے نام نہاد تاریخی ادب کا بہت بڑا حصّہ اُونچے اور طاقتور لوگوں کی زندگی کے غیراہم واقعات سے پُر ہے۔ جہاں تک ان کی تاریخی قدر و قیمت کا تعلّق ہے، تو قطع نظر اس بات کے کہ ان میں سے بہت سے برائی کی حد تک تاریخوں سے مبرّا ہیں، لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم یہ ہے کہ ان کی پسند و ناپسند، ان کے توہمات اور کٹرپن، اور ان کے اپنے میلانات جن کے باعث سچائی پوشیدہ رہی ہے اور ذہن صحیح راہ سے بھٹک جاتا ہے، ان سب باتوں سے اکثر اوقات ان کے بیانات خراب ہو جاتے ہیں اور نہایت ناقابلِ اعتبار بن جاتے ہیں۔ روزنامچہ نگاروں کی یہی وہ خامیاں ہیں جن کے باعث بعض محققین کو یہ بہانہ ہاتھ آجاتا ہے کہ جو چیز ان کے مفروضہ مقاصد کو پورا کرتی نظر آتے اسے مان لیں اور جو چیز ایسا نہ کرے اسے رد کر دیں۔ دوسری طرف یہ ہوا ہے کہ تحریری باتوں کو بنا تنقید اور بلا شک و شبہ مان لینے کی وجہ سے ایسی متعدد کتابیں تیار ہوگئی ہیں جنھیں تاریخ کہا جاتا ہے، لیکن جب گہرائی سے جانچ پڑتال کی جاتی ہے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تاریخ نہیں جھوٹے قصّے ہیں۔ لہٰذا، مندرجہ بالا سطور میں جن مختلف خامیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہر قسم کی تاریخی ادب میں عام ہیں۔ غیر فارسی تاریخی ادب میں بھی بلاشبہ بعض ایسی خصوصیات ہیں جو بڑی عام ہیں اور ان میں بھی خوبیاں اور خامیاں ہیں۔ ہندی (یہ لفظ بڑے وسیع معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے) کے بیشتر روزنامچوں کی بڑی نمایاں خصوصیات یہ ہے کہ جنم پتریوں میں اہم واقعات، جیسے کسی شخص کی پیدائش، تخت نشینی، وفات وغیرہ کی نہ صرف تاریخ دی جاتی ہے بلکہ دن، گھنٹہ اور ساعت (پَل)[3] تک دی جاتی ہے۔ لیکن جو لوگ یہ جانتے ہیں انہیں تعجب نہ ہوگا ایک بڑا پرانا رواج

Marfat.com

یہ تھا کہ جو لوگ ایسے اندراجات کے ذمہ دار تھے، وہ ایک مذہبی پرہیز فریضے کی طرح یہ ساری چھوٹی چھوٹی تفصیلات درج کرتے تھے۔

اس ادب کے خاصے بڑے حصے کی ایک اور قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عوام کے کارناموں اور زندگی پر براہِ راست یا بالواسطہ طور سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن راجپوت سرداروں کی بیشتر تاریخوں اور کتبات میں دیوتا صفت انسانوں کے شاندار کارنامے بیان کرتے وقت جب مضحکہ خیز اور ناممکن قسم کے دعوے کیے جاتے ہیں تو فارسی ہم چشم بالکل ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود، سنسکرت، اپابھرمشا اور ہندی میں ایسی بہت سی کتابیں ہیں جو کہیں زیادہ قابلِ اعتبار اور مواد کے لحاظ سے کہیں زیادہ مالا مال ہیں۔

اب یہ بات بالکل طے ہو چکی ہے کہ پُرانوں میں جن حکومتوں کی فہرستیں شامل کی گئی ہیں جیسے متسیا، وایو، وشنو اور بھگوت وہ نندا، موریہ، شنگا، کنوا اور آندھرا حکومتوں تک بالکل صحیح ہیں۔ اس کے بعد گو ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے عظیم ادبی ذخیرے کا ایک معمولی حصہ بچ چکا ہے پھر بھی تاریخی کتابوں کی خاصی بڑی تعداد پر روشنی پڑ چکی ہے۔ مندرجہ بالا سطور میں ہم بتا چکے ہیں کہ تاریخی اور نیم تاریخی کتابوں کی ایک بڑی تعداد پر جو روشنی پڑی ہے وہ خصوصاً ممتاز جرمن اہلِ علم جی، بہلر اور دوسرے لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے ان میں سے بیشتر یا تو چرتا ز ہیں یا پربندھا ز ہیں یعنی جین اہلِ علم کی سوانحیں یا تاریخی قصوں کے مجموعے۔ ہم ذیل میں دورِ وسطیٰ کی چند اہم کتابوں کے نام دے رہے ہیں۔

اپنی کتاب "حیات ہیم چندر اچاریہ" (اصل کتاب جو جرمن زبان میں ہے اس کا ترجمہ منی لال پٹیل نے انگریزی میں کیا ہے)، (سنگھی جین سیریز، نمبر 11، 1936) میں بہلر ذیل کے پربندھا ز کا ذکر کرتا ہے:

پربھاوکا چرترا، جو 22 جین اچاریوں، پربھا چندرا اور پرادیومنا سوری کی

Marfat.com

سوانحوں کا مجموعہ ہے (سر کا 1250)۔

مروتنگا کی پربندھا چنتامنی، جسے پہلے پہل اے۔ کے۔ فوربیز نے اپنی کتاب دس مالا (تاریخ گجرات) میں استعمال کیا ہے اور جس کا انگریزی ترجمہ سی۔ ایچ۔ ٹونی نے کیا ہے۔ ایچ۔ وی۔ ویدی نے ہندی میں ترجمہ کیا ہے۔ (سنگھی جین سیریز 1929)۔ یہ تاریخی قصوں کا ایک بہت بڑا مجموعہ ہے، جو بہلر کے کہنے پر، کے مطابق، خاصی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کا مصنف جو کاٹھیاواری وردھامانوا کا مروتنگ تھا، اس نے 1305ء — 6 میں اسے مکمل کر لیا تھا۔ پربندھا جین رشیوں اور منیوں کی زندگی کی کہانیاں ہیں۔ پربندھا کا لہجہ گو حکایتی ہے پھر بھی ان میں بہت کچھ ایسا مواد موجود ہے جس کی تصدیق کتبات اور دوسرے قابلِ اعتبار ماخذوں سے ہوتی ہے۔ (بہلر، حیات، ہیم چندر اچاریہ، صفحہ 4)۔

راج شیکھر کی پربندہ کوش، جو مشہور رشیوں، شاعروں اور سیاسی مدبروں کی سوانحوں کا مجموعہ ہے اور جو وکرم سمیت 1405 مطابق 1348ء – 49 اے ڈی میں دلی (دہلی) میں مکمل ہوئی۔

جن من دان اپادھیا کی کمار پال چرتا جو 1435ء – 36 اے ڈی میں مکمل ہوئی۔

راجہ کمار پال چولکیہ کی تین بڑی سوانحیں ہیں، جن کے تینوں مصنفوں یعنی جے سنگھ سوری، چرتر سندر گنی اور جن من دان اُپادھیا نے ایک ہی نام کمار پال چرت دیا ہے۔ لیکن مشہور جین اچاریہ ہیم چندر جین نے راجا کمار پال چولکیہ (پیدائش 1092ء، تخت نشینی 1142ء، وفات 1173ء) کی بیس سے زیادہ سوانحوں کا خلاصہ کر دیا ہے۔ یہ مجموعہ سنگھی جین سیریز (نمبر 41، 1956ء) میں کمار پال چرتر سنگرہ کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔

Marfat.com

ہیم چندر اچاریہ نے دوالیشرے مہاکاویہ کے نام ہی سے دو اور تاریخی کاویہ لکھی ہیں، جن میں ایک سنسکرت میں اور دوسری پراکرت میں ہے۔ پہلی میں چولکیہ حکومت کی تاریخ کا خلاصہ دیا گیا ہے، اور دوسرے میں کمار پالا کہ زندگی کے حالات دیئے گئے ہیں۔

شہنشاہ ہرش وردھن کے درباری شاعر بان بھٹ کی ہرش چرت۔ (سنسکرت) یشوورمن کے درباری شاعر، وکپتی راج (آٹھویں صدی) کی گودواہو (پراکرت)۔ یشوورمن کی فتح بنگال کا حال دیا ہوا ہے۔

پدم گپت عرف پارمیل (دسویں صدی کے آخر میں) کی نواشاسنک چرت (سنسکرت)۔ مالوہ کے فرمانروا، وکپتی منجا (975 تا 995) کی زندگی۔

بلاّل کی بھوج پربندہ۔ گیارھویں صدی کے شروع میں — راجہ بھوج کے انتظام سلطنت کا حال دیا گیا ہے۔

بلھانا (بارہویں صدی کے شروع میں) کی وکرانامک دیو چرت (سنسکرت) کلیانی کے چولکیلہ، راجہ وکرامانک کی زندگی اور دور، (1076ء تا 1126ء)۔

سندھیاکرنندی (گیارہویں صدی کے آخر میں) کی رام چرت (سنسکرت) بنگال کی پال حکومت کے رام پال کی تاریخ۔

کلہن (1148ء تا 1150ء) کی راج ترنگی (سنسکرت) کشمیر کی تاریخ۔ اس کے مصنّف کا کہنا ہے کہ یہ تاریخ لکھتے وقت اس نے کشمیر کی تقریباً چودھا تاریخوں سے استفادہ کیا تھا۔ جناراج ترنگنی (سنسکرت) — کشمیر کے زین العابدین (1411ء تا 1463ء) کا ہم عصر تھا — کلہن کی تاریخ کے تسلسل میں ہے۔

شری ور پنڈت کی راج ترنگی (سنسکرت)۔ جناراج 1434ء میں فوت ہوگیا تو

Marfat.com

اس کے شاگرد شری ور نے اس کی نامکمل کتاب لکھنا شروع کی۔ شری ور کو زین العابدین، اس کے بیٹے اور پوتے، حیدر شاہ اور حسین شاہ کی سرپرستی حاصل رہی۔ شری ور کی تاریخ فتح شاہ کی تخت نشینی تک کے دور (1434ء تا 1479ء) کا احاطہ کرتی ہے۔

چوتھی راج ترنگنی دو مصنفوں یعنی پراجیہ بھٹ اور شکا کا کام ہے۔ شکا ہمیں بتاتا ہے کہ پراجیہ بھٹ نے ایک کتاب راجیہ ولپتکا نامی لکھی جس میں کالی یگ یعنی 4589 مطابق 1486ء اے، ڈی تک کے واقعات درج کیے۔ جب فتح شاہ حکومت کر رہا تھا۔ اس کے بعد شکا نے، جو اکبر کا ہم عصر تھا، 1588ء تک کشمیر کی کہانی لکھی، اور ابوالفضل کے کہنے کے مطابق 1588ء میں جب شہنشاہ پہلی دفعہ وادی میں پہنچا تو راج ترنگنی اسے پیش کی گئی۔

راجہ پرتھوی راج چوہان کے ایک کشمیری نژاد درباری شاعر جیانک (جیرتھ) نے پرتھوی راج وجے (سنسکرت) لکھی۔ یہ کتاب 1178ء تا 1200ء دوران کبھی لکھی گئی تھی۔ یہ اُس کے سرپرست کی ایک لائقِ اعتبار تاریخ ہے۔

جے سنگھ سوری (بارہویں صدی) کی ہمیر مد مرداں (سنسکرت)۔ بھیم دوئم چالوکیہ اور محمد غوری کے درمیان ہونے والی جنگ کا حال دیا ہے۔

نیا چندر سوری کی ہمیر مہا کاوے (سنسکرت) رنتھمبور کے ہمیر دیو کی تاریخ جسے 1298ء میں علاالدین خلجی نے شکست دی تھی۔

جنا ہرش گنی (تیرہویں صدی) کی وستو پال چرت (سنسکرت)۔ دھولکا (ضلع احمد آباد کا ڈھولکا) کے راجہ وردھاول کے وزیر اور ایک دولت مند تاجر شہزادے مہاتیہ وستو پال کی سوانح حیات۔ وردھاول تیرہویں صدی میں انہلواڑہ، پٹن کے راجہ بھیم دوئم کا ایک باج گذار تھا۔ (دیکھیے بی، جی، سینڈرس کی مہاتیا وستو پال اور اس کا ادبی حلقہ) (تذکرہ بہادر سنگھ سیریز نمبر 3)۔

Marfat.com

گنگا دھر پنڈت کی منڈلک مہا کاوے (سنسکرت)۔

ان میں بیشتر سنسکرت میں اور بعض پراکرت میں لکھی گئی ہیں۔

مندرجہ بالا فہرست میں ابتدائی دورِ وسطیٰ کی محض تھوڑی سی تاریخی اور نیم تاریخی کتابیں دی گئی ہیں۔ تقریباً یہ ساری ہی کتابیں شمالی ہندوستان کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں۔

بعد کے دور کے واسطے ہمارے پاس بڑے انواع و اقسام کا تاریخی ادب موجود ہے جس کو ذیل کی قسموں میں بانٹا گیا ہے۔

ابھیے لیک، القاب نامہ، اتپتی گرنتھ، ایتہاسک بٹن، کرسی نامہ، حیات، گجلّ، چرت، جاس، جنم پتری، جیونی، تحقیقات، دفتر بہی، پتّر، پروانہ، رقعہ، پٹاولی، باٹ یا ورت، پرشاستی، یادداشت، رسو، رسیا یا رسا، وگت ـــ وشاولی یا بنساولی۔

ان کے علاوہ بہت سی ایسی اصطلات مغل انتظامیہ کی اصطلاحات سے لی گئی تھیں جن سے سرکاری اندراجات کی مختلف قسموں کے نام ظاہر ہوتے تھے، جیسے عوارج، پروانہ، رقعہ، سند، سیاہ بقایا وغیرہ۔ یہ سب بیکانیر میں راجستھان کے پُرانے محافظ خانے میں محفوظ ہیں۔[6]

آخر میں مغل دور کی تاریخ سے تعلق رکھنے والی سنسکرت اور ہندی کی ان چند ایک کتابوں کا ذکر اس نظر سے کیا جاسکتا ہے تاکہ تاریخ کے طالب علموں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول ہو کہ یہ دستاویزات ان پہلوؤں کے بارے میں بے شمار معلومات اور اعداد و شمار فراہم کرتے ہیں جن پہلوؤں کو فارسی روزنامچہ نگار عام طور سے نظرانداز کر دیتے ہیں۔

ایک نہایت دلچسپ اور بصیرت بخش کتاب ایک جین رشی کی سوانح حیات ہے جس

Marfat.com

کا نام بھانو چندر گنی تھا اور جو شہنشاہ اکبر کا ہم عصر تھا۔ اسے ایک اور جین رشی سدی چندر اوپادھیا نے لکھا ہے (سنگھی جین سیریز نے شائع کیا ہے)۔ جیسا کہ ہمیں خود مُصنّف کے اعتراف سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نہایت صحیح اور سچّا بیان ہے۔ رشی کی زندگی کا حال بیان کرنے کے علاوہ مُصنّف نے عظیم شہنشاہ، اس کے متعدد سماجی بہبودی کے کاموں نیز شہنشاہ کے دِل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں اور اس کے عظیم وزیر ابوالفضل کا نہایت درفشاں بیان دیا ہے۔ مصنّف شہنشاہ کی ہمہ گیر خوبیوں کو تعریف و توصیف کے اِن الفاظ کا نذرانہ عقیدت پیش کرتا ہے۔ "کوئی ایک فن، کوئی ایک شاخ علم، کوئی ایک طاقت اور بہادری کا کام ایسا نہ ہوگا جسے نوجوان شہنشاہ نے انجام دینے کی کوشش نہ کی ہو۔"[6] مُصنّف ابوالفضل کی وسعت علم اور اس کی بے پناہ ذہانت کا زبردست مداح ہے۔ ابوالفضل کی صحبت میں اسے بہت برس گذارنے کا موقع ملا تھا۔ وہ کہتا ہے! "(ابوالفضل) ہر ادب کے بحر ذخار میں غوطہ زن ہو چکا تھا اور اہلِ علم حضرات میں سب سے افضل تھا۔ ادب میں کوئی ایسی بات باقی نہیں بچی ہے جو اس نے دیکھی یا سنی نہ ہو۔"[7]

ایک اور غیر معمولی کتاب جو لائق توجّہ ہے۔ ایک خاصے غیر معمولی شخص بنارسی داس (1586ء تا 1643ء اے، ڈی) کی لکھی ہوئی خود نوشت سوانح عمری ہے جو اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کا ہم عصر تھا۔ بنارسی داس یو، پی کے ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے تقدیر کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے تھے اور ایک دفعہ وہ سخت مفلسی کی حالت پر پہنچ گیا تھا۔ وہ شاعر بھی کچھ کم رُتبے کا نہ تھا۔ اس مُصنّف کے کردار کا ایک غیر معمولی وصف یہ ہے کہ اپنی خود نوشت سوانح عمری (جسے اردہ کتھانک کہا جاتا ہے یعنی آدھی زندگی کی کہانی۔ کیونکہ 1641ء میں جب یہ کتاب لکھی گئی تو وہ برس کا تھا اور اسے توقع تھی کہ وہ پورے ایک سو دس سال زندہ رہے گا، لیکن

Marfat.com

قسمت کو یہ منظور نہ تھا چنانچہ 1643ء میں دو ہی سال بعد وہ مرگیا) میں خود بنارسی داس علاحدہ ہو جاتا ہے اور ایک مشاہد کی سی مکمّل بے تعلّقی سے اپنی زندگی کے واقعات اور افعال پر نظر ڈالتا ہے اور اتنی نمایاں دیانت داری نیز صاف گوئی سے انہیں منعکس کرتا ہے کہ بس تعجب ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنی اِن ساری مشتبہ اور رکیک حرکتوں کا کُھلے طور سے اعترافِ کرتا ہے جو اس سے کبھی سرزد ہوئیں، اور اس کا بھی کہ اس نے آگرے میں مفلسی اور گمنامی کی زندگی گذاری۔ اس کی تزک کا ہر ورق ایک نایاب عطیے کا شاہد ہے یعنی خود کو دوسروں کی نظر سے دیکھنا، اور وہ خاصی حد تک انسانیت کے اس بنیادی عنصر کا حامل ہے یعنی اس میں خود اپنے اُوپر ہنسنے کی صلاحیت ہے۔ وہ ضمناً کاروبار و تجارت اور ذرائع آمد و رفت نیز سڑکوں کے محفوظ ہونے کے بارے میں بڑی دلچسپ معلوماتِ فراہم کرتا ہے۔ وہ اس بات کا بھی شاہد ہے کہ خود دارالسلطنت آگرہ میں ضروریات زندگی بے حد ارزاں تھیں۔

اگر صحیح طور سے مستقل مزاجی کے ساتھ تحقیق کی جائے تو اسی طرح کی اور زیادہ کتابوں پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ یہاں زور دے کر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہندو اہلِ علم اور شاعروں کی تحریریں، جو زیادہ تر شاعرانہ تحریریں ہی ہیں، بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہیں۔ یہ ہندو اہلِ علم اور شاعر وہ لوگ تھے جنہیں نہ صرف راجاؤں، شہنشاہیوں اور صوبائی فرمانرواؤں کی سرپرستی ملی بلکہ امراء اور دوسرے صاحبِ اقتدار لوگوں کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔

یہاں مثال کے طور پر چند ایک مثالیں دُنیا ہی کافی ہوگا۔ غالباً گووند بھٹ ہندو شاعروں میں وہ سب سے ممتاز شخص ہے جسے اکبر اعظم کی سرپرستی ملی۔ اور جس کو شہنشاہ نے اکبریہ کالی داس کے خطاب سے نوازہ۔ اِس شاعر کی تحریروں (جو زیادہ تر پرشاستیاں یا قصیدے ہیں) سے ہمیں مغلوں کی اُس حوصلہ افزائی اور اہل دلی کا ثبوت ملتا ہے جو

Marfat.com

انہوں نے سنسکرت زبان کے ذریعے ہندو تہذیب کی احیا کے لیے دکھائی۔[8] سترہویں صدی کے ہندو درباری شاعروں میں جگن ناتھ پنڈت راج کا نام بڑا مشہور اور معروف ہے۔ اسے آصف خاں اور خود شہنشاہ شاہجہاں کی بڑی عنایات حاصل رہیں، اور اس نے اپنے سرپرست کی تعریف میں آصف ولاس لکھی۔ ان شاعروں کی تحریروں سے ہمیں ہندو اور مسلمان دونوں کے نام نہاد اونچی سماجی طبقوں کے رجحانات کے بارے میں بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک طرف تو بڑے بڑے مسلم لوگوں کی کیفیتِ انتشار اور بدلتی ہوئی نفسیاتی حالت اور دوسری طرف دورِ آخر کے مغل دربار کے پر تغیّر ماحول کی نکاسی کرتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ مختلف مذہبی برادریوں کی قربت اور ایک ملے جلے نیز صحت مند سماجی تانے بانے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو فرقہ پرستی اور اختلافات سے پاک تھا اور جو اس زمانے کے ہندی ادب میں نظر آتا ہے، جس ادب میں دورِ آخر کے شہنشاہوں کی وہ کوششیں بھی شامل ہیں جو انہوں نے ہندی شاعری میں کیں۔ رام پور کے ریاستی کتب خانہ کی شائع کردہ نادرات شاہی (۱۹۴۴ء) شہنشاہ شاہ عالم دوئم کی ہندی (ہندوستانی) نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ نظمیں دربار اور شہری لوگوں کی سماجی و مذہبی زندگی کی ایک زندہ تصویر پیش کرتی ہیں۔ ہمیں بہت سی ایسی جھلکیاں نظر آتی ہیں کہ شہنشاہ اپنے ہندو اور مسلمان درباریوں کے ساتھ کس طرح ہولی اور دیوالی جیسے ہندو تہواروں کا لطف اُٹھاتا تھا۔ ہمیں انواع و اقسام کے بہت سے آلاتِ موسیقی، آتشبازیوں، پھلوں اور پھولوں، نوروز، شادی اور پیدائش کی تقریبوں اور دوسرے جشنوں کے بارے میں معلومات ملتی ہے، جن میں دونوں مذہبی برادریاں یکساں جوش و خروش سے شامل ہوتی تھیں۔ شہنشاہ ہولی کا اتنا شائق تھا کہ اس نے ہولی یا ہوری پر بیسیوں حسین شعر لکھے تھے۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ عظیم مغلوں کے تخت پر متمکن ہونے والے بادشاہوں میں شاہ عالم دوئم سب سے زیادہ غم زدہ شخص تھا۔ اس نے مہدجی سندھیا کو خطاب کر کے جو شعر لکھا

Marfat.com

اس میں اپنی بیکسی اور قابلِ رحم حالت کا بڑی شدّت سے اظہار کیا تھا اور مہدجی سندھیا کے کہنے پر انگریزوں کی پناہ سے نکل کر آلہ آباد سے دہلی چلا آیا تھا۔

راجستھان کے بعض مندروں اور نجی ذخیروں کے ایک حالیہ معائنے سے ایسے موزوں اور مختلف قسم کی دستاویزوں کا پتہ چلتا ہے جن کا تعلّق اقتصادی، سیاسی اور سماجی حالات، فن اور علمِ تعمیر، اوزان اور پیمائشوں اور دوسرے بہت سے دلچسپ مضامین سے ہے۔ تقریباً دو سو سے زائد مسودوں اور طبع شدہ نادر کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے اور محقوق کی رہنمائی اور مدد کے واسطے اِن منتخب کتابوں کی مدد سے نمونے کا ایک تفصیلی کیٹیلاگ تیار کیا گیا ہے۔ لیکن اس قسم کا مواد اکیلے راجستھان ہی میں اتنا زیادہ ہے کہ سرکار اور علمی اداروں کو انہیں تلاش کرنے، محفوظ رکھنے اور کیٹیلاگ کرنے پر فوری توجہ دینی چاہیئے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ موسم کی سختیوں اور لاپرواہی کی وجہ سے یہ برباد ہو جائے۔

Marfat.com

حوالہ جات

1۔ دیکھیے : Annals and Antiquities of Rajasthan پر ٹوڈ کی تمہید۔

2- History of Hindu Madienal India.

Dynastic History of Northern India تین جلدیں، اور دو جلدیں یہ دونوں کتابیں موجودہ صدی کی تیسری دہائی میں شائع ہوئیں۔ 1960ء میں بی، پی، مزمدار کی ایک تحقیقی کتاب اور شائع ہوئی جس کا نام ہے — Socio Economic History of Northern India (1030ء تا 1194ء). تاریخ گہدوال، چندیل چند ایک مونوگراف ہیں جو ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوئی ہیں۔

3- ایک پل 24 سیکنڈ کے برابر ہوتا ہے۔

4- تفصیلات کے لیے دیکھیے مصنّف کی کتاب: Discriptive Catalogue of Non-Persian Sources of Medieval India History.

5- "نہ میں نے غرور کی وجہ سے مبالغہ کیا ہے نہ میں نے عاجزی کے باعث کم کرکے دکھایا ہے۔ یہاں وہ بیان کر دیا ہے جو واقعی گذرا ہے۔

6- صفحہ، VII

7- صفحہ، VII

8- Cf. Introducing India (R.A. Sec. of Bengal; Part II) P. 84.

Marfat.com

دَورِ وَسطیٰ کے دوران تاریخِ پنجاب کے بعض غیر مُسلم مآخذ

گینڈا سنگھ

ہندوستانی تاریخ کے دَورِ وَسطیٰ کے دَوران پنجاب کے مسلمانوں کے زیرِ نگین رہا جو شمال مغرب سے آئے تھے۔ وہ یا تو ترکی بولتے تھے یا پشتو یا فارسی۔ لیکن اس وقت پشتو پورے طور سے ادب کی زبان نہ بن پائی تھی۔ اور چونکہ افغانستان پر لمبے عرصے تک ایرانیوں کا سیاسی تسلط رہا تھا۔ اس لیے افغان عالموں نے ان کی زبان اپنالی تھی اور اسی زبان میں اپنی اپنی تاریخی کتابیں لکھی تھیں۔ ترکوں اور افغانوں کے علاوہ ایرانی بھی بڑی تعداد میں پہلے پنجاب آئے اور بعد میں دہلی سلطنت جانے لگے۔ یہ لوگ یا تو حملہ آوروں کے ساتھ آئے یا پھر تلاش معاشی میں آئے۔ ان میں سے بعض لوگ اچھے عالم تھے۔ جس طرح سلطنت کے سرکاری کاغذات کی زبان فارسی تھی۔ اسی طرح ان کی کتابوں کی زبان بھی فارسی تھی جو تاریخ، سوانحِ حیات، سیاحت اور مذہب وغیرہ پر تھیں۔ لہٰذا ملک میں فارسی کی حیثیت حکومت کی سرکاری زبان کی طرح مستحکم ہو گئی۔

گو یہ صحیح ہے کہ فارسی مآخذ ہیں اور مضامین سے مالا مال ہیں' لیکن ادب کی ایک قسم اور بھی ہے' جس کی جانب بدقسمتی سے مورخین کی توجہ نہیں جا سکی ہے یہ ادب ملک کی دیسی زبانوں میں ہے اور عوام الناس نیز حکمران طبقے دونوں کی سماجی' مذہبی' اقتصادی اور سیاسی زندگی پر روشنی ڈالتا ہے۔ دَورِ وَسطیٰ کے دوران جن مذہبی تحریکوں نے جنم لیا یہ ادب ان

Marfat.com

تحریکوں کے بانیوں کی کہاوتوں میں محفوظ ہے۔ پنجاب میں سب سے اہم تحریک سکھوں کی تھی، جس نے نہ صرف عوام کی زندگی کے مختلف گوشوں پر اثر ڈالا، بلکہ انھیں ایک مخصوص قسم کی برادری میں بدل دیا اور ایک سیاسی قوت بنا دیا، جس قوت نے اٹھارویں صدی میں مغل حکومت کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا اور افغانوں کو اپنے ملک سے مار بھگایا۔

لودی سلطانوں کے دَورِ حکومت میں گورونانک (1469ء تا 1539ء) نے سکھ تحریک کی بُنیاد ڈالی۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے دَورِ حکومت کی آخری دھائی میں 1699ء میں جب گورو گوبند سنگھ نے خالصہ کی تخلیق کی تو یہ تحریک اپنے بامِ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ پہلے پانچ گوروؤں اور نویں گورو کی کہاوتیں گورو گرنتھ صاحب میں شامل ہیں اور دسویں گورو کی دسم گرنتھ میں ہیں۔ گوروؤں کی مذہبی تعلیمات کا مطالعہ سکھوں کی بعد کی تاریخ اور اُن گوروؤں کی زندگی میں رونما ہونے والے مختلف واقعات کے ادراک اور اظہار کے لیے تو ضروری ہے ہی، لیکن دو گرنتھوں میں بڑی تعداد میں ایسے اشلوک موجود ہیں جو اس زمانے کے سماجی، مذہبی اور سیاسی حالات کی صحیح قلمی تصویریں ہونے کی بنا پر بڑی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔

گورونانک کو لودی سلطانوں اور دو مغل بادشاہوں کے زمانے میں عوام کی حالت کا اور ان کی جانب طبقہ امرا کے رویّہ کا براہِ راست علم تھا۔ بابر کی تیسری مہم (21-1520ء) کے دوران سیّدپور (امین آباد) میں لوگوں کے قتلِ عام کے وہ عینی شاہد تھے، اور اس بارے میں ان سارے بیانوں سے زیادہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے جو ہمیں معلوم ہیں۔ نسلوں پُرانی رواج پرستی کے خلاف ان کی بغاوت نیز محض طبقہ امرا کو خوش کرنے کے لیے اپنی زبان اور لباس وغیرہ کو تج دینے والی غلامانہ ذہنیت کے خلاف ان کا احتجاج، یہ دونوں چیزیں اسادی وار میں نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ گرنتھ میں بڑی تعداد میں ایسے شبد ہیں جن میں ان کی اور ان کے جانشینوں کی اصلاحوں، سکھ برادری اور فکرِ سکھ کا ارتقا اور اُن کی

Marfat.com

بتدریج نشوونما اور اُن دِنوں کے متعدّد واقعات کے حوالے مِلتے ہیں۔

ورن کے مصنّف بھائی گورو داس (1551ء تا 1629ء) گورو انگد سے لے کر گورو ہرگوبند تک پانچ گوروؤں کے ہمعصر تھے، اور ان میں سے آخری چار سے ان کے نہایت نزدیکی تعلقات تھے۔ انھوں نے کوئی پچاسی پوڑیاں گورو نانک کی آمد سے قبل عوام کی مذہبی، اور سیاسی حالات پر، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مقامات مقدّسہ کے واسطے گورو کے سفر پر، پنڈتوں، سدھوں اور مُلّاؤں سے ان کے مباحثوں پر اور دوسرے گوروؤں کی زندگی پر صرف کی ہیں۔ اس نے علاوہ انھوں نے گوروؤں کے زمانے کے ممتاز سکھوں کے نام دیے ہیں اور چھٹے گورو ہرگوبند کے زمانے تک پنجاب اور پنجاب سے باہر ہونے والے سکھ اجتماعوں کے قائدین کے نام دیے ہیں۔

پانچویں گورو ارجن کے بڑے بھائی پرتھی چند اور ان کے بیٹے مہربان کے زمانے میں جب نزاعی رُجحانات بڑھنے لگے تو پروپیگنڈے کے لیے سوانحی اور دوسری قسموں کا ادب تیار کرنے کا خاصہ جوش پیدا ہوگیا۔ مارچ 1932ء میں لاہور کے باوا اُدھم سنگھ نے کہانیوں (ساکھیاں) کے مسوّدوں کا ایک مجموعہ اور مہربان اور ہار جی کے مضامین جنھیں ان کے مقلدوں نے سترھویں صدی میں تحریر کیا تھا، خالصہ کالج امرتسر کو پیش کیا تھا۔ بعد میں مجھے مہربان اور ان کے جانشینوں کے حالاتِ زندگی مِلے جو کسی شخص درباری نے تحریر کیے تھے۔ حال میں پٹیالہ کے پروفیسر پریتم سنگھ مہربان سے تعلق رکھنے والے ادب کے کچھ اور مسوّدات دستیاب ہوئے ہیں جو پرتھی چند کے جانشینوں کی ادبی اور دوسری سرگرمیوں پر خاصی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے مضامین جن میں سکھ گوروؤں کی طرح قلمی نام "نانک" جوڑا گیا ہے، اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ خود کو گورو ارجن اور گورو ہرگوبند کے مدمقابل بنانے کے لیے کوشاں تھے اور اپنے مضامین کو گورو نانک اور ان کے مستند جانشینوں کا درجہ دِلوانا چاہتے تھے۔ یہ ان اسباب میں سے ایک نمایاں سبب تھا جن کے باعث گورو ارجن کو گوروؤں کے اصل مضامین ایک

Marfat.com

جگہ جمع کرنے اور 1604ء میں انھیں ایک مستند کتاب کی شکل میں ترتیب دینے کی ترغیب ہوئی جسے اب گورو گرنتھ صاحب کہا جاتا ہے۔ اصل کتاب جسے ہم مقدس کتاب کا پہلا مسوّدہ کہہ سکتے ہیں کرتار پور (جالندھر) میں سودھی "گورو" کے پاس اب بھی محفوظ ہے۔

مہربان کی لکھی ہوئی گورو نانک کی جنم سکھی، جس کی ترتیب و تدوین کرپال سنگھ نے کی ہے، خالصہ کالج امرتسر نے 1965ء میں کی تھی۔ سودھی مہربان اور ان کے جانشینوں کی عزیزوں کے مسوّدے سکھ جواتی کتب خانہ، ایس۔جی۔پی۔سی۔ امرتسر کے ذخیروں میں محفوظ ہیں۔

بھائی گورداس کے بعد ضلع بھٹنڈہ کے مقام منسا کے نزدیک بھاپھرے بھائی کے مقام کے رہنے والے بھائی بالو آتے ہیں۔ وہ گورو ارجن کے ہمعصر تھے اور ان کی وفات 1660ء بی کے مطابق 1604ء اے، ڈی بمقام جھتیرا ہوئی تھی۔ ان کے شلوکوں، واکوں اور سہارفیوں میں جگہ جگہ گورو سے گفتگو کے حوالے ملتے ہیں اور صحیح معنوں میں گورو کی تعلیمات ملتی ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب سوچک پرسنگ گورو کا میں مختصراً گورو نانک کی زندگی کے وہ حالات دیے ہیں جو پہلے گورو کے ایک ساتھی بھائی بالا نے گورو انگد کو سُنائے تھے۔ اس سے بھائی بالا، جو تلونڈی، رائے بھوئی (جو اب مغربی پاکستان میں ننکانہ صاحب کے نام سے مشہور ہے) میں گورو اور سلطان پور لودھی کا ساتھی تھا، کے بارے میں شکوک و شبہات دُور کرنے میں مدد ملتی ہے۔

موضع سُور سنگھ کے ایک دھاوی یا بھاٹ، ناتھا کی کتاب وارن میں گورو ہرگوبند کی لڑائیوں کا مفصّل ذکر ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ناتھا گورو ہرگوبند کا عصر تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہی شخص وہ ناتھ مل ہے، جس نے ستمبر 1708ء میں دکن کے مقام ناندر میں گورو گوبند سنگھ کے دربار میں فارسی کا امرنامہ لکھا اور پڑھا، جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ گورو ستمبر کو سُورج گرہن کے موقع پر مادھو داس (جن کا دوسرا نام بندہ سنگھ ہے) کے مُنھ پڑ گئے، اور یہ بھی کہ شہر کے لوگوں نے شہنشاہ سے یہ شکایت کی کہ مادھو داس بدل کر بندا سنگھ ہو گئے ہیں۔

Marfat.com

کرم سنگھ نے امرتسر کے رسالہ پھلواری میں شائع ہونے والے اپنے مضامین سے کسی ایک مضمون میں اس وارن (جو چھٹے گورو کی بابت ہے) کا ذکر کیا ہے، لیکن اس وقت اس کا پتہ نشان معلوم نہیں ہے۔ لیکن طبع شدہ امرنامہ موجود ہے، جسے سکھ ہسٹری سوسائٹی امرتسر، پٹیالہ نے 1953ء میں چھاپا ہے۔

ہنومنت سوامی کی شری سمرتھنچا بکھار (مراٹھی زبان میں شری سمرتھ رام داس کی زندگی کی کہانی) میں چھٹے سکھ گورو ہرگوبند اور عظیم مراٹھا سنت کی اس ملاقات کا ذکر ہے جو تقریباً 1634ء میں گڑھوال کے مقام سری نگر میں ہوئی۔ گرمکھی کا ایک مسودہ پنجاہ ساکھیاں ہے۔ اس میں بھی اس ملاقات کا حال دیا ہوا ہے۔ اس کی اُنتالیسویں ساکھی اور بکھار کو اگر ملا کر پڑھا جائے تو اس گفتگو کا جو تاثر سمرتھ رام داس کے ذہن پر ہوا اس کی واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ سمرتھ رام داس نے جب یہ دیکھا کہ گورو ایک جنگجو سپاہی کا لباس پہنے، ایک طرف تلوار لٹکائے، اپنے پیچھے ہتھیار بند مُریدوں کا جتھا لیے شکار سے واپس لوٹ رہے ہیں، تو انھوں نے تعجب سے پُوچھا: "مَیں نے سُنا تھا کہ تم گورو نانک کی گدی سنبھالے ہوئے ہو۔ گورو نانک تو ایک تیاگی سادھو تھے، ایک سنت جنھوں نے دُنیا تیاگ دی تھی۔ تم ہتھیار لگاتے ہو اور فوج اور گھوڑے رکھتے ہو۔ تم خود کو سچّا بادشاہ (اصل بادشاہ) کہلواتے ہو تم کس طرح کے سادھو ہو؟ گورو ہرگوبند کا جواب بڑا معنی خیز تھا، اور اس سے واقعتاً سکھوں کے فلسفہ فکر و عمل میں جس رُوحانیت اور فطری اخلاقیات کا امتزاج ہے اس کی ترجمانی ہوتی تھی۔ گورو نے کہا وہ "باطنی طور پر سادھو اور ظاہری طور پر شہزادے ہیں۔ ہتھیاروں سے مُراد غریب کی حفاظت اور ظالم کی تباہی ہے۔ بابا نانک نے دُنیا نہیں تیاگی تھی یعنی خودی اور انا تیاگی تھی":

"گورو ہرگوبند کہیا: باطن فقیری، ظاہر امیری، شستار غریب کی رکھیا، جروانے کی بھجیہ، بابا نانک سنسار نہیں تیاگیا، مایا تیاگی تھی":

Marfat.com

گورو تیغ بہادر، گورو گوبند سنگھ وغیرہ کے وہ خطوط جنھیں حکم نامے کہا جاتا ہے اور جو پٹنہ کے ہر مندر صاحب مندر میں اور دوسرے مقامات پر محفوظ کر لیے گئے ہیں، اور وہ خطوط جو سُنام کے تحصیل دار گوردت سنگھ ہریکا، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ کے بھائی رندھیر سنگھ اور دوسرے حضرات نے جمع کیے ہیں، اس لائق ہیں کہ ان کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ گورو گوبند سنگھ کا شہنشاہ اورنگ زیب کے نام وہ خط جسے ظفر نامہ کہا جاتا ہے خصوصاً اس آخری معرکے کے نقطۂ نظر سے جو شاہی افواج سے ہوا، خاصی تاریخی اہمیت کا دستاویز ہے۔ ان کا بچتر ناٹک، جو خود نوشت سوانح عمری کے انداز میں لکھا گیا ہے، ان کے زمانے کے بہت سے واقعات بتاتا ہے، خصوصاً ان تصادموں کے بارے میں بتاتا ہے جو شوالک کے راجاؤں سے ہوئے یا ان مغل عہدیداروں سے ہوئے جو اُن کی تحریک کو دبانے کے لیے آئے تھے۔

بھگت سنگھ کی گربلاس چھیون پادشاہی اور گربلاس پادشاہی داس (سکھا سنگھ کی) بالترتیب چھٹے اور دسویں گورو کی مشہور سوانحیں ہیں اور چھپی ہوئی شکل میں مل سکتی ہیں۔ شاعر سوہن کی گربلاس چھیون پادشاہی مسوّدے کی شکل میں ہے اور محقّقوں کی توجہ کی طالب ہے۔ اسی طرح مہا پرکاش بھی اتنی ہی مشہور ہے اور نثر اور نظم دونوں میں موجود ہے۔ منظوم مہا پرکاش کو چھپوانے کی خاطر شعبۂ لسانیات پٹیالہ کے ایک محقّق اس کی ترتیب و تدوین کر رہے ہیں۔ گورو گوبند سنگھ (اور دوسرے گوروؤں کی) کچھ اور مشہور سوانحوں میں کویر سنگھ کلال کی گربلاس پادشاہی داس، سنگھ ساگر اور ویر سنگھ بال کی گر کرت پرکاش کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ پرچھیاں سیوا داس (پٹیالہ 1963ء)، پرچھی گورو گوبند سنگھ جی، سکھیاں گورو۔ گورو صاحبان، پنجاہ ساکھیاں، سوکھی، سکھی پوتھی، سری گورو تیغ بہادر تے۔ سری گورو گوبند دے۔ مالوہ دیس رتن دی (جے سکھی مک، 1873ء) اور ٹریولس آف گورو تیغ بہادر اینڈ گوبند سنگھ، 1876ء کے ناموں سے سردار

Marfat.com

عطار سنگھ نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے)۔ وہ کتابیں ہیں جن میں گوروؤں کی زندگی کی کہانیاں دی ہوئی ہیں اور جو تنقیدی اور بغور مطالعے کی طالب ہیں۔

درشن کی کتاب وار امرتسر کی میں اس ضمن میں بڑا واضح بیان دیا ہوا ہے کہ دکن کے مقام ناندیڑ میں گورو گوبند سنگھ کی وفات کے چھ مہینے کے اندر اور باندا سنگھ بہادر کی تسخیرِ پنجاب سے ایک سال پہلے مارچ 1709ء امرتسر میں سکھوں اور صوبہ لاہور کی مغل سرکار کے درمیان کھوں تصادم شروع ہو گیا۔ مصنف لکھتا ہے کہ شہنشاہ بہادر شاہ کے دورِ حکومت میں سمبت 1766ء بی کے، مطابق 1709ء اے ڈی مارچ 29، بیساکھی کے دن کچھ سکھوں اور امرتسر کے ایک کھتری سوداگر چھوہر مل کے بیٹے (راموں مل) اور اس کے نوکروں کے درمیان شہتوت کی ایک چھوٹی سی ٹوکری پر جھگڑا ہو گیا۔ مزاج میں گھمنڈ ہونے کے باعث چھوہر مل نے شہر کے سکھوں سے برا سلوک کیا اور ان کے خلاف اپنے عزیزوں کا ایک وفد لے کر لاہور کے صوبیدار نواب اسلم خاں سے ملا۔ شاہد بلاس کے مصنف سیوا سنگھ کے مطابق چھوہر مل ایک نمایاں منا تھا اور راجی پسر سودھی مہربان پسر پرتھی چند کے خلاف سودھی نرنجن داس کا کارکن تھا، اور سکھوں کی دشمنی کے واسطے بہت مشہور تھا۔ سرکاری پروانوں سے لیس ہو کر چھوہر مل مقامی سکھوں کی جانب ایک جارحانہ رویے کے ساتھ امرتسر واپس پہنچا۔ اس کی یہ بڑھتی ہوئی جارحیت سکھوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ ایک چھوٹی سی لڑائی میں چھوہر مل کے آدمی ہار گئے، اور اس کا مکان اور جائداد لٹ گئے۔ تب چھوہر مل نے پٹی ہیبت پور کے امین، ہر سہائے سے مدد مانگی، جو اس خیال سے سکھوں پر دوڑ پڑا کہ انھیں ان کے مقدس شہر سے نکال باہر کرے۔ یہ سن کر نواحات کے سکھ بھی اپنے برادران مذہب کی حفاظت کے لیے دوڑ پڑے۔ اس لڑائی میں ہر سہائے اور اس کے بعض ممتاز اشخاص جن میں کچھ سید اور برہمن بھی شامل تھے، مارے گئے (بیساکھ 9، مطابق 6 اپریل 1766ء) اور سکھوں کو فتح حاصل ہوئی۔ یہ دیکھ کر لاہور کے صوبے دار اسلم خاں نے سکھوں کے خلاف قدم اٹھایا اور اس علاقے

Marfat.com

کے ایک اہم لمبردار دلیوا جاٹ (نوشیرا پنّوں کا چودھری) کو لاہور سے آدمی اور اصلاحِ جنگ دے کر سکھوں کے خلاف فوج کشی کرنے پر مامور کیا۔ دلیوا مکمل سرکاری حمایت کے باوجود لڑائی ہار گیا، اور میدانِ جنگ سکھوں کے ہاتھ چھوڑ کر اپنی جان بچا کر بھاگ گیا۔ یہ پہلی فتح تھی جو سکھوں نے کسی سوچے سمجھے منصوبے اور منظم قیادت کے بغیر ایک قوم کی حیثیت سے لاہور کی مغل حکومت کی سرکاری سختیوں کے خلاف حاصل کی۔ اس شکست سے صوبیدار اسلم خاں بڑا ناامید ہوا اور اس واقعہ کی اطلاع شہنشاہ بہادر شاہ کو دکن بھجوائی۔ شہنشاہ ان دنوں اس بنا پر سکھوں کا احسان مند تھا کہ گورو گوبند سنگھ نے جنگ وراثت کے معرکہ جاجاؤ (8 جون 1707ء) میں اس کے چھوٹے بھائی شہزادہ اعظم کے خلاف اس کو مدد دی تھی۔ وار امرتسر کا مصنّف ہمیں بتاتا ہے کہ شہنشاہ نے اسے نانک کے مقلّدین کے خلاف تلوار اٹھانے کی حماقت پر فہمائش کی جو خدا رسیدہ لوگوں کی ایک جماعت تھی۔

اس جھگڑے کی کہانی اور بعد کے تصادموں کی تصدیق بھٹ سیوا سنگھ کی کتاب بھائی منی سنگھ کی شاہد بلاس (ترتیب و تدوین گرجا سنگھ، پنجابی اکاڈمی، لدھیانہ، 1961ء) سے خوب اچھی طرح ہوتی ہے۔ یہ کتاب اس کے بھٹ آباؤ اجداد کے پیشہ ورانہ اندراجات پر مبنی ہے۔ اسے پہلی سکھ برطانوی جنگ کے دوران بڈول کے ہیرو راجہ (سردار) اجیت سنگھ کی سرپرستی میں بمقام لڈوا لکھا گیا تھا، اور مصنّف کے آبائی وطن بھیدسن میں مکمل کیا گیا تھا۔

لاہور کی حکومت کے خلاف اور پنجاب میں بندا سنگھ کی آمد سے پیشتر سرہند کے وزیر خاں کی فوجوں کے خلاف امرتسر اور اس کے نواحات کے سکھوں کی فتوحات کا حوالہ شہنشاہ بہادر شاہ کے شاہی دربار کے اخبار یعنی اخبارِ دربارِ معلّا بتاریخ 29 ربیع الاوّل 1122ھ میں ملتا ہے۔ یہ اخبارات دربار شاہی کی کارروائیوں کی تاریخی معلومات حاصل کرنے کا ایک بے بہا ذریعہ ہیں، اور بیکانیر میں راجستھان کے ریاستی محافظ خانے میں محفوظ ہیں۔

Marfat.com

حال میں گوسائیں گربانی - گوسائیں مت کا گورو گرنتھ (National Publishing House, Delhi - 1964) شایع ہوئی ہے۔ جو ضلع گجرانوالہ (پنجاب جو اب مغربی پاکستان میں ہے) میں بدّوکی گوسائیں کے سین داس کی فکر اور ان کی تعلیمات پر روشنی ڈالتی ہے۔ وہ گورو نانک کے ہمعصر تھے۔ ان کے بعد ان کے متعدد جانشین ہوئے جنھوں نے سین داس کے مشن کو کم و بیش ہندو فرقے کے انداز پر جاری رکھا۔ حالانکہ کتاب کا بڑا حصّہ (صفحات 56، 86، 631، 704 تا 724، 751 تا 85) کنس رائے کی کتاب وار سری بھگوت داس اوتار اور ہرش چند کتھا، سین داس اور ان کے مقلدین کی زندگی اور تعلیمات، پر مشتمل ہے، پھر بھی اس نے دورِ وسطیٰ کے پنجاب کی مذہبی اور سماجی تاریخ پر ایک مفید مطلب بار کا اضافہ کیا ہے۔

لیکن ان میں سے کوئی بھی سوانح کسی ہمعصر مصنّف کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ صرف سیناپتی کی سری گر سوبھا ہی وہ اکیلی کتاب ہے جو ہم عصر ہونے کا دعوا کر سکتی ہے۔ حالانکہ لگتا ہے کہ یہ گورو گوبند سنگھ کی وفات کے تینتیس برس بعد 1798ء بی کے مطابق 1741ء اے ڈی میں مکمل ہوئی، پھر بھی اس میں درج کیے جانے والے بعض واقعات کے بارے میں سیناپتی اس یقین کے ساتھ لکھتا ہے جیسے وہ چشم دید ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ اس کتاب میں بعض بڑی فاش غلطیاں ہیں، جیسے گورو کی ان سرگرمیوں کے بارے میں جو راجپوتانہ میں رہیں، اور خصوصاً ان کی شادی کے بارے میں جو بظاہر یہ واقعہ تھا کہ ان کی بیوی برہان پور آگرہ میں اور زور آور سنگھ کا حوالہ دیا گیا ہے وہ اصل زور آور سنگھ یعنی گورو گوبند سنگھ کا بیٹا نہ تھا۔ وہ چمکور کی لڑائی (دسمبر 1704ء) میں مارا جا چکا تھا۔ وہ خود گورو کی نظروں کے سامنے لڑتا رہا، جس نے خود اپنی آنکھوں سے اسے میدانِ جنگ میں گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ جو زور آور سنگھ راجپوتانہ میں گورو کی چھاؤنی میں پہنچا وہ وہ لڑکا تھا جو گورو کے اصل بیٹوں کے چمکور میں مارے جانے اور سرہند میں پھانسی دیے جانے کے بعد ان کی بیوی

Marfat.com

ماتا سُندری نے گود لے لیا تھا۔ یہ غلطیاں اور ترتیب واقعات سے بعض جگہ جو انحرافات پائے جاتے وہ ان واقعات کا صحیح علم نہ ہونے کے باعث ہیں جن واقعات کے بارے میں اس نے سُنائی باتیں تحریر کر دی ہیں۔ لیکن چند ایک مستثنیات کے علاوہ یہ کتاب گورو گوبند سنگھ کی حیات اور ان کے زمانے پر مفید مطلب معلومات کی ایک کان ہے۔

دہول کی سنگت (سکھوں کا مذہبی اجتماع) کو مخاطب کر کے جو خط گورو گوبند سنگھ نے بتاریخ پہلی کاتک، 1764 ء بی کے مطابق 2 اکتوبر 1707 ء اے ڈی کو لکھا تھا وہ شہنشاہ بہادر شاہ اور گورو کی ملاقات (4 رجمادی الاوّل، 1119 ھ مطابق 23 جولائی 1707 ء) اور شہنشاہ کے مصالحانہ اور باعزت رویّے کا ایک براہِ راست دستاویزی ثبوت ہے شہنشاہ نے گورو کو اجازت دی تھی کہ وہ اس کے سامنے ہتھیاروں سے پوری طرح لیس ہو کر آسکتے ہیں۔ اس نے انھیں چھ ہزار روپے مالیت کی اعزازی خلعت عطا کی تھی جس میں جواہرات سے مزین ایک پٹکا (ڈھکڈکی) بھی شامل تھا۔ گورو کے لیے یہ ایک بے مثال اعزاز تھا جس سے بظاہر ان کی اعلا مذہبی حیثیت کا اعتراف مقصود تھا۔ یہ واضح نہیں ہے کہ گورو کے ان الفاظ کا کیا مفہوم ہے کہ ہور بھی کام گورو کا مسد کا سبھ ہوتے ہیں (مقدّس آقا کی عنایت سے اور بھی سارے کام پورے ہو جاتے یا طے ہو جاتے ہیں)۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ شہنشاہ سے ان کی جو گفت و شنید ہوئی وہ اس سے مطمئن تھے، اور جب پنجاب لوٹتے وقت وہ کہلور پہنچے (جو بظاہر کہلور کے علاقے میں مقام آنند پور رہے) تو انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ خالصہ کے لوگ ہتھیار بند آئیں جس سے بظاہر یہ مقصد تھا کہ اگر سرہند کے فوجدار نواب وزیر خاں یا شوالک کی طرف سے کوئی مخالفت ہو تو اس کا مقابلہ کیا جائے۔

گورو گوبند سنگھ کے آخری ایّام کے بارے میں دھن سنگھ کا مسوداتی بیان جسے اُنیسویں صدی کے وسط کے آس پاس نقل کیا گیا تھا۔ ناندیر میں لگنے والے گورو کے زخم پر پٹیاں باندھنے اور عمل جراحی کے بارے میں بڑی خوش آئند روشنی ڈالتا ہے۔ یہ جان لیوا زخم سرہند کے

Marfat.com

نواب وزیر خاں سے بھیجے ہوئے دو پٹھانوں نے لگایا تھا۔ اس کے مطابق یہ جراح جو زخم سینے کے لیے شہنشاہ بہادر شاہ نے بھجوایا تھا، ایک انگریزی شخص تھا جس کا نام کول اینڈ کال تھا، اور جسے اس کی خدمات کے صلے میں گورو نے روزانہ دس مہریں دیں تھیں۔ شہنشاہ نے پیش کش کی تھی کہ گورو کے قاتلوں کے ساتھیوں یا شرکائے جرم کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ لیکن گورو نے اس بات سے اتفاق نہ کیا، اور یہ کہا کہ یہ تو کسی اور شخص کے آلۂ کار تھے، اور اس ڈرامے میں ان کا حصّہ خود مختار اداکاروں کا سا منا تھا۔

کلّیاتِ بھائی نند لال گویا شہزادہ معظم (شہنشاہ بہادر شاہ) کے دیوان بھائی نند لال کی فارسی اور پنجابی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ وہ دسویں گورو کا بڑا عقیدت مند چیلا تھا۔ اور اس کا دیوان (غزلیات) زندگی نامہ اور جوت لباس (جو فارسی اور پنجابی زبانوں میں ہے) سکھ فلسفے کی کتابیں ہیں، گنج نامہ اور توصیف و ثنا گوروؤں کی شان میں قصیدے ہیں، جن میں گورو گوبند سنگھ کا خصوصی ذکر ہے، اور جو مصنّف کے مطابق زمین پر خدا کا عکس تھے۔ چونکہ یہ قصیدہ ایک ہمعصر کا لکھا ہوا ہے جس نے انھیں خاصے عرصے تک بڑے قریب سے دیکھا تھا، اس لیے اس بنا پر اس کی بڑی تاریخی اہمیت ہے کہ یہ قصیدہ رُوحانی اور غیر مذہبی قائد کی حیثیت سے گورو گوبند سنگھ کے اس اعلا کردار کو بیان کرتا ہے جس کی بنا پر شہنشاہ بہادر شاہ ان کی تعریف و تعظیم کرنے لگا تھا۔ نند لال کا راحت نامہ اور تنخواہ نامہ ان باتوں کے تلخیصی مجموعے ہیں جو سکھوں کو کرنی چاہئیں یا نہ کرنی چاہئیں، اور اس کی عرض الالفاظ ان عربی اور فارسی الفاظ کا مجموعہ ہے جو گوروؤں کی قصیدہ خوانی اور تعریف زبانی کے واسطے استعمال کیے گئے ہیں۔ دستور الانشا کلّیات میں شامل ہے، اس میں اشخاص اور مقامات کے بارے میں جو حوالے ملتے ہیں وہ کئی بار اتنے مبہم ہیں کہ تاریخی تحقیق میں مددگار ثابت نہیں ہو سکتے۔

بندا سنگھ کا خط بتاریخ پوہ 12 رسمت ' (1767 بی کے) مطابق 12 دسمبر 1710ء

Marfat.com

ان بہت سی غلط فہمیوں کو صاف کر دیتا ہے جو بعض لاعلم لوگوں کی تحریروں کے باعث پیدا ہوگئی ہیں۔ اس کی مہر سے یہ الفاظ کہ دیگ و تیغ و فتح و نصرت بیرنگ یافت زرنانک گورو گوبند سنگھ (دیگر حاجت مندوں کی حاجت روائی اور شکم سیری کے لیے، تلوار غریبوں اور لاچاروں کی حفاظت کے لیے اور فوری فتح خالصہ کی فوجوں کے لیے گورو نانک سے حاصل ہوئی ہے۔ گوبند سنگھ) گوروؤں اور خصوصاً گورو گوبند سنگھ کے لیے، جنھوں نے اسے خالصہ کی صفوں میں داخل کر لیا تھا، اس کی گہری عقیدت اور احسان مندی ظاہر کرتے ہیں۔ وہ جونپور کے مذہبی اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آپ معبودِ ازلی کہ خالصہ ہیں اور آپ کو اس رہت (اصولِ برتاؤ) کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے جو خالصہ کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ خود اپنی طرف سے وہ یہ کہتا ہے:

"میں تاکیداً کہتا ہوں کہ جو خالصہ کی رہت کے مطابق زندگی بسر کرے، گا گورو اسے بچالے گا۔"

غیر مسلم ہمعصروں کی جو مستند کتابیں بندا سنگھ کی زندگی اور کارنامے تشکیل دینے میں مدد کرتی ہیں ان میں کام راج کی کتاب عبرت نامہ' 1718ء سیوا داس (شو داس) کی کتاب شاہ نامہ یا فرخ سیر نامہ' 1721ء اور کوشل چند کی کتاب تواریخ محمد شاہ نادر الزمانی ہیں۔ آخر الذکر کتاب 1154ھ مطابق 1741ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ بات کہ اس زمانے میں سکھوں نے کس غیر معمولی صبر کے ساتھ مسکراتے ہوئے اپنی زندگیاں اپنے عقیدے کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاویں' ایسٹ انڈیا کی کمپنی کے سفیر (جون سرمن اور ایڈورڈ اسٹیفینسن) کے مراسلے' بتاریخ 10/مارچ 1761ء سے اخذ کی جا سکتی ہے' جو مراسلہ دہلی سے فورٹ ولیم اور بنگال کاؤنسل کے صدر اور گورنر عزت مآب روبرٹ' ہیجیز کے نام بھیجا گیا تھا۔

یہ خط بروز منگل' 5/جون 1716ء کو فورٹ سینٹ جارج میں صلاح و مشورے

Marfat.com

کے ایک موقع پر پڑھا گیا تھا۔ یہ خط مدراس ڈائری میں اور انڈیا آفس میں رکھی 1715ء سے 1719ء تک کی کتاب صلاح و مشورہ، نمبر 87، ریخ 239 میں اور جی۔ ٹی۔ دھیلر کی ارلی ریکارڈس آف برٹش انڈیا، صفحہ 180 میں، اور سی۔ آر۔ ونس کی وی ارلی اینلس آف دی انگلش ان بنگال، 96 تا 98 (ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ 1963ء، ایڈیشن، جلد دوئم، حصہ دوئم، 120 تا 121) میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کیسر سنگھ چھبر اپنی کتاب بنساولی نامہ دساں پاٹ شاہیاں کا میں دعوا کرتا ہے کہ گروؤں خصوصاً دسویں گورو کے بارے میں اس کے بیانات ایک بہی پر مبنی ہیں، جو گورو کے زمانے کے اندراجات کی کتاب تھی اور اس کے آباؤ اجداد کے قبضے میں تھی۔ یہ کتاب ان واقعات کی مفید مطلب معلومات سے پُر ہے جو اس نے ذاتی مشاہدے یا براہِ راست علم کی بنا پر تحریر کیے ہیں۔

اٹھارویں صدی کی تاریخ پنجاب پر پنجابی کی سب سے اہم کتاب بھنگو رتن سنگھ شاہد کی پراچین پنتھ پرکاش (امرتسر 1914ء، 1962ء) ہے۔ اس کا مصنف مرات کوٹ کے سردار مہتاب سنگھ کا پوتا اور کرور سنگھیا مسال کے سردار شیام سنگھ کا نواسہ تھا۔ یہ دونوں سردار دل خالصہ کے قائدین تھے۔ مصنف نے اپنے آباؤ اجداد اور ان سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگوں سے اس صدی کے پہلے نصف میں سکھوں کی قربانیوں اور تکلیفوں کے بارے میں، دلوں، جتھوں اور مسالوں کی تشکیل کے بارے میں، اور ان مقابلوں، کارناموں اور فتوحات کے بارے میں، براہِ راست معلومات حاصل کر لی تھی جن کے نتیجے میں بالآخر پنجاب خود مختار ہو گیا، اور سکھوں کی جمہوری حکومتیں قائم ہو گئیں۔ یہاں پہنچ کر کتاب ختم ہو جاتی ہے رتن سنگھ نے اُنیسویں صدی کے پہلے نصف (1898ء بی سے مطابق 1841ء اے، ڈی میں مکمل ہوئی) پراچین پنتھ پرکاش لکھی۔ اس وقت سکھ مسالوں کے کئی قائدین اور ان کے نزدیکی جانشین زندہ تھے اور درانیوں۔ احمد شاہ و تیمور شاہ۔ رہیلوں اور مرہٹوں سے

Marfat.com

مقابلوں کی یاد بھی تازہ تھی۔ اگر اس کتاب میں بندا سنگھ اور بندیوں کے خلاف اس کا وہ تعصب موجود نہ ہوتا جو اسے اپنی مخالف گروہ کے قائدین سے ورثے میں ملا تھا، اور جو چند ایک معمولی غلطیاں ہیں وہ نہ ہوتیں، تو کہا جاسکتا تھا کہ پراچین پنتھ پرکاش اٹھارویں صدی کے پنجاب کی تاریخ کی نہایت لائقِ اعتبار ماخذ ہے۔ رتن سنگھ نے اپنی کتاب نظم میں لکھی ہے کیونکہ یہی اس زمانے کا رواج تھا، لیکن چونکہ اس کا تخیل تخلیقی نہ تھا اس لیے اچھی بات یہ ہوئی کہ واقعات کا بیان بڑی حد تک مبالغے کی رنگ آمیزی سے پاک اور معروضی ہی رہا۔

جیمس براؤن کی دی ہسٹری آف دی اوریجن اینڈ پروگریس آف سکھس، فارسی رسالہ نانک شاہ (رسالہ دو احوالِ نانک شاہ درویش جو عبدالسلام سیکشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مطابق تاریخِ افغاناناں 22/ج/ 15 ہے) پر مبنی تھی جسے اس کے واسطے لاہور کے بدھ سنگھ اروڑانے ملہر (کوٹلہ) کے لالہ عجائب سنگھ سورج کے ساتھ مل کر ایک دیوناگری مسودے سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا جیمس براؤن نے فارسی مسودے کا انگریزی آزاد ترجمہ کر دیا۔ یہ جیمس براؤن شاہ عالم کے دربار میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کارندہ تھا جو وہاں اپنے اعلا افسر گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کو اطلاعات بھیجنے پر مامور کیا گیا تھا۔ یہ مسودہ انتہائی ناقص تھا، اور سکھوں کے طور و طریق اور رسم و رواج کی بابت بالکل خاموش تھا، حالانکہ اس زمانے میں انہی باتوں کا مطالعہ کرنے کے لیے وہ بے تاب تھا۔ ان دنوں سکھ پنجاب میں، مغل سلطنت کی سرحدوں پر، اور اودھ کے نواب وزیر کے علاقوں میں ایک بڑی پُر زور سیاسی قوت کی طرح اُبھر رہے تھے، اور راجپوتوں نیز مرہٹہ سرداروں سے معاہدے کر رہے تھے۔ اس لیے جیمس براؤن نے نہ صرف یہ کہا کہ تمہید میں وہ سب کچھ لکھ دیا جو اس موضوع نیز دوسرے موضوعات پر اسے معلوم ہوا تھا، بلکہ اس میں اپریل 1785ء یعنی ترجمے کی تاریخ تک کا بیان شامل کر دیا۔ اس میں اس نے جس آخری بات کا ذکر کیا ہے وہ 31 مارچ 1785ء

Marfat.com

کامعاہدہ ہے جو مرہٹوں کے نمائندے امباجی انگلے اور سکھ سرداروں کے یعنی خالصہ جی کے نمائندے سردار بگھیل سنگھ کے مابین ہوا۔ اپنی ساری چھپی ہوئی خرابیوں کے باوجود یہ کتاب پہلا باقاعدہ رسالہ ہے جو کسی شخص نے سکھوں کے بارے میں تالیف کیا۔

سکھوں کی بابت یورپین لوگوں کے لکھے ہوئے ابتدائی مسلسل بیانوں میں ایک اور بیان ایک سوئس انجینئر، کرنل انطوئن لوئی ہنری پولیر کی کتاب سکیس (Sigues) میں ہے۔ فورٹ ولیم کی تعمیر میں اس انجینئر کا کام سارے ماہرین فن بیحد سراہتے ہیں۔ کچھ عرصے کے لیے اسے اودھ کے شجاع الدولہ کی ملازمت کے واسطے بھیجا گیا تھا۔ اودھ کا دارالسلطنت تھا، جو اٹھارہویں صدی میں تہذیبی اور تعلیمی اداروں کا ایک عظیم مرکز تھا۔ یہاں کرنل پولیر کو صاحب علم لوگوں سے ملنے کا موقع ملا اور وہ ہندوستان کے مذاہب اور تاریخ میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (جو اب محض ایشیاٹک سوسائٹی ہے) کے ابتدائی رکنوں میں سے تھا اور 29 جنوری 1784ء کو اس کا رکن منتخب ہوا تھا۔ اس نے سوسائٹی کی مجلسوں کے لیے جو مقالے لکھے اور پڑھے ان میں سے ایک سیقس پر تھا یا ہسٹری آف سیکس تھا، جو اس نے 20 دسمبر 1787ء کو پڑھا تھا!

سیقس پر پولیر کا مقالہ صریحاً اس اتفاقی معلومات پر مبنی تھا جو اس نے شجاع الدولہ کی ملازمت کے دوران، اور استعفا دینے کے بعد والے برسوں میں جمع کی تھی، جب بانو دہلی کے نواحات میں کبھی اتفاقاً سکھوں سے اس کی ملاقات ہو جاتی تھی یا کہیں اس بارے میں سن لیتا تھا کہ سکھوں کے تعلقات مغلوں، رہیلوں، جاٹوں، راجپوتوں اور مرہٹوں سے کیسے ہیں۔ حقائق کی بابت اس میں بہت سی ایسی غلطیاں ہیں جو اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کی ابتدا کے غیر ملکی مصنفوں کی تحریروں میں عام طور سے پائی جاتی ہیں، کیونکہ گہرے ذاتی تعلقات کی کمی کے باعث انہیں سکھوں کے اداروں اور تاریخ کا براہ راست علم نہ ہو پاتا تھا، اور مستند کتابوں نیز اصلی دستاویزوں کی غیر موجودگی کے باعث انہیں

Marfat.com

اپنی تحقیقوں کے لیے لائقِ اعتبار مآخذ نہیں ہل پاتے تھے۔ مزید براں سکھوں کے بارے میں پولیر کے اپنے تعصّبات بھی تھے جو ان مغل عہدیداروں کی یک طرفہ رپورٹوں کے باعث اس کے ذہن پر طاری ہو گئے تھے، جن مغلوں کے خلاف وہ اسّی برسوں سے زیادہ مدّت سے جدوجہد کر رہے تھے۔ اس لیے مقالہ لکھتے وقت اسے جو کچھ معلومات دی گئی اس پر اس نے فوراً یقین کر لیا۔[2]

جارج فاسٹر کا خط نمبر XI میں، جو اس کی کتاب اے جرنی فرم بنگال ٹو انگلینڈ (لندن 1798ء) کی پہلی جلد میں دیا ہوا ہے، سکھ لوگوں کی ابتدا اور ترقّی کی مختصر تاریخ گورونانک کے زمانے سے فروری، مارچ 1783ء تک دی ہوئی ہے۔ فروری، مارچ 1783ء وہ زمانہ تھا جب وہ پنجاب کے مشرقی پہاڑی علاقوں میں سفر کر رہا تھا۔ اس خط کے علاوہ جو پورا کا پورا سکھوں کے بارے میں ہے، اس نے ان کے بارے میں کہیں کہیں اور بھی حوالے دے ہیں، جیسے صفحات 128 تا 30، 198 تا 99، 227 تا 28 اور جلد دوئم صفحات 83، 88۔ ایک حقیقی محقّق کی طرح فاسٹر میں "رنگ آمیزی کرنے اور حقایق کو غلط انداز میں پیش کرنے کا میلان نہ تھا۔" "وہ کہتا ہے چونکہ میری کوئی دلچسپی یا نظریہ نہ تھا اور نہ میں کسی قوت سے مرعوب تھا اس لیے حیثیت میں تھا کہ جو چیز میرے سامنے آئے اسے جذبات سے علاحدہ ہو کر جانچوں۔" اور وہ اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب رہا ہے اس کا خط نمبر XI اٹھارہویں صدی کے سکھوں کا ایک خاصہ معروضی مطالعہ ہے اور مفید مطلب معلومات کا خزانہ ہے۔

حکومت بمبئی نے چھیالیس جلدوں میں جو پیشوا دفتر انتن نوادلیلے کا گد (دفترِ پیشوائے منتخبات) شایع کی ہے، اس کے واسطے وہ ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی تاریخ کے طلبہ اور محققین کے شکر و احسان کی مستحق ہے۔ اس کی پینتالیس جلدوں کی تدوین راؤ بہادر گووند سردیسائی نے کی تھی، اور متفرق مقالات والی چھیالیسویں جلد (فارسی میں) کی

Marfat.com

تدوین ڈاکٹر ایم۔ ناظم نے کی تھی۔

بعد میں حکومتِ بمبئی نے دفترِ پیشوائے منتخبات کو ڈاکٹر پی۔ ایم۔ جوشی کی ادارت میں مقالات کے ایک نئے سلسلے کی طرح جاری رکھا۔ اتنی ہی تاریخی اہمیت کی کچھ اور بھی کتابیں ہیں جیسے راجواڑے کی مراٹھیاں چیہ اتیہاساچی سادھنے کی جلد نمبر ۱، 3، 6 اور 12، ڈی، بی، پرالنی کی دِلی وتھیل مراٹھیا پنجی، راجہ کرّارے (ہنگنے کی خط وکتابت) دو حصّوں میں اور ساتھ میں ایک ضمیمہ، اور جودہ پوریتھل راجہ کارنے (کرشنا جی جگن ناتھ وکیل کی خط وکتابت) جو پہلے پہل بہت سے مختلف سلسلوں کے متعدد دوسرے دستاویزوں کے ساتھ اتیہاس سنگراہا (زرنایا ساگر پریس، بمبئی) میں چھپی تھی۔

جی۔ ایس۔ سروارکر کے تدوین کیے ہوئے دی ہسٹوریکل پیپرس آف دی سندھیاز آف گوالیار جو ستارا ہسٹوریکل ریسرچ سوسائٹی نے 1934ء اور 1940ء میں دو جلدوں میں شایع کیے ہیں، اور سردیسائی ہی کے تدوین کیے ہوئے دی ہسٹوریکل پیپرس ریلیٹنگ ٹو مہہ جی سندھیا جو حکومتِ گوالیار نے 1937ء میں شایع کیے ہیں، درانیوں، رہیلوں، بیگم سمرو، سکھ سرداروں اور ریاستِ پٹیالہ کی بابت شمالی ہندوستان کے ان امور کے بارے میں جن کا تعلق دہلی کے شمال اور جنوب دونوں سے تھا، نہایت براہِ راست قسم کے مآخذی مواد پر مشتمل ہیں۔

اس جگہ پونا کی اتیہاس سمشودک منڈل کی اشاعتوں کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے، جس نے اپنے دو سلسلہ مقالات سویا گرنتھ مالا (تقریباً ۱۰۰ اشاعتیں) اور پرسکرت گرنتھ بالا کے ذریعے پیشوائے وکیلوں اور خبرنویسوں کی خط وکتابت کے مجموعوں پر مشتمل کوئی دو سو جلدیں شایع کی ہیں جیسے ہنگنے دفتر (تدوین، جی۔ ایچ۔ کھرے)، چندرا چد دفتر (تدوین، ڈی۔ وی۔ آپٹے)، ویدیا دفتر، انتن نوندلیلے کاگد وغیرہ۔ منڈل نے مرہٹی زبان کے علاوہ سویا گرنتھ مالا سلسلہ مقالات میں ہندوستانی تاریخ کے فارسی مآخذوں (ابتہاسک

Marfat.com

فارسی ساہتیہ) کی بھی متعدد جلدیں منڈل کے مہتمم محافظ خانہ جی۔ایچ۔کھرے کی اِدارت میں شایع کی ہیں۔ ان جلدوں میں فارسی کے جو خبر نامے اور دستاویز شامل ہیں۔ (جلد پنجم، حصّہ اوّل 1961ء میں شایع ہوا تھا) ان میں عام طور سے شمالی ہندوستان کا ذکر ہے، اور پنجاب کے بھی بہت سے حوالے ہیں جو زیادہ تر اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف سے تعلق رکھتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے مندرجہ بالا سطور میں ذکر کیا ہے، اٹھارہویں صدی میں آخری تین دہائیوں کے علاوہ مصنّفوں کی توجّہ اس صورت میں سکھوں کی طرف ہوتی ہے جب وہ لاہور کی حکومت کے خلاف اور وقتاً فوقتاً سرہند اور دہلی کے خلاف جدوجہد کرتے یا پھر درانیوں، رہیلوں، بھٹیوں اور مرہٹوں کے خلاف لڑتے۔ اور یہ سب باتیں اس زمانے کی عام تاریخی کتابوں اور سوانحوں میں دی ہوئی ہیں جو زیادہ تر مسلمان مصنّفوں نے لکھی ہیں۔

جن کتابوں کا ذِکر پہلے کیا جا چکا ہے ان کے علاوہ غیر مُسلموں کی کتابوں میں سدھ رام کی رقعاتِ عالمگیری یا دمزد اشادۂ عالمگیری (1708ء)، جگ جیون داس گجراتی منتخب التواریخ (1708ء)، بھیم سین کی دِلکشا (1728ء)، لالہ رام کی تحفتہ الہند، دونی چند کی لکّر نامہ، آنند رام مخلص کی تذکرہ، وقائعہ اور سفرنامہ (1748ء)، چترمان کی چہار گلشن (1759ء)، گاہسی راج کی احوالِ جنگِ بھووا احمد درّانی یا جنگِ پانی پت (1761ء)، شیو پرشاد کی تاریخ فرّاخ بخش یا فیض بخش (1776ء)، متّالال کی تاریخِ شاہ عالم جسے شاہ عالم نامہ بھی کہا جاتا ہے (1782ء)، صاحب سنگھ کی منتخب المسوّدات (1784ء)، بہاری لال کی احوالِ نجیب الدولہ و علی محمد خاں و دوندے خاں (1787ء)، ہرچرن داس کی چہار گلشنِ شجاعی (1787ء)، متر سین کی ذور نامہ (1793ء) اور دلپت رائے کی امیر الاملا (1800ء)، وہ کتابیں ہیں جو اس بنا پر خاص طور سے لائق ذِکر ہیں

Marfat.com

کہ ان میں کبھی کبھی پنجاب کے حوالے ملتے ہیں۔ ان کتابوں کے ناموں کے ساتھ جو تاریخیں دی گئی ہیں ان میں سے ہر تاریخ تصنیف یا نقل کی تاریخ نہیں ہے، بلکہ بعض صورتوں میں یہ کتاب میں دیے ہوئے آخری واقعے کی تاریخ ہے۔ فارسی میں صرف ایک چھوٹی سی کتاب رسالۂ نانک شاہ ہے جو خاص طور سے سکھوں کے بارے میں ہے۔ یہ لاہور کے بدھ سنگھ اروڑا اور ملیر (کوٹلہ) کے عجائب سنگھ سورج کی لکھی ہوئی ہے۔ لیکن جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے، یہ محض ایک ہندی مسودے کا ترجمہ ہے، جسے کسی ایسے شخص نے لکھا ہے جو سکھوں کے مذہب اور تاریخ سے پوری طرح واقف نہ تھا۔ بخت مل کا خالصہ نامہ (1810ء تا 1814ء) اور خوشوقت رائے کی کتاب تواریخِ پنجاب جسے تواریخِ سکھیاں (1811ء)، بھی کہا جاتا ہے، ان کتابوں میں شمار ہوتی ہیں جو انیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں لکھی گئی ہیں اور جن میں زیادہ تر اٹھارہویں صدی کے پنجاب کا ذکر ہے۔ بخت مل نے اپنی کتاب کینھوال کے بھائی لال سنگھ کی سرپرستی میں لکھی، اور اس کا پہلا مسودہ (جو اب رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کی لائبریری میں محفوظ ہے) جون میلکوم نے اپنی کتاب اسکیچ آف دی سکھس لکھتے وقت استعمال کیا تھا، جو 1812ء میں لندن میں شائع ہوا۔ خوشوقت رائے ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا سرکاری خبر نویس تھا۔ اس نے اپنی کتاب تواریخِ پنجاب 1811ء میں کرنل ڈیوڈ اوکٹرلونی کی خواہش پر لکھی تھی، اور اسے جون 1811ء کی مٹکاف ـــــ رنجیت سنگھ گفت و شنید پر ختم کیا تھا۔ حالاں کہ دیا رام کی شیر و شکار مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں قدرے بعد کے زمانے میں لکھی گئی ہے پھر بھی اس میں زیادہ تر اٹھارہویں صدی کے آخر میں ستلج کے اس پار والے معاملات اور خصوصاً ان معاملات کا ذکر ہے جن کا تعلق ڈی بوئن، پیرون، لوئی بورکوئن، جارج تھومس، مرہٹوں اور مالوہ کے سکھ سرداروں سے ہے۔ اس میں دیے ہوئے آخری واقعات میں مہاراجہ

Marfat.com

رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع الدّولہ کی گفت و شنید اور اس کی کشمیر کی مہم ہے۔

اس کے علاوہ، غیر مسلموں کی لکھی ہوئی تحریروں کا ایک اتنا بڑا میدان موجود ہے جسے اب تک کسی ہندوستانی یا غیر ملکی محقق نے چھوا تک نہیں ہے یہ بھٹ اور پنڈا تحریریں ہیں جنھیں پیشہ ور محافظینِ شجرات اور رزمیہ نظمیں گانے والے لوگوں نے قائم اور محفوظ رکھا ہے۔ پنجاب کے بھٹ بھدسن تلودہ (جنڈ) کرکشیتر، بنبوری، کرسندھو، سرسا، کیتھال اور ستلج کے اس پار والے متعدد مقام پر ملتے ہیں، جبکہ پنڈے ایسے تیرتھ استھانوں میں رہتے ہیں جیسے ہردوار، پیہوا کروکشیتر، پریاگ، گیا، اجودھیا، کماکھیا دیوی (گوہاٹی)، پوری وغیرہ۔ پرانے باضابطہ گروہوں کی طرح بھٹ لوگ راجاؤں، سربرآوردہ لوگوں، سرداروں اور دوسرے لوگوں کے نسل نامے محفوظ رکھتے تھے، اور ان کے افعال شجاعت و فیاضی تحریر کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنے یجمانوں یا سرپرستوں کے سال وار واقعات بھی تحریر کرتے تھے اور انھیں پڑھ کر سناتے تھے۔ مقررہ مدت کے بعد وہ اپنے مقررہ حلقوں میں گاؤں گاؤں پھرتے اور خاندان کے مرد بچوں کی پیدائش اور موت اور ان موقعوں پر سربراہ خاندان سے جس قدر تفصیلات حاصل ہوتیں وہ سب اپنی بہی میں تحریر کر لیتے تھے۔ پیدائش اور شادی کے موقعوں پر وہ نسب نامے پڑھ کر سناتے تھے اور اس خاندان کے آباؤاجداد و نیز نمایاں لوگوں کے کارنامے گا کر سناتے تھے۔ بھٹوں میں جو لوگ زیادہ پڑھے لکھے تھے انھوں نے جذبات سے بھری ایسی نظمیں لکھیں جو تاریخی اعتبار سے درست اور خاصی ادبی اہمیت کی حامل تھیں، اور انھیں کسی علاقے کی تاریخ اور علاقے کے لوگوں کی سوانحیں لکھتے وقت بڑے مفید مطلب ماخذی مواد کی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ عام طور پر بھٹکشری یا

Marfat.com

بھٹاچاری رسم الخط میں لکھی ہوئی ہیں اور مضبوط کپڑے کی تہہ دار جلد کے رجسٹر کی صورت میں محفوظ ہیں۔ انھیں بہی کہا جاتا ہے۔ بھائی منی سنگھ والی سیوا سنگھ کی شاہد بلاس بھٹ موہلو رام کی بہی میں موجود تھی، اور اے بھدرسن کے بھٹ چھجو سنگھ نے، جو اس کے مصنف کی نسل سے تھا، 1937ء بی، کے مطابق 1870ء اے ڈی میں بھٹاچاری رسم الخط سے گورمکھی میں نقل کیا تھا۔ گذرے ہوئے وقت کے ساتھ بعض ایسی صورتیں پیدا ہو رہی ہیں کہ بھٹوں کی نئی نسل جس کے بعض افراد نئے پیشے اپنانے لگے ہیں، ان پرانی بہیوں کو نظر انداز کرنے لگے ہیں۔ اس لیے وقت آگیا ہے کہ ذرا بھی تاخیر کیے بغیر تاریخی ماخذوں کے اس بیش بہا خزانے کو بچانے کے لیے ایک باضابطہ اور منظم کوشش کی جائے اور تاریخی تحقیق کے مفاد کی خاطر اسے پنجابی اور دیوناگیری رسم الخط میں تبدیل کرکے شایع کرا دیا جائے۔

اسی طرح ہندوؤں کی بہیوں میں ان تیرتھ یاتریوں کے نسب ناموں کی بابت بیش قیمت تحریریں موجود ہیں جو یا تو یونہی، ورنہ اپنے مرے ہوئے رشتے داروں کی راکھ لے کر تیرتھوں پر جاتے ہیں۔ تیرتھ استھان کے پوتر پانی راکھ ڈالنے سے پہلے یا غوطہ لگانے سے پہلے اس پنڈے کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جس کے پاس اس علاقے کی بہی ہوتی ہے، جس علاقے میں اس یاتری کا گاؤں یا شہر واقع ہوتا ہے۔ یہ پنڈا مذہبی رسوم ادا کرتا ہے جس کے واسطے اسے ایک مقررہ اجرت دی جاتی ہے۔ یہ اجرت اس خرچے کے علاوہ ہوتی ہے۔ جو یاتری اس کی رہائش اور کھانے کے لیے دیتا ہے۔ یاتری کی ملاقات سے پنڈے کو موقعہ ملتا ہے کہ خاندان کے نسب نامے کو تازہ ترین شکل میں مکمل کرلے، اور ایسی ساری معلومات بھی درج کرے جو خاندان یا گاؤں کے آئندہ یاتریوں کے نقطۂ نظر سے مفید ہے۔ بعض اوقات پنڈے پڑھے لکھے یاتریوں سے اپنے اندراجات پر اس خیال سے تصدیق یا دستخط کروالیتے

Marfat.com

تھے تاکہ سند رہے۔

بھٹوں اور پنڈوں کی ساری بہیوں میں گاؤں، فرقوں، گوتروں اور خاندانوں کے اعتبار سے دُرست فہرستیں بنی ہوتی ہیں، اور اگر کسی خاندان کا ذکر بہی میں موجود ہے تو اُسے ڈھونڈنے میں دو ایک منٹ سے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ اگر کسی خاندان کا ذکر پہلے بہی میں موجود نہیں ہے تو پنڈا فوراً آئندہ حوالے کے لیے وہ معلومات تحریر کر لیتا ہے جو یاتری اسے دیتا ہے۔ بھٹوں اور پنڈوں کی بہیوں میں فرق یہ ہے کہ بھٹ اپنے اپنے علاقوں میں جا کر موقع پر اپنے اندراجات مکمّل کرتے تھے، اور پنڈے تیرتھ استھانوں پر اپنے یاجمنوں کی آمد کا انتظار کرتے تھے۔ اس طرح بعض ایسی صورتوں میں جب یاجمن تیرتھ استھانوں پر نہ پہنچ پاتے تو پنڈوں کے اندراجات میں بڑی مدّت تک کوئی چیز تحریر نہیں ہوتی۔ اِسی لیے بھٹوں کی بہیاں پنڈوں کی بہیوں کے مقابلے میں زیادہ مکمل اور زیادہ فائدے مند ہیں۔

بھٹوں اور پنڈوں کے علاوہ، جو برہمن اور نیم برہمن ذاتوں سے تعلّق رکھتے تھے، دَورِ وسطیٰ کے پنجاب میں بھاٹوں کا ایک اور طبقہ بھی تھا جو آلاتِ موسیقی دھاد اور رباب کے نام پر دھادی یا ربابی کہلاتے تھے، اور لوگوں کے سامنے نمائش کرنے کی خاطر دھاد یا رباب بجانے میں کمال حاصل کرتے تھے۔ وہ ذات کے اعتبار سے ڈوم یا مراثی تھے، لیکن سکھ گوروؤں اور سرداروں کی سرپرستی میں رہ کر انھوں نے سکھ طریقۂ زندگی اپنا لیا تھا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے بنیادی طور پر گویّے تھے، لیکن اکثر اوقات وہ ایسی چار بیتیں لکھ لیتے تھے جو ادبی اعتبار سے بڑی بلند پایہ ہوتی تھیں، اور ان میں سے بعض کو گوروؤں اور بعض مستند سنتوں کے اشلوکوں کے ساتھ سکھوں کے پاک صحیفے، گورو گرنتھ صاحب میں بڑا اونچا مقام دیا گیا ہے۔ نا تھا، جس نے وار یا گورو ہرگوبند کی جنگوں پر رزمیہ نظمیں لکھیں، اور نانتھ مل دھادی، جو امر نامہ کا مصنّف ہے، اسی جماعت سے

Marfat.com

تعلق رکھتے تھے۔ جیسا کہ میں نے مندرجہ بالا سطور میں کہیں ذکر بھی کیا ہے، میرا خیال یہ ہے
کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخص کے ہیں۔ ستلج کے اس پار والے علاقوں، جالندھر کے
دوآبوں، اور باری کے پرانے سردار خاندانوں کے کاغذات، نیز مغربی پاکستان کے
بعض متمول گھرانوں کے خاندانی کاغذات کی اگر اچھی طرح چھان بین کی جائے تو یقیناً دھاریوں
کی لکھی ہوئی بعض بیش قیمت تاریخی واریں ملیں گی۔

Marfat.com

حوالہ جات

چونکہ سوسائٹی کے ریکارڈ میں اس مقالے کی کوئی نقل موجود نہ تھی، نہ یہ مقالہ سوسائٹی کے رسالے میں شایع کیا گیا تھا، اس لیے میں نے انڈیا آفس لائبریری سے اس کی ایک فوٹو اسٹیٹ نقل حاصل کر لی (Orme Mss., XIX, pp. 33)۔

میں نے انھیں لائقِ اعتبار مواد کی روشنی میں درست کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ لائقِ اعتبار مواد اب 1962ء میں چھپنے والی کتاب ارلی یورپین اکاؤنٹس آف دی سکھس کے حاشیے کی عبارت میں مل جاتا ہے۔

Marfat.com

دَورِ وُسطیٰ کے ہندوستان پر ابتدائی برطانوی تاریخی تحریر کی خصوصیات

جے۔ ایس۔ گریوال

ابتدائی برطانوی تاریخی تحریر، پر یہ مقالہ اٹھارہویں صدی کے آخری اور انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کے برطانوی مورخوں کا احاطہ کرتا ہے! دَورِ وُسطیٰ کے ہندوستان پر برطانوی فنِ تاریخ نگاری کی خصوصیات کے مطالعے کے واسطے تقریباً نوّے سال کی اس مُدت کا انتخاب بے سوچے سمجھے نہیں کیا گیا ہے۔ اس زمانے کے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے پھیلاؤ کی روش کا اور اس پھیلاؤ کے باعث عام برطانوی زندگی میں پیدا ہونے والے مسائل سے جوابی عمل کا فنِ تاریخ نگاری سے گہرا تعلق تھا۔ اس تاریخی تحریر کی روشن اور خاصیت، اور اس زمانے کی عام برطانوی فنِ تاریخ نگاری کے طریقوں نیز بڑے رُجحانوں کے درمیان قریبی تعلق، مورخوں کے سماجی اور تہذیبی ماحول کا ان کی کتابوں کے کردار پر گہرا اثر، ان کی فکر و نظر کا عام خاکہ، بحیثیت مجموعی اس پوری تاریخی تحریر کی نشوونما کے پیچھے کام کرنے والی منطق ـــــ ان ساری باتوں نے مل کر اس دَور کے مورخوں کو ایک ایسی وحدت بخش دی جو بس انہی کا حصہ تھی۔

ان مورخوں کے کام اور اس زمانے کے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے پھیلاؤ کی روش کے درمیان جو نزدیکی تعلق تھا وہ ان مضامین سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے تاریخ لکھنے کے واسطے انتخاب کیے ـــــ جیسے مثال کے طور پر، روہیلے، بعد کے

Marfat.com

مغل فرمانروا، میسور، مرہٹے، سکھ۔ مزید برآں، پہلے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کے امکان اور پھر قیام کے ساتھ ہند مسلم "ہمارے پیش رو" سمجھے جانے لگے۔ ان کی حکومتیں ہندوستان کے نئے فرمانرواؤں کے واسطے نہایت دلچسپ موضوع بن گئیں۔

مورّخوں کے عملی اور سرکاری مقاصد ان مسائل کا جوابی عمل ظاہر کرتے ہیں جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے پھیلاؤ سے برطانوی عوام کی زندگی میں پیدا ہو گئے تھے۔ مثال کے طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین نے اٹھارہویں صدی میں صرف اس لیے دستوری اور قانونی تحقیقیں شروع کر دیں کیونکہ کمپنی برطانوی ہندوستان پر حکومت کرنے کے مسائل سے دوچار تھی۔ ہندوستانی دورِ وسطیٰ پر برطانوی تاریخی تحریروں کا حجم انیسویں صدی کی ابتدا میں بہت کچھ اس بنا پر بڑھ گیا، کیونکہ برطانوی ہندوستان، جو اب سلطنتِ برطانیہ کا سب سے اہم حصّہ بن چکا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہی نہیں بلکہ ساری انگریزی قوم کی ذمّہ داری بن چکا تھا اور مصنّفین نے فطری طور پر پوری انگریزی قوم کو خطاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے واسطے اپنی کتابوں کے استعمال یا عملی مفہوم سے اس دور کے تقریباً سارے ہی مصنّف باخبر تھے۔ ان میں سے بعض نے دورِ وسطیٰ کے ہندوستان کی بابت اپنے علم کی روشنی میں حکومت کے مسائل پر کھلم کھلا بحث کی ہے۔

بہرکیف، عملی مقصد کے غلبے کے باوجود، دورِ وسطیٰ کے ہندوستان پر برطانوی تاریخی تحریر کا عام برطانوی فنِ تاریخ نگاری سے بہت گہرا تعلق تھا۔ مثال کے طور پر، ہندوستانی معاشروں کے بارے میں جیمس مل کی تحقیق ان اسکاچ عمرانی تحقیقوں کی نقل تھی جنھیں اڈم فرگوسن اور جون ملیر نے مقبولِ عام کیا تھا۔ اسی طرح، الیگزینڈر ڈاؤ کو بے خوف و خطر دورِ روشن خیالی کے مورّخوں کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس نے ناصحانہ مقصد کے تحت ان حقایق کو لائق فہم انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی جو آسانی سے دستیاب

Marfat.com

ہوگئے تھے۔ اگر اس کی کتاب کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ اس کے بڑے بڑے مفروضات وہی تھے جو ڈیوڈ ہیوم اور ایڈورڈ گبّن کے تھے۔

حالانکہ یہ ممکن نہیں کہ ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے سارے برطانوی مورّخین کو برطانوی فنِ تاریخ نگاری کے کسی نہ کسی موریہ خیال میں جگہ دی جا سکے، پھر بھی یہ ضرور ہے کہ برطانوی فنِ تاریخ نگاری کے بڑے بڑے رُجحانات ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی برطانوی تاریخ نگاری میں پورے طور سے نظر آتے ہیں۔ راجپوتوں کے بارے میں جیمس ٹوڈ کی کتاب برطانوی دورِ وسطیٰ کے مورّخین کے کام سے بیحد متاثر ہوئی ہے۔ ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن کو بھی یقین ہوگیا تھا کہ دورِ وسطیٰ کے مُسلم ہندوستان کی تاریخ "قرونِ وسطیٰ کے یورپ کی تاریخ پر روشنی ڈالے گی"۔ تاریخ کے بارے میں جوزف ڈیوی کنگھم کا تصوّر اس آزاد خیال انگلیکی (کلیسائے انگلستان کا جدت پسند پیرو) کی "سائنس" اور "فلسفے" کے نزدیک آگیا تھا جس نے انیسویں صدی کی ابتدا میں انگریز فکرِ تاریخ میں "ایک انقلاب" بپا کر دیا تھا۔[3] تاریخی دستاویزوں کو جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کا کام ـــــ جو انیسویں صدی کی ابتدا میں برطانوی تاریخی نقطۂ نظر میں ہونے والی تبدیلی کی عکاسی کرتا ہے ـــــ برطانوی ہندوستان میں بھی اتنا ہی اہم بن چکا تھا جتنا خود برطانیہ عظمیٰ میں۔ تاریخی علم وفضل نے ہندوستانی دورِ وسطیٰ پر برطانوی تاریخی تحریر کے کردار کو اسی قدر بدلا تھا جتنا عام برطانوی فنِ تاریخ نگاری کو بدلا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ برطانوی فنِ تاریخ نگاری کے طریقوں اور رُجحانوں نے ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی برطانوی تحریر کے کردار پر اثر ڈالا تھا۔ ابتدائی انیسویں صدی کے ہندوستان کے برطانوی مورّخین گو بڑی حد تک ادبی مآخذوں پر بھروسہ کرتے تھے، پھر بھی وہ انہیں سند کا نہیں مآخذ کا درجہ دیتے تھے۔ ان کا مقصد، جیسا کہ ان میں سے ایک مصنّف نے دوسرے سے کہا ہے، یہ تھا کہ "حقائق حاصل کرنا اور انہیں سوچ سمجھ کر ملانا تاکہ بکواس سے بھری

Marfat.com

بکوڑوں اور لاف گزاف سے بھری تواریخوں کے انبار سے ایک مستقل اور عقلی تاریخ تیار کی جاسکے۔"[4] اس بات کا اعتراف کہ غیر تاریخی ادب، تاریخی دستاویزیں اور علم آثار قدیمہ تاریخی تحقیق کے لیے موزوں ہوتے ہیں ابتدائی انیسویں صدی کے دن بہت سے برطانوی مورخوں نے کرلیا تھا جو ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی بابت لکھتے تھے۔ لہٰذا، اس دور کے شروع میں جہاں الیگزینڈر ڈاؤ نے یورپین سیاحوں کی فارسی تاریخوں پر قناعت کی وہاں ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن نے اسی دور کے آخر میں خطوط، فرمان، توزکیں، سکے، زبان اور ادب کی شہادتوں اور ایشیا اور یورپ دونوں کی تاریخوں اور سیاحوں کا استعمال کیا۔ ان مورخوں کی بڑی بڑی کتابوں کے تفصیلی تجزیے کی بنیاد پر بے خوف وخطر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان مورخوں نے "تاریخی طریقہ" اپنے وطن کے ہمعصروں سے سیکھا تھا۔

ان کے مقاصد یا تاریخی طریقے کی بابت ان کی وہ ترتیب جس کے باعث ان کی کتابوں کا ایک مخصوص کردار بنا، اس کی اہمیت کم کیے بغیر یہ بات پورے زور کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔ کہ ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے برطانوی مورخین کے سماجی اور تہذیبی ماحول کا اثر زیادہ لطیف تھا۔ اور اسی لیے ان کی کتابوں کا کردار بنانے میں زیادہ فیصلہ کن ثابت ہوا۔ ایڈورڈ گبن کا ہسٹری آف دی ڈکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر ایک معنوں میں ایک "جدید یورپین نشاۃِ ثانیہ کے عہد زریں کے عام خیالات کا مظاہرہ" تھی[5] جیمس مل کی ہسٹری آف برٹش انڈیا بھی انگریز فلسفی انتہاپسندوں کے خیالات کے بارے میں ہمیں اس قدر بتاتی ہے جتنی انگریز دورِ روشن خیالی کے بارے میں گبن کی ہسٹری۔ ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے برطانوی مورخوں کی کتابیں جو ان کے زمانے کے ادبی، جمالیاتی، اور مذہبی نیز عقلی دھاروں کی عکاسی کرتی ہیں، دراصل اس سماج کی عکاسی کرتی تھیں جس میں وہ رہتے اور کام کرتے تھے۔ اس بات کو الٹ کر یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی دورِ وسطیٰ پر برطانوی تاریخی تحریر کا کردار بناتے وقت اس دور میں ابھرتے ہوئے انجیلی عقیدے

Marfat.com

اور رومانیت نے بھی اتنا ہی گہرا اثر ڈالا جتنا روشن خیالی اور فلسفیانہ انتہا پسندی نے ڈالا تھا۔ اب تک کی ان تاریخی تحریروں میں سے بیشتر کا تجزیہ انہی مؤثر تحریکوں کی اصطلاح میں کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستانی دَورِ وُسطیٰ کے سارے برطانوی مورّخوں میں جو چیز مشترک تھی وہ یہ مفروضہ تھا کہ ان کے ملک میں ان کا زمانہ اس زمانے سے ہر لحاظ سے بہتر تھا جس پر وہ لکھ رہے تھے مثال کے طور پر الیگزینڈر ڈاؤ نے دستوری بادشاہت کے تحت اپنے ساتھی شہریوں کی آزادی اور خوشی کا مقابلہ استبدادی حکومت کے تحت ہندوستانی رعایا کی "غلامی" اور مصائب سے کیا۔ ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن کے نزدیک ہندوستانی دَورِ وُسطیٰ کے دوران نہایت خوشحال اور انتظامی اعتبار سے بہترین زمانوں میں بھی عام حالت اس زمانے کے یورپ کی ریاستوں کی عام حالت سے گئی گذری تھی جن کا انتظام بس یُونہی سا تھا۔ حقیقت یہ ہے، کہ اس زمانے کے مغربی یورپ کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ وہ اخلاقی اور عقلی اعتبار سے دُنیا کی تاریخ کے ہر زمانے سے بہتر تھا۔ آخری تجزیے سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ جدید سائنس کے عروج اور فکرِ انسانی و ٹیکنالوجی پر اس کے اثرات نے جدید یورپین تہذیب کو ایشیا اور یورپ کی ساری تہذیبوں میں، ممتاز بنادیا تھا۔ حتیٰ کے سر ولیم جونس، اپنی اس شہرت کے باوجود کہ وہ ایشیا کے لوگوں کے سب سے بڑے مدّاح ہیں، یہ سمجھتے تھے کہ علوم سائنس میں وہ "محض طفلِ مکتب" تھے[6] ان کے نزدیک یورپ "حسین مالکہ" تھا اور ایشیا زیادہ سے زیادہ "خادمہ"۔[7]

بحرکیف، اس عام مفروضے کے باوجود کہ اس زمانے کا یورپ ہندوستان پر فوقیت رکھتا تھا، ہندوستان اور اس کے ماضی کی جانب ان برطانوی مورخوں کے رویّے بہت مختلف تھے، اور ان رویّوں سے بڑی حد تک ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی مؤثر مدرسۂ فکر سے وابستہ تھے، جیسے دَورِ روشن خیالی کے ڈاؤ جیسے مورخ ہند مُسلموں کی سیاسی کامیابی اور

Marfat.com

زور و قوت کو سراہ سکتے تھے اور واقعتاً سراہتے تھے۔ وہ بعض فرمانرواؤں کے بے تعصب انداز کو بھی سراہتے تھے۔ وہ اس بات میں یقین کرتے تھے کہ ہندوستان کی برطانوی سلطنت میں یا کہیں بھی امن اور سیاسی استحکام قائم رکھنے کے واسطے یہ بہتر ہوگا کہ جاہل عوام کو توہم پرستی کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ افادیت پسندوں اور انجیلیوں کے نظریے گو بڑے مختلف تھے لیکن ہندوستان اور اس کے ماضی کے بارے میں ان کا تقریباً یہی نظریہ تھا انھیں ہندوستانی معاشروں میں شاذ ہی کوئی چیز لایق تعریف نظر آتی تھی۔ اور ان کی نظر میں ہندوستان کے مستقبل کا دارو مدار یا تو ان بخششوں پر تھا جو ہندوستانیو کو مل جائیں یا برطانوی انھیں عطا کر دیں۔ رومان پسندوں نے ہندوستانی معاشروں اور ہندوستانی تہذیبوں کے بعض پہلوؤں کو علاحدہ علاحدہ سراہا — جیسے مثال کے طور پر مذہب، اخلاقیات، شاعری، موسیقی، مصوری، سنگ تراشی یا عمارت سازی۔ بعض رومان پسند تو یہاں تک کہنے کے لیے آمادہ ہوگئے کہ ہندوستانی طریقۂ زندگی ہندوستانیوں کے لیے اتنا ہی قابلِ قدر تھا جتنا برطانویوں کے لیے برطانوی طریقۂ زندگی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی اداروں کو اس وقت تک نہیں چھونا چاہیے جب تک ہندوستانی خود انھیں بدلنے کی خواہش نہ کرنے لگیں۔

اس دَور کے برطانوی مورّخوں کے کائناتی مفروضات خواہ کچھ بھی رہے ہوں، لیکن وہ ریاست تمدّن اور قومیت کے تصورات کو اپنا عام خیالی ڈھانچہ سمجھتے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دَورِ روشن خیالی کے مورّخوں نے سب سے اعلا مقام ریاست کے تصوّر کو دیا تھا، اور افادیت پسند نیز انجیلی مصنّفوں کے نزدیک قومیت اور ریاست کے تصوّرات تمدّن یا سماج کے تصوّر کے ماتحت تھے۔ لیکن دوسری طرف رومان پسندوں کے خیال میں ریاست اور تمدّن کے تصوّرات قومیت کے تصوّر کے ماتحت تھے۔ ایڈورڈ گبن اور سرولیم جونس (جنھوں نے ہندوستانی دَورِ وسطیٰ پر براہِ راست کچھ نہیں لکھا) کا عام خیالی

Marfat.com

ڈھانچہ ہی تو تھا جس نے ان کی کتابوں کو ان خوبیوں سے مزین کیا جن خوبیوں نے ہندوستانی دَورِ وُسطیٰ کی بابت برطانوی تحریر کے کردار پر فیصلہ کن اثر ڈالا۔ اسلامی تاریخ پر لکھتے وقت گبن کو یہ طریقہ، کہ "اپنی تصویر میں قوموں کے گروہ" شامل کر دوں، نہایت بامعنی لگا۔[9] تاہم اس نے اسلامی تمدّن کے اتحاد پر زور دیا جو اس کی نظر میں مسلم دُنیا کی علاقائی خصوصیات سے بالاتر تھی۔ اس مفروضے کے مطابق ہند مُسلم لوگ سارے نسلی اور علاقائی خطوطِ تقسیم کے باوجود، اپنے طریقہ زندگی کے اعتبار سے سوائے مُسلمانوں کے دُنیا کی ہر قوم سے جُدا تھے۔ سر ولیم جونس نے ہندو تمدّن کو ہندوؤں کے خیالات کا مجموعہ بنا کر یہ ظاہر کیا کہ ہندو تمدّن ایک بے مثل چیز ہے اور اس طرح مغرب کے لوگوں کے واسطے لفظِ ہندوستان کو تقریباً ہندو ہندوستان کے مترادف کر دیا۔ اس کے بعد ہندوستانی تاریخ کو باقاعدہ طور پر "ہندو" اور "مسلمان" تاریخ میں بانٹنے کا مسئلہ محض وقت کی بات رہ گئی۔ جیمس مل، وہ پہلا مورّخ، جس نے یہ تقسیم باقاعدہ کی، اس بات پر فخر کرتا تھا کہ وہ علم تمدّن کا ایک نہایت سنجیدہ طالبِ علم ہے۔ اس نے بڑی آسانی سے یہ بات مان لی تھی کہ گبن اور جونس اس کے براہِ راست پیش رو تھے۔

مزید برآں، چونکہ گبن اور جونس نے مسلم اور ہندو تمدّنوں کی قدر و قیمت کو جانچا تھا، اس لیے ہندوستانی دَورِ وُسطیٰ کے برطانوی مورّخوں نے نہ صرف یہ کہ انھیں جُدا سمجھا بلکہ یہ بھی سمجھا کہ یہ دونوں تمدّن معیار کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ جیمس مل نے ہندوؤں کی حکومت، قوانین، مذہب، ادب، فن، تاریخ نگاری، فلسفہ، علومِ سائنس و ٹیکنالوجی، اخلاقیات اور آداب و اطوار پر بحث کی، جان بوجھ کر مسلمانوں سے ان کا مقابلہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تمدّن کے ہر دائرے میں مسلمان ہندوؤں سے بہتر تھے۔ ہوریس ہے مین ولسن نے اس بات کے حق میں دلیلیں دے کر کہ ہندو سوائے فنِ تاریخ نگاری کے ہر اعتبار سے مسلمانوں سے

Marfat.com

افضل ہیں، مل کے فیصلے کو درست کرنے کی کوشش کی۔ ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندوستان کا ماضی محض بیان کیا ہے، اس پر کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا ہے، [9] اس نے واقعی ہندو اور اسلامی تمدنوں میں معیار کے اعتبار سے فرق پایا۔

لیکن مل کے برعکس، الفنسٹن قومیت کو تمدن کا ماتحت نہیں بناتا۔ رومان پسندوں کی طرح وہ یہ سمجھتا تھا کہ "قومی" اکائیاں تمدن کے ڈھانچے میں رہ کر زیادہ لائق توجہ ہوتی ہیں۔ ہندوستانیوں کی بابت بلا ارادہ چھوٹے چھوٹے فیصلے صادر کر دیے گئے تھے۔ ان کو نظر میں رکھتے ہوئے اس نے زور دے کر کہا تھا کہ ہندوستان میں دس قومیں آباد ہیں جو آداب و اطوار اور زبان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنی ہی مختلف ہیں جیسے یورپ کی قومیں اور اسی کے ساتھ "اس عام یکسانیت کی بھی حامل ہیں جو مسیحی دنیا کی قوموں میں نظر آتی ہے۔" جیمس گرانٹ ڈف اور جیمس ٹوڈ پہلے ہی مرہٹوں اور راجپوتوں کو ہندو سماج کے عام ڈھانچے کے اندر "قوموں" کا درجہ دے چکے تھے۔ جوزف ڈیوی کننگھم، جو الفنسٹن کو مورخ کی حیثیت سے بڑا سراہتا تھا، سکھوں کو ایک علاحدہ قوم کا درجہ دیتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی بابت برطانوی تحریر کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو لگتا ہے کہ نشو و نما کے بارے میں اس کی اپنی ایک منطق تھی۔ یہ دور الیگزینڈر ڈاؤ کے کام سے شروع ہوا، جو ہندو مسلم سیاست کا پہلا عام مورخ تھا اور جسے سمجھا جاتا تھا کہ وہ محض فرشتہ کی کتاب گلشنِ ابراہیمی کا مترجم ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں ڈاؤ کے براہِ راست جانشینوں، یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں نے ہندو مسلم حکومت اور قانون نیز ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی سیاست پر تحقیقی کام کر کے دائرۂ تلاش و جستجو کو

Marfat.com

پھیلا دیا۔ اُدھر گبن نے اسلامی تمدّن کی ایک نئی تصویر بنائی جس سے مُسلم تاریخ کے اقتصادی، سماجی، اور تہذیبی پہلوؤں پر انواع و اقسام کے رنگ پڑتے تھے اور دوسری بہت سی باتیں اخذ کی جا سکتی تھیں، اُدھر جونس نے پورے ہندو تمدّن کو از سرِ نو تلاش کرنے کی کوشش کی۔

اس پس منظر کے ساتھ اور نہایت مختلف مفروضات اور مقاصد کے ساتھ، انجیلیوں اور افادیت پسندوں نے، جن کی نمائندگی انیسویں صدی کی ابتدا میں چارلس گرانٹ اور جیمس مل کرتے ہیں، یہ انداز نظر اختیار کیا کہ ماضی اور حال دونوں زمانے کے ہندوستانی معاشروں نیز تمدّنوں کے مطالعے کے ذریعے ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی تاریخ کو سمجھا جائے تاکہ برطانوی ہندوستان میں شاہی ذمّہ داری کو "اخلاقی شہنشاہیت" سے تعبیر کیا جا سکے، اور اس طرح ہندوستانی دورِ وسطیٰ پر لکھنے والے اپنے براہِ راست پیش رو مصنّفوں کے رویّوں سے انھوں نے یک لخت ناطہ توڑ لیا۔

ہندوستانی دورِ وسطیٰ پر برطانوی تاریخی تحریر کے کردار اور راہِ سفر کو اس ردِّ عمل نے متاثر کیا جو بنیادی سماجی تبدیلیوں کی وکالت کے باعث برطانوی ہندوستان اور برطانیۂ عظمیٰ دونوں ملکوں میں پیدا ہوا تھا۔ جون برگس جیسے بعض اینگلو انڈین حضرات نے اس بات پر زور دیا کہ شہادتوں کی کمی کے باعث ہندوستانی لوگوں پر اخلاقی فیصلے صادر نہیں کیے جا سکتے۔ جیمس ٹوڈ جیسے رومان پسندوں نے اپنی تحقیقات کے مضامین سے بہترین باتیں اخذ کر کے یہ دکھایا کہ ہندوستان میں اخلاقی شہنشاہیت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے جی۔ آر گلیگ جیسے قدامت پسندوں کو موزوں مواد فراہم کر دیا، جو برطانوی ہندوستان میں بنیادی سماجی تبدیلیوں کی مخالفت تقریباً اسی انداز سے کرتے تھے جس انداز

Marfat.com

سے اپنے وطن میں انتہا پسندی کی مخالفت کرتے تھے۔

ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن، اس دور میں ہندوستانی دورِ وسطیٰ کا آخری عام مورخ اس دور کے متعدد خصوصی رجحانات کی نمائندگی کرتا ہے، اور اس نے برطانیہ عظمیٰ میں ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی تاریخ کی بابت جو بھی علم تھا اس سب کا خلاصہ کر دیا ہے۔ دورِ روشن خیالی سے اپنے عقلی رشتے کے باعث وہ تمام عمر ہیوم اور گبن کو سراہتا رہا اور انھوں نے جن قدروں کی بنیاد پر فیصلے صادر کیے تھے ان قدروں کو تمام عمر مانتا رہا۔ رومان پسندوں سے اس کا جذباتی تعلق اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ہندو اور مسلمان میں تفریق کیے بغیر ہندوستانی ماضی کا مطالعہ پوری خیالی ہمدردی کے ساتھ کیا۔ ہندوستان میں بنیادی سماجی تبدیلی کے انجیلی اور افادیت پسند داعی جس اخلاقی شہنشاہیت کی تبلیغ کرتے تھے، اس تبلیغ کی حمایت کیے بغیر وہ ایک ایسی اخلاقی اور عقلی حیاتِ نو کا خواہش مند اور اس کے لیے کوشاں تھا جس کی بنا پر ہندوستان کے ماضی سے یک لخت ناتہ نہ ٹوٹے۔ ہندوستان کے ماضی کے بارے میں اس کی نظر، جسے ایک سیاسی آزاد خیالی سے قوت حاصل ہوتی تھی، اکثر اوقات اسے مستقبل میں ایک آزاد اور ''متمدن'' ہندوستان کی تصویر دکھاتی تھی۔

دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کے بارے میں اس وقت تک جو علم موجود تھا اس کو مختصر کرتے وقت الفنسٹن نے یہ کوشش کی تھی کہ ''مسلم'' ہندوستان کو اس پورے دائرے میں ایک جگہ دی جائے۔ اس کی کہانی میں راجپوتوں، مرہٹوں اور سکھوں کو بھی اتنا ہی اہم مقام دیا گیا تھا جتنا ہند مسلم ''قوموں'' کو دیا گیا تھا۔ ہند مسلموں کا نسلی مجموعہ، ان کی قومی خصوصیات، ہندوستان میں غیر مسلموں کی جانب ان کے رویے، ہند مسلموں کی حکومت، انتظام سلطنت، زبان، سماجی رسم و رواج، مذہبی عقائد اور مذہبی معمولات اور عادات و اطوار پر ہندوستانی ماحول کا

Marfat.com

اثر، ہندوؤں پر مسلم فتوحات کا اثر، ہندو دھرم پر اسلام کا اثر ــــ الفنسٹن کو دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کے ان سارے پہلوؤں میں اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی ہند مسلموں کی جنگوں، حکومت، ادب، فنون اور ان کی خوشحالی میں تھی۔ حالانکہ اس نے ہندو اور مسلم "قوموں" کو دو نہایت مختلف تمدنوں کے افراد کی نظر ــــ سے دیکھا تھا، پھر بھی اس کے نزدیک دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ ہندو مسلم مفاہمت کے نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتی تھی۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اکبر ہندوستان میں ایک "قومی" ریاست کا خالق تھا۔

دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کی جو ترجمانی الفنسٹن نے کی وہ اس کے فوراً بعد کے جانشین ایچ۔ ایم۔ ایلیٹ کو منظور نہ تھی، جس نے دورِ وسطیٰ کے ہندوستان کی ایک ایسی عام تاریخ لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا جو الفنسٹن کے مفروضات اور مقاصد سے بالکل مختلف مفروضات اور مقاصد مبنی تھی۔ ایلیٹ کی ببلیوگرافیکل انڈیکس ٹو دی ہسٹوریَنس آف محمڈن انڈیا (1849ء) دورِ وسطیٰ کے ہندوستان پر برطانوی تاریخی تحریر کی تاریخ میں نمایاں طور سے ایک نئے دور کا آغاز کرتی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے منصوبے ہی "مسلم" ہندوستان کا تصور واضح ہو گیا ہے اور دورِ وسطیٰ کا ہندوستان مخصوص مطالعے کا میدان بن گیا ہے۔ لیکن اس مطالعے کی حدود گھٹ کر ہند مسلم سیاستوں کی تاریخ بن گئی جو "دیسی روزنامچہ نگاروں" کی شہادت پر مبنی تھا۔ ایلیٹ کا علم و فضل اسے ہندوستانی دورِ وسطیٰ پر لکھنے والے بیشتر پیش رو مورخوں سے اتنا جدا گانہ مقام نہیں دیتا جتنا اس کا جارحانہ رویہ اور ذلت آمیز انداز نظر دیتا ہے۔

ایلیٹ کو دیسی روزنامچہ نگار زیادہ تر غبی، متعصب، لاعلم اور سطحی معلوم ہوئے۔ انھوں نے اسے ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے سماجی، سیاسی اور مذہبی اداروں کی بابت کچھ نہیں بتایا۔ اس کا دعوا تھا کہ اس کی تاریخ لکھنا ابھی باقی ہے۔ وہ اس منفی نتیجے پر پہنچا تھا کہ دورِ وسطیٰ کے مسلم مورخ جنھوں نے ہندوستان کی بابت

Marfat.com

لکھا اس بات کو نظر انداز کر گئے کہ لوگوں ـــــ جن کے بارے میں ایلیٹ کہتا ہے کہ زیادہ تر غیر مسلم تھے۔ کی زندگی پر استبدادیت کے کتنے خطرناک اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان روزنامچہ نگاروں نے اپنی ساری توجہ ہند مسلم دربار اور اس کی شان و شوکت پر مرکوز کر دی، اور اس طرح بے رحم قانون کے نقصان دہ اثرات کو بھی انداز کر گئے۔ اگر انھوں نے اپنے قیصروں کو سیوٹونیس کی دیانت داری سے دیکھا ہوتا، تو شاید وہ ہر دفعہ کسی نہ کسی کیلی گلا کی تصویر بناتے۔ ہندوستان میں مسلم حکومت کی بابت ایلیٹ کسی شاندار فریب نظر سے دھوکا نہ کھا سکا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت نے پانچ دہائیوں میں اپنے عوام کی بہبودی کے لیے جو کام کیے مسلمان اتنی ہی صدیوں میں نہ کر سکے۔ ایلیٹ نے اپنے ہر پیش رو سے مختلف ہو کر یہ کہا کہ "ہندوستان کے فرمانرواؤں کی حیثیت سے ہماری تقدیر"۔[12] لہٰذا، انیسویں صدی کے وسط تک یہ ابتدائی دور خاتمے کے نزدیک آچکا تھا۔ اس دور کی آخری بڑی کتاب جی۔ ڈی۔ کننگھم کی ہسٹری آف دی سکھس، پہلے ہی ۱۸۴۹ء میں شایع ہو چکی تھی۔ اسی سن میں ایلیٹ نے اپنی ببلیوگرافیکل انڈیکس شایع کی تھی۔

Marfat.com

حوالہ جات

۱۔ اس مقالے میں دیے جانے والے سارے ہی مشاہدات مندرجہ ذیل مصنفوں کی بڑی بڑی متعلقہ کتابوں کے کم و بیش تفصیلی مطالعے پر مبنی ہیں۔

Dew, A., The History of Hindostan, 3 Vols 1782-72

Gladwin, F., The History of Hindostan, Vol. I,

Calcutta, 1788.

Gladwin, F., Ayeen Akbary, 2 Vols. London 1800

Kirk patrick, W., 'The Institutes of Ghazan Khan

The New Asiatic Miscellany, Calcutta, 1789, 149-226.

Hamilton, C., The Hedaya or Guide, 4 Vols., London 1791

Hamilton, C., An Historical Relation of the Origin,

Progress, and final Dissolution of the Government of

Rohilla Afgans in the Northern Province of Hindostan

London, 1768

Scott, J., The memories of Eradat Khan, London, 1786

Scott, J., Ferishta's History of Dekhan, 2 Vol.,

Shrewsbury 1974.

Marfat.com

Francklin, W. The History of the Regin of Shaw Aulum, London, 1794.

Gibbon' E., The History of Declinc and Fall of Reman Empire 7 vol. 1776-88; edited, J.B. Bury. London, 1896-1900.

Jones, W., The Works, 13 Vols. London, 1807.

Price, D., Chrenological Retrospect, Or Memoir of the Principal events of Mohommedan History.3 Vols., 1811-21.

Maurice, T.. The Modern History of Hindostan, London, London 1802-10

Grant, C , Observations of the State of Society Among the Asiatic subjects of Great Britain.London 1813

Mill' J: The History of British India, 3 Vols London, 1817.

Erskine W., Memoirs of Zehir-ed-Din Mohammed Baker, London, 1826.

Wills, M., Historical Sketches of South India, 3 vols., London, 1810-17

Briggs. J., History of the Rise of the Mohommedan Power in India, 4 Vols., London, 1829

Marfat.com

Grant Duff, A History of the Mahrattas, 3 vols., London,1826.

Tod., J., Annals and Antiquities of Rajasthan. 2 vols. London, 1829-32

Gleig, G.R. The History of the British Empire in India, vol. I London, 1830

Elphinstone' M.. The History of India 2 vols., London 1841

Gunningham,J.D,A. History of the Sikhs, London 1849

Elliot,H.M. Bibliographical Index to the Historians of Muhammedan India, Calcutta'1849.

2. Mountstuart Elphinstone to William Erskine,18. 7, 1836 quoted Colebrooke T. E. Life of the Honourables Mount Stuart Elphinstone 2 vols., London, II p.345

3. Forbes D. The liberal Anglican Idea of History, Combridge' 1952.

4. Mountstuart Elphinstone to James Grant Diff Grant Duff,20.4 1822 quoted,Colebrooke T.E., Life of the Honourable Mountstuart Elphinstone. II.p. 137.

5. Whitehead, A.N. Adventures of Ideas, Cambridge, 1961, p.137

Marfat.com

6. The works of Sir, William Jones, 13 vols. London 1807 III, p. 19

7. Ibid.III pp. 1-9.

8. Birkbeck Hill. G , [ed.] The Memoirs of the life of Edward Gibbon,London, 1900

9. Forbes, D. The Libral Anglican Idia of History, p. 133 Philips. C.H., Historians of India ,Pakistan and Ceylon,London, 1961,p.7.

10 Elphinstone, The History, of India, I p. 323

11. Elliot, Perface, Bibliographical Index VIII, XV.

12. Ibid, XXX.

Marfat.com

سرسید اور مولانا شبلی

زیڈ۔ ایچ۔ فاروقی

علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید احمد خاں (1817ء تا 1898ء) کئی لحاظ سے نمایاں خصوصیتوں کے حامل تھے۔ انہیں اس لحاظ سے بھی ممتاز حیثیت حاصل ہے کہ انھوں نے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر مسلمانوں کی توجہ ان کارناموں کی طرف مبذول کرائی جن کا تعلق ان کے ماضی سے تھا۔ انھوں نے شبلی کی کتاب المامون پر 1889ء میں جو دیباچہ لکھا تھا اس میں ان کے اس رجحان کی جھلک پورے طور پر موجود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے سوچنے کے ڈھنگ میں یہ رجحان اس طور پر نہیں پایا جاتا کہ اسے بیماری کی حد تک بڑھی ہوئی رومانیت کہا جا سکے، لیکن یہ بات بہرحال درست ہے اور ان مختلف اصلاحی سرگرمیوں سے پہلے کی علمی دلچسپیاں اس کی گواہ ہیں۔ اس رجحان نے ان کے علیگڈھ کے ایک قریبی رفیق شبلی (1857ء تا 1914ء) کی ذات میں ایک ٹھوس شکل اختیار کرلی، جنہوں نے ادب، تاریخ اور دینیات میں اپنے گہرے لگاؤ کے باعث اردو میں فن تاریخ نگاری کو ایک ٹھوس مقصد اور سمت عطا کی۔ اس مقالے میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ ان دونوں حضرات نے اس میدان میں جو کوششیں کی ہیں انہیں مختصراً جانچا جائے۔

سرسید کی تعلیم پرانے انداز پر ہوئی۔ لیکن ان میں آزادی سے سوچنے اور

Marfat.com

آگے بڑھ کر کام کرنے کی صلاحیت تھی، وہ کیریکٹر اور اخلاقی قوت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے خاندان اور اپنے روحانی پیشواؤں (شاہ علام علی کی خانقاہ کے لوگ) کی منشا کے خلاف انگریزوں کی ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ان کی عمر اکیس سال تھی۔ اس وقت سے لیکر 1857ء تک جب ان کی زندگی میں ایک اہم موڑ آیا، انہوں نے اگر کوئی کام کیا تو اس کا تعلّق علم و ادب سے تھا۔ تاریخ اور ادب سے ان کو گہری دلچسپی تھی۔ انہوں نے روایتی انداز میں راہِ سنت اور کلمات حق جیسے رسالے لکھے، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی امور کے معاملے میں وہ ہنوز دورِ وسطیٰ میں رہ رہے تھے اور ابھی مغرب کی آزاد خیالی سے متاثّر نہیں ہو پائے تھے۔ لیکن جہاں تک تاریخ کا تعلّق ہے ایسے شواہد ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ مغرب کی علمیت سے واقف ہو رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ انہیں ان پر مسرّت دنوں کا پورا احساس تھا جب مسلمانوں نے ہندوستان کی تاریخ اور تہذیبی ارتقا میں اہم حصّہ لیا تھا۔ ان کی یادگار کتاب آثار الصنادید اس بات کی تائید کے لیے موجود ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ
آثار پدید است صنادیدِ عجم را

اس شعر سے ان اچھے دنوں کے متعلّق سر سید کے گہرے جذبے اور وابستگی کی ترجمانی ہوتی ہے جب ہندوستان میں مسلم تہذیب اپنے شباب پر تھی۔ اس سے ان کے اس ذہنی رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے جس نے انہیں آمادہ کیا کہ خواہ کھنڈرات ہی کے روپ میں، اس گذرے ہوئے قافلے کے آثار ہی محفوظ کرلیں جس سے خود ان کا تعلّق تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ ذہنی رجحان برابر قائم رہا، کیونکہ شبلی کی المامون کے دیباچے میں بھی انہوں نے کچھ اسی انداز سے لکھا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا:

Marfat.com

"یہ نہایت سچا مقولہ ہے کہ وہ قوم نہایت بد نصیب ہے جو اپنے
بزرگوں کے کارناموں کو بھلا دے یا ان کو نہ جانے"!

لیکن قطع نظر اس کے، یہ کتاب سرسید کی سخت کاوشوں اور اس علمی منصوبہ بندی پر بھی روشنی ڈالتی ہے جس کے تحت تصنیف و تالیف کا کام کیا جاتا ہے۔ اس ایڈیشن میں کئی خامیاں تھیں۔ مثال کے طور پر، تاریخی عمارتوں کے نقشے تو مکمل تھے، لیکن ان سے متعلقہ کتبات نامکمل رہ گئے تھے اور پورے طور سے نقل نہ کیے گئے تھے۔ اس کتاب کی زبان پر تکلف اور جگہ جگہ مبالغہ آمیز تھی۔ سرسید ان خامیوں سے واقف تھے، اور دوسرے ایڈیشن میں جو 1854ء میں شائع ہوا تھا آخری باب، جس میں دہلی کے شاعروں، عالموں، صوفیوں اور فنکاروں کا ذکر تھا' ایڈورڈ تھامس کے مشورے سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان اور خالص علمی تحقیق دونوں کے نقطۂ نظر سے یہ کتاب تاریخ کا ایک معیاری تحقیق کام بن گئی۔ بہرکیف دوسرے ایڈیشن کی بدلی ہوئی زبان سے قطع نظر، تاریخ نگاری کے فن کے پیش نظر سرسید کے بارے میں ڈاکٹر حبیب اللہ کی رائے بڑی جائز لگتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: "عہدِ وسطیٰ کے مسلمان مورخین کی روایتوں نے اُردو کی اپنی کتابوں پر بھی ناگزیر طور سے اپنا اثر ڈالا۔ سرسید احمد خاں کی آثار الصناوید میں، جو اُردو میں تاریخ کی اولین کتابوں میں سے شمار ہوتی ہے، یہ اثر نمایاں ہے۔ اس میں ان کے اپنے شہر دہلی کے آثارِ قدیمہ کا بیان ہے اور ساتھ میں تاریخی عمارتوں کے نقشے ہیں نیز ایک باب اس زمانے کے سماج اور طور و طریق پر ہے۔ اگرچہ اس میں ماضی کی تاریخ کی سلسلہ وار بیان نہیں ملتا لیکن اس کا تاریخی مقصد واضح ہے اور روزنیتھال کی تقسیم کے مطابق یہ اسی طرز سے لکھی گئی ہے جسے "لوکل ہسٹری" کہا جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ سرسید احمد خاں کے دل میں اس کتاب کے لکھنے کا خیال اس وجہ سے پیدا ہوا ہو کہ اس سے چند برس پہلے ایک برطانوی افسر کی دعوت پر فارسی

Marfat.com

میں آگرہ (اکبرآباد) کی روتاریخیں لکھی جاچکی تھیں ..... جس قسم کی تفصیلات ان کتابوں میں ملتی ہیں اسی طرح کی تفصیلات تقریباً سبھی فارسی تاریخوں میں درج کی جاتی تھیں، اور طبقاتِ اکبری اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ سرسید احمد خاں نے 1839ء میں فارسی میں جامِ جم لکھی تھی، اس میں تیمور سے لیکر بہادر شاہ تک تمام مسلمان بادشاہوں کی مدتِ حکومت، سال تاجپوشی، سنِ پیدائش اور موت وغیرہ کا اندراج جدولوں کے ساتھ ملتا ہے۔ یہ دراصل تاریخ نگاری کی وہ شکل ہے جسے "تقویم" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آثار الصنادید سے بھی اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف تاریخ نگاری کے سلسلے میں تاریخ کے ماخذوں کی اہمیت سے خوب واقف تھا۔ آثار کی تیاری میں انہوں نے جن اصل ماخذوں سے استفادہ کیا ان کی فہرست دی ہے۔ اس سے بجا طور پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جب وہ ضروری کتابوں سے استفادہ کر رہے تھے، انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، مخطوطوں کی شکل میں کتابیں اس حالت میں ملی ہوں گی کہ ان سے فائدہ اٹھانے میں وقت ہوتی ہوگی اور انہوں نے یہ منصوبہ بنالیا ہوگا کہ اگر زمانے نے کچھ فرصت دی تو ان میں سے کم از کم چند کتابوں کی اشاعت کا انتظام ضرور کریں گے۔ 1855ء میں انہوں نے ابوالفضل کی آئینِ اکبری کا پہلا لتھوگراف ایڈیشن چھپوایا جس کا متن ان متنوں کے مقابلے کے بعد حاصل ہوا جو مہیا ہوسکے اور اس میں قابلِ قدر توضیحات کا اضافہ کیا گیا۔ محض یہی دو کتابیں (آثار اور آئین) انہیں دنیا کے عالموں میں اونچا مقام دلواسکتی ہیں"[2] چند برس بعد 1862ء میں انہوں نے برنی کی تاریخ فیروز شاہی کی تدوین کی، اور 64-1863ء میں تزکِ جہانگیری کی تدوین کر کے شائع کرایا۔ یہ سب اپنی اپنی نوعیت کے پہلے کام تھے جن سے دوسروں کو یہ احساس ہوا کہ صحیح تاریخ لکھنے میں مغربی طریقہ کار کی کیا اہمیت ہے۔ سرسید کے طریقہ کار اور

Marfat.com

اندازِ نظر سے جو اصل دستاویزوں کے مطالعے پر مبنی تھا، مولانا شبلی خاص طور پہ بے حد متاثر ہوئے۔

مولانا شبلی، بہر حال، ایک مختلف طبیعت کے شخص تھے۔ سر سید کی طرح انہیں بھی اسلام کے روایتی علوم کی تعلیم و تربیت دی گئی تھی۔ لیکن سر سید کے مقابلے میں ان کا اسلامی علوم و ادب کا مطالعہ زیادہ وسیع اور گہرا تھا۔ لیکن سر سید حقیقت پسند تھے اور نئے زمانے کی جنویتوں کو پوری طور سے جانتے اور مانتے تھے، جبکہ شبلی رفتہ رفتہ عینیت کی طرف جھکتے گئے اور ان کے یہاں ایک طرح کی رومانیت بڑھتی گئی جس سے وہ اپنے آپ کو کبھی الگ نہ کر سکے۔ سر سید اور حالی (1837ء تا 1941ء) کے برخلاف انہیں نہ صرف یہ کہ اسلام کی عظمت رفتہ کے ذکر کا شوق تھا، بلکہ انہوں نے اسے بیان کرنے کے واسطے ایک پورا پروگرام بنایا تھا۔ انہوں نے مسلم تاریخ کی عظیم شخصیتوں اور ان کے زمانے کے حالات کی تعریف کی اور انہیں دوبارہ زندہ کر دیا۔ انہوں نے رسول کی ذی اثر سوانحوں، اسلام کی ابتدائی برسوں کی عظیم شخصیتوں اور خوشحال عباسی حکومت جس میں بڑے بڑے علمائے دین اور ایرانی شاعر گزرے ہیں، ان سب کے بارے میں ایک پورا سلسلہ کتب قائم کر کے مسلمانوں کو ان کے عظیم ورثے کی یاد اس طرح دلائی کہ وہ اسے بھول نہ سکیں۔[4] علاوہ ازیں، انہوں نے اسلام اور اس کی عظیم شخصیتوں کی دفاع کی مہم بھی شروع کر دی، جس مہم میں وہ اپنی ماخذی مواد کے موزوں استعمال کے باعث خاصے کامیاب رہے جو مواد انہیں دستیاب ہو گیا۔ وہ علمیت کے جدید تقاضوں سے پوری طرح واقف تھے لیکن بعض اوقات اپنی رومانیت کے باعث وہ غیر معروضی ہو جاتے تھے اور عذر پیش کرنے لگتے تھے۔ پھر بھی وہ اپنے زمانے کے غالباً اکیلے مورخ ہیں جو فنِ تاریخ کے بارے میں ٹھوس نظریات رکھتے تھے۔ اپنی مشہور و معروف کتاب الفاروق کے دیباچے میں وہ مسلم فنِ تاریخ نگاری کے میدان کے ابتدائی باکمال مورخوں، جیسے ابن قیتبہ (المتوفی

Marfat.com

276ھ)، واقدی (المتوفی 230ھ)، البلاذری (المتوفی 279ھ)، طبری (المتوفی 310ھ) اور مسعودی (المتوفی 386ھ) کی بڑے پرزور انداز میں تعریفیں کرتے ہیں، لیکن ان لوگوں کی ذہنی تنزّلی کا رونا روتے ہیں جو پانچویں صدی کی ابتدا میں ان کے بعد آئے۔ وہ ابن خلدون (1332ء تا 1406ء) کے علاوہ ان سب پر بڑی تنقید کرتے ہیں۔ ان کے بموجب ابن خلدون ہی وہ شخص تھا جس نے فلسفۂ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ وہ کہتے ہیں کہ تاریخ لکھتے وقت دو باتوں پر نظر رکھنی چاہیئے:

(1) "جس عہد کا حال لکھا جائے اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات درج کیے جائیں یعنی تمدّن معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب — ہر بات پر پورا زور دینا چاہیئے۔"

(2) "کوشش کرنی چاہیئے کہ تمام واقعات میں سبب اور مسبّب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔"

ان کا کہنا ہے کہ ابتدائی تاریخوں میں یہ طریقِ کار نہیں ملتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ابتدائی مورخین عام طور پر فلسفے اور عقلی علوم سے ناواقف تھے۔ وہ ان مختلف علوم سے بھی ناواقف تھے جن کا تعلق تاریخی واقعات سے ہوتا ہے۔ اس لیے نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر صورتوں میں سیاسی واقعوں، جنگوں، تہواروں اور حکومتوں کے عروج و زوال کو محض بیان کر دینے پر اکتفا کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم نکتہ ہے: تاریخ کی کتابوں میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ عام طور پر کس حد تک لائقِ اعتبار ہیں؟ واقعات کی درستی کو جانچنے کے دو طریقے ہیں — روایت اور درایت۔ چونکہ مُسلمانوں میں حدیث اور رجال کے علوم کی پوری نشوونما ہو چکی تھی، اس لیے ابتدائی مُسلم تاریخ نویسوں نے روایت کے طریقے کا پورے طور سے اور تنقیدی انداز سے استعمال کیا، لیکن درایت کا طریقہ کا نظر انداز کر دیا گیا۔ درایت سے ان کی مراد مختصراً یہ ہے کہ عقلِ سلیم اور اصولِ عقلی کی روشنی میں واقعات کو جانچا اور ماخذوں کو پرکھا جائے۔ وہ اس بات کے بھی حق میں تھے کہ اصولِ اسباب و علل کی

Marfat.com

روشنی میں واقعات کی ترجمانی کرتے وقت قیاس اور اجتہاد سے کام لینا چاہیے"۔ اور اسی باعث انہیں یوروپی مورخوں میں عیب نظر آتے ہیں۔ زبان اور محاوروں کے بارے میں ان کا خیال یہ ہے کہ سادہ زبان میں بیان کر دینے چاہئیں اور انداز بیان کی لطافتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔

یہی وہ اصول ہیں جو ان کے بیان کے مطابق تاریخ لکھتے وقت اپنانے چاہئیں۔ لیکن یہ بہرحال بدنصیبی ہی تھی کہ وہ خود پورے طور سے ان اصولوں پر کاربند نہ ہوئے۔ اپنی روایتی تعلیم خصوصاً وہ تعلیم و تربیت جو انہوں نے ادب اور مکتبی دینیات میں حاصل کی، نیز اسلامی تمدّن کی عظمت کے اظہار اور مدافعت کی جو ذمہ داری انہوں نے خود اپنے سر لے لی تھی، ان سب باتوں کے باعث "تاریخ ان کے نزدیک انسانی سماج کی سیاسی، سماجی اور مادی ترقّی نہ رہی بلکہ بنیادی طور پر عقلی اور تہذیبی ارتقا کی تاریخ بن گئی"۔[5] مزید یہ کہ 'المامون' میں وہ عذر پیش کرتے نظر آتے ہیں اور الفاروق میں غیر معروضی ہو جاتے ہیں۔

شبلی نے ہندوستانی تاریخ پر بہت کچھ نہیں لکھا' اور اس ضمن میں بھی ایک نکتہ لائق توجہ ہے۔ وہ دینیاتِ اسلام کو اپنا وطن اور اس کی تاریخ کو اپنی قومی تاریخ سمجھتے تھے۔ المامون کے مقدمے میں وہ کہتے ہیں: "ہندوستان کی بہت سی تاریخیں لکھی گئیں اور مغلیہ اور تیموریہ کے کارنامے بڑی آب و تاب سے دکھائے گئے، لیکن ظاہر ہے کہ ہندوستان کی مجموعی تاریخ ہماری قومی تاریخ کا ایک بہت چھوٹا حصّہ ہے"۔[6] یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان سے باہر اسلام اور اس کے کارناموں کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ ان کا رسالہ' اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر' واحد کتاب ہے جو انہوں نے ہندوستان کی تاریخ پر لکھی۔ اس کے علاوہ ان کے چند مضامین اور ہیں، مثلاً گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ، جہانگیر کی توزک، عبدالباقی کی مآثر رحیمی زیب النساء، مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے

Marfat.com

اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی اور ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدّن کا اثر۔

(1) اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر:

یہ چھوٹی سی کتاب، جو ہندوستانی تاریخ کی ان چند کتابوں میں شمار ہوتی ہے جو اوریجنل کہی جاسکتی ہیں، اورنگ زیب کے دماغ میں ہے۔ شبلی کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کو ہمیشہ غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے، اور انگریز مورخوں نیز ان ہندوستانیوں نے جنھوں نے آنکھ بند کرکے انگریزوں کی پیروی کی ہے، اس کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔ گو ان کی دلیلیں سیاسی نوعیت کی ہیں۔ لیکن ان سے ان کا مذہبی رجحان بھی ظاہر ہوتا ہے، اور اورنگ زیب کے عہد سے متعلّق بعد میں جو دستاویزیں ملی ہیں اور جو اس وقت انہیں حاصل نہیں تھیں، ان کی بنیاد پر کئی باتوں میں ان کی تردید کی جاسکتی ہے۔ انگریز مصنفین مثلاً الفنسٹن اور لین پول پر ان کی تنقید اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ اس سے ان کا انگریز مخالف رویّہ ظاہر ہوتا ہے۔ جو کچھ تو ان کے اتحادِ اسلامی (پین اسلام ازم) کے خیالات کے باعث تھا اور کچھ علیگڈھ تحریک سے ان کی مخالفت کے باعث تھا۔ اس کتاب میں صرف چند ایک نزاعی پہلوؤں اور واقعوں کو یہ دکھانے کے لیے پرکھا گیا ہے اور ان کی وضاحت کی گئی ہے کہ ناروا داری اور عہد شکنی کے جو الزامات اورنگ زیب پر لگائے جاتے ہیں ان کا کوئی جواز نہیں ہے۔ مُصنّف جو خود ایک حنفی سنّی تھے، اس کوشش کے باوجود کہ معروضیت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، غیر جانبدار نہ رہ سکے ہیں۔ کیونکہ اورنگ زیب کی مذہبیت، حکومت کے کاروبار میں مذہبی اصولوں پر اس کے عمل اور کٹر مذہبی لوگوں کی بتائی ہوئی راہِ مستقیم سے دارا شکوہ کا گریز اور اس پر اورنگ زیب کی ناپسندیدگی، شبلی اس سبب کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔

(2) ہمایوں نامہ، معاصرِ رحیمی اور توزک جہانگیری۔ شبلی کے یہ تینوں مضامین دراصل

Marfat.com

ایک طرح کی ادبی تقریظیں ہیں، یہ علی الترتیب ۱۹۰۷ء، 1908ء اور ۱۹۱۰ء میں رسالہ الندوہ لکھنؤ میں شائع ہوئے تھے۔ ان مضامین کے لکھنے اور شائع کرنے کا مقصد، ایسا معلوم ہوتا ہے، یہ تھا کہ اُردو پڑھنے والے حلقے میں ان تاریخی ماخذوں کو متعارف کیا جائے اور ہندوستان کے مسلم حکمرانوں اور امراء کے شاندار کارناموں کو عام کیا جائے۔ شبلی کی عظمت اس میں ہے کہ ان میں تاریخ کا شعور بدرجہ اتم تھا اور اس کے ساتھ انہیں اس کی فکر تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ مستند اوریجنل ماخذوں کی معقول، بے لاگ اور ایماندارانہ جانچ اور پرکھ کے بعد از سرنو لکھی جائے۔ انہوں نے ان کتابوں کو اسی نقطہ نظر سے جانچا ہے اور پھر اس لحاظ سے ان کی اہمیت بتائی ہے کہ یہ کتابیں بنیادی ماخذ ہیں اور ان سے مغلوں کے تہذیبی کارناموں سے متعلق باوثوق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کہیں کہیں معذرت اور مدافعت کی جھلکیاں ہیں، لیکن مجموعی اعتبار سے یہ تحریریں اس کی شاہد ہیں کہ شبلی دراصل طبعاً مورخ تھے اور اپنی قوم کو تاریخ کا درس دینا چاہتے تھے"۔[7]

(3) زیب النساء — اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء کی زندگی سے متعلق یہ چھوٹا سا مضمون ۱۹۰۹ء میں الندوہ میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کے لکھنے کی تحریک یوں ہوئی کہ اس زمانے میں ایک انگریزی رسالے انڈین میگزین اینڈ ریویو میں زیب النساء پر ایک سستے قسم کا مضمون چھپا جو سنی سنائی باتوں اور بازاری افواہوں پر مبنی تھا۔ اس میں شبلی نے اس بات پر افسوس کیا ہے کہ انگریز مصنفین جو غلطیاں کرتے ہیں وہ عام طور پر پھیل جاتی ہیں اور بڑے جوش وخروش سے انہیں سنا اور کہا جاتا ہے۔ وہ نسل در نسل چلتی رہتی ہیں۔ اور لاعلم لوگوں کے ذہن میں مسلمانوں کی اخلاقی زندگی کے بارے میں برے خیالات پیدا ہوجاتے ہیں۔ ان تمہیدی جملوں کے بعد انہوں نے زیب النساء کی زندگی کے حالات، مستند تذکروں اور معاصرین کی کتابوں سے اخذ کرکے لکھے ہیں۔ انہوں نے معاصر الامراء، معاصر عالمگیری، سرو آزاد، خزانہ عامرہ، عالمگیر نامہ، ید بیضا اور مخزن الغرائب سے بہت سے حوالے دیے ہیں

Marfat.com

اور مغل شہزادی کے کمالات ظاہری و معنوی تیز اس کے کردار کی ایک صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کی زبان سادہ اور دلیلیں وزنی ہیں۔

(4) ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدّن کا اثر ـــــ یہ مضمون ایک مختصر سی تمہید سے شروع ہوتا ہے اور میرا خیال ہے کہ تاریخ کے بارے میں شبلی کے اندازِ نظر کی عکّاسی کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں :

"کسی غیر قوم کا کسی غیر ملک پر قبضہ کرنا کوئی جرم نہیں، ورنہ دُنیا کے سب سے بڑے فاتح سب سے بڑے مجرم ہوں گے۔ لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ فاتح قوم نے ملک کے تہذیب و تمدّن پر کیا اثر پیدا کیا۔ چنگیز خاں فتوحات کے لحاظ سے دنیا کا فاتحِ اعظم ہے لیکن اس کی داستان کا ایک ایک حرف خون سے رنگین ہے۔ مرہٹے ایک زمانے میں تمام ہندوستان پر چھا گئے لیکن اس طرح کہ آندھی کی طرح اُٹھے، لوٹا مارا، چوتھ وصول کی اور نکل گئے۔ بخلاف اس کے متمدن قوم جب کسی ملک پر قبضہ کرتی ہے تو وہاں کی تہذیب و تمدن دفعتاً بدل جاتے ہیں۔ سفر کے وسائل، رہنے سہنے کے طور، کھانے پینے کے طریقے، وضع و لباس کا انداز، مکانوں کی سجاوٹ، گھروں کی صفائی، تجارت کے سامان، صنعت و حرفت کی حالت، ہر چیز پر ایک نیا عالم نظر آتا ہے، اور گو مفتوح قوم ضد سے احسان نہ مانے، لیکن در و دیوار سے شکرگذاری کی صدائیں آتی ہیں۔"[9]

اس بیان میں اسی رجحان کی جھلک موجود ہے کہ اسلام سے پہلے دُنیا میں ہر طرف اندھیرا تھا۔ ہندوستان میں، جہاں تک زندگی کے تہذیبی اور تمدّن پہلوؤں کا تعلّق ہے، ہندوؤں میں کوئی لائقِ ذکر بات نہیں تھی۔ البیرونی نے کتاب الہند میں جو کچھ لکھا ہے یہ رجحان اس سے کس قدر مختلف ہے۔ لیکن یہ ایک خصوصیت ہے اور یہی خصوصیت حالی، ذکا اللہ اور دوسروں میں بھی ملتی ہے۔ مضمون بہر حال، قابلِ مطالعہ ہے اور شبلی نے ثابت کیا ہے کہ مسلمان کتنی ہی چیزیں اپنے ساتھ ہندوستان لائے۔ اس کتاب میں بھی وہ اپنے

Marfat.com

دعوے کی حمایت میں تزکِ بابری، خافی خان، تزکِ جہانگیری، آئینِ اکبری اور معاصر الامراء جیسے اصل ماخذوں سے بہت سے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

(5) مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی۔ اس مضمون سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ مسلمان علم و فن کے قدر دان تھے اور ان کو تعلیم دی گئی تھی کہ علم مسلمانوں کا کھویا ہوا سرمایہ ہے اور جہاں یہ ملے حاصل کرلیں۔ ہندوستان آنے سے قبل انہیں علم و فن سے لگاؤ رہا تھا اور جب وہ یہاں آئے تو یہ روایت اپنے ساتھ لائے۔ شبلی نے یہ مضمون بھی ایک اشتعال انگریزی کی بنا پر لکھا تھا۔ بھارت مترکلکتہ کے ایڈیٹر نے ملامسیح کی رامائن پر ریویو لکھا اور مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا:

"صدیوں سے ایک ایسی کتاب گمنامی کے ظلمات میں پڑی ہوئی تھی، وجہ شاید یہ ہو کہ مکانوں نے اسے پسند نہ کیا ہو۔"

"مسلمانوں نے صدیوں اس ملک پر مسلسل حکومت کی، اور اس کا خاتمہ بھی ہوگیا، مگر اس ملک کے علم و ادب کی طرف انہوں نے بہت کم توجہ کی..... امیر خسرو نے یہاں کی زبان کی طرف توجہ کی تھی مگر محض تفریح کے خیال سے۔ ہندوؤں کی کتابوں کے مطالعے کی طرف کبھی ان کا خیال نہ ہوا، نہ وہ ان کی کچھ خبر رکھتے تھے۔"

"مگر عہدِ اکبری میں جو کچھ ہوا وہ بہت محدود تھا۔" "داراشکوہ نے البتہ ہندوؤں کے اونچے درجے کی کتابوں کی طرف بھی توجہ کی تھی..... لیکن اس کوشش کی بدولت جو آپ نے ہندوؤں کی کتابوں کو جاننے کے لیے کی تھی، آپ کو کفر کا فتویٰ ملا اور جان دینا پڑی۔"

شبلی اسی طرح کے اقتباسات دیتے ہیں اور انہیں یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ بھارت متر کے ایڈیٹر جیسے عمدہ ذہن کے ہندو بھی بعض اوقات اپنی لاعلمی کی بنا پر ایسے

Marfat.com

بے بنیاد الزام لگا دیتے ہیں۔ انہوں نے اس الزام کی سخت تردید کی ہے کہ ملا مسیح کی زندگی اور کارناموں کی بابت ذکر نہیں ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فارسی شاعروں کا کوئی ایک تذکرہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں مسیح کا نام نہ آیا ہو ایڈیٹر نے لکھا تھا کہ ملا مسیح پانی پت کا رہنے والا تھا، اور اس کے بارے میں سوائے اس کے کچھ اور نہیں معلوم ہوتا ہے۔ شبلی کا کہنا ہے کہ جہانگیر کے امرا میں ایک امیر مقرّب خاں تھا جو دراصل پانی پت کا رہنے والا تھا لیکن اس نے کرانہ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ مسیح کرانہ کا رہنے والا تھا، لیکن چونکہ اسے مقرّب خاں کا قرب اور سرپرستی حاصل تھی، اس لیے اس کے بارے میں بھی یہ سمجھا جانے لگا کہ پانی پت کا رہنے والا تھا، تقریباً ہر تذکرے میں اس کی رامائن کا ذکر موجود ہے، اور معاصرالامراء کے مُصنّف نے اس کے بعض منتخب اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ عوام نے اسے اس لیے بھلا دیا کہ شاعری کی حیثیت سے اس میں کوئی خوبی نہ تھی۔ فردوسی نے اپنے شاہ نامہ میں غیرمُسلم ایرانیوں کی شجاعت اور کارناموں کا ذکر کیا، اور صولت ترکستانی نے صولتِ فاروقی لکھی جس میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے کارناموں کی تعریف کی۔ لیکن کیا ہوا؟ فردوسی کو فارسی شاعری کا ہر طالب علم پڑھتا اور جانتا ہے، جبکہ صولتِ فاروقی سے کوئی واقف نہیں ہے۔ ملا مسیح محض ایک معمولی شاعر تھا، اس نے اگر رسولِ خدا کے بارے میں لکھا ہوتا تب بھی عوام اسے نہ جانتے۔

شبلی نے اپنے اس مضمون میں ان سارے الزامات کی تردید کی ہے، اور ماخذوں ہی کی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ ترکوں اور مغلوں کو اس بارے میں کوئی تعصب نہ تھا۔ لیکن یہ سوال جوں کا توں باقی رہتا ہے کہ عام طور پر ہندوؤں

Marfat.com

اور مسلمانوں دونوں ہی نے بالکل عقلی اعتبار سے کیا یہ غلطی نہیں کی ہے کہ ایک دوسرے کے مذہب کو نہ پڑھا ہے نہ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ آج کے مورخوں سے توقع ہے کہ اس سوال کا جواب دیں گے۔ ان سے یہ بھی توقع ہے کہ اس لاپرواہی کے اسباب و نتائج کی چھان بین کریں گے۔

Marfat.com

حوالہ جات

۱۔ شبلی، المامون، قومی پریس، لکھنؤ، این، ڈی، صفحہ ۱ ۔

2. Habibullah'A.B.M.' Historical writing in Urdu,; A Survey of Tendencies' in Historions of India, Pakistan by C. H. Philips. London,1961, p.482-83

3. M.Mujeeb. Indian Muslims,London.

4. W.C.Smith,Modern Inslam in India, London,1946 . p.43.

5. Habibullah, Op. Cit., p.478

6. Shibli Op. Cit Parr Part I' p.2

7. Habibullah, Op. cit., p.486

8۔ مقالات شبلی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، 1937، صفحہ ۱۹۴

Marfat.com

مغل ہندوستان کے بعض سوویت مورخین

سریندر گوپال

ہندوستان اور سوویت یونین میں بڑھتے ہوئے دوستانہ تعلقات کے ساتھ سوویت یونین میں ہندوستانی علوم سے گہری دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ وہ جدید ہندوستان کی تاریخ کا خاص طور سے مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن برطانوی فتوحات اور ہندوستان کے معاشی استحصال سے تعلق رکھنے والے مسائل کو سمجھنے اور ان کے تجزیہ کرنے کے خیال سے سوویت مورخوں نے مغلوں کے عہد میں ہندوستان کی معاشی زندگی پر خاص طور سے توجہ دی ہے۔

مارکس اور لینن کے مقلد ہونے کی وجہ سے سوویت مورخین اقتصادی امور میں عقیدہ جبر کے حامی ہوتے ہیں اور زیادہ تر اقتصادی تاریخ پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ جاگیردارانہ دور کے بارے میں وہ عموماً صنعتی اور زرعی پیداوار کی تکنیکوں اور صورتوں، نظامِ زر کی حدود وانتہا، دیہاتوں کو شہروں میں بدلنے کا عمل، شہروں کی نوعیت، زمین کی ملکیت کی نوعیت وغیرہ کی بابت مطالعہ کرتے ہیں اور اس سوال کا جواب فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا جاگیردارانہ اقتصادیات میں سرمایہ دارانہ نظام کے عنصر شامل تھے یا نہیں۔ اس مقالے میں عموماً ہماری کوشش یہ رہے گی کہ مغل ہندوستان میں دستکاری پیداوار کی قسموں کی بابت سوویت عالموں کے نظریات کا مطالعہ کیا جائے۔

Marfat.com

یہ وہ موضوع ہے جو اُن کے درمیان ہونے والے گرما گرم مباحثوں کا مرکز رہا ہے۔ اس پر بڑی حد تک اس سوال کے جواب کا دارومدار رہا ہے کہ مغل دور میں آیا سرمایہ دارانہ نظام کے جراثیم موجود تھے یا نہیں۔

مرحوم پروفیسر رائزنر نے، جن کے سر موجودہ سوویت ماہرین ہندوستانیات کے گروہ میں مغل عہد کے ہندوستان کی اقتصادی تاریخ میں شوق کی جوت جگانے کا سہرا باندھا جاتا ہے، اپنے رسالے نارودنی ڈویژنیاوی انڈائی وی XVII تا XVIII وی وی (ہندوستان میں سترھویں اٹھارویں کی صدیوں کی مقبول عام تحریکیں) میں اسی مسئلے کو اُٹھایا تھا۔ حالانکہ مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کی تحریکیں اس کتاب کا اصل موضوع ہیں، مگر پروفیسر رائزنر نے پہلے باب میں سترھویں صدی کے دوسرے نصف میں مغل سلطنت کی سماجی و اقتصادی تاریخ کی بعض خصوصیات پر بحث کی ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق اقتصادی زندگی کی مشترکہ خصوصیات یہ تھیں: "ایسی برادری جو کاشتکاروں اور دستکاروں کا مجموعہ تھی، طبقوں اور ذاتوں کی تقسیم ہر جگہ خلط ملط تھی؛ بچی کھچی غلامی اور آبائی املاک نیز قوم واری ڈھانچے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہندوستان میں حرفوں کو کاشتکاری سے پورے طور پر علاحدہ نہیں کیا گیا تھا، اور تجارتی تعلقات کی نشوونما بس اس حد تک ہو پائی تھی کہ ہندوستانی مشترکہ منڈی تو ایک طرف رہی، ایسے بازار بھی نہیں تھے جو ہندوستانی عوام کے مختلف علاقوں کو چھوتے ہوں۔ ملک کے چھوٹے چھوٹے علاقوں والی جاگیردارانہ تقسیم کا خاتمہ نہ ہو پایا تھا"[3] مصنف مارکس کے اس نظریے کی تائید کرتا ہے کہ ایسے جاگیردارانہ نظام کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ گھریلو دستکاریاں ہوتی ہیں اور لوگ چھوٹی چھوٹی زمینوں کے مالک ہوتے ہیں[4]۔ ہندوستان میں جاگیرداروں کی جائداد و املاک سرکاری زمین کی صورت میں قائم رہی تاکہ ان ذرائع آبپاشی پر سب کا اختیار رہے جو زرعی پیداوار کے لیے نہایت ضروری تھے[5]۔ سرکاری زمین جائداد ایک ایسی علامت تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ

Marfat.com

زمین اور ذرائع آبپاشی پر پورے جاگیردار طبقے کی اجارہ داری ہے، اور اسی کے باعث بڑے بڑے جاگیردار اپنی برتری جتایا کرتے تھے۔

عظیم مغل کا دعویٰ تھا کہ اس کی سلطنت کی آٹھویں حصّہ قابل زراعت زمینیں اس کی نجی زمینیں ہیں۔ جاگیروں والے نظام نے زیادہ تر زمینیں بڑے جاگیرداروں کے ایک گروہ کے سپرد کر دیں۔[6] مغل فرمانرواؤں کی اس پالیسی کے باعث کہ تھوڑی سی مدّت کے بعد جاگیرداروں کا تبادلہ کر دیا جاتا تھا، ان میں یہ ہمّت پیدا ہو جاتی تھی کہ ہر طرح کا جبر کرکے کسانوں سے روپیہ وصول کر لیں۔ لیکن یہ جاگیردار نہ ایسا کر سکتے تھے نہ انہیں اتنا وقت ملتا تھا کہ زمین کے پہلے مالکوں کی زمین پر قبضہ کر لیں۔ زمین کے پہلے مالک زیادہ تر ہندو تھے جنھوں نے زمینوں پر اس وقت قبضہ کر لیا تھا جب وہ ملک کے حکمراں گروہوں میں شامل تھے۔[7] ان جاگیرداروں میں سے اکثر جاگیرداروں کی جائدادیں شہروں میں تھی۔ لیکن ہندوستان کے شہر کاروبار اور دستکاریوں کے مرکز نہ تھے بلکہ جاگیردارانہ عناصر کے زیر اثر تھے، جن کے باعث شہروں میں سرمایہ دارانہ عناصر کے پھولنے پھلنے میں بڑی سنگین قسم کی رکاوٹیں حائل تھیں۔[8]

مندرجہ بالا حقائق کے باوجود پروفیسر رائزنر اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہندوستانی سماج میں ایسے ترقی پسند عناصر مختلف شکلوں میں ضرور اُبھرے جیسے محنت کش عوام شہروں اور گاؤں میں تقسیم ہو گئے، شہروں اور گاؤں میں تبادلۂ اشیا کا عمل تیز ہوتا گیا، علاقائی منڈیاں وجود میں آگئیں جن میں کچھ حد تک زرعی پیداوار کا کاروبار بھی ہونے لگا۔[9] زرعی پیداوار کے سلسلے میں ایسے اشارے ملتے ہیں کہ بعض پیداواریں بعض علاقوں میں خصوصیت سے ہوتی تھیں۔[10] اقتصادی سرگرمیوں کے مرکزوں کی حیثیت سے شہروں کی اہمیت میں اضافہ بھی ہوا۔[11] ان باتوں نے ہندوستان کی دیہی برادریوں کے کردار کی اس خصوصیت کو کہ وہ دوسری برادریوں سے الگ تھلگ رہتی تھیں، کم کیا ہوگا۔

Marfat.com

لیکن اس ترقی نے سرمایہ دارانہ نظام کے قیام کی شرطِ اولین کو ابھی تک پورا نہیں کیا تھا، ہاں اس نے اس طبقاتی کشمکش پر ضرور اثر ڈالا تھا جو سماج میں جاری تھی۔[13] کسان اور دستکار جاگیرداروں کے خلاف جنگ میں متحد ہو گئے۔ اور اس اتحاد کے باعث کئی مقبول عام تحریکیں پیدا ہوئیں۔[14]

اقتصادی زندگی کی ایک اور اہم خصوصیت گاؤں کے مہاجن کا رول تھا۔ پروفیسر رائزر کے خیال میں اس کی ابتدا سولہویں صدی کے آخر میں ہوئی جب زمین کا لگان نقد روپے کی شکل میں وصول کیا جانے لگا۔ جب اورنگ زیب نے لگان بڑھا کر کل پیداوار کا پچاس فیصدی سے زیادہ کر دیا تو جاگیردار کسانوں کا اور زیادہ استحصال کرنے لگے اور کسان مہاجنوں کے مستقل شکار بن گئے۔[15] پیداواری قوتوں کو سخت دھکا لگا اور کسان مجبور ہو گئے کہ اپنی زمینوں سے دست بردار ہو جائیں اور کاشتکاری چھوڑ دیں۔ مارکس کی تقلید میں پروفیسر رائزر کہتے ہیں کہ تجارت اور سود خوری کے بڑھنے سے جو سرمایا حاصل ہوا اس سے کوئی ترقی نہ ہوئی، کیونکہ اس کے باعث پیداوار کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی اور پیداوار کی نوعیت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔[17]

استحصال کے نتیجے میں کسان جاگیرداروں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور طبقاتی جنگ اور زیادہ تیز ہو گئی۔ سترھویں صدی کے آخر میں مغل سلطنت کو جس بحران کا سامنا کرنا پڑا اس کا ایک خاص سبب یہی تھا۔[18]

ایک اور اہم حقیقت جس کے سبب مغل سلطنت کو بحران کا سامنا کرنا پڑا یہ تھی کہ خود طبقہ امراء میں اختلافات بہت بڑھ گئے تھے۔ عیش و عشرت کی زندگی اور فضول خرچی کے عادی ہونے کی وجہ سے وہ مہاجنوں سے اکثر قرض لیتے، اور کسانوں کی طرح مہاجن انہیں بھی اپنے پنجوں میں جکڑ لیتے تھے۔ اس سے بالآخر کسانوں ہی پر بُرا اثر پڑتا تھا۔ اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے جاگیرداروں نے تجارت اور مہاجنی شروع

Marfat.com

کر دی۔ جاگیردار یہ نہیں چاہتے تھے کہ کسانوں کے استحصال سے جو آمدنی ہو اس میں مرکزی حکومت کا بھی حصّہ ہو۔ چھوٹے اور درمیانی درجے کے جاگیردار اور خصوصاً ہندو جاگیردار یہ چاہتے تھے کہ "اپنے کسانوں کا استحصال صرف انہیں کا حق رہے، اس استحصال میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو" ملک کے اقتصادی تنزّل میں جب یہ نئی صورت شامل ہوگئی تو اٹھارویں صدی کے وسط میں مغلیہ سلطنت کے آخری انتشار کے لیے زمین ہموار ہوگئی۔[20]

پروفیسر رائزنر سترھویں صدی کے ہندوستان میں یوروپی تجارتی کمپنیوں کے رول پر بھی غور کرتے ہیں، اور یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یوروپی لوگوں نے ہندوستان کو استحصال اور سرمایہ اکٹھا کرنے کے لیے اپنا ہدف بنالیا۔ انہوں نے بحر ہند کی گودی میں ہونے والی بحری تجارت سے ہندوستانیوں کو باہر نکال دیا۔ راس اُمید ہوتے ہوئے یوروپ کے واسطے جو نیا تجارتی راستہ کھلا تھا اس کے باعث بحر روم کے آس پاس کے علاقوں میں ہونے والی ہندوستان کی برّی تجارت زوال پذیر ہوگئی، اور بہت سے شہر (خصوصاً شمالی مغربی ہندوستان کے) تباہ ہوگئے۔[21] یوروپین کمپنیوں نے ادھر اقتصادیات پر قبضہ جمانا شروع کیا اور اُدھر ہندوستانی جہازوں پر بحری ڈاکے ڈالنے شروع کر دیے۔[22]

پروفیسر رائزنر کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب کی اقتصادی پالیسیوں نے مغلیہ سلطنت کے بحران کو نہ صرف شدید کیا بلکہ آخری تباہی تک پہنچا دیا۔[23]

پروفیسر رائزنر نے مغل سلطنت کے خلاف ہونے والی مقبول عام تحریکوں کو بھی موضوع بنایا ہے، اور سلسلے وار بہت سے مضمونوں میں ان پر بحث و مباحثہ کیا ہے۔ انہوں نے خاص طور سے مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کی تحریکوں کا ذکر کیا ہے۔

دیہی برادری کا انتشار، گاؤں میں وسائل زر کا دخول، جاگیرداروں کی معاشی اور فوجی قوت میں اضافہ، ان سب باتوں نے مرہٹوں میں جاگیردارانہ نظام کی نشوونما کے واسطے

Marfat.com

زمین ہموار کر دی۔ اب مرہٹہ جاگیردار اس بات کے لیے تیار ہو چکے تھے کہ نہ صرف بستیوں کی زمین پر قبضہ کر کے اپنی زمینوں کو وسعت دیں بلکہ باہر کے لوگوں نے جو زمین ہتھیا رکھی ہے ان سے جنگ کر کے زمین چھین لیں۔ مرہٹہ بغاوتوں کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی تھا۔[24] کسانوں نے ان جاگیرداروں کا ساتھ دیا کیونکہ ان کا استحصال نہ صرف ان کے جاگیردار کرتے تھے بلکہ احمد نگر اور بیجاپور کے جاگیردار بھی کرتے تھے۔ سترھویں صدی کے دوسرے نصف میں مغلوں کے حملے کسانوں کو مکمل تباہی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔[25]

پروفیسر رائز نر سکھوں کی شورش کو ایک کسان تحریک کہتے ہیں کہ یہ تحریک شہروں کے خوشحال تاجروں اور دستکاروں نے ان جاگیرداروں کے استحصال کے خلاف شروع کی جو جان و مال حفاظت کی ضمانت بھی نہ دے سکے تھے۔ دارالسلطنت کے قرب کے باعث انہیں بہت سے غیر معمولی ٹیکس دینا پڑتے تھے۔[26] سترھویں صدی کے وسط میں جب مغل سلطنت کا بحران شدید ہو چکا تھا اور ملک کی اقتصادی حالت بہت زیادہ بگڑ چکی تھی تو عوام — یعنی وہ ہزاروں کسان جن کی زمینیں چھن چکی تھیں اور وہ دستکار جن کی روزی ختم ہو چکی تھی تحریک میں شامل ہو گئے۔[27]

جاٹ، جنھوں نے مغل سلطنت کے خلاف دوسری سب سے زیادہ طاقتور تحریک شروع کی، وہ بھی دارالسلطنت کے آس پاس علاقوں میں رہتے تھے۔ رائز نر اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ نہ صرف جاگیرداروں نے بلکہ تاجروں نے بھی ان کا سخت استحصال کیا۔ یہ تاجر دور افتادہ مقاموں سے نیل اور کپڑا خریدنے کے لیے بڑی تعداد میں جمع ہوتے تھے۔[28] ان کے مصائب بڑھ گئے تھے کیونکہ دارلسلطنت کے نزدیک رہنے کی وجہ سے ان سے زبردستی بیگاری جاتی تھی اور شاہی منصوبوں جیسے قلعوں، محلوں، مسجدوں اور سڑکوں کی تعمیر میں لگا دیا جاتا تھا۔[29] مغل فوجیں اپنی جنگی مہموں کا آغاز آگرہ سے کرتی تھیں اور ایسے موقعوں پر بے خوف نظر اطراف کے کسانوں میں خوب لوٹ مار کرتی تھیں۔ اس باعث کسان اور

Marfat.com

زیادہ مفلس ہوگئے تھے۔

اس طرح پروفیسر رائز نر نے اُس سٹرن کو وضاحت سے بیان کیا ہے جو سترھویں صدی کے دوسرے نصف میں مغل سلطنت کی اقتصادی حالت میں پیدا ہو چکی تھی، اور یہ دکھایا ہے کہ مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں تینوں کی مقبولِ عام بغاوتوں کو اقتصادی بے اطمینانی سے قوت حاصل ہوئی۔

دوسرے سوویت محققین مغل ہندوستان کی اقتصادی حالت کے بارے میں بحیثیت مجموعی پروفیسر رائز نر کے نظریات سے اتفاق کرتے ہیں۔ ان کے اس بیان سے، کہ سترھویں صدی میں ہندوستان کی اقتصادیات میں وہ عناصر موجود نہیں تھے جن کے باعث جاگیر دارانہ اقتصادیات سرمایہ دارانہ اقتصادیات میں بدل سکتی۔ بعض سوویت محققین اتفاق کرتے ہیں، لیکن دوسرے محققین اس کی تردید کرتے ہیں۔

پروفیسر رائز نر کی تائید کرنے والوں میں سب سے ممتاز شخصیت ڈاکٹر (میڈم) انتونووا کی ہے۔ ڈاکٹر پاولوف، ڈاکٹر علائف، ڈاکٹر چیچیروف، ڈاکٹر (میڈیم) اشرفیاں پروفیسر رائز نر سے اتفاق نہیں کرتے۔

اکبری ہندوستان پر اپنے رسالے میں ڈاکٹر (میڈم) انتونووا لکھتی ہیں کہ اٹھارویں صدی تک ہندوستان کی اقتصادیات قدرتی اقتصادیات پر مبنی تھی۔[30] پیداوار کے طریقے جاگیر دارانہ تھے اور اقتصادیات پر جاگیر داروں کا غلبہ تھا۔ جاگیر دار تجارت میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ ملک میں درآمد کی جانے والی سب کی سب اشیا عیش و عشرت کا سامان ہوتی تھیں جنھیں جاگیر دار استعمال کرتے تھے۔[31] تاجروں اور مہاجنوں کی خوشحالی کا دارومدار جاگیر داروں کی خوشنودی پر تھا۔ تاجروں اور مہاجنوں کے سرمائے کی وصولی پر منحصر ہوتی تھی اور اسی لیے کسانوں کے استحصال میں وہ بالواسطہ شریک رہتے تھے۔[32] لہٰذا انہوں نے جاگیر داروں کی مخالفت نہیں کی اور اس طرح ہندوستان

Marfat.com

میں ایک نئے معاشرتی نظام کے عناصر کی تخلیق کرنے سے قاصر رہے۔ ڈاکٹر (میڈم) انتونووا کی رائے میں انتہائی ترقی یافتہ تجارت اور مہاجنی نظام سرمایہ دارانہ نظام کو بڑھنے سے روکتے رہے۔[33]

مُصنّف کو اس بات سے بہر حال اتفاق ہے کہ ہندوستان میں اندرونی تجارت بڑی ترقی کر گئی تھی اور خصوصاً اناج ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا جاتا تھا۔ ملک کے دوسرے حصّوں میں جو اناج درآمد کیا جاتا تھا اس میں بنگال کا بہت بڑا حصّہ ہوتا تھا۔[34] میلوں اور منڈیوں کی بڑی تعداد جو عموماً تیرتھ استھانوں کے آس پاس لگتی تھیں، اس بات کا ثبوت ہے کہ اندرونی تجارت بڑے زور و شور سے ہوتی تھی۔[35] مُصنّف اندرونی تجارت کے عروج کو خود شہنشاہ کی بڑھی ہوئی دلچسپی سے منسوب کرتی ہیں۔ جس نے سڑکوں کا ایک جال بچھا کر ملک کے مختلف حصّوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا تھا۔[36] ایک اہم بات یہ تھی کہ جاگیردار باہری تجارت کے برعکس ملک کی اندرونی تجارت میں شریک نہیں ہوتے تھے، غالباً اس وجہ سے کہ اس تجارت میں کم فائدہ تھا۔ مُصنّف کہتی ہیں کہ ان تبدیلیوں نے بھی ملک کے اقتصادی نظام کو سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام میں بدلنے کے لیے راہ ہموار نہ کی۔

سود خوری کا دائرہ بہت وسیع ہوا، لیکن مُصنّفہ اپنی تائید میں مارکس کو نقل کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ پیداوار کے طریقے میں کوئی تبدیلی آگئی تھی۔ یہ نظام آخر کار مغل سلطنت کے زوال کے اسباب میں شامل ہو گیا۔[39]

شہروں کا ذکر کرتے وقت مُصنّفہ بتاتی ہیں کہ یہ چار قسموں کے تھے یعنی:

(۱) فوجی چھاونیوں کے آس پاس والے شہر

(۲) تیرتھ استھانوں کے آس پاس والے شہر

(۳) بندرگاہ ...

Marfat.com

(4) اندرونی تجارت اور دستکاریوں کے مرکزوں کے آس پاس والے شہر

بعض شہروں میں بلاشبہ یہ چاروں ہی خصوصیات تھیں۔ سارے شہروں میں ایک قدرِ مشترک تھی ــــ ان سب پر جاگیرداروں کا غلبہ تھا۔ جاگیرداروں کی برتری کے باعث درمیانی طبقے کی نشوونما کے امکانات ختم ہوگئے تھے۔ تاجروں کو اس بات کا موقع نہ ملتا تھا کہ ملک کی سیاسی زندگی میں آزادی کے ساتھ حصّہ لے سکیں۔[41]

دستکار بھی جاگیرداروں کے دست نگر تھے، جو اشیا کی پیداوار اور فروخت میں مداخلت کرتے رہتے تھے۔[42] حرفوں کی تنظیم بڑے پُرانے انداز کی تھی، اور پیداوار کے اوزار بہت سادہ تھے۔[43] ایسی کوئی علامت نہیں ملتی جس سے پتہ لگے کہ ہندوستان میں "صنعتی دور" کی سحر ہوچکی تھی، یعنی بہت سے کاریگر اور دستکار ایک مالک کے تحت اور ایک چھت کے نیچے مل کر کام کرنے لگے تھے۔ ڈاکٹر (میڈم) انتونوا کہتی ہیں کہ ہندوستان میں یہ "صنعتی دور" کبھی وجود میں نہیں آیا۔[44] شاہی کارخانوں میں کاریگر کبھی صحیح معنوں میں ملازم نہیں رکھے گئے۔ یہ دستکار وہ لوگ ہوتے تھے جنھیں سزا کا خوف دلا کر کام کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ محنت کی کوئی اندرونی تقسیم نہیں ہوئی تھی، اور کارخانے کسی کی ذاتی تحویل میں نہیں آئے تھے۔[45] لہٰذا ہندوستان کے اقتصادی نظام میں سرمایہ دارانہ نظام کے عناصر موجود نہیں تھے۔

ڈاکٹر (میڈم) انتونوا وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ سرمایہ دارانہ عناصر کی کمی کا سبب جان و مال کا غیر محفوظ ہونا تھا، جس کی وجہ سے لوگ ایسی مہموں میں سرمایہ نہیں لگاتے تھے، جن سے صنعتی پیداوار ہو سکتی تھی۔[46] مندرجہ بالا دلیلوں کی بنیاد پر ڈاکٹر (میڈم) انتونوا پروفیسر رائزنر کے اس بیان سے اتفاق کرتی ہیں کہ ہندوستان کے اقتصادی نظام میں سرمایہ دارانہ نظام کے عناصر موجود نہیں تھے۔

Marfat.com

ڈاکٹر (میڈم) انتونووا نے اپنے دعوے کی اپنے مضمون، اوجنینیری سے کیپیٹل ازماوی انڈاق (ہندوستان میں سرمایہ دارانہ نظام کی ابتدا)، میں اور زیادہ وضاحت کی ہے۔ ان کے بموجب گو وسائل زر بڑی تعداد میں موجود تھے لیکن جاگیرداری کا اثر اتنا زیادہ بڑھا ہوا تھا کہ امیر تاجر اپنی دولت چھپانے کی کوشش کرتے تھے تاکہ جاگیرداروں کی لالچی نظریں اس پر نہ پڑنے پائیں۔[47] ہو سکتا تھا کہ ڈھونڈنے پر کوئی امیر تاجر نظر آجاتا۔ لیکن کسی امیر کاریگر کا ملنا ایک نہایت ہی غیر معمولی بات تھی۔[48] وسائلِ زر کی یہ ترقی بھی خود کفیل گاؤں کی علاحدگی کو ختم نہ کرسکی۔ پیداوار کے طریقے میں تبدیلی کا تو کہنا ہی کیا اوزار اور پیمائشوں میں بھی کوئی یکسانیت نہ تھی۔[49] پیداوار کے معاملے میں محنت کی تقسیم، جو "صنعتی نظام" کا ایک نہایت ضروری جز ہوتی ہے، حرفوں کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتی۔ حرفوں، جیسے جہاز رانی یا کانیں کھودنے میں، یہ بے حد ضروری تھی۔[50] مغلوں کے اقتصادی نظام میں ذیل کے یہ تینوں بنیادی عناصر موجود نہیں تھے، جن کے باعث سرمایہ داریت کو فروغ حاصل ہوتا ہے:

(1) محنت کشوں کی بہت بڑی تعداد جو ذاتی طور سے کسی کے دست نگر نہ ہوں اور جن کے پاس پیداوار کے واسطے اپنے اوزار نہ ہوں۔

(2) بیشتر سرمائے کا چند ہاتھوں میں ہونا۔

(3) پیداوار کی صلاحیت کا ایک معیار تک پہنچ جانا۔[51]

ہندوستان میں سرمایہ دارانہ انداز کی پہلی فیکٹری انیسویں صدی میں انگریزی سرمائے سے قائم کی گئی تھی۔[52]

ڈاکٹر (میڈم) انتونووا کے دعوے کو ڈاکٹر پاولوف، ڈاکٹر علائف، ڈاکٹر چیچیروف اور ڈاکٹر (میڈم) اشرفیان جیسے بہت سے محققوں نے چیلنج کیا ہے۔ ڈاکٹر پاولوف نے اپنے رسالے فورمی رووانی انڈائی چکوئی بورشوازی (ہندوستانی بورژوازی کی تشکیل)

Marfat.com

سترھویں صدی میں ہندوستان کے اقتصادی نظام پر بحث کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہندوستان کے اقتصادی نظام میں سرمایہ داریت کے عناصر موجود تو تھے، لیکن وہ اس قدر قوی نہ ہو پائے تھے کہ کسی مستقل تحریک کا آغاز کر سکیں۔[53] ڈاکٹر پاولوف کا کہنا ہے کہ گجرات کے بندرگاہوں میں بہت سے مزدور ملازم تھے، جو ایک مالک کے تحت کام کرتے تھے اور لہٰذا اس وقت "صنعتی دور" کا آغاز ہو گیا تھا۔[54] پیداوار کے معاملے میں محنت کش پورے طور سے تقسیم ہو چکے تھے۔[55] اور دیہی برادری کا یہ کردار کہ وہ دوسروں سے بالکل الگ تھلگ رہتی تھی تیزی کے ساتھ ختم ہو رہا تھا۔[56]

ڈاکٹر علائف نے ڈاکٹر پاولوف کی تائید کی ہے۔ انہوں نے اپنے رسالے از ہانے انڈیا (جنوبی ہندوستان) اور ایک مضمون رزویتی انڈس کوگیسٹواڑد پرونک نودی نیاوی انڈیو اوروپ ئستو (یوروپی لوگوں کے رخوں تک ہندوستان میں کپڑا سازی کی نشوونما) میں ڈاکٹر (میڈم) انتونووا کے دعوے کو رد کر دیا ہے۔ ان کے بموجب تاجروں یا ان کے نمائندوں نے کاریگروں کو پیشگی رقم دینے کا جو نظام بنا رکھا تھا، اس کے نتیجے میں کاریگر صحیح معنوں میں ان کے غلام بن کر رہ گئے تھے، اور کاریگر واقعتاً کرائے کے مزدور بن کر رہ گئے تھے۔[57] تاجروں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ بہت سے کاریگر پیداوار کے واسطے استعمال کیے جانے والے اپنے اوزاروں سے محروم ہو گئے تھے۔[58] ہندوستانی تاجروں اور دلالوں کی جڑیں اتنی گہری جا چکی تھیں کہ یوروپی لوگ اپنی انتہائی کوشش کے باوجود ان سے پیچھا نہ چھڑا سکے اور کاریگروں سے براہ راست تعلقات قائم نہ کر سکے۔[59]

صنعتی دور کی یہ خصوصیت، یعنی کسی خاص شے کی تیاری میں محنت کشوں کی پورے طور سے تقسیم، ہندوستان میں سترھویں صدی میں موجود تھی۔ گجرات ـــــ اور کارومنڈل کے ساحلی علاقے میں کپڑے کی رنگائی اور چھپائی کے ماہر پھل پھول رہے

Marfat.com

تھے۔ گجرات میں جہازوں کی بار برداری ایک آزاد پیشہ تھی۔ کپڑے بڑے پیمانے پر ایک شہر میں تیار کیے جاتے تھے اور دوسرے شہروں میں ان کی دھلائی اور رنگائی ہوتی تھی۔[60] الافیین کے بموجب سترھویں صدی میں تنجور شہر کے نزدیک کپڑوں کی چھپائی کی تین بڑی فیکٹریاں تھیں۔[61] تاجروں نے سرمائے کے ذریعے جب کاریگروں کو مطیع بنا لیا تھا تو بعض ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے جن کے باعث سرمایہ دارانہ تعلقات کی نشو ونما ہو سکتی تھی۔[62]

ڈاکٹر چیچیروف اپنی کتاب اکنومی چیسکوے رازوتائی انڈائی پیرد انگلی اسکم زوددوانیم (برطانوی فتح سے پہلے ہندوستان کی اقتصادی نشو ونما) اور مضامین نکوٹورائی میٹریالائی اور ریمز لینوم پروئز بورا ستولے دی سیورو۔ ووستوچنخ رائنوف انڈائی دی XV تا XVII دی دی (سولہویں اور سترہویں صدی میں ہندوستان کے شمال مشرقی علاقوں میں دستکاری پیداوار کی بابت بعض اشیائے ماخذ)، اور پوڈ چینیی ریز لاٹور گوورم کیپیٹلوم سیورو۔ ووستوچنخ آئی اُوگو۔ ووستوچنخ رایونخ انڈائی دی دی (اٹھارویں صدی میں ہندوستان کے جنوبی مشرقی اور شمالی مشرقی علاقوں میں تاجروں کے سرمائے کے ذریعے دستکاریوں کا مطیع کیا جانا) میں ڈاکٹر پاولوف اور ڈاکٹر علائف کی تائید کرتے ہیں۔ وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "سولہویں سے اٹھارویں صدی تک ہندوستان کے جاگیردارانہ اقتصادی نظام میں اسی کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے عمل سرگرم کار تھے جن کے باعث اس دور کے خاتمے کے نزدیک پیداوار سے تعلق رکھنے والے جو رشتے تھے ان میں بعض اشد ضروری تبدیلیاں تو ہو گئیں لیکن وہ پوری طرح سے بدلے نہیں۔"

جہاں تک معیار کا تعلق ہے اس دور میں جاگیردارانہ ہندوستان کے حرفوں میں محنت کی اقتصادی تنظیم کی پرانی روایتی شکلوں کے ساتھ نئی شکلیں بھی اُبھریں۔

Marfat.com

محنت کی زیادہ گہری سماجی تقسیم، حرفوں کا زراعت سے اور شہروں کا گاؤں سے علاحدہ ہونا، اور زر و اشیا کے مابین تعلّقات کی نشوونما، ان سب باتوں نے سرمایہ دارانہ انداز کی چھوٹی صنعتوں اور بڑے پیمانے پر مال تیار کرنے والی صنعتوں کی شکلوں میں ایسے بنیادی عناصر مہیا کر دیئے جو سرمایہ دارانہ انداز کے تعلّقات کے لیے نہایت ضروری ہوتے ہیں۔[63]

بحیثیتِ مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوویت مورخ رخ بدل بدل کر ڈاکٹر پاولوف، ڈاکٹر علائف اور ڈاکٹر چیچیروف کے نظریات کے اردگرد گھومتے رہے ہیں۔ اس بات کی تصدیق ان خیالات سے ہوتی ہے جن کا اظہار نووے اسٹوریا انڈائی (ہندوستان کی نئی تاریخ) میں کیا گیا ہے۔ (یہ کتاب اٹھارویں صدی کے وسط سے پہلی جنگ عظیم تک کے واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ سوویت محققین کے ایک مشترکہ منصوبے کے تحت وجود میں آئی ہے اور اسے ادارۂ عوامِ ایشیا، ماسکو نے تیار کروایا ہے، اور اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ذریعے سوویت محققین کی ملی جلی رائے کا اظہار ہوتا ہے) سترھویں اور اٹھارویں صدیوں کے پہلے نصف میں ہندوستان کے سماجی اور اقتصادی حالات پر جو باب دیا گیا ہے، اس میں مصنف یہ لکھتے ہیں کہ "حرفوں کی مختلف شاخوں میں سرمایہ دارانہ نظام کے عناصر کبھی کبھی اور بالکل ابتدائی صورت میں نظر آتے ہیں"۔[64]

نووے اسٹوریا انڈائی کے مصنف جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ موجودہ تاریخی ثبوتوں اور شہادتوں پر مبنی ہے اور لگتا ہے کہ درست ہے۔

اس نظریے کو تسلیم کرنا غلط ہوگا کہ سترھویں صدی میں ہندوستان کی اقتصادیات جاگیردارانہ انداز سے بدل کر سرمایہ دارانہ انداز پر آگئی تھی، کیونکہ ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس سے یہ ظاہر ہو کہ پیداوار کی تنظیم اور طریقے میں کوئی تبدیلی آگئی تھی۔

Marfat.com

اُس وقت بھی پیداوار پُرانے اوزاروں کے ذریعے کی جاتی تھی۔ اشیا کی بڑھتی ہوئی مانگ پیداوار کی تنظیم اور طریقے میں انقلاب لاکر نہیں بلکہ زیادہ توجّہ اور مہارت کے ذریعے پوری کی گئی تھی۔ زیادہ توجّہ اور مہارت سے مراد یہ ہے کہ پہلے جو بہت سے کسان کچھ وقت کاشتکاری کرتے اور کچھ وقت دستکاری کرتے تھے، انہوں نے زراعت تج کر سارا وقت حرفوں پر صرف کرنا شروع کر دیا۔ اس بات کی تصدیق اُس زمانے کے ماخذوں سے ہوتی ہے اور سوویت محقّقین بھی اسے مانتے ہیں۔ لیکن یہ کہنا بھی اتنا ہی غلط ہوگا کہ ہندوستان کی اقتصادی حالت پر جمود طاری تھا، اور وہ اس لائق نہ تھی کہ نئی چنوتیوں کو قبول کر سکے۔

اس بارے میں ناقابل تردید ثبوت موجود ہے کہ ہندوستان کا اقتصادی نظام، جو خود کفیل گاؤں پر مبنی تھا، اس کی جڑیں کھوکھلی کی جا رہی تھیں۔ زمین کا لگان نقد کی صورت میں ادا کرنے کا جو رواج سولہویں صدی میں رائج کیا گیا، اس نے اقتصادی نظام زر کی حوصلہ افزائی کی اور منڈیوں کے لیے مال پیدا کیا جانے لگا۔ اقتصادی نظام زر سترھویں صدی کے ہندوستان میں چاروں طرف رائج تھا۔[65] ایسٹ انڈیا کمپنی کے دستاویزات اور ملک میں آنے والے یورپین سیاحوں کے بیانات اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ صرّافوں اور مہاجنوں کی اہمیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ اس بات کی صریحی علامتیں ہیں کہ اقتصادی نظامِ زر بڑھ رہا تھا۔ سوویت محقّقین، خصوصاً ڈاکٹر پاولوف، ڈاکٹر علاتف ـــــ ، اور ڈاکٹر چیچیروف، بھی یوروپین کمپنیوں کے فراہم کردہ ثبوتوں اور شہادتوں کی بنیاد پر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ ایک اور بات جو اقتصادی نظامِ زر کی ترقّی کی نشاندہی کرتی ہے یہ ہے کہ ملک میں سکے ڈھالنے والی بہت سی ٹکسالیں قائم ہو گئی تھیں۔

سڑکوں کے اس جال نے، جو شیر شاہ اور اکبر نے بنوایا تھا، مرکزی اقتدار کو مستحکم کرنے کے علاوہ، گاؤں کی علاحدگی ختم کرنے میں بھی لے لیا۔[66] آمد و رفت کے ذرائع بہتر ہو جانے

Marfat.com

کی وجہ سے دور افتادہ مقاموں میں اشیا و شامان کا تبادلہ ہونے لگا۔ مثال کے طور پر کشمیر، گجرات اور بنگال کے درمیان سڑکوں کے راستے نہ صرف بڑے پیمانے پر تیار کیے جانے والے مال کا بلکہ خام اشیا کا بھی تبادلہ ہونے لگا۔[67] لہٰذا ڈاکٹر پاولوف، ڈاکٹر علائف اور ڈاکٹر چیچیروف کا یہ کہنا درست لگتا ہے کہ پورے ہندوستان کی ایک منڈلی بنانے کا رجحان موجود تھا۔ اگر یہ بات ہو جاتی تو ہندوستانی گاؤں کی خود کفیل اقتصادی حالت پر ضرور اثر پڑتا اور پھر ایک بنیادی تبدیلی آ جاتی۔[68]

یہ بنیادی تبدیلی سترھویں صدی میں نہیں آئی، لیکن اس تبدیلی کی علامتیں نظر آنے لگی تھیں۔ ریاست کی بڑھی ہوئی مانگ اور امرا نیز تاجروں کے جبر کے باعث کسان اور کاریگر دونوں مفلسی کا شکار ہو گئے تھے۔ کسانوں نے اپنی زمینیں چھوڑ دی تھیں اور مزدوروں کی ایک پوری ایسی فوج تیار ہو گئی تھی جو اجرت پر اپنی محنت بیچنے کے لیے تیار تھے۔[69] اہل حرفہ کی حیثیت میں ایک زیادہ اہم تبدیلی آ گئی تھی۔

کاریگروں کی آزادی سلب ہوتی جا رہی تھی۔ عملی طور پر ان کی یہ آزادی ختم ہو چکی تھی کہ اپنا مال خود بازار میں لے جائیں، کیونکہ اب وہ جو کام کرتے تھے تاجر یا تاجروں کے نمائندے اس کی پیشگی اُجرت انہیں دے چکے ہوتے تھے۔ یہ پیشگی اُجرت محض زر نقد[70] یا خام[71] مال ہی کی شکل میں نہ ہوتی تھی، بلکہ پریشانی کی صورت میں، اناج[72] کی شکل میں بھی دیدی جاتی تھی تاجروں کے سرمائے کے ذریعے جب کاریگروں کو مطیع بنا لیا گیا تو نظامِ پیداوار کی تنظیم میں غیر واضح لیکن اہم تبدیلیاں آ گئیں۔

آزاد کاریگر، جو اب دشواریوں میں پھنس چکا تھا، کرائے کے کاریگر کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے تیار تھا۔ یورپی لوگوں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھایا۔ ان کی فیکٹریوں اور کارخانوں میں ہندوستان کا دیگر اجرتوں کی خاطر اپنی مہارت کا سودا کرنے لگے۔ بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ ہندوستانی جولاہے یورپی لوگوں کے

Marfat.com

کارخانوں میں کام کرتے تھے۔[73] انگریزوں نے احمد آباد میں ایک رنگائی کا کارخانہ قائم کیا تھا جس میں ہندوستان کاریگر کام کرتے تھے۔[74] اسی طرح انگریزوں نے شورہ صاف کرنے کے لیے اپنی فیکٹریاں کھولنی چاہیں۔[75] چنانچہ ایک نیا رشتہ، مالک اور ملازم کا — جو سرمایہ دارانہ نظام ایک لازمی جز ہوتا ہے — فروغ پا رہا تھا۔ یہاں صنعتی نظام کا بھی ایک جراثیم موجود تھا (جب بہت سے کاریگران اوزاروں وغیرہ کی مدد سے ایک چھت کے نیچے کام کر رہے ہوں جو اوزار وغیرہ مالک نے فراہم کیے ہوں) جو پیداوار سرمایہ دارانہ نظام کا پیش رو ہوتا ہے۔ ڈاکٹر (میڈم) انتونووا کے اس دعوے کی تردید میں کہ سترھویں صدی میں ہندوستان کے اقتصادی نظام میں سرمایہ دارانہ نظام کا کوئی عنصر موجود نہ تھا اور صنعتی نظام کو کبھی فروغ حاصل نہ ہوا، ڈاکٹر پاولوف، ڈاکٹر علائف اور ڈاکٹر چیچیروف نے درست کیا ہے کہ اسی نکتے پر زور دیا ہے۔[76]

یہ اہم نکتہ تشریح طلب ہے کہ سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام کی یہ کلیاں سترھویں صدی میں کھل کر پھول نہ بن سکیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ سارے ہندوستان کا پورا اقتصادی نظام جاگیرداروں کے تیجہ غصب میں تھا۔ جان و مال غیر محفوظ ہونے کے سبب ہندوستانی تاجروں کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ایسی تجارتی مہموں میں سرمایہ لگائیں۔ یوروپ کے ملکوں سے مقابلے کے ڈر نے بھی ان پر روک لگائی۔ یوروپی لوگوں نے جاگیرداروں کو مجبور کر کے مختلف سہولتیں حاصل کر لی تھیں اور اس لیے ہندوستانی معشیت میں دیسی تاجروں کے مقابلے میں ان کی حیثیت کہیں اچھی تھی۔ ہندوستانی مہم جو کو پیچھے ڈھکیلنے کے لیے تجارت کے علاوہ کچھ اور طریقے بھی استعمال کرتے تھے جیسے قوت کا استعمال۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی سرمایہ سود پر رقم دینے کے لیے صرف کیا جانے لگا۔ اس میں خطرات کم تھے اور منافع بھی بہت معمولی نہ تھا۔ یوروپی

Marfat.com

لوگوں نے اس کی ہمت افزائی کی کیونکہ ان کے پاس سرمائے کی کمی تھی۔ ڈاکٹر پاولوف اور ڈاکٹر علاآف نے صحیح کہا ہے کہ اس بات کی وجہ سے سترھویں صدی کی ہندوستانی معشیت میں سرمایہ دارانہ عناصر کی ترقی رک گئی۔

لہٰذا، مندرجہ بالا شہادت کی روشنی میں یہی نتیجہ نکالا جاسکتا، اور ہمیں نووے اسٹوریا انڈاق کے مصنفوں سے اس نتیجے پر اتفاق کرلینا چاہیے کہ مغلوں کے عہد میں جاگیردارانہ معیشت تبدیل ہورہی تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام کے عناصر جو کمزور تھے اور کبھی کبھی نظر آتے تھے، خود اس لائق نہ تھے کہ جاگیردارانہ معیشت کو مکمل طور سے بدل سکیں۔

مغل ہندوستان کے بعض سوویت مورخوں نے جن ماخذوں سے استفادہ کیا ہے ان پر ایک نوٹ :

ہندوستانی قاریوں کو شاید یہ جاننے کا شوق ہو کہ سوویت محققوں نے نتائج اخذ کرتے وقت کن ماخذوں کو لائق اعتبار سمجھا۔

سوویت محققوں نے اپنے مطالعے کی نوعیت کے اعتبار سے ہی کسی مخصوص ماخذ کی اہمیت کا تعین کیا ہے۔ چونکہ سوویت مورخوں کی توجہ زیادہ تر سماجی اور اقتصادی پہلوؤں پر مرکوز تھی اس لیے وہ آئینِ اکبری جیسی کتابوں اور پیلزائرٹ، ٹورنیر، برنیر اور تھیونوٹ جیسے یوروپی سیاحوں کے سفرناموں کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

مغل ہندوستان کے مطالعے کے واسطے بہت زیادہ ماخذ موجود ہیں اور یہ بات کسی فردِ واحد کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ان سب سے استفادہ کرے۔ اس لیے ضرورت اس کی مقتضی ہے کہ ان میں سے کچھ کا انتخاب کرلیا جائے اور مختلف سوویت مورخوں نے اپنی تحقیقوں کی نوعیت کے اعتبار سے کچھ مخصوص ماخذوں پر زور

Marfat.com

دیا ہے۔

پروفیسر رائز نر نے اپنی کتاب نمروڈنی ڈویژنیا وی انڈاق وی XVII تا وی وی XVIII میں سترھویں اور اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف میں مقبولِ عام تحریکوں اور ان کے اقتصادی بنیادوں کی جانچ پرتال کو اپنا موضوع بنایا ہے، اور چنانچہ انہوں نے خاص طور سے سترھویں صدی کے یوروپی لوگوں کے سفرناموں پر تکیہ کیا ہے۔ انہوں نے پیلزآئرٹ اور منوچی پر خاص طور سے تکیہ کیا ہے۔ اورنگ زیب کے دور کی معلومات کے واسطے آخرالذکر بلاشبہ ایک ذخیرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ سکھوں کی تحریک کا حال لکھتے وقت پروفیسر رائز نر نے منتخب اللباب جیسے زور ناموں پر بھی نظر رکھی ہے، اور اس کے فارسی متن سے استفادہ کیا ہے۔ مزید برآں پروفیسر رائز نر نے مرہٹہ اور سکھ تاریخوں پر انیسویں اور بیسویں صدی میں کی جانے والی برطانوی اور ہندوستانی محققوں کی تحقیقوں سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے گرانٹ ڈف، کنکیڈ نبد پرسینس، میکالف، الفنسٹن، کنگھم، ولیم اروِن، مورلینڈ، جارو ناتھ سرکار، ایس، این، سین اور چوکسے وغیرہ کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے ایل، آر، کرشن کی فرانسیسی میں لکھی ہوئی کتاب لاسکھس اور یجنے ایٹ ریویلپمینٹ دی لاکلو نانتے سے بھی رجوع کیا ہے۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں ہندوستانی برادریوں یعنی مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کی زرعی تاریخ ازسرِنو لکھتے وقت، پروفیسر رائز نر نے ان ہندوستانی گزیٹیروں سے بہت استفادہ کیا ہے جو اُنیسویں صدی کے اواخر میں شائع کیے گئے تھے۔ اس کے باعث سترھویں اور اٹھارویں صدی پر بعد کے واقعات کا کسی حد تک عکس پڑ گیا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ پروفیسر رائز نر کے کام میں

Marfat.com

ایک سخت رکاوٹ تھی۔ ان کی رسائی مقامی ماخذوں تک نہ تھی۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ سترھویں صدی کے ہندوستان کی زرعی تاریخ لکھنے کے واسطے ضلع گزیٹیروں پر بھروسہ کرنا سوویت فن تاریخ نگاری کی ایک نمایاں خصوصیات ہے۔

اکبر کے عہد میں ہندوستان کی سماجی اور اقتصادی حالت پر ڈاکٹر (میڈم) انتونووا کا جو رسالہ 1952ء میں شائع ہوا تھا، اس میں انگریزی، فارسی، فرانسیسی، جرمن اور روسی، بہت سی زبانوں کے اولین اور ثانوی اہمیت کے ماخذوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ انہوں نے اولین اہمیت کے جو فارسی ماخذ استعمال کیے ہیں ان میں ابوالفضل کی آئینِ اکبری اور اکبر نامہ، بدایونی کی منتخب التواریخ اور نظام الدین احمد کی طبقات اکبری شامل ہیں۔ اکبر کے عہد کا درست ادراک حاصل کرنے کے خیال سے انہوں نے اس عہد سے پہلے اور بعد کے بعض دوسرے فارسی روزناموں سے بھی رجوع کیا ہے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں — برنی کی تاریخ فیروز شاہی شاہ نواز خاں کی معاصر رحیمی، نہاوندی کی معاصر الامراء، امین احمد رازی کی ہفت اقلیم، اور اور علی محمد خاں کی مراتِ احمدی۔ (یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ متذکرہ بالا روزناموں میں سے بعض روزناموں سے انہوں نے مسودوں کی شکل میں استفادہ کیا ہے، جو تاشقند میں ادارہ تحقیقات شرقیہ کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ اس کتب خانے میں ہندوستان سے تعلق رکھنے والے پرانے مسودوں کا بڑا عمدہ ذخیرہ موجود ہے۔ یہ ذخیرہ منتظر ہے کہ ہندوستانی محققین اچھی طرح اس کا مطالعہ کریں۔)

ڈاکٹر (میڈم) انتونووا نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات پر پارلیمانی کمیٹیوں کی ان رپورٹوں سے بھی استفادہ کیا ہے جو اکبر کے عہد کے زرعی مسائل پر بحث کرنے کے واسطے انیسویں صدی میں شائع کی گئی تھیں۔

Marfat.com

انہوں نے جن دوسرے اولین اہمیت کے ماخذوں سے استفادہ کیا۔ ان میں تلسی داس کی رامائن (روسی زبان کا ترجمہ)، اوی گرنتھ (ای، ٹرمپ کا ترجمہ)، ایلیٹ اور ڈاؤسن، اور یوروپی عصری سیاحوں کے سفرنامے شامل ہیں۔ پروفیسر رائنر کی طرح وہ بھی پیلزائرٹ کی کتاب جہانگیرس انڈیا پر بے حد تک تکیہ کرتی ہیں تاکہ ہندوستانی کسانوں، کاریگروں اور عوام کی اقتصادی حالت کے بارے میں اپنے اخذ شدہ نتائج پر زور دے سکیں۔

ڈاکٹر (میڈم) انتونووا نے ثانوی اہمیت کے ایسے ماخذوں سے استفادہ کیا ہے جو جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں ہیں۔ انہوں نے جرمن زبان میں بہلر، گلیسینپ، ہورن اور وان نومر کی کتابوں سے رجوع کیا ہے۔ فرانسیسی زبان میں انہوں نے تاسی اور منیانتے کی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ اکبر پر انگریزی میں جو کتابیں دستیاب ہوسکی ہیں ان کا انہوں نے ہر پہلو سے استعمال کیا ہے۔ ان میں ونسینٹ اسمتھ، مورلینڈ، ابنِ حسن، بے، بے، مودی، کرشنا مورتی اور ورما وغیرہ کی کتابیں شامل ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر (میڈم) انتونووا نے طرح طرح کے بہت سے ماخذوں سے استفادہ کیا ہے۔

ڈاکٹر پاولوف نے اپنی کتاب فورمی رودانی انڈائی اسکوئی برزوہوازائی میں سترھویں صدی کے ہندوستان کی اقتصادی حالت کا احوال لکھتے وقت محض یوروپی سیاحوں کے سفرناموں پر تکیہ کیا ہے۔ انہوں نے یوروپی تجارتی کمپنیوں کی دستاویزوں کو نظر انداز کردیا ہے اور ایسے اہم سیاحوں کے سفرناموں کو بھی انداز کردیا ہے جیسے اطالوی سیاح پیٹرو ڈیلا والے اور فرانسیسی سیاح کارے نیز کچھ اور سیاحوں کو بھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مصنّف نے اقتصادی رجحانات کے بارے میں کچھ عاجلانہ نتائج اخذ کر لیے ہیں، جو ان کے پیش کیے ہوئے ثبوتوں

Marfat.com

سے میل نہیں کھاتے ہیں۔ مزید براں، مُصنّف سترھویں صدی کے بارے میں جو بیانات دیتا ہے ان کی تائید میں بڑی آزادی کے ساتھ سترھویں صدی کے آخر اور اٹھارویں صدی کے وسط تک کے ثبوت و شہادت پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر پاولوف کے برعکس ڈاکٹر علائف اپنی کتاب ازبان انڈیا میں ماخذوں کے بارے میں تفصیلات کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ انہوں نے جو دور منتخب کیا ہے یعنی چودھویں سے اٹھارویں صدی تک کا دور، وہ نہایت طویل ہے۔ اور اس کے بارے میں بہت سے اور مختلف قسم کے ماخذ موجود ہیں۔ ڈاکٹر علائف نے اولین اہمیت والے طرح طرح کے ماخذوں سے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے جیسے کتبے، سفر نامے، یوروپی کمپنیوں (خصوصاً انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی) کی چھپی ہوئی دستاویزیں اور عصری روز نامچے (انگریزی ترجمے)۔ انہوں نے ضلع گزیٹیروں، رسالوں، اور دوسری اطلاعاتی تحریروں سے بھی استفادہ کیا ہے جو ان کے احاطہ تحقیق میں آتی ہیں اور جنھیں ملکی سرکار کے شعبے موجودہ اور پچھلی صدیوں میں وقتاً فوقتاً شائع کراتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر علائف نے عملاً ان ساری طبع شدہ تحقیقوں سے استفادہ کیا ہے جو جنوبی ہند کے بارے میں کی گئی ہیں۔ اور ان کے دور تحقیق سے تعلّق رکھتی ہیں۔ یہ سب تحقیقیں انگریزی میں ہیں اور ہندوستانیوں یا یوروپی لوگوں کی ہیں۔ وہ اپنے نتائج کے بارے میں احتیاط برتتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے عصری ثبوتوں اور شہادتوں کی بنیاد پر نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر علائف کا رسالہ درحقیقت ایک بڑا تفصیلی تحقیقی کام ہے۔

ڈاکٹر چیچیروف نے اپنا رسالہ اکونومی چیسکوتے رزوتیائی انڈائی پیریڈ انگلائی اسکم زودوانیم لکھتے وقت اولین اور ثانوی اہمیت کے سارے ماخذوں (یوروپی تجارتی

Marfat.com

کمپنیوں کے طبع شدہ دستاویزات اور اس زمانے کے یوروپی سیاحوں کے طبع شدہ سفرنامے) کے علاوہ انہوں نے فارسی کے ان عصری روزناموں (فارسی میں) کا بھی مطالعہ کیا ہے جن کا ان کے موضوع سے کوئی تعلّق ہے۔ انہوں نے بنگالی زبان کے کچھ ماخذوں سے بھی استفادہ کیا ہے تاکہ سماجی و اقتصادی حالت کے بارے میں ان کے نتائج کو تقویت حاصل ہو سکے۔ موضوع سے تعلّق رکھنے والے عصری کتبات کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرے سوویت مورخوں کی طرح انہوں نے حکومتِ ہندوستان کے مختلف محکموں کی شائع کی ہوئی رپورٹوں کا بھی مطالعہ کیا ہے تاکہ زرعی نظام کے بارے میں صحیح تناظر حاصل ہو سکے۔ ڈاکٹر چیچیروف نے تنقیدی طور سے عملاً ان ساری مطبوعات سے استفادہ کیا ہے جو اس مضمون پر یوروپی اور ہندوستانی محققوں نے انگریزی زبان میں طبع کرائی ہیں۔

لہٰذا اس مختصر بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغل ہندوستان پر سوویت محققوں کی تحقیقیں اولین اہمیت والے طرح طرح کے ماخذوں پر مبنی ہیں۔ ان کی تعریف کرنا چاہیے کہ انہوں نے اتنی زبانوں اولین اہمیت والے اتنے بہت سے ماخذوں سے استفادہ کیا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ طبعی وجوہات کی بنا پر وہ مقامی اشیاء سے استفادہ نہ کر سکے۔

Marfat.com

حوالہ جات

1۔ Contributions of Indian Economic Hist-
-ory (Calcutta, 1960), p. 98

2۔ آئی، ایم، رائزنر، نارڈونی ڈویزنیا وی انڈائی وی XVII تا XVIII
وی ۔ دی. موسکودا، 1961 ۔

3۔ ایضاً، صفحات 5 تا 6 ۔

4۔ ایضاً، صفحہ 7 ۔

5۔ ایضاً، صفحہ 11 ۔

6۔ ایضاً، صفحہ 14 ۔

7۔ ایضاً، صفحہ 15 ۔

8۔ ایضاً، صفحہ 16 ۔

9۔ ایضاً، صفحہ 17 ۔

10۔ ایضاً، صفحہ 18 ۔

11۔ ایضاً

12۔ ایضاً

13۔ ایضاً، صفحہ 19 ۔

14۔ ایضاً

Marfat.com

15۔ ایضاً، صفحہ 21۔

16۔ ایضاً

17۔ ایضاً، صفحہ 22۔

18۔ ایضاً، صفحہ 24۔

19۔ ایضاً، صفحہ 25۔

20۔ ایضاً، صفحات 26 تا 27۔

21۔ ایضاً، صفحہ 27۔

22۔ ایضاً

23۔ ایضاً، صفحہ 29۔

24۔ ایضاً، صفحات 112 تا 113۔

25۔ ایضاً، صفحہ 113۔

26۔ ایضاً، صفحہ 178۔

27۔ ایضاً، صفحہ 193۔

28۔ ایضاً، صفحہ 223۔

29۔ ایضاً

30۔ کے، اے، انتونووا، اوچیرکی اوبشچستوینخ اوتنوشینی، ای، پولیٹی چسکوگو اسٹوری منگولسکائے انڈائی وریمن اکبارا (1556 تا 1605)، موسکووا، 1952 صفحہ 111۔

31۔ ایضاً، صفحہ 113۔

32۔ ایضاً

33۔ ایضاً، صفحہ 114

Marfat.com

34. ایضاً، صفحہ 118 ۔

35. ایضاً، صفحات 118 تا ۱۱۹ ۔

36. ایضاً، صفحہ 120 ۔

37. ایضاً، صفحہ 123 ۔

38. ایضاً

39. ایضاً، صفحہ 125 ۔

40. ایضاً، صفحہ 128 ۔

41. ایضاً، صفحہ 134 ۔

42. ایضاً، صفحہ 135 ۔

43. ایضاً، صفحہ 136 ۔

44. ایضاً، صفحہ 138 ۔

45. ایضاً، صفحہ 139 ۔

46. ایضاً، صفحہ 140 ۔

47. اوجی جیفیز یسے کیپٹل ازماوی الٹرانیکس ووستکا، موسکووا، 1962،
صفحہ 181 ۔

48. ایضاً

49. ایضاً، صفحہ 182 ۔

50. ایضاً، صفحہ 184 ۔

51. ایضاً، صفحہ 187 ۔

52. ایضاً، صفحہ 194 ۔

53. پاولوف، فورمیرووانی انڈاق اسکوئی برژوازی، موسکووا، 1958،

Marfat.com

صفحات 35 تا 36 ۔

54۔ ایضاً، صفحہ 35 ۔

55۔ ایضاً، صفحہ 32 ۔

56۔ ایضاً، صفحہ 16 ۔

57۔ علائف، ازہان انڈیا، موسکووا، 1960، صفحہ 59 ۔

58۔ اوجینیز یسے، صفحہ 176 ۔

59۔ ازہان، صفحہ 61 ۔

60۔ ایضاً، صفحات 65 تا 66 ۔

61۔ جینیز یسے، صفحہ 177 ۔

62۔ ایضاً، صفحہ 176 ۔

63۔ چیچیروف، الکنوحے چسیکوئے زرویئ انڈائی پیریڈ انگلائی اسکم زوروانیم، ماسکووا، 1965 صفحہ 280 ۔

64۔ نووے اسٹوریا انڈائی، موسکووا، 1961، صفحہ 55 ۔

65۔ ڈاکٹر عرفان حبیب نے اپنے مقالے " Banking in Mughal India " میں خاصی تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہ مقالہ کتاب " Contribution Indian Economic History" میں چھپا ہے۔ جلد اوّل، صفحات 1 تا 21 ۔

66۔ The Cambridge History of India, (Cambridge, 1937) Vol. IV, P. 57. K. A. Antova, Ocherki p. 120.

67۔ Pant, D. , The Commercial policy the Mughal, (Bombay, 1930), 'P 95; Ed. Dauvers, FC. Letters ecived by the East India Co. from its servants in the East. 1602-13 (London,1896) Vol.I,p.32 Pelsaert,Jahargir's India, (Combridge,1925) p.19

Marfat.com

68۔ ہم اس کا حوالہ بھی دے سکتے ہیں کہ اناج ہندوستان کے ایک حصّے سے دوسرے حصّوں میں بھیجا جاتا تھا۔ اُن دنوں یہ ایک عام بات تھی۔

Irfan Habib,the Agrarian System of Moghul India London,1963.

69۔ اس بیان کی تائید میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہروں میں ملازموں کی بہتات تھی اور غلاموں کی تجارت زوروں پر تھی۔

70۔ The English Factories in India,1622-23,(Oxford 1908) P.116'The English Factories in India,1661-64,(Oxford 1923),p.209'The Diaries of Streynsham Master,London 1911).Vol.I,p.113

71۔ Fryer,A New Account of East India and Persia (London 1909)Vol.I,p 122:Master Vol.I,p.135

72۔ The English Factories in India; 1630-33 Oxford1910 33

73۔ Master,Vol I pp 113 , 138 , 141

74۔ The English Factories in India 1646 (Oxford, 1914)pp 27

75۔ The English Factories in India, 1942 -45 (Oxford 1913) pp 164 - 205

76۔ یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جہاز سازی اور کان کنی میں صنعتی نظام کے جراثیم پہلے ہی موجود تھے۔ یورپی سیاحوں کے بیانات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

Marfat.com

آنند کمار سوامی راجپوت مصوّری
کے مورّخ کی حیثیت سے

بی۔ این۔ گوسوامی

راجپوت مصوری کے مورّخ کی حیثیت سے آنند کمار سوامی کے بارے میں لکھنا بیک وقت مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ آسان یوں ہے کہ اس کی ذات یا اس کی تحریکوں کے بارے میں شاید ہی کچھ ایسی باتیں ہوں جو معلوم نہ ہوں۔ وقت کے اعتبار سے وہ ہم سے اتنے نزدیک ہیں کہ ان کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ اور ان کی تحریروں کے بارے میں شاید سب کچھ معلوم ہے، اور مزید یہ کہ، جن ماخذی اشیا کو انہوں نے اپنے موضوعات کی بنیاد بنایا ہے وہ ایسی نہیں ہیں جن تک صرف انہی کی رسائی ہوتی ہے۔ اور پھر بھی ان کے کام کے بارے میں کچھ لکھنا نہ صرف اس لیے مشکل ہے کہ راجپوت مصوری پر حرفِ آخر ابھی لکھا نہیں گیا ہے — ہر گزرتا ہوا سال نئے دستاویزوں پر روشنی ڈالتا ہے — بلکہ اس لیے بھی مشکل ہے کہ ان کی تحریر کی روشنی دل میں گھر کر جاتی ہے اور وہ اتنے سلیقے سے لکھتے ہیں کہ جہاں انتہائی زور دے رہے ہوں وہاں بھی عمدگی کے ساتھ کسی نہ کسی طرح اختلافات کی گنجائش چھوڑ دیتے ہیں تاکہ ان کے دعوے بھی اپنی جگہ قائم رہیں اور اختلافات بھی باقی رہیں۔ وہ اتنے یقینِ کامل کے ساتھ لکھتے تھے اور ان میں قارئین

Marfat.com

کو متاثر کرنے کی اتنی صلاحیت موجود تھی کہ آج بھی کوئی شخص ان کی کتاب پڑھتا ہے تو اس پر بے جانے بوجھے ان کا جادو چل جاتا ہے، اور ان کے بارے میں اس کا فیصلہ معطل سا ہو کر رہ جاتا ہے۔

آزاد فیصلوں کو اپنے حق میں بدل لینے کی اس لیاقت کا مظاہرہ انہوں نے اپنی ابتدائی تحریروں سے اس زمانے میں ہی کر دیا تھا جب انہوں نے علم معدنیات کو چھوڑ کر ہندوستان کے فن اور تہذیب کی ترجمانی شروع کر دی تھی، اور جب انہوں نے اپنی کتاب راجپوت پینٹنگ لکھی، جس سے پہلے اسی موضوع پر 1912ء میں وہ ایک مختصر مضمون لکھ چکے تھے[2]۔ تو مغربی دنیا میں جیسے طوفان آ گیا۔

ان کی راجپوت پینٹنگ کی پہلی طباعت کو پچاس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس وقت سے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور ابتدائی زمانے کی ان تحریروں میں ہندوستانی مصوری پر کی جانے والی تحقیقوں کے باعث بڑی اہم تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ اس لیے اب وقت آ گیا ہے کہ ڈاکٹر کمار سوامی کے کام پر اور خصوصاً اس کام پر جو راجپوت مصوری سے تعلق رکھتا ہے نئے سرے سے نظر ڈالی جائے۔ یہ نظر محض اس خیال سے ہی نہ ڈالی جائے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے فیصلے پختہ ہو گئے ہیں، بلکہ اس لیے بھی ڈالی جائے کہ گو یہ ایک رسم سی بن گئی ہے کہ کمار سوامی کے اخذ کردہ نتائج سے اختلاف کیا جائے، پھر بھی اس موضوع پر لکھنے والے تقریباً سارے ہی مصنفین آج بھی جب راجپوت مصوری کی روح تک پہنچنا چاہتے ہیں تو انہی کی تحریر سے رجوع کرتے ہیں۔ وہ کتاب جس نے مصنفوں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا تھا آج بھی باعث دلکشی بنی ہوئی ہے۔

آنند کمار سوامی کی کتاب کی خوبیوں پر اگر تفصیل سے گفتگو کی جائے تو ایسا لگے گا کہ جانی بوجھی باتوں کو بار بار کہا جا رہا ہے۔ صحیح معنوں میں انہوں نے ہی راجپوت

Marfat.com

فن کی دریافت کی، اور اگر یہ کہا جائے کہ راجپوت مصوّری کے نمونے موجود تھے اور ان سے پہلے شائع بھی کیے گئے تھے[3]۔ تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان سے پہلے نہ ان نمونوں پر مجموعی طور سے نظر ڈالی گئی تھی اور نہ انہیں صحیح طور سے سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی وہ ایک انبار کی شکل میں بڑے ہوتے تھے جنھیں دورِ وسطیٰ کی ہندوستانی مصوّری کا نام دیا جاتا تھا، اور اس بات کا سہرا ڈاکٹر کمار سوامی کے سر ہے کہ انہوں نے ان نمونوں کو ڈھونڈا، جھاڑا، پونچھا اور پھر اپنے لطیف محاوروں کے چوکھٹے میں جڑ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ہمارے واسطے راجپوت مصوّری کے جوہر کو چھان کر نکالا، اور اس مہم میں ان کے فکر و خیال کی وہ تابناکی اور اظہارِ خیال کی وہ روانی اور حسن کام آیا جو ان میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ ہندوستانی فن کے معاملے میں انہیں بلاشبہ آج تک کے سارے فصیح ترین مُصنّفوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے پیہم کوششوں کے ذریعے نئی تحقیقات کے لیے ایک ماحول بنا دیا اور اس ماحول کو بیڈن پوول اور جیمس فرگوسن جیسے ماہرین، کی لغویت اور تعصب" نیز ہندوستانی فن کو" دوبارہ زندہ کرنے والے" متعدد مُصنّفوں کی بے جا محبت اور بے جا جوش و خروش سے پاک کر دیا۔

ہمارا خاص مقصد بہر حال یہ ہے کہ آنند کمار سوامی نے مورّخِ فن کی حیثیت سے جو کام کیا ہے اس پر نظر ڈالیں، اور جب اس نظر سے دیکھا جاتا ہے تو ان سے بہت سے اختلافات بھی پیدا ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ اس مختصر مقالے کا ایک ضروری مقصد یہ بھی ہے کہ ان اختلافات کو ضابطہ تحریر میں لایا جائے۔ ایسا کرتے وقت غلطیاں بھی سرزد ہو سکتی ہیں، لیکن ذیل کے نکات اس لیے سامنے لائے گئے ہیں کہ مختلف نقطۂ نظر کا پیش کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

ابتدا ہی میں ہر شخص مجبور ہو کر یہ سوال پوچھ لیتا ہے کہ ڈاکٹر کمار سوامی کی

Marfat.com

رائے میں وہ حدود کیا ہوتیں ہیں جن کا ایک مورّخِ فن کو احترام کرنا چاہیے۔ انہوں نے اپنی کتاب راجپوت پینٹنگ5 میں لکھا ہے کہ "کسی کو مورّخِ فن ثابت کرنا ہو تو اس میں لیاقت ہونا چاہیے کہ وہ اپنے موضوع اور اپنے قاری کے درمیان ایک تعلّق قائم کر دے" اور اپنا جملہ جاری رکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ " میں نے بس یہی کوشش کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ اس معمولی بیان کا کوئی معمولی حصّہ نہ تھا جس بیان کے ذریعے انہوں نے اپنی ابتدائی کتاب کے "مستقبل کے طلبا" سے " ارادی اور غیر ارادی غلطیوں" کو نظر انداز کرنے کی درخواست کی تھی۔ یہ جملہ مورّخِ فن کی مقصد کی سوچی سمجھی تعریف تھا۔ کم و بیش اسی تعریف سے وہ آخری ایّام تک وابستہ رہے۔ اس ابتدائی زمانے کے سیاق میں دیکھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آنے لگتی ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب راجپوت پینٹنگ میں اس مظہرِ حسن کی سماجی اور نفسیاتی تشریحات پر اتنا وقت کیوں صرف کیا۔ لیکن برسوں بعد بھی وہ یہی سمجھتے تھے کہ بحیثیت مورّخِ فن یہی تشریحات اُن کا موضوع سخن ہیں۔ مدرسہ ہائے فن میں امتیاز۔ مختلف طرزِ فن کا ارتقا، ان کا تجزیہ، اور ان کے مابین آپسی تعلقات۔ ان سب باتوں کی اہمیت جیسا کہ ان کی کتاب میں ہے۔ بس معمولی رہی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے ان باتوں کو نظر انداز کیا۔ ذہانت اور بصیرت کی بہتات کے ساتھ انہوں نے ایسے اشارے دیئے اور ایسے نظریئے قائم کیے جنھوں نے بعد کی تحقیقوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا، لیکن ان باتوں پر انہوں نے خاص طور سے سوچا ہو ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا بیشتر وقت راجپوت مصوّری کی تاریخ لکھنے پر نہیں بلکہ اس کی ترجمانی پر صرف ہوا۔

آیئے اس کی ایک مثال لیں۔ آنند کمار سوامی نے راجپوت مصوّری کو راجستھانی اور پہاڑی دو بڑے خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ اپنی کتاب راجپوت پینٹنگ میں انہوں

Marfat.com

نے اوّل الذکر کو جے پور، دتیا، اور چھا اور" غالباً اودے پور اور اجّین" وغیرہ جیسے مقامی مدرسہ فن میں تقسیم کیا ہے، اور یہ تقسیم کرتے وقت انہوں نے مقامات کے درمیان محض فاصلے کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی طویل بحث نہیں کی ہے کہ وہ کیا چیزیں ہیں جو ایک سے دوسرے کو جدا کرتی ہیں۔ پہاڑی گروہ میں انہوں نے دو خاص مدرسوں جموں اور کانگڑھ کے درمیان لکیر کھینچی ہے، اور اس پورے علاقے کی مصوّری کے سارے نمونوں کو انہی دو مرکزوں سے وابستہ کر دیا ہے، لیکن ساتھ ساتھ اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ کچھ اور مرکز بھی ہو سکتے ہیں جیسے چمبا، کُولُو، منڈی، سوکیت، رامپور، گولیر جہاں زیادہ سرگرمی تھی[8]۔

راجپوت پینٹنگ کی اشاعت کے تقریباً دس سال بعد انہوں نے مقامی مدرسوں میں راجپوت مصوّری کی جو تقسیم کی تھی اس میں اور زیادہ مواد کا اضافہ کرنا چاہا، اور راجستھان گروہ میں بندیل کھنڈ، میواڑ، مغربی مالوہ اور گجرات نیز مرکزی راجپوتانہ (جس میں انہوں نے " جودھ پور، بیکانیر اور سب سے زیادہ یہ کہ جے پور" کو رکھا) کے مرکز شامل کر دیئے[9]۔ ہر چند کہ یہ تقسیم بڑی تفصیلی اور مؤثر معلوم ہوتی ہے، پھر بھی ان بنیادوں پر گفتگو کرنا خارج از دلچسپی نہ ہوگا جن کی بنیاد پر ڈاکٹر کمار سوامی نے ان میں تمیز کی اور فن کے نمونوں کو بعض مدرسوں سے منسوب کیا۔ ابتدائی راگ ـــ مالا مجموعے بندیل کھنڈ کے حصّے میں آئے، جس کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ " نمونوں میں دی ہوئی عمارتوں کا انداز عموماً ایک جیسا ہے، اور ان پر جو اشعار لکھے ہوئے ہیں ان کی زبان ایک جیسی ہے[10]"، لیکن ایسا لکھتے وقت انہوں نے ایمانداری سے اس ڈر کا بھی اظہار کیا کہ " یہ بنیاد کمزور بھی ہو سکتی ہے۔"

میواڑ مصوّری کے واسطے ان کے نزدیک خاص ثبوت یہ تھا کہ مصوّری کے نمونوں

Marfat.com

میں شری کشن کو شری ناتھ جی کے روپ میں دکھایا گیا ہے، اور چونکہ یہی چیز ناتھواڑہ کے مندر میں ملتی ہے اس لیے "فطری طور پر یہ فرض کیا جا سکتا ہے" کہ مصوّری کے یہ نمونے میواڑ میں تیار کیے گئے تھے۔ اُودے پور کے جھیل محلوں میں دیواری تصویریں بھی موجود تھیں، اور اُودے پور کے خاص محل کی دیواروں "زیادہ نئی شبیہیں اور مصوّری کے دوسرے نمونے" موجود ہیں۔

ڈاکٹر کمار سوامی نے مزید کہا کہ جودھ پور کی مصوّری "ایک خاص قسم کے بڑے صافے"[12] کی وجہ سے پہچانی جا سکتی تھی؛ اور جہاں تک اجمیر اور کچھواہوں کے دارالحکومت آمبیر کا تعلّق ہے، بڑے معقول طور پر یہ فرض کیا جا سکتا ہے..... پہلے ہی سولھویں اور سترھویں صدی میں راجپوت مصوّری کا خاص مرکز تھا: اس مفروضے کا ایک سبب تو یہ ہے کہ جے پور اور مغل دربار کے درمیان سیاسی تعلّقات کے باعث اس مصوّری نے ابتدائی مغل مصوری کو متاثر کیا تھا۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ بیسویں صدی کے جے پور میں کاغذ اور دیوار دونوں پر مصوّری کی ایک قومی روایت موجود ہے۔[13]

ڈاکٹر کمار سوامی نے مصوّری کے تقریباً ان سارے مدرسوں کی بابت جو کچھ لکھا ہے اس میں خاص معقول باتیں بھی ہوں گی، لیکن ہر شخص کی توجہ اس طرف مبذول ہو جاتی ہے کہ جن باتوں کی بنیاد پر وہ مختلف مدرسوں میں تمیز کرتے ہیں ان کا تعلّق طرزِ مصوّری کی اندرونی خوبیوں سے الگ ہوتی ہیں۔ کوئی بھی شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ ڈاکٹر کمار سوامی نے جن باتوں کو ثبوت بنایا ہے وہ باتیں دراصل ہر مدرسہ فن کے مزید تجزیے کا آغاز بن سکتی ہیں۔ ایک ایسی ناقابلِ اعتراض بنیاد جس کی بنا پر کسی مخصوص مدرسہ فن کی مصوّری کے نمونوں کو یکجا کہا جا سکتا ہے۔ یہ بڑی فطری بات ہوتی ہے کہ کسی مدرسہ فن کے طرزِ مصوّری کے اجزائے ترکیبی کا بیان

Marfat.com

اور تجزیہ کر کے اس مرکزِ فن کے انداز پر بناتے ہوئے مصوّری کے زیادہ سے زیادہ نمونے شناخت کیے جاتے اور پھر اس مدرسہِ فن کی نشو و نما بیان کی جاتی۔ لیکن کام کا یہی زیادہ اہم حصّہ تشنۂ عمل رہ گیا ہے۔

پہاڑی مصوّری کی بابت ڈاکٹر کمار سوامی کے بیان میں یہی بات نظر آتی ہے کہ وہ پنجاب کے پہاڑی علاقوں کی مصوّری کے نمونوں کو طرزِ مصوّری کی بنیادوں پر شناخت کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ انھوں نے 1916ء میں پہاڑی مصوّری کے نمونوں کی جموّں اور کانگڑہ دو گروہوں میں جو تقسیم کی تھی اس تقسیم کو انھوں نے اپنے کیٹیلاگ میں قائم رکھا لیکن اس کے ساتھ یہ لکھ دیا کہ "ہو سکتا ہے کہ زیادہ صحیح علم حاصل ہونے پر پہاڑی مصوّری کے زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ نمونوں کو کسی اور منصوبے کے تحت تقسیم کرنا پڑے[۵]"۔ لیکن اس "منصوبے" میں اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کہ روایتی بیانات کے مطابق پہاڑی ریاستوں کو سیاسی اعتبار سے مشرقی یا جالندھر کے قرب و جوار کی ریاستوں کے گروہ اور مغربی یا ڈوگرا ریاستوں کے گروہ میں تقسیم کیا گیا ہے، جس میں سے ہر گروہ میں گیارہ ریاستوں کے نام اور اُن پر حکومت کرنے والے خاندانوں کے نام دیے گئے ہیں جیسے کٹوچ، گلیریا، جاموال، جسروٹیا وغیرہ۔ اس بات کا یا تو معمولی سا ذکر ہے یا پھر کوئی ذکر نہیں ہے کہ کیا ہر خود مختار سیاسی اکائی سے لازمی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہاں مصوّری کا اپنا ایک آزاد طرز موجود تھا، اور حالانکہ ڈاکٹر کمار سوامی کے خیال میں نور پور، گولر، کانگڑہ، منڈی، ساکھیت جموّں اور بندھرالٹا کے علاوہ دوسری ساری ریاستوں میں اپنے اپنے مدرسہِ فن تھے، لیکن اس وقت تک جو علم حاصل ہوا تھا اس کی روشنی میں ان کے لیے یہ بتانا مشکل تھا کہ کون سا نمونہ کس مدرسہِ فن سے تعلق رکھتا تھا[۶]۔

Marfat.com

یہ نتیجہ اخذ کرنا ہی پڑتا ہے کہ ڈاکٹر کمار سوامی نے مصوّری کے مقامی مدرسہ ہائے فن کا موجود قائم کرنے کے لیے سیاسی حدود اور سیاسی اثر کو مرکزی اہمیت دی، کیونکہ اگر ایسا نہ سمجھا جائے تو پنجاب کے پہاڑی علاقوں کی ساری ریاستوں، اور جموّں نیز کانگڑہ سے تعلّق رکھنے والے فن کے دونوں مدرسوں کی وضاحت کرنا بڑا مشکل ہو جائے گا۔ آخر الذکر کے معاملے میں وہ بڑے معنی خیز انداز میں یہ تحریر کرتے ہیں کہ اگر اس مظہر حسن کی وضاحت انہیں کرنا پڑے تو وہ اس طرح کریں گے کہ "یہ بتا دیا جائے کہ اٹھارویں صدی میں جموّں اور کانگڑہ پہاڑی ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقت ور اور دولت مند ریاستیں تھیں"۔[16]

ڈاکٹر کمار سوامی نے جو بڑے بڑے فرق بتائے ہیں وہ اب بظاہر معقول نہیں لگتے، اور خوش قسمتی سے اب ہمیں مقامی مدرسہ ہائے فن کے بارے میں بہت زیادہ علم حاصل ہو چکا ہے، لیکن اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ بسوہلی، مانکوٹ، کُولو اور بلاس پور جیسے مرکزوں میں فن کی نشوونما کی جو اہمیت ہے، اس زمانے میں اندازہ نہ لگا پانے کی وجہ سے میں انہیں مورد الزام ٹھہرا رہا ہوں۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ ڈاکٹر کمار سوامی نے جو تقسیم کی اس میں جلد بازی سے کام لیا۔ اور ثبوت و شہادت کے لیے جن اشیاء کو بنیاد بنایا انہیں اور زیادہ بہتر طریقے سے بنیاد بنایا جا سکتا تھا۔

یہ بات ہمیں ان ماخذوں میں سے ایک ماخذ کی طرف لیجاتی جیسے ڈاکٹر کمار سوامی نے معلومات حاصل کرنے کے لئے لائقِ اعتبار سمجھا۔ یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ پہاڑی مدرسہ ہائے فن کے تجزیے کے واسطے انھوں نے خود پہاڑوں میں جا کر تحقیق کی یا شاہی ذخیروں کو دیکھا۔ انہوں نے اس علاقے میں صرف ایک دفعہ جانے کا ذکر کیا ہے اور وہ بھی پرانے کانگڑہ کے شہر میں۔ اس

Marfat.com

لیے یہ نتیجہ اخذ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہیں آتا کہ انہوں نے یہ موٹی تقسیم کچھ اس بنا پر کی کہ جموں اور کانگڑہ دولت اور قوت کے اعتبار سے اہم ریاستیں تھیں، اور کچھ اس معلومات کی بنا پر کی جو لو واورات کے سوداگروں اور خصوصاً امرتسر کے اس سوداگر"[17] نے فراہم کی تھی؛ جس کا ذکر وہ اپنی تحریروں میں بڑے نمایاں طور سے کرتے ہیں۔ یہی وہ سوداگر تھے جن سے انہیں مصوری کے وہ بہت سے نمونے اور تصویری خاکے دستیاب ہوئے، جن کی مدد سے ان کا عظیم الشان ذخیرہ وجود میں آیا۔ یہ وہ دن تھے جب سوداگر اپنے ساتھ مینا توروں کے انبار لیے پھرتے تھے، اور خوبیوں کا خیال کیے بغیر سارے نمونوں کے نہایت ہی کم دام مانگا کرتے تھے[18]۔ اگر کوئی گاہک دلچسپی دکھاتا تو یہ سوداگر ان نمونوں کی بابت "صحیح معلومات" فراہم کر دیتا، اور یہ نتیجہ اخذ کیے بنا نہیں رہا جا سکتا کہ ڈاکٹر کمار سوامی کے ثبوت و شہادت کا خاصہ بڑا حصہ انہی سوداگروں کی فراہم کردہ معلومات پر مبنی ہے۔

بظاہر یہ بات قابلِ اعتراض نہیں لگتی؛ اور یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ یہ سوداگر اپنی جمع کی ہوئی چیزوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوں گے۔ مصوری کے نمونوں کی سخت تلاش میں وہ پہاڑوں کی آخری حدوں تک پہنچ گئے ہوں گے، اور ذخیروں کی بابت، جو نمونے حاصل کیے ہوں گے ان کے ساکھوں کی بابت، مصوروں کی بابت، اور مصوروں کی خاندانی روایتوں کی بابت انہیں معلوم ہوا ہوگا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ساری معلومات وہ ہوگی جو انہوں نے مختلف اسباب کی بنا پر اپنے ہی تک محدود رکھی ہوگی۔ جو انہوں نے فراہم کی ہوگی وہ یا تو یہ سمجھ کر دی ہوگی کہ دوسروں کے لیے بابت دلچسپی ہوگی یا پھر سوچ سمجھ کر اسے بدل کر پیش کیا ہوگا، کیونکہ جن لوگوں سے انہیں یہ نمونے ملتے تھے ان کا صحیح پتہ اس ڈر سے نہ دیتے ہوں گے کہ کہیں حریف سوداگروں کو نہ معلوم ہو جائے یا پھر خود

Marfat.com

گاہک براہِ راست خریدنے پہنچ جاتیں اور بعض صورتوں میں قانون کا خوف بھی رہتا ہوگا، کیونکہ ہمیں خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ کم از کم فن سنگتراشی کے بہت سے نمونے ان قانونوں کو توڑ کر حاصل کیے گئے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ اہم یادگاروں کو محفوظ رکھا جائے۔ اس کاروبار میں ایسی بہت سی کہانیاں سننے کو ملتی ہیں کہ سوداگروں نے جو نمونے فراہم کیے ان کے بارے میں کس کس طرح محققوں کو دھوکے دیے، تاہم محققوں نے بڑی ہمت کے ساتھ اس "معلومات" کی تصدیق کی اور پھر اس کی بابت ایک نظریہ بنایا!

صرف ایک معاملہ ایسا پتہ لگا ہے جب ڈاکٹر کمار سوامی کو سوداگر کی معلومات پر کچھ شک گزرا، اور وہ بھی اس وقت جب اس سوداگر نے کچھ ایسی تصویروں کی تفصیلات بتائیں، جن کو وہ خود جموں طرزِ فن کا نمونہ سمجھ رہے تھے۔ امرتسر کے سوداگر نے انہیں "تبتی" کہا، اور ڈاکٹر کمار سوامی مصوّری کے ان نمونوں کی بابت دی جانے والی تفصیلات پر ہلکا سا شبہ کرتے ہوئے صرف یہ لکھتے ہیں کہ "یہ نام نہاد تبتی" تصویریں"[19]۔ مجھے ڈر ہے کہ باقی سارے معاملات میں انہوں نے اس راوی کی ہر بات کو بڑی سنجیدگی سے مان لیا، اور اس تیز فہمی کے ساتھ ثبوت و شہادت کی چھان بین نہ کی جو ان کے بیشتر کام کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔

مصوّری کے نمونوں پر جو تحریریں دی ہوئی ہیں، ان کو اہمیت دینے کے لیے کوئی بھی شخص اس لیے مجبور ہو جاتا ہے کہ کوئی دوسرا ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ لگتا ہے ان تحریروں کو پڑھتے وقت انہوں نے قدرے جلد بازی سے کام لیا۔ ٹکری تحریروں کو پڑھتے وقت غلطی ہو جائے تو کوئی الزام نہیں دے سکتا، کیونکہ یہ ایک ایسی لپی ہے جو ایک نہایت مستقل مزاج محقق کے لیے چنوتی بن سکتی ہے، لیکن مصوّری کے بیشتر راجستھانی نمونوں پر جو ناگری تحریریں ہیں ڈاکٹر کمار سوامی نے انہیں بھی پڑھنے میں

Marfat.com

غلطیاں کی ہیں ۔ اگر ذرا بھی صبر و تحمل سے کام لیا جاتا جو اس کام کے لیے ضروری ہوتا ہے تو یہ غلطیاں سرزد نہ ہوئی ہوتیں ۔ ان میں سے بعض تحریروں کو کہیں اور پڑھنے کا مجھے موقع ملا ہے۔[20] اور گو ایسے مختصر اور پر مغز عنوانات کے پڑھنے میں ہر شخص غلطی کر سکتا ہے جیسے عنوانات راجپوت مصوّری کے نمونوں پر اکثر لکھے نظر آتے ہیں، پھر بھی یہ بات نہایت ضروری ہے کہ جب تک تحریر کے بارے میں ہر شک و شبہ رفع نہ ہو جائے اس کی بابت کوئی نظریہ نہ قائم کیا جائے ۔

ممکن ہے کہ ڈاکٹر کمار سوامی نے راجپوت مصوری کو فن کے چند مخصوص مدرسوں میں بانٹنے کا جو سادہ سا منصوبہ بنایا تھا ، اور انہیں ایسی ریاستوں یا مقاموں سے منسوب کیا تھا جو آسانی سے پہچانے جا سکیں ، اس کا سبب یہ رہا ہو کہ وہ اپنے قاریوں کو ایک درجہ انتشار سے بچانا چاہتے تھے ، کیونکہ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ لکھتے وقت ان کے ذہن میں ایک خاص قسم کے قاری تھے ۔ یہ بات صاف ہے کہ انھوں نے مغربی عوام کے لیے لکھا کہ — ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ راجپوت مصوّری کے بارے میں تشریحات اور بلاشبہ ان کے بہت سے دوسرے نظریات ان کتابوں میں ملتے ہیں جو زیادہ تر انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں شائع ہوئی ہیں — اور غالباً وہاں کے لوگوں کے خیال سے اس تقسیم کو ضرورت سے زیادہ آسان بنایا ۔ اور جانے بوجھے ناموں اور مظاہر حسن کی متوازی اصطلاحوں کا استعمال کیا ۔ راجپوت پینٹنگ میں ہمیں جگہ جگہ اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ ایسے موضوعات اور ایسے رویّوں کے توسل سے مغربی دنیا کے سامنے راجپوت مصوّری کی وضاحت کر رہے ہیں جو ان کے جانے بوجھے موضوعات اور رویّے ہیں ۔ چنانچہ ہندوستان میں دیسی شاعری کے کلاسیکی دور کو "اس کے دانتے اور چوسر کا زمانہ"[21] کہا گیا ہے ۔ راجپوت مصوری کا وہ نمونہ جس میں رادھا کرشن کا پیغام سن رہی ہے ، ان کو "ایک اعلان"[22] کی یاد دلاتا ہے ۔ کانگڑہ مصوروں کی دیہاتی

Marfat.com

تصویریں انہیں وٹیو اور ملٹ کے برّی مناظر کی تصویروں سے مختلف لگتی ہیں۔[23]
حالانکہ اپنی تحریروں میں مغربی قاریوں کو خطاب کر کے انہوں نے ایک قابلِ تعریف
مقصد حاصل کر لیا۔ مغربی عوام کا خاصہ بڑا حصّہ ہندوستانی فن کے حسن و جمال سے
متاثّر ہو گیا۔ اور مخصوص قسم کے قاریوں کے لیے لکھنا بھی کوئی بری بات نہیں، لیکن
بدقسمتی یہ ہوئی کہ جُوں جُوں وقت گذرتا گیا ان کا یہ رویّہ اور پُختہ ہو گیا۔ ڈاکٹر کمارسوامی
نے جس منصوبے کے تحت راجپوت مصوّری کی تاریخ کی قدرے سادہ انداز میں ترجمانی
شروع کی تھی وہ منصوبہ بعد کے برسوں میں ایک ایسا سانچہ بن گیا جس سے تاریخِ فن کے
اصل جوہر کا کم از کم کچھ حصّہ ضرور باہر رہ گیا۔ جب کوئی شخص ہندوستانی مصوری جیسے
متعدد رخ والے مظہرِ حسن کی بات کر رہا ہو تو سیدھے خطوط کھینچنے کا امکان کم رہ جاتا
ہے اور نہ اختلافات پرزور انداز میں اور واضح طور پر بیان کیے جا سکتے ہیں، لیکن ڈاکٹر
کمارسوامی نے اسے اس نظر سے دیکھا جیسے یہ محض خالص اور واضح رنگوں کا
معاملہ ہو۔

مثال کے طور پر مغل اور راجپوت مصوّری کے درمیان امتیاز کی بات
لیجیے جس پر وہ بضد تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک ایسا فرق تھا "جس پر مزید کسی دلیل
کی ضرورت نہ رہ گئی تھی .... کیونکہ ہماری معلومات میں جو بھی اضافہ ہوتا ہے اس سے
یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ فن کے شاید ہی کوئی دوسرے ہم عصر دو مدرسے
ایسے ہوں جو مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہوں"۔[24] مغل
مصوّری کو وہ میناتوری مصوری کا فن خیال کرتے تھے، جبکہ ہندو مصوّری ایک
ایسا فن تھی جو مندروں، محلوں اور عام عمارتوں کی دیواروں سے نیچے اُتر آئی تھی۔
پہلی شاہانہ شوق کی چیز تھی، دوسری عالمگیر چیز تھی۔ پہلی شکل کے اعتبار سے
"امیرانہ اور پیشہ ورانہ" تھی جبکہ دوسری پجاریوں والی اور مقبولِ عام چیز

Marfat.com

تھی، اور اس اعتبار سے اکثر اوقات بنیادی طور پر بڑی تصوفانہ ہوتی تھی کہ اس کے ذریعے بیشتر گھریلو واقعات کی لامحدود اہمیت کا اظہار ہوتا تھا۔" ڈاکٹر کمار سوامی اس موضوع پر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ "مغل درباری ایک ایسے فن میں دلچسپی نہیں لے سکتے تھے جو گوالنوں اور گوالوں سے تعلق رکھتا ہو، نہ ویشنوں کو ایسی تصویروں سے دلچسپی ہو سکتی تھی جس میں ہاتھیوں کی لڑائی دکھائی گئی ہو۔"[25]

ان بیانات میں گو لہجے کی شدت نظر آتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ باتیں بہت کچھ صحیح بھی ہیں۔ اور اس موضوع پر کہ فنِ مصوّری کے مغل اور راجپوت مدرسوں میں کوئی فرق نہ تھا، ایک پل بھی سنجیدگی سے بحث کرنے کا امکان نہیں ہے۔ دونوں مدرسہ ہائے فن کے مثالی نمونے ایک نظر میں شناخت کیے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں مدرسہ ہائے فن میں جن باتوں پر زور دیا جاتا ہے، وہ اور ان کے مزاجوں کا اختلاف بھی شناخت میں آ جاتا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس بات پر بھی بحث کی جا سکتی ہے کہ یہ دو عالم ہیں جن کے رہنے والے ایک دوسرے کو پہچانے کی اتنی سخت کوشش کریں گے؟ اگر یہ درست ہے کہ ابتدا کے مثالی نمونوں کا فرق بہت واضح ہے تو کیا یہ بات بھی اتنی ہی درست نہیں ہے کہ جیسے جیسے طرزِ فن ترقی کرتے گئے نشو و نما کے خطوط متوازی رہنے کے بجائے ایک دوسرے کی طرف قدرے جھکتے گئے؟ اس بات سے کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مصوّری کے جو بہت سے نمونے ملے ہیں ان کو جب فن کے کسی مدرسے میں جگہ دینا مشکل ہو گیا تو محققین نے اس مسئلے کا حل یہ ڈھونڈا کہ انہیں "راجپوت مغل" کہنے لگے؟ اور پھر کوئی شخص ان حقائق سے کیسے منہ موڑ سکتا ہے جن کو دوسروں نے بڑے غور سے دیکھا ہے، لیکن ڈاکٹر کمار سوامی نے محض حاشیے میں جگہ دی ہے۔[26]

Marfat.com

کہ جن مغل مصوّروں کے نام ہمیں معلوم ہیں ان میں سے بیشتر ہندو تھے، اور یہ کہ مسلمان مصوّروں کی ایک بہت بڑی تعداد بیکانیر اور میواڑ جیسے راجپوت درباروں میں مصروفِ کار تھی[27] اور یہ کہ اگر مغل مصوّری کا حوالہ نہ دیا جاتے تو اٹھارویں صدی میں مصوّری کے تقریباً ہر پہاڑی نمونے میں جو تبدیلی آئی اس کی وضاحت محض طرزِ فن کی بات کر کے ہرگز نہیں کی جا سکتی۔

یہ خطیبانہ باتیں نہیں ہیں جن کی تکرار کر کے محض ایک خاص نکتے پر زور دیا جا رہا ہے۔ جس بات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر کمار سوامی کا تجزیہ اس صورت میں جائز لگ سکتا ہے جب فن کے دو مدرسوں کے نکاتِ اختلاف پورے عزم کے ساتھ ابھار کر دکھائے جائیں، اور نکاتِ اتفاق و یکسانیت یا تو نظر انداز کر دیے جائیں یا ان کی اہمیت گھٹا کر دکھائی جاتے۔ فن کے ان دونوں مدرسوں کی بابت یہ کہنا کسی طرح جائز نہ ہوگا کہ چند صدیوں تک ان کے درمیان فاصلہ بنا رہا اور یہ ایک دوسرے کی کارروائیوں کو خفیہ طور سے دیکھتے رہے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو اب عام طور پر مان لیا گیا ہے۔

مغل اور راجپوت فن کے مدرسوں کے درمیان مزاج اور احساس کا فرق اس وقت تیزی سے کم ہونے لگتا ہے جب ہم دونوں مدرسوں کے مضمون کے علاقے میں مراجعت کرنے لگتے ہیں۔ اس بات میں سچائی ہو سکتی ہے کہ گو مغل فن شبیہ سازی میں برتر تھا، لیکن راجپوت مصوّری نے "بھی شبیہیں بنائیں" حالانکہ "یہ اس کے فن کا ایک اتفاقی پہلو تھا" یا یہ کہ راجپوت مصوّروں کے مقابلے میں مغل مصوّروں نے اپنے اردگرد کے ماحول میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا جبکہ راجپوت مصوّروں کو یا تو سرے سے ایسی کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں یا بہت معمولی سی تھی۔ لیکن ایک حد کے بعد ان خطوط پر بحث کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ حقیقی تعداد کے اعتبار سے ہم

Marfat.com

کوئی شخص یہ ثابت کر سکتا ہے کہ راجپوت ریاستوں کی ایسی تصویریں جو غیر مذہبی کہی جاسکتی ہیں یا جو بالکل دنیاوی موضوعات پر بنائی گئی ہیں وہ ان کے فن کا اتنا بڑا حصّہ ہیں جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ویشنو لوگ ہاتھیوں کی لڑائی میں دلچسپی لیتے تھے، اور مغل ہمیشہ نہ سہی۔ لیکن کبھی کبھی ضرور روحانیت سے متعلّق موضوعات پر کام کرتے تھے۔ شبیہوں اور درباری منظروں، موسیقی کی محفلوں اور گھوڑ سواروں کی ٹکڑیوں پر جو لاتعداد تصویریں ملتی ہیں اور جن کا تعلّق راجستھانی اور پہاڑی دونوں مرکزوں سے ہے، ایسے موضوعات فراہم کرتی ہیں جن میں مصوّر اور ان کے سرپرست دونوں کو ہی بڑی خوشی حاصل ہوتی تھی، اور یہ موضوعات اس فن کا محض اتفاقی پہلو ہرگز نہیں لگتے۔ ان منظروں میں کوئی خود شناسی نہیں ہے نہ کوئی جھجک ہے، بالکل اس طرح جیسے راجپوت مصوّری کی خاصی بڑی تعداد کے ان نمونوں میں کوئی خود شناسی اور جھجک نہیں ملتی جو علانیہ طور پر عاشقانہ ہیں اور جن میں رتی رہسیہ جیسی کتابوں کے مناظر بڑے شوق سے شوخ رنگوں میں بنائے گئے ہیں۔[29]

ڈاکٹر کمار سوامی پوری راجپوت مصوری کے فلسفیانہ رجحان سے، اور اس بات سے کہ وہ برابر تصوف کی طرف مائل رہی، اس درجہ متاثر ہیں کہ میرے خیال میں وہ اس نکتے پر بعض اوقات حد سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ ہر کوئی دیکھ سکتا ہے کہ راجپوت مصوری میں جو عاشق نظر آتے ہیں وہ سب کے سب کرشن اور رادھا نہیں ہوتے۔ اکثر اوقات یہ عام لوگ ہوتے ہیں، فانی قسم کے نائک اور نائکہ جن کے چہرے بعض اوقات مصوّر کے سرپرست کی اصل تصویر ہوتے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ تصویر میں کسی جانے بوجھے راجہ کا چہرہ نظر آتا ہے۔ جو بانس کی چق کی پیچھے سے جھانک رہا ہوتا ہے یا کسی پوشیدہ مقام پر محبوب

Marfat.com

سے ملاقات کر کے برآمدے سے نکل رہا ہوتا ہے، اور پھر ایسی صورتوں میں یہ بہانہ بھی کہ شاید یہ عاشق کرشن ہو ختم ہو جاتا ہے۔

اپنی کتاب راجپوت پینٹنگ میں ڈاکٹر کمار سوامی نے انیسویں صدی کی سنگی طباعت والی بچّوں کی ایک کتاب دل بہلاوا کا سرورق چھاپا ہے۔ اس میں ایک منظر دکھایا گیا ہے جس میں عورتیں کنویں سے پانی کھینچ رہی ہیں یا پانی لیجا رہی اور ایسی عام بات چیت کر رہی ہیں جس سے اس منظر پر دیے ہوئے عنوان کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر کمار سوامی اس تصویر کو "چاہ محبّت" کہتے ہیں اور پھر کبیر اور ودیاپتی کے اشعار اس انداز میں لکھتے ہیں جیسے تصویر میں اس کنویں کو تصوف کی کسی علامت کی طرح دکھایا گیا ہو۔[30] میرے خیال سے یہ غلط ہے۔ یہ ایک سیدھا سادہ سا منظر ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اور اگر کوئی شخص یہ بتانا ہی چاہتا ہے کہ مصوّری کی راجپوت روایت میں اس کا اصل منبع کیا ہے، تو اس منظر کو اسی طرح کے ان سیدھے سادے منظروں سے وابستہ کر دے جن میں پیاؤ یا کوئی عمارتی سرگرمی دکھائی گئی ہو، یا کسی پڑاؤ میں یا جلتی ہوئی آگ کے گرد مسافروں کا مجمع دکھایا گیا ہو۔

اس معاملے میں اور دوسرے معاملات میں جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر منظر یا ہر صورتِ حال سے ڈاکٹر کمار سوامی جو معنی اخذ کرتے ہیں ان سب کو جوڑ کر ایک ایسی مکمل تصویر بنا دیتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی فن کی روایت ایک نہ ٹوٹنے والا تسلسل ہے، اور راجپوت مصوّری اس کا ایک نہایت اعلیٰ اظہار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سارے وقت بہت سی دلیلیں اسی بات کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے دیتے رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہر شخص اس بات سے واقف ہونے لگتا ہے کہ وہ بڑے لطیف انداز میں مستقل

Marfat.com

مزاج کے ساتھ ایک خاص نمونے کا تانا بانا بن رہے ہیں۔ چنانچہ اس بات کا سبب بھی ظاہر ہونے لگتا ہے کہ وہ مغل مصوّری اور راجپوت مصوّری کے درمیان اتنا فرق کیوں کر رہے ہیں، اور آخر الذکر کو دیسی فن اور عوام کا فن کیوں کہتے ہیں؛ وہ جو نمونہ بناتے ہیں اس میں مغل مصوّری کا کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔ مغل فن" ہندوستانی مصوّری کی طویل تاریخ میں محض ایک واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس واقعے سے ہندوستانی مصوّری نے کوئی اثر نہیں لیا۔ مغل مصوّری نے زندگی اور مذہب دونوں کو ایک ساتھ گلے سے نہیں لگایا اور لہٰذا وہ کوُر پر ہی رہی۔ انہوں نے 1910ء میں سر ولیم روتھنسٹائن کو لکھا تھا" ہندو یا راجپوت فن اجنتا کی نسل سے ہے، اس نے عروج وانتہا اور زوال میں کم از کم 1500 برس بیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں غیر مذہبی مغل فن کے 200 برس ہوا کے ایک جھونکے کی حیثیت رکھتے ہیں"[31] ڈاکٹر کمار سوامی کو ہوا کے اس جھونکے سے کوئی گہری دلچسپی نہ تھی۔

اس بات پر زور دینا کہ راجپوت فن عوام سے وابستہ تھا اس انداز فکر کا ایک حصّہ تھا۔ عوام کے مذہب یا مقبول عام ڈرامے، یعنی شمال ہندوستان کی یاترا یا رسا، سے اس فن کا تعلّق قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے تاکہ یہ پتہ لگ سکے کہ اس فن کی جڑیں اس سرزمین میں کتنی گہری ہیں۔ آیا راجپوت مصوّری عوام کا فن تھی یا "امیر لوگوں کا فن" تھی، اس کا فیصلہ کرنے کے لیے تو تفصیلی مطالعے کی ضرورت ہے، لیکن اس کا مختصراً ذکر کرتے ہوئے یہ بات ضرور بحث طلب ہے کہ راجپوت مصوّری، کم از کم سولہویں سے اُنیسویں صدی تک کی وہ مصوّری جس سے ہم واقف ہیں، کیا اسی انداز میں عوام سے متعلّق ہے جس انداز میں ڈاکٹر کمار سوامی سمجھتے ہیں۔ گو کوئی بھی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ فنِ مصوّری اور راجستھان

Marfat.com

کے درباروں کے درمیان عام طور پر تعلّقات تھے، لیکن پنجاب، پہاڑیوں سے تو اس پختہ تعلّق کے ایسے ثبوت ملتے ہیں جن کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ مجھے پچھلے چند برسوں میں پہاڑی فنکاروں کے متعدّد خاندانوں کی نقل و حرکت دیکھنے کا موقع ملا ہے اور میں نے بڑی دلچسپی سے یہ عمل دیکھا ہے کہ جونہی کہیں سیاسی طاقت کا زوال شروع ہوا ایک لخت وہاں کا فنِ مصوری بھی مضمحل ہونے لگا اور اس دربار سے جو مصور وابستہ تھے وہ شاہی سرپرستی کی تلاش میں کسی اور جگہ منتقل ہو گئے۔[33] اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ راجپوت مصوری کا عوام سے کوئی تعلّق نہ تھا، لیکن کیا یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ مصوری کے ان نمونوں کے غیر رسمی پن، یا ان کے دیہاتی موضوعات کو جو اس بات کا ثبوت سمجھ لیا جاتا ہے کہ فن سرپرستی سے آزاد تھا، بعض اوقات غلط ہوتا ہے۔

لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ راجپو مصوری بھی پورے طور سے نہ سہی تو خاصی حد تک ہی ایک ایسا فن تھا جو راجستھان اور پہاڑوں کے شاہی گھرانوں سے وابستہ لوگوں کے ہاتھوں وجود میں آیا تھا، تو پھر اس فن اور مغل فنِ مصوری کے درمیان جو فرق ہے وہ دھندلا پڑ جائے گا، اور دونوں فن اس طرح متوازی ہو جائیں گے کہ فرق کی بابت دی جانے والی دلیلیں متاثر ہو جائیں گی، اور اس طرح ڈاکٹر کمارسوامی کا وہ مقصد بھی متاثر ہو جائے گا جو انھوں نے اپنا رکھا تھا۔ وہ مقصد یہ ثابت کرنا تھا ہندوستان کے پاس قومی جذبات کے اظہار کے لیے ہمیشہ سے ایک اپنا ذریعہ موجود تھا، اور ایسی چیزیں جو اس فن کی روح سے میل نہیں کھاتی تھیں، انھیں کچھ عرصے تک تو برداشت کیا، لیکن بالآخر نکال باہر کر دیا۔

یہ بات جسے ہم نے ان کا "مقصد" کہا ہے ان کی کتاب راجپوت پینٹنگ کے آخری اس باب میں کھُل کر سامنے آجاتا ہے، جسے بڑی معنی خیز اور قدرے غیر تاریخی انداز میں انھوں نے "آج اور کل" کا عنوان دیا ہے۔ یہاں انھوں نے بے تکلفی سے مورّخِ فن کا رول ختم کر کے بڑی عمدہ اور فصیح زبان میں یہ کہا ہے کہ ہندوستان میں پھر سے زندگی اور مذہب کا اتحاد ہو جانا چاہیے

Marfat.com

کیونکہ اسی اتحاد سے گلِ فن پیدا ہوتا ہے، اور اسی کے ساتھ اپنے اس یقین کامل کا پُرزور اظہار کیا ہے کہ ہندوستان خواہ کتنی ہی مصیبتوں سے دوچار رہے لیکن وہ اپنی آواز پھر حاصل کرے گا۔ ان کے نزدیک راجپوت فن متصوفانہ، غنائی، مسلسل مظہرحسن تھا، جس کی بابت انھوں نے ثابت کر کے دکھایا تھا کہ ایک پوری قوم کا فن تھا، بیک وقت ان ساری قدروں کی علامت تھا جن قدروں کو ان کے زمانے میں بڑی زوردار اور تباہ کن قوتوں سے خطرہ لاحق تھا، اور ان ساری چیزوں کی علامت تھا جن چیزوں کو صنعتی نظام، دفترشاہی اور مغربی اصولوں کے بڑھتے ہوئے سایوں سے بچانے کی ضرورت تھی۔

ان دنوں اس انداز سے بات کہنے کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت تھی جس انداز سے آنند کمارسوامی نے اپنی بات کہی، کیونکہ انھوں نے برطانوی حکومت کے رویّوں پر کڑی تنقید کی، لیکن کیا یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ایسا کرتے وقت انھوں نے اپنے خیالات کی مشتہری کی خاطر اپنے اندر کے مورّخ کو دبا دیا۔ کیونکہ جب ہم رواروی میں کوئی تصویر بناتے ہیں اور ماضی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے وقت ان ثبوتوں اور شہادتوں پر نظر نہیں رکھتے جو موجود ہوتے ہیں تو شاید مورّخ کی حیثیت سے ہم اپنے فرضِ منصبی میں کچھ کوتاہی کرتے ہیں۔

Marfat.com

حوالہ جات

1. Ananda K. Coomaraswamy, Rajput Painting, 2 Vols., Oxford, 1916.

اس تحقیق کے لیے کتاب کا مکمل عنوان باعث دلچسپی ہوگا۔ عنوان یہ ہے: "راجپوت مصوری، راجستھان اور پنجاب ہمالیہ کی ہندو مصوری کا احوال، سولھویں سے انیسویں صدی تک کا بیان جو اس زمانے کی فکر کی روشنی میں دیا گیا ہے"۔ ساتھ میں متن اور ترجمے دیے گئے ہیں۔ بعد میں اس کا نام مختصر کرکے صرف آر۔ پی۔ لکھا جائے گا۔

2. Coomaraswamy, 'Rajput Painting', Burlington Magazine, Vol. XX No. 108, March 1912.

3. Vincent Smith's History of Fine Arts in India and Ceylon (Oxford 1911) and E.B. Havells Indian Sculpture and Painting, (London, 1908).

مندرجہ بالا کتابیں 1912ء سے پہلے ہی شایع ہو چکی تھیں۔ ان میں مصوری کے بعض ایسے نمونے شامل تھے جو ملک سے باہر تھے، یا کم از کم ان کے بارے میں یہ کہا گیا تھا۔ ڈاکٹر کمار سوامی نے مصوری کے راجپوت نمونوں پر ذیل کے اپنے مقالوں میں توجہ دی تھی۔

Selected Examples of Indian Art (Broad Com-

Marfat.com

-pden, 1910, Indian Drawings 2 Vols. (London, 1910-12).

Arts and Crafts of India and Ceylon (Edinburgh, 1913)

لیکن برلنگٹن میگزین کا مضمون اور آکسفورڈ والی تحقیق کی دو جلدوں نے راجپوت مصوری کو نئے معنیٰ پہنا دیے۔

ڈاکٹر کمار سوامی نے ان 'اینگلو انڈین' مصنفین کے بارے میں بڑے طعن آمیز انداز میں لکھا ہے وہ انھیں اس نام سے پکارتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے :

4۔ "یہ بات کہ مصوری کے راجپوت نمونے ان اینگلو انڈین مصنفوں نے بالکل نظر انداز کر دیے غالباً بی۔ ایچ۔ بیڈن پاول کے اس فقرے سے واضح ہو جائے گی: اس طرح کے ملک میں ہمیں توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ کوئی ایسی چیز نظر آجائے گی جو ذہن اور راجپوت کو گہرائی تک متاثر کر سکے گی۔ اینگلو انڈین مصنف کا عام طور پر یہی نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر فرگوسن یہ لکھتا ہے کہ "یہ بات حقیقتاً ایک لمحے کے لیے بھی نہیں مانی جا سکتی کہ ہندوستان اس اعلا معیارِ ذہنی پر پہنچ گیا تھا جس پر یونان پہنچ گیا تھا یا اخلاق کی اس بلندی پر پہنچ گیا تھا جس پر روم پہنچا تھا" یہ فیصلے صحیح ہیں یا غلط اس کا فیصلہ تو خود وقت کرے گا، میں اس سلسلے میں کم سے کم یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ان لفظوں سے کہ "ہمیں توقع نہیں رکھنی چاہیے" اور "یہ بات حقیقتاً ایک لمحے کے لیے بھی نہیں مانی جا سکتی" غیر سائنسی رویے کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر یہ اصول برتا جائے تو تحقیق کا بس ایک ہی مقصد رہ جائے گا کہ ہم نے جو فیصلے پہلے سے کر رکھے ہیں ان کی تصدیق کر دیں۔

5۔ Ibid, Vol. I, p. 6.

6۔ Ibid, Vol. I, p. 6.

Marfat.com

7. Ibid, Vol. I, p. 9

8. Ibid, Vol. I, p. 9

9. Ananda K. Coomarswamy, Catalouge of Indien collection in the Museum of Fine Arts . Boston, pt. V Rajput Painting(Cambridge Mass, 1926)

اس کے بعد اسے محض (Catalogue), p. 3 لکھا جائے گا۔

10. Ibid, Pt. V, p. 3

11. Ibid, Pt. V, p. 4

12. Ibid, Pt. V, p. 4

13. Ibid, Pt. V, pp. 5-6

14. Ibid, Pt. V, p. 6

15. Ibid, Pt. V, pp. 6-7

16. Ibid, Pt. V, p. 8

17. Ibid, Pt. V: p. 7

18۔ رائے کرشن جی ان دنوں کی بہت سی یادوں اور بڑی پُر کشش معلومات کے حامل ہیں جب محققوں کی نظر پہلی بار مصوری کے پہاڑی نمونوں پر پڑی تھی۔ انھیں غیر معمولی وضاحت کے ساتھ یہ یاد ہے کہ اس صدی کی پہلی دو دہائیوں میں لوگوں کو ان نمونوں سے کوئی گہری دلچسپی نہ تھی، نمونوں کے سوداگر انھیں حاصل کرنے کے لیے کس طرح چکر کاٹتے پھرتے تھے، اور ان سوداگروں میں مشہور مشہور سوداگر کون تھے۔ میں رائے جی کا بڑا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے بہت کچھ معلومات دی اور بڑی گرما گرم بحثیں کیں۔

19. (Catalogue), pt. V pp 6-7

Marfat.com

20. B. N. Goswami, ' On some Rajasthani Portraits in the Museum of Fine Arts, Boston' Bulletin of the School of Orient l and African Studies.

21. R. P., Vol. 1, pp 2-3

22. Ibid, Vol. I, p. 8

23. Ibid, Vol. I, p.24

24. Ibid, Vol. I, p. 5

ایسا لگتا ہے کہ یہ موضوع ڈاکٹر کمار سوامی کا پسندیدہ موضوع تھا کیونکہ ان کی اس کتاب میں، اور ان کی ایک اور کتاب History of Indian & Indonesin Art. میں اس مضمون پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ دونوں مدرسہ فن ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو رکھے جا سکتے ہیں۔

25. R. P., Vol. I, p. 6

26. پورا نوٹ دلچسپ ہے اور اس طرح ہے:

"یہاں اس بات پر تفصیل سے بحث کرنا فضول ہے کہ اصل مغل مصوری میں کون کون سے راجپوت عناصر موجود تھے۔ ہندوستانی عناصر مختلف سمتوں میں ملتے ہیں۔

(۱) سترہویں صدی کے پہلے پچیس برسوں میں ہندو موضوعات کی تصویروں میں۔

(۲) "راجپوت دور" میں اکبر اور جہانگیر کے درباروں کے ہندو پہناؤں میں۔

(3) اٹھارہویں صدی میں طرزِ فن اور موضوعات کی آمیزش میں، خصوصاً اودھ میں جب آمیزش کی بنا پر ملے جلے طرزِ فن سامنے آئے۔

(4) اس حقیقت میں کہ نصف سے زیادہ مغل مصور دیسی ہندو تھے۔

Marfat.com

ان تمام حالات کی بنا پر مغل اور راجپوت مصوری میں یکسانیت پیدا ہوگئی، نمبر اور نمبر معاملات میں یہ یکسانیت بالکل سطحی تھی۔ نمبر اور نمبر معاملات میں یہ زیادہ بنیادی تھی۔

History of Indian and Indonesian Art, pp. 127-28, n. 2.

27۔ مسلمانوں مصوروں کا ایک پورا خاندان بیکانیر دربار میں کام کرتا تھا اور میواڑ میں مصور صاحب دین کا نام مشہور ہے۔ بیکانیر کے مصوروں کے تصویری خاکوں کا ایک پورا سلسلہ موتی چند خزانچی مجموعے میں موجود ہے اور زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب یہ سلسلہ کارل کھنڈال والا، موتی چندر اور پرمود چندر کی ذیل کی کتاب میں شایع ہوا تھا:

A Catalogue of the Exhibition of the Shri Moti Chand Khajanchi Collection & Co. (New Delhi, 1960

میواڑ کے مصور کے لیے دیکھیے:

Douglass Barrett and Basil Gray painting of India [Lonsonne, 1963] pp 139 - 140

28۔ مغل اور راجپوت مدرسہ ہائے فن کے درمیان تعلقات کے موضوع پر آرنالڈ اور ولکنسن نے "ہیگل کے انداز کے اس نتیجے پر" آلون اسٹیوکین سے اتفاق کیا ہے کہ ان دونوں مدرسوں کے درمیان بظاہر جو وسیع اختلافات نظر آتے ہیں ان کو ایک گہرا بنیادی اتحاد ختم کر دیتا ہے۔

دیکھیے:

The Library of A. Chester Beatly : A Catalogue and C. [Oxford 1936] Vol. I p. ix

Marfat.com

Basil Gray نے اس موضوع پر مندرجہ ذیل مضمون میں لکھا ہے:

Intermingling of Mughal and Rajput Art 'Marg Vol. 1 1953 P. 37

مغل مصوری کے نمائشی برآمدوں میں یہ (ہندوستانی قوتِ تخلیق) باہر نظر آنے لگتی اور پھر بھی اپنی رُوح کے اندرونی نظارے کو بھولتی نہیں، راجپوت مصوری کے نمائشی برآمدوں میں اندر چلی جاتی ہے، لیکن قدرتی دُنیا سے گہرے طور پر واقف رہتی ہے۔

میں غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے ان بیانات کی تائید میں جو اس مقالے میں اس ضمن میں دیے ہیں، اس موضوع پر جو کل کام ہوا ہے اس سے حوالے دوں پچھلے کئی برسوں میں جو بڑے بڑے ذخیرے جانچے گئے ہیں اور شایع کیے گئے ہیں، اور اس موضوع پر جو اب تیار ہوا ہے، اس سے ہندوستانی مصوری کے طلبہ خوب اچھی طرح واقف ہیں۔

فن کے ان سب ذخیروں میں جو اب تک پہاڑوں میں موجود ہیں کوئی بھی شخص یہ دیکھ سکتا ہے مصوری کے نمونوں کے مجموعے کے مجموعے عاشقانہ، جذبات کے حامل ہیں اور ضلع کانگڑہ میں راجول کے چندو لال اور سملوتی کے پورن چند جیسے مصور جو ابھی حیات ہیں اپنی خاندانی روائتوں کے بارے میں واضح طور سے یہ بتاتے ہیں کہ یہ نمونے سرپرستوں کے کہنے پر خاص طور سے بنائے گئے تھے۔

۳۰۔ R. P. Vol. I p. 76.

۳۱۔ دیکھیے: K. N. Town drow, ' Sir William Rathenstin', Art and Letters' xxv, I, 1951, p 18 R. P. Vol. I p. 2

۳۲۔ R. P. Vol. I p. 2

Marfat.com

"آج کل کا عوامی فن ایک ایسی روایت ہے جو براہِ راست ماضی سے حاصل ہوئی ہے۔ ہندوستان کی دیسی شاعری کی طرح راجپوت مصوری میں یہی عوامی فن اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ یہی وہ تہذیب ہے جو شاہوں اور کسانوں کی مشترکہ تہذیب تھی۔"

مباحثے کے لیے میرے یہ مضمون دیکھیے:

۔33 A study of New Documents, Asian ReAiew, Vol. 2 No. 2 August 1985, 1965. Sikh Painting ; An analysis of Paւronage oriental arts.

Marfat.com

ہنری جارج کین

کے۔ کے۔ شرما

ایچ۔ جی۔ کین نے رگبی، آکسفورڈ اور ہیلے بری میں تعلیم حاصل کی تھی۔ 1847ء میں وہ انڈین سول سروس میں آئے اور 1882ء میں ریٹائر ہو گئے۔ سلطنت برطانیہ کے لیے جو خدمات انجام دیں تھیں ان کے باعث 1879ء کے قریب ان کا احترام کیا جانے لگا تھا۔ انھیں ٹی۔ ایچ۔ ایس۔ ایسکوٹ کی کتاب "سلطنت کے ستون" میں جگہ دی گئی تھی۔ ریٹائر ہونے کے بعد کین نے بہت لکھا، لیکن دَورِ وُسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کے مطالعے کے واسطے ان کا بڑا حصّہ دی مغل امپائر (1869ء)، دی فال آف دی مغل امپائر (1876ء)، اور دی ٹرکس ان انڈیا (1879ء) کی شکل میں پہلے ہی دیا جا چکا تھا۔ انھوں نے دَورِ وُسطیٰ کے ہندوستان کو کیوں فوقیت دی اس کی وضاحت ان کے اس فقرے سے ہو جاتی ہے جو کافی بعد میں تحریر کیا گیا تھا: "لفظ تاریخ کو اگر بالکل صحیح معنیٰ میں استعمال کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کا آغاز مسلم قوت کے قیام سے پہلے شاید ہی ہوا ہو" (ہسٹری آف انڈیا، 1893، 'I'، ix)۔ یہاں بہرحال یہ بتا دینا چاہیے کہ کین ہندوستان کے پہلے برطانوی مؤرخ نہیں تھے جنھوں نے اس رائے کا اظہار کیا ہے۔

کین اپنے آپ کو اسٹوارٹ الفنسٹن کا "شاگرد" سمجھتے تھے۔ لیکن اس بنا پر

Marfat.com

انھوں نے یہ نہیں کیا کہ اپنے سابق مورخوں کے خیالات قبول کرنے سے یا انھیں دُہرانے سے باز رہتے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہندوستان میں پڑھنے والے موجود ہیں، انھوں نے مناسب یہی سمجھا کہ اپنے وطن اور ہندوستان کے انگریز قاریوں کے لیے ایک عام مورخ کے انداز میں لکھیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی طلبہ کے سامنے ہندوستانی تاریخ معقول انداز میں پیش کریں۔ ایسا اسی صورت میں ممکن تھا جب "واقعی عملی حقایق کا ذکر کیا جائے،" اور اونچی حیثیت والے افراد کی جنگوں، محاصروں، یا سازشوں اور جُرموں کی ذرا ذرا سی تفصیلات بیان نہ کی جائیں" (ہسٹری آف انڈیا IX)۔ الفنسٹن اور حقیقتاً اپنے بیشتر سابق مورخوں اور ہم عصروں کی طرح، لیکن ترقی کے عمل میں یقین کرتے تھے اور ان کے نزدیک اہم ترین تاریخی مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ قبلِ برطانوی ہندوستان میں ترقی نہ ہونے کی وجوہات بیان کریں۔

"یہ بات بڑی قابلِ توجہ ہے کہ مشرقی آریوں نے جس جزیرہ نما پر قبضہ کیا تھا اس کا مقدر اس قدر مختلف کیوں رہا، اور یہ بات بھی کہ اس جزیرہ نما نے فرقوں اور خیالوں کو مخلوط کرنے اور ترقی کرنے کے رُجحانات کا اظہار کیوں نہیں کیا۔ اور یہ بات جانچ پڑتال کے لائق ہے کہ وہ مخصوص اسباب کیا تھے جن کے باعث یہ اختلاف رُونما ہوا، اور یہ بات بھی تصدیق طلب ہے کہ ہندوستان کے لوگوں نے اوپر اٹھ کر سماجی اور سیاسی ارتقا کے اس تصور کو کیوں نہیں اپنایا جو یورپ کی قوموں میں اب بھی ایک مفید عمل کی صورت میں بڑھ رہا ہے"۔

"میڈیول انڈیا" کلکتہ ریویو (VXXL) الفنسٹن کے برعکس اور کسی قدر جیمس مل کی طرح، لیکن ہندوستانی تاریخ کے دَورِ وُسطیٰ کو دورِ قدیم سے بہتر سمجھتے تھے ہندوؤں کا اپنا ایک تمدن تھا لیکن، یہ "ایک فرسودہ تمدن" تھا جو لگتا ہے کہ "ایک معین شکل اختیار کر چکا تھا اور اپنی ساری قوت کھو چکا تھا" (دی مُغل امپائر)۔ ہندوؤں پر

Marfat.com

جو سماجی جمود طاری ہو گیا تھا کین اسے ذات پات اور ملے جلے خاندان سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان دونوں نظاموں نے "انفرادیت کو آختہ کر دیا تھا" اس نزاعی مسئلے پر کہ آیا ہندوؤں کی حالت میں گراوٹ مسلمانوں کی فتحِ ہند سے آیا تھا کین نے ذیل کا یہ دلچسپ تبصرہ کیا تھا:

"ان یورشوں سے جو بھی مصائب پیدا ہوئے ہوں، اور ان کے جلو میں جو بھی تباہیاں آئی ہوں، اور حکومت کے اقدامات کتنے ہی جابرانہ، من مانے یا جارحانہ رہے ہوں، اگر اس ملک کی ہندو آبادی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو ملک کی حالت اور زیادہ خراب ہو جاتی۔ اگر مسلمانوں کا غلبہ بذاتِ خود ایک خرابی تھا تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ خرابی ضروری تھی۔"

یہاں کین کا رویہ جیمس مل کے رویے کی یاد دلاتا ہے۔ کین نے ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے بارے میں زیادہ تر اپنے سابق مورخوں کے خیالات محض معمولی سی ترمیم کے ساتھ منظور کر لیے تھے اور انھیں آگے بڑھایا تھا۔ مثال کے طور پر، الفنسٹن نے اس زمانے کے ملک ہندوستان کے بارے میں خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ محض ایک جغرافیائی اظہار ہے۔ اور انھوں نے ہندوستانی چیزوں کے بارے میں باہر کے رویے اور "آج کل کے انتہائی نازک مزاج انگریز غریب الوطن" (یہ الفاظ کین کے ہیں) کے رویے میں بھی یکسانیت پائی تھی۔ پھر الفنسٹن ہی کی طرح کین نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ پورے دورِ وسطیٰ میں ہندو ادارے قائم رہے، اور ہندو اور مسلمانوں کے درمیان دوستی اور بقائے باہمی کے جذبات کو سراہا ہے۔

"ترکمان اور پٹھان حکومتوں کے تحت ہندو پنجاب میں، ہندوستان میں اور بعض دور دراز صوبوں میں اپنے ضابطوں اور رواجوں پر عمل پیرا

Marfat.com

رہے۔ جنوبی علاقوں میں انھیں اور بھی کم چھیڑا گیا۔ ان ممالک کے بڑے حصے میں بڑے عرصے تک ان کی خود مختار ریاستیں قائم رہیں اور ان صوبوں میں بھی جو مُسلم حکومت کے تحت تھے ہندوؤں نے اعتماد اور قوت کے عہدے حاصل کیے' اور دونوں نسلوں میں اکثر اچھے تعلقات رہے۔"

(ہسٹری آف انڈیا' ج352)۔

الفنسٹن ہی کی طرح کین بھی یہ پسند کرتے تھے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے تحت قدیم رواجوں کا تحفظ کیا جائے۔ ("میڈیول انڈیا" "کلکتہ ریویو LXXV)۔ اپنے سابق منصوبوں کی طرح اور ہندوستان پر لکھنے والے تقریباً سارے ہی برطانوی مصنّفوں کی طرح کین یورپ کو ایشیا سے اور برطانوی حکومت کو مُسلم حکومت سے ہر طرح برتر سمجھتے تھے۔ حالانکہ ہندوؤں کے مقابلے میں مُسلم حکومت بہتر تھی' لیکن وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی: "یہی وہ مُلک ہے جو حالانکہ لمبے عرصے تک مسلم حکومت کے تحت رہا ہے (اور اب بھی مُسلمانوں کے زیرِ اثر ہے) لیکن اب ترقی کی راہ پر گامزن ہوا ہے۔"

("اسلام اِن انڈیا" کلکتہ ریویو LXXI)۔

گو بعض اوقات انھیں ہندوستان میں برطانوی حکومت کی خامیوں کا احساس ہوتا تھا' پھر بھی وہ سلطنتِ برطانیہ کے سخت طرفدار رہتے تھے: "ان کے نزدیک ان بہت سے آقاؤں میں جن کی ہندوستان نے اب تک تابع داری کی ہے سب سے زیادہ ایماندار' بہادر اور لائق آقا بیشک و شبہ برطانوی تھے۔"

("انڈیا اِن 1880 "کلکتہ ریویو' LXXIII)۔

یہ بات بڑی باعثِ دلچسپی ہوگی کہ ہندوستانی لوگوں کے بارے میں کین کے

Marfat.com

خیالات سابق کے سخت ترین مصنف جیسے بھی نہیں تھے۔ ان کے نزدیک تاریخ میں جتنی قومیں گذری ہیں ہندوستانی ان کے مقابلے میں سب سے زیادہ دھوکے باز اور فتنہ انگیز تھے: "مجھے ابھی تک ایک بھی ہندو ایسا نہیں ملا ہے جس میں کوئی ہو، اور ایماندار مسلمان یہاں نہیں بستے۔" ایسا لگتا ہے کہ کین 1857ء کے واقعات نہ بھلا سکے نہ معاف کر سکے۔ اور غالباً یہی وہ اہم ترین بات ہے جس کی مدد سے ہندوستانی دورِ وسطیٰ کی بابت ہم ان کے اندازِ فکر کو سمجھ سکتے ہیں۔

Marfat.com

مُغلوں کے محصولِ زمین کے انتظام کی بابت
سرکار اور مورلینڈ کے خیالات

بی۔ آر۔ گروور

اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے دوران ہندوستانی مُنشیوں اور انگریز منتظم محققوں نے مغلوں کے محصول زمین کے انتظام پر مبصروں کے انداز میں نظر ڈالی تھی۔ لیکن اس مضمون پر کبھی کسی پیشہ ور مورّخ نے جامع انداز میں کچھ نہیں لکھا۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف میں دو معروف محققوں، سر جے۔ این۔ سرکار اور ڈبلو۔ ایچ۔ مورلینڈ نے مغل ہندوستان پر کام کیا۔ یہ دونوں ہمعصر تھے۔ ایک ہندوستانی پیشہ ور مورّخ تھا اور دوسرا پہلے پہل ایک انگریز سول مُلازم تھا جس کا تقرر ہندوستان میں کیا گیا تھا، اور جو بالآخر ایک مورّخ بن گیا۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں سر جے۔ این۔ سرکار نے بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ مغل زمانے پر کام کیا اور اس دَور کی سیاسی تاریخ پر بڑی عظیم الشان کتابیں لکھیں۔ سرکار نے مغل سلطنت کے انتظامی ڈھانچے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا! لیکن اس سلسلے میں انھوں نے کوئی خاص کارنمایاں نہیں کیا۔ محصول کے سلسلے میں انھوں نے آئینِ اکبری، مراتِ احمدی، چند ایک دستور العمل اور سترہویں نیز اٹھارہویں صدی کے روزنامچوں پر تکیہ کیا۔ ان مآخذوں کے استعمال کے باوجود وہ مغلوں کے محصولِ زمین کی ان اصطلاحات کا صحیح طور سے تجزیہ نہ کر سکے جو ان مآخذوں کے فارسی مَتن میں

Marfat.com

دی گئی تھی۔ مغل انتظام پران کی کتاب میں محصولِ زمین کے انتظام پر سرسری انداز میں لکھے ہوئے ابواب میں کوئی ربط نہیں ہے۔ اس میں عصری مسودوں سے لیے واقعات زیادہ ہیں، اور زرعی نظام کی مربوط تصویر پیش کرنے کی کوئی ایسی کوشش نظر نہیں جسے سراہا جا سکے۔ اورنگ زیب کے دَور کے وہ دو فرمان جو سرکار کو برلن کی رائل لائبریری میں ملے تھے، اور جنہیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں چھپوایا تھا اور بعد میں اپنی کتاب مغل ایڈمنسٹریشن [2] میں شامل کر لیا تھا، ان میں سے وہ فرمان جو محمد ہاشم کے نام تھا کرنل گیلووے نے پہلے ہی صحیح طور سے استعمال کر لیا تھا۔ سرکار کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ اس فرمانوں کے فارسی متن پر اور خصوصاً ان کی شرحوں پر کچھ زیادہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ محصول کی بابت اٹھارہویں صدی کے اواخر کا جو ادب برلن لائبریری میں موجود ہے وہ حالانکہ اٹھارہویں صدی کے بہار اور بنگال کی تاریخ کے واسطے نہایت ہے، لیکن مزید چھان بین کیے بغیر اسے سولھویں اور سترہویں صدیوں کے لیے منظور نہیں کیا جا سکتا۔ مزید برآں، بنگال اور شمالی ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں محصول کے طریقوں میں جو اختلافات تھے ان کو صاف طور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حالانکہ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں بنگال کے ہندوستانی ماہرین محصول کی رسائی مغل زمانے کے بعض فرمانوں اور دستور العمل تک ضرور ہو چکی تھی، لیکن ان کی لکھی ہوئی شرحوں میں اس عہد کے محصول کے طریقوں کے جو تجزیے کیے گئے ہیں وہ سارے کے سارے دُرست نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض شرحیں اس عظیم نزاعی مسئلے پر برطانوی منتظمین محصول کے خیالات اور تصورات کو تقویت پہنچانے کے لیے لکھی گئی تھیں جو مسئلہ مستقل بندوبست کے نفاد سے پہلے بنگال میں زمینداروں اور حکومت کے درمیان حکومت کے اراضیاتی حقوق کی بابت اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اورنگ زیب کے دَور کے یہ دو مشہور دستاویز ہاتھ آجانے کے

Marfat.com

بعد اور محصول کی بابت اس تمام ادب سے لاعلم ہونے کے باعث جو برلن لائبریری میں موجود تھا، سرکار ان شرحوں کا پس منظر نہ دیکھ سکتے تھے جو اٹھارہویں صدی کے آخر میں بنگال میں لکھی گئی تھیں، اور نہ اس حیثیت میں تھے کہ کسی نتیجہ خیز حقیقت تک پہنچ سکتے۔ اس سب کے باوجود سرکار کا ترجمہ اور فرمانوں پر ان کی وہ شرحیں جو طبع ہو گئی تھیں بعد کے محققوں نے مسئلے کی مزید چھان بین کیے بغیر تسلیم کر لیں۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں بعض ہندوستانی منشیوں نے مغلوں کے محصولِ زمین کے انتظام کے خاص پہلوؤں پر اچھی طرح روشنی ڈالی تھی، لیکن محصول کی بابت جو ادب موجود تھا اس کے ان حصّوں کا احاطہ نہ کیا گیا۔ آئینِ اکبری کا ترجمہ ایچ۔ ایس۔ جیرٹ نے کیا تھا اور بلوخ مین نے اس کی شرح کی تھی۔ سرکار نے اس شرح پر بھی نظرِ ثانی کی اور اس کی شرح لکھی۔ لیکن اس میں بھی بڑی بڑی غلطیاں ہیں۔ ابوالفضل کی آئینِ اکبری کے تیسرے دفتر میں محصول کی بابت اصطلاحات پر مشتمل جو عبارتیں دی ہوئی تھیں ان کا ترجمہ زیادہ تر غلط کیا گیا ہے۔ سرکار نے تاریخی نوعیت کے جو نوٹ دیے ہیں اور محصول کی بابت اصطلاحات کی جو تعریفیں دی ہیں وہ مغل محصول سے متعلق دستاویزوں پر نہیں بلکہ زیادہ تر غیر ملکی اسلامی رواجوں اور پہلے کی لکھی ہوئی فرہنگ پر مبنی ہیں۔ لہٰذا مختلف قسم کے مباحثے شروع ہو گئے ہیں اور مغلوں کے محصولِ زمین کے نظام پر جدید تاریخی تحریروں میں فرضی نتائج نظر آنے لگے ہیں۔

ڈبلو۔ ایچ۔ مورلینڈ پہلے مورّخ تھے جنھوں نے مغلوں کے زراعتی نظام کا گہرائی سے مطالعہ کیا، اور ان کی ابتدائی کتابوں کے باعث ہندوستان کی اقتصادی تاریخ کے طلبہ اس بنا پر ان کے بیحد احسان مند ہیں کہ انھوں نے مغل عہد کی مکمل تصویر پیش کرنے میں خاصے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ مورلینڈ معاشیات کے ایک ذہین طالب علم اور تربیت یافتہ انگریز سول ملازم تھے جن کا تقرر ہندوستان کے صوبہ

Marfat.com

ئے متحدہ (یو-پی) میں ہوا تھا۔ اپنی ابتدائی کتاب دی ریونیو ایڈمنسٹریشن آف دی یونائٹڈ
ونسز (۱۹۱۱ء میں شایع ہوئی) میں انھوں نے دل سے یہ کوشش کی تھی کہ ہندوستان کے
صول زمین کے ورثے کا سراغ بالکل ابتدائی زمانے سے لگایا جائے، اور انیسویں صدی نیز
ویں صدی کی ابتدا میں برطانوی حکومت کے تحت اس نظام کا ارتقا معلوم کیا جائے۔ مورلینڈ
نداز نظر بنیادی طور پر ناصحانہ تھا۔ اس عمومی تاریخی خاکے کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ زرعی
ئل بالکل ابتدائی زمانے کا ورثہ تھے اور ان میں آج تک ایک تسلسل تھا۔ اس بات
طع نظر، دورِ وسطیٰ کے محصول زمین کے نظام کا ہندوستان کے انیسویں، بیسویں
یوں کے محصول زمین کے نظام سے مقابلہ کرنا، اور تاریخی مثالوں کے ذریعے اس
پر زور دینا کہ پہلے کے انتظام میں برطانوی انتظام نے بہت سی اصلاحات
ں، اس گہری خواہش کا اظہار تھا کہ سابقہ ہندوستانی انتظام محصول پر برطانوی
ظام محصول کی برتری دکھائی جائے۔ اس کتاب کا مقصد یہ بھی تھا کہ انگریز افسرانِ مال
یک ایسا دستی ہدایت نامہ مل جائے جس کی مدد سے وہ زمینداروں اور کاشتکاروں
لق رکھنے والے بیسویں صدی کے ان زرعی مسائل سے نمٹ سکیں جن مسائل کو
صیت کے ساتھ تاریخی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہ بات بہرحال
تبہ ہے کہ کیا مورلینڈ اس منزل پر ان نمایاں تبدیلیوں کو صاف طور سے سمجھ گئے تھے
ٹھارہویں صدی کے دوران رونما ہوئی تھیں، اور کیا انھوں نے مغلوں کے محصول
ں کے انتظام کی خصوصیات کے نقش کو خاصی حد تک دھندلا دیا تھا۔ سولھویں،
ویں صدی کے مغل انتظام محصول کا صحیح تجزیہ کرتے وقت انھوں نے جو بھی غلطیاں
وں، مورلینڈ نے سیاسی اور فوجی واقعات کی اہمیت کم کرکے اس پیچیدہ مسئلے
لیا ہندوستانی تاریخ محض ان واقعات کا بیان ہے، خوب حل کیا۔ انھوں نے
وستانی تاریخ میں اقتصادی قوتوں کے رول پر زور دیا۔ انھوں نے اس

Marfat.com

حقیقت پر زور دیا کہ کسی دیہی سماج میں لوگوں کا خاص پیشہ زراعت ہوتا ہے، اور ہر ہندوستانی حکومت کی آمدنی کا یہی خاص ذریعہ تھا۔ گذرے ہوئے ہندوستانی سماج میں یہی اقتصادی عنصر فیصلہ کن تھا۔ ان کی بعد کی ہر تحریر میں اسی پہلو پر زور دیا گیا ہے۔

مورلینڈ نے منتظم کی حیثیت سے اقتصادی مورخ کی حیثیت تک جو ترقی کی وہ بتدریج ہوئی۔ جب مورلینڈ اور یوسف علی اپنا مشترکہ مقالہ اکبرس لینڈ ریونیو سسٹم آن دی بیسس آف دی آئین اکبری شایع کرایا تو مورلینڈ کو مغلوں کے محصولِ زمین کے انتظام سے حقیقی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ اسی موضوع کو تقویت پہنچانے کے انھوں نے 'انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر' 'انڈیا فردم اکبر ٹو اورنگ زیب' اور 'اگریرین سسٹم آف مسلم انڈیا' جیسی کتابیں لکھیں جو بنیادی طور سے تاریخی تحقیق پر مبنی کتابیں تھیں، اور اب مورلینڈ ایک اعلا درجے کے اقتصادی مورخ بن چکے تھے۔ انھوں نے رفتہ رفتہ اخلاقی لہجہ ترک کر دیا اور برطانوی حکومت اور مغل عہد میں کاشتکاروں کی حالت کا مقابلہ کر بھی ترک کر دیا لیکن ہر چند کہ انھوں نے تاریخی تحقیق کا طریقہ اپنا لیا تھا، پھر بھی انھیں ہمیشہ اس بات کا اشتیاق رہتا تھا کہ ایسی ماٰخذی اشیا ہاتھ لگ جائیں جو ان کے رجحانات اور نوآبادیاتی نظریے سے میل کھا سکیں۔ ایک ماہر افسرِ مال ہونے کے باعث مورلینڈ کو اس قدر تجربہ اور علم حاصل ہو چکا تھا کہ مالی مسائل کے دشوار پہلوؤں پر خوب اچھی طرح لکھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ آئینِ اکبری کے مختلف متنوں، عصری روزناچوں غیر ملکی سیاحوں کے سفرناموں، اور چند ایک فرمانوں نیز دستورالعملوں کا تقابلی مطالعہ کرنے لگے تھے۔ لیکن ان سب کے باوجود، ترجمانی کے بارے میں مورلینڈ کی تنگ خیالی نے ان کے تاریخی تحقیق کے طریقے کو محدود کر دیا تھا۔ آئینِ اکبری کی تکنیکی عبارتوں کا پڑھنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جب

Marfat.com

ہائے متحدہ (یو۔پی) میں ہوا تھا۔ اپنی ابتدائی کتاب دی ریونیو ایڈمنسٹریشن آف دی یونائٹڈ پروونسز (1911ء میں شایع ہوئی) میں انھوں نے دل سے یہ کوشش کی تھی کہ ہندوستان کے محصول زمین کے ورثے کا سراغ بالکل ابتدائی زمانے سے لگایا جائے، اور انیسویں صدی نیز بیسویں صدی کی ابتدا میں برطانوی حکومت کے تحت اس نظام کا ارتقا معلوم کیا جائے۔ مورلینڈ کا اندازِ نظر بنیادی طور پر ناصحانہ تھا۔ اس عمومی تاریخی خاکے کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ زرعی مسائل بالکل ابتدائی زمانے کا ورثہ تھے اور ان میں آج تک ایک تسلسل تھا۔ اس بات سے قطع نظر، دورِ وسطیٰ کے محصول زمین کے نظام کا ہندوستان کے انیسویں، بیسویں صدیوں کے محصول زمین کے نظام سے مقابلہ کرنا، اور تاریخی مثالوں کے ذریعے اس بات پر زور دینا کہ پہلے کے انتظام میں برطانوی انتظام نے بہت سی اصطلاحات لیں، اس گہری خواہش کا اظہار تھا کہ سابقہ ہندوستانی انتظام محصول پر برطانوی انتظام محصول کی برتری دکھائی جائے۔ اس کتاب کا مقصد یہ بھی تھا کہ انگریز افسرانِ مال کو ایک ایسا دستی ہدایت نامہ مل جائے جس کی مدد سے وہ زمینداروں اور کاشتکاروں سے تعلق رکھنے والے بیسویں صدی کے ان زرعی مسائل سے نمٹ سکیں جن مسائل کو خصوصیت کے ساتھ تاریخی پسِ منظر میں سمجھنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ یہ بات بہرحال مشتبہ ہے کہ کیا مورلینڈ اس منزل پر ان نمایاں تبدیلیوں کو صاف طور سے سمجھ گئے تھے جو اٹھارہویں صدی کے دوران رونما ہوئی تھیں، اور کیا انھوں نے مغلوں کے محصولِ زمین کے انتظام کی خصوصیات کے نقش کو خاصی حد تک دھندلا دیا تھا۔ سولھویں، سترہویں صدی کے مغل انتظام محصول کا صحیح تجزیہ کرتے وقت انھوں نے جو بھی غلطیاں کی ہوں، مورلینڈ نے سیاسی اور فوجی واقعات کی اہمیت کم کرکے اس پیچیدہ مسئلے کو کہ کیا ہندوستانی تاریخ محض ان واقعات کا بیان ہے، خوب حل کیا۔ انھوں نے ہندوستانی تاریخ میں اقتصادی قوتوں کے رول پر زور دیا۔ انھوں نے اس

Marfat.com

حقیقت پر زور دیا کہ کسی دیہی سماج میں لوگوں کا خاص پیشہ زراعت ہوتا ہے، اور ہر ہندوستانی حکومت کی آمدنی کا یہی خاص ذریعہ تھا۔ گذرے ہوئے ہندوستانی سماج میں یہی اقتصادی عنصر فیصلہ کن تھا۔ ان کی بعد کی ہر تحریر میں اسی پہلو پر زور دیا گیا ہے۔

مورلینڈ نے منتظم کی حیثیت سے اقتصادی مورخ کی حیثیت تک جو ترقی کی وہ بتدریج ہوئی۔ جب مورلینڈ اور یوسف علی اپنا مشترکہ مقالہ اکبرس لینڈ ریونیو سسٹم آن دی بیسس آف دی آئینِ اکبری شایع کرایا تو مورلینڈ کو مغلوں نے محصولِ زمین کے انتظام سے حقیقی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ اسی موضوع کو تقویت پہنچانے کے انھوں نے 'انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر'، انڈیا فردم اکبر ٹو اورنگ زیب' اور اگریرین سسٹم آف مسلم انڈیا' جیسی کتابیں لکھیں جو بنیادی طور سے تاریخی تحقیق پر مبنی کتابیں تھیں' اور اب مورلینڈ ایک اعلا درجے کے اقتصادی مورخ بن چکے تھے۔ انھوں نے رفتہ رفتہ اخلاقی لہجہ ترک کر دیا اور برطانوی حکومت اور مغل عہد میں کاشتکاروں کی حالت کا مقابلہ کر بھی ترک کر دیا لیکن ہر چند کہ انھوں نے تاریخی تحقیق کا طریقہ اپنا لیا تھا، پھر بھی انھیں ہمیشہ اس بات کا اشتیاق رہتا تھا کہ ایسی ماخذی اشیا ہاتھ لگ جائیں جو ان کے رجحانات اور نوآبادیاتی نظریے سے میل کھا سکیں۔ ایک ماہر افسرِ مال ہونے کے باعث مورلینڈ کو اس قدر تجربہ اور علم حاصل ہو چکا تھا کہ مالی مسائل کے دشوار پہلوؤں پر خوب اچھی طرح لکھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ آئینِ اکبری کے مختلف متنوں، عصری روزنامچوں غیر ملکی سیاحوں کے سفرناموں، اور چند ایک فرمانوں نیز دستور العملوں کا تقابلی مطالعہ کرنے لگے تھے۔ لیکن ان سب کے باوجود، ترجمانی کے بارے میں مورلینڈ کی تنگ خیالی نے ان کے تاریخی تحقیق کے طریقے کو محدود کر دیا تھا۔ آئینِ اکبری کی تکنیکی عبارتوں کا پڑھنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جب

Marfat.com

مورلینڈ نے لکھنا شروع کیا تو مالیات سے تعلق رکھنے والی سترہویں صدی کی پرانی اشیائے ماخذی دستیاب نہیں ہو پائی تھیں، اور مالیات کی اصطلاحات کے دُرست معنی سمجھے بغیر نظریات قائم کرلینا دُشوار بھی تھا اور پُرخطر بھی تھا۔ ایسی صورت میں جب کسی دَور کی دستاویزیں موجود نہ ہوں تو تکنیکی مورخ کو تاریخ کی ترجمانی کرتے وقت سخت رویہ اپنانے سے گریز کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات کہ مورلینڈ کو اپنے زمانے کی مالیات کا بڑا وسیع تجربہ تھا ایک لحاظ سے ان کا عیب بھی ہے، کیونکہ مبہم عبارتوں کی ترجمانی کرتے وقت ان کے دل میں اپنے تخیّل سے کام کرنے کی بڑی خواہش پیدا ہوئی۔ یہ بات چند ایک مثالوں سے خوب اچھی طرح واضح کی جاسکتی ہے۔ مورلینڈ جمع دہ سالہ (دس سالہ بندوبست) کا مفہوم بیان کرتے وقت یہ کہتے ہیں کہ عبارت میں لفظ جمع اس مطالبے کے لیے استعمال نہیں کیا گیا ہے جس کا تعیّن کیا گیا ہو بلکہ یہ لفظ محض اس مسئلے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ نئی قیمت کیا مقرر کی جائے۔[3] انھیں ابوالفضل سے نفرت ہوجاتی ہے اور طیش میں آکر وہ یہ کہتے ہیں کہ آئینِ اکبری ایک ناقص کتاب ہے اور اس کے متن میں یقیناً کچھ خرابی ہے۔ یہاں ہمیں ایک ماہرِ مالیات کے حد سے بڑھے ہوئے اعتماد کی مثال ملتی ہے، جو تاریخی تحقیق کے طریقے کو اپنی خواہش کے مطابق بدل دیتا ہے۔ جہاں تک اورنگ زیب کے دَور میں حکومت کے مطالبے کا تعلق ہے، رسک داس کروری (بہار والے) کے نام شاہی فرمان میں صاف طور سے کہا گیا ہے کہ مطالبے کا تعیّن صورتِ حال کے مطابق (زمین کی قسموں کے اعتبار سے) $\frac{1}{2}$، $\frac{1}{3}$ اور $\frac{2}{5}$ (کل پیداوار کا) میں سے کسی دو کے لحاظ سے کیا جائے۔ مورلینڈ کہتے ہیں کہ مذکرہ بالا فرمان مختلف متعیّنہ دروں کی بابت محض ایک نظریاتی بیان ہے، کیونکہ اصل مطالبہ کم سے کم رقم کے نزدیک نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ رقم کے نزدیک تھا۔ حالاں کہ مورلینڈ کے پاس کوئی ایسا عصری دستاویزی ثبوت موجود نہ تھا جس کی بنا پر فرمان کے بیان کو رد کیا جاسکے، اور ایسا انھوں نے محض اپنے شعبۂ مالیات کے اس تجربے

Marfat.com

کی بنا پر کیا تھا کہ سرکاری نقطۂ نظر سے حکومت کی آمدنی میں کس طرح اضافہ کیا جاتا ہے۔ پرگنوں کے اصل دستاویزات جو اب محافظ خانۂ راجستھان، بیکانیر میں موجود ہیں، اور جن میں مطالبہ حکومت کے متذکرہ بالا اختلاف کا ذکر ہے، یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مورلینڈ کا مفروضہ بالکل غلط تھا۔ مورلینڈ یہ سمجھ نہ پائے کہ محصول کا مطالبہ جو زمین اور فصلوں کی مختلف قسموں پر مبنی تھا مغل ضوابط کے تحت کس طرح نافذ کیا گیا۔ آئین اکبری اور اورنگ زیب کے فرمانوں میں ایک خاص قسم کا بیان ہے کہ ان دونوں بادشاہوں کے عہدوں میں کُل پیداوار کا بالترتیب $\frac{1}{3}$ اور $\frac{1}{2}$ محصول مقرر کیا گیا تھا۔ مورلینڈ نے محصول کے اس مطالبے کو ہر قسم کی زمین اور فصل کے لیے جو یکساں تصوّر کر لیا، وہ قدرے غلط ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ دراناج والی فصلوں پر مطالبۂ محصول کے سب سے اُونچے درتھے، اور مقررہ دروں کا جو گھٹتا بڑھتا ایک نہایت تفصیلی پیمانہ بنا گیا تھا اس پر کسی در کا تعیّن مخصوص علاقے کی زمین اور فصلوں سے مطابق کیا جاتا تھا۔ اور یہ در اتنے مختلف تھے کہ ایک ہی گاؤں میں کئی در نافذ کیے جاتے تھے۔ نقد فصلوں (جنس کامل) کے مقررہ در نسبتاً کافی کم تھے، حالانکہ یہ در بھی زمین کی تقسیم اور فصلوں کی نوعیت والے اصولوں پر مبنی تھے۔ اس بات سے بالآخر ہمارا وہ اندازہ ضرور متاثر ہوگا جو ہم اس ضمن میں لگائیں کہ مغل زمانے میں محصول کے مطالبوں سے کاشتکاروں کی حالت پر کیا اقتصادی اثر پڑا ہوگا۔ مورلینڈ نے آئین اکبری کے مطالبے کی بنا پر ضبطی اور نسق سے تعیّن کے طریقوں کا جو تجزیہ کیا ہے وہ بالکل صحیح نہیں ہے۔ مورلینڈ نے نسق کی تعریف یوں کی ہے کہ "گروہ کے محصول کا تعیّن" یا وہ "مجموعی رقم" جو گاؤں یا پرگنے پر مکھیاؤں کی مرضی سے لگائی جاتی تھی، اور مکھیاؤں کو آزادی ہوتی تھی کہ کاشتکاروں کی زمین کے مطابق اس مجموعی رقم کو ان پر تقسیم کر دیں۔ مورلینڈ کی نسق کی یہ تعریف غلط ہے۔ مغل دَور میں تعیّنِ محصول کے ان متذکرہ بالا طریقوں کے عام ہونے کے بارے میں بھی مورلینڈ نے بہت سخت رویّہ اختیار کیا ہے۔ ان کے خیال

Marfat.com

یں اکبر کے تحت تعینِ محصول کا سب سے زیادہ پسندیدہ طریقہ ضبطی تھا، اور نسق جس میں "گاؤں کے گروہوں کے محصول کا تعین" اور "محصول کا سالانہ سرسری تعین" شامل ہوتے تھے اورنگ زیب کے عہد کے دوران رائج تھا۔ ان کے مطالعے کے دو مقررہ قطبین ہیں۔ ایک آئینِ اکبری اور دوسر رسک داس کرودی کے نام اورنگ زیب کا فرمان۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ محصول کے طریقے بادشاہوں کی مرضی سے اس طرح یک لخت ختم نہیں ہو جاتے۔ ضبطی طریقہ پورے مغل عہد کے دوران جاری رہا اور محصول کے تعین کے دوسرے طریقوں کے ساتھ چلتا رہا۔

مورلینڈ زمیندار اور رعایا جیسے لفظوں کی عمومیت سے اچھی طرح واقف تھے، اور انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ "کسانوں" کے لیے اصطلاح زرعی رعایا استعمال کریں۔ انھوں نے اچھا کیا کہ زمین کی ملکیت کے بارے میں جو نظریاتی اور قانونی ترجمانی کی جاتی ہے اس بحث میں نہ پڑے۔ بیشتر مصنفین اٹھارہویں صدی کے اواخر سے اس بحث میں غرق تھے[5] لیکن وہ کاشتکاروں کی ان مختلف قسموں کی تفصیلات پر بحث نہیں کر سکتے تھے جن کاشتکاروں کا زمین سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق تھا۔ مغل عہد میں زمینداری گاؤں اور رعایتی گاؤں میں زمین کی ملکیت کی جو مختلف نوعیتیں تھیں وہ انھیں سمجھ نہیں سکتے تھے۔[6] ملکیتِ زمین کے مسئلے کی بابت وہ یہ سمجھتے تھے کہ کسانوں کو قبضہ رکھنے کا حق تھا، اور اس کے علاوہ ان کے پاس اس زمانے کے کوئی ایسے اعداد و شمار نہیں تھے جن کی مدد سے وہ اس مسئلے پر روشنی ڈالتے۔ انھوں نے اس اہم مسئلے کو حل کیے بغیر یونہی چھوڑ دیا۔ اس نازک بحث سے بچنے کے باوجود کہ آیا مغل نظام زمینداری کے اصول پر مبنی تھا یا رعیت واری کے اصول پر، انھوں نے دونوں طریقوں سے جو بھونڈی سی مماثلت دکھائی وہ کچھ مبہم سی ہے۔ یہ ان کی زبردست خواہش تھی کہ مسلم عہد کے دوران وقتاً فوقتاً اگر ایسے دور آئے ہوں جب حکومت نے براہِ راست یا "گروہ کے

Marfat.com

محصول کا تعین" والے طریقے کے ذریعے گاؤں کے مکھیا کی مدد سے (خصوصاً سترہویں صدی کے بعد سے) کسانوں کے معاملات میں دخل دیا ہو، تو اسے تحریر کریں۔ اس خواہش سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اس بات کا ادراک نہیں تھا کہ مغل محصول کا انتظام کس طرح کرتے تھے، اور مغلوں کے زمانے میں حکومت اور رعایا کے درمیان تعلق قائم رکھنے والے ایسے لوگوں کا کیا رول تھا جو صاحبِ زمین بھی تھے۔ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے اس روایتی سہ رخی تقسیم کو مان لیا کہ مغل علاقے تین طرح کی زمینوں میں تقسیم کیے گئے تھے، خالصہ، جاگیر اور نیم آزاد یا خود مختار سرداروں کی زمینیں۔ مورلینڈ یہ بات بھی اچھی طرح نہ سمجھ سکے کہ ہندو سرداروں (زمینداران عمدہ وغیرہ) کے علاقوں میں مغلوں کے محصول زمین کے ضوابط کس حد تک نافذ ہوئے تھے، عملی اور غیر عملی علاقوں کی حد بندی کس طرح ہوتی تھی، اور یہ علاقے مغل حکومت کی خدمات کے صلے میں خود سرداروں (زمینداروں) یا مغل حکومت کے عہدیداروں کو کس حد تک تفویض کیے جا سکتے تھے۔ 7

ان کا یہ یقین، کہ میواڑ جیسی ہندو زمینداری مغل نظام سے متاثر ہوئے بغیر خالص روایتی ہندو تصورات کی بنا پر اپنے محصول کا انتظام کرتی رہی، کسی دستاویزی ثبوت سے ثابت نہیں ہوتا۔ مورلینڈ اس بات کو نہ سمجھ سکے کہ مغل زمانے میں ہندو سرداروں کے علاقوں میں محصول کی تنظیم میں اندر سے کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ہندو سرداروں کی حیثیت میں کیا فرق پڑا۔ اگر ہندو راجپوت سرداروں کے مختلف نوعیت کے علاقوں (زمینداران عمدہ، زمینداران، وغیرہ) کو مغل محصولات کا حصہ نہ سمجھا جائے، تو مغل انداز کے محصول زمین کے انتظام کا پورا ادراک ہو ہی نہیں سکتا۔ مزید برآں، مورلینڈ کا یہ خصوصی دعوا کہ ابتدائی مسلم حکومتوں کی طرح مغل حکومت بھی ملک کی سالانہ پیداوار اور زرعی ترقی کے واسطے سیاسی اور سماجی ماحول تیار کرنے میں ناکام رہی، بالکل غلط ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ بڑھا ہوا مطالبۂ محصول، کسانوں اور انتظامیہ کے درمیان

Marfat.com

مستقل تصادم، اور کسی نہ کسی زرعی علاقے میں آبادیوں کا اُجڑنا، وہ چیزیں تھیں جنھوں نے نظام محصول پر اس قدر اثر ڈالا کہ وہ خاتمے کی حد پر پہنچ گیا، اور سترہویں صدی کے وسط کے بعد پورا اقتصادی نظام بیٹھ گیا۔ یہ نتائج سب کے سب مشتبہ ہیں اور پرانی عصری دستاویزوں کے ثبوت کی بنیاد پر قائم نہیں کیے گئے ہیں۔ ان سارے مسائل کی ایسی مزید چھان بین ضروری ہے جو سائنٹفک انداز پر کی جائے، اور چھان بین کرتے وقت مغل سلطنت کے مختلف علاقوں کے سیاسی، عمرانی اور انسانی پس منظر پر نظر رکھی جائے۔ زرعی پیداوار کے بارے میں حکومت اور کسانوں کے کیا خیالات تھے؟ "آبادی اور مزید کاشت کے لیے حاصل ہو جانے والی زمینوں کے درمیان کیا تناسب تھا؟ زمین کی تفصیلی تقسیم کی بنا پر کتنا محصول مانگا جاتا تھا؟ نیز وہ دوسرے سماجی اور اقتصادی عناصر تھے جن کا مغل دور پر غلبہ رہا تھا؟ ان سب باتوں پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

کسانوں کی زندگی کے بارے میں غیر ملکی سیاحوں کے بیانات پر مورلینڈ نے جو اس قدر اعتماد کیا ہے اس سے جانبداری ظاہر ہوتی ہے۔[8] غیر ملکی سیاح ملکیتِ زمین کے ہندوستانی تصور کو نہ سمجھ سکے، اور انھیں یہاں کے ادارے اپنے ملکوں کے اداروں سے مختلف نظر آئے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ جب تک زمین کی ملکیت طبقۂ امرا کے ہاتھوں میں نہ دی جائے گی زرعی خرابیاں رونما ہوتی رہیں گی۔[9] وہ یورپ کے دوسرے لوگوں کی طرح ذہنی پیچیدگیوں کے شکار تھے اور ہندوستانیوں کے بارے میں انھوں نے متضاد قسم کے بیان دیے۔ برنیر کا یہ بیان، کہ کسان مصائب اٹھا رہے ہیں اور اپنی زمینیں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں، یقیناً مبالغہ آمیز ہے۔ برنیر نے ایشیا کے ممالک کے زرعی سماج کی غلط تصویر اس مقصد سے پیش کی تھی کہ فرانسیسی حکومت یورپی اقوام کی برتری سے محفوظ ہو سکے، اور خصوصاً فرانس کی زمینی تقسیم نیز اس فرانسیسی تمدن

Marfat.com

کی برتری سے محفوظ ہو سکے جو ستّرہویں صدی میں یورپی تہذیب کی حدانتہا سمجھا جاتا تھا۔ جب تک سیاحوں کے بیانات کی چھان بین، ان کے مقاصد اور اس بات کو ذہن میں رکھ کر نہ کی جائے گی کہ وہ ہندوستان کے دیہی طریقۂ زندگی کو کس حد تک سمجھ سکتے تھے، اس وقت تک مغل ہندوستان کے بارے میں ان کے تجزیے پر بھروسہ کرنا نہایت غلط ہوگا یہی مورلینڈ کی سب سے بڑی خامی تھی۔ مورلینڈ نے دَورِ وُسطیٰ کے ہندوستان کے عمرانی اور انسانی پس منظر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے ان زمینداری بندوبستوں پر کچھ نہیں لکھا ہے جو قبیلوں اور فرقوں کی بُنیاد پر قائم تھے ـــــ یہی وہ اصل حقیقت ہے جس کے ذریعے مغل ہندوستان کی زرعی تاریخ اور دیہی سماج کے ادراک کا اصل سُراغ ملتا ہے۔ مورلینڈ نے پرگنے کی سطح سے نیچے جانے کی کوشش نہیں۔ حتیٰ کہ محصول وصول کی مشینری کے بارے میں بھی ان کا بیان نہایت سرسری ہے۔ انھوں نے ان سماجی واقتصادی عناصر کے تجزیے کی کوئی کوشش نہ کی جو گاؤں اور قصبوں میں لوگوں کی زندگی پر اثر ڈالتے تھے۔ یہ گاؤں اور قصبے بہت سے علاقوں میں پورے طور سے شہروں سے جُڑے ہوئے تھے۔ تجارت اور کاروبار کے پھیلاؤ کا نقد فصلوں کی کاشت پر بہت بڑا اثر پڑا، دَورِ نقدی کے ذریعے جو تعلقات بنتے ہیں، حکومت کے محصولات جمع کرنے میں، ان تعلقات کے رول پر بھی بہت اثر پڑا۔ مورلینڈ کا خاص قابلِ تعریف کام یہ تھا کہ انھوں نے مغلوں کے نظامِ محصولاتِ زمین کی وضاحت ہندوستانی تاریخ کے دَورِ قدیم اور ابتدائی دَورِ وُسطیٰ کے پسِ منظر کے ساتھ اس طرح کی کہ ہر زمانے کی زرعی خصوصیات کی ایک مربوط تصویر سامنے آگئی۔ لیکن انھیں یہ احساس نہ ہو سکا کہ ستّرہویں صدی کے دوران سماجی واقتصادی قوتوں کی کیا رفتار تھی۔ مغل عہد کے دوران زرعی مسائل کی بابت مورلینڈ کے بہت سے نظریوں اور نتیجوں میں بڑی ترمیم کی ضرورت ہے۔

Marfat.com

حوالہ جات

۱۔

J. N. Sarkar, Mughal Administration, Calcutta 1920 (4th edition, 1952)

مندرجہ بالا کتاب مغل انتظام پر سرکار کی اکیلی کتاب ہے۔ جو دوسری کتاب
انتظامی مسائل پر کچھ روشنی ڈالتی ہے وہ احکام عالمگیری کا ترجمہ ہے جس
عنوان ہے: (Anecdotes of Aurangzeb) مندرجہ ذیل کتاب
میں دیکھیے:

Studies in Aurangzeb's Reign.

2۔

J. N. Sarkar, ,The revenue Regulations of Aurangzeb' Studies in Auranzeb s Reign. Journal and Proceedings of the Asiatic Society of Bengal, New Series, Vol. II 1906 pp. 223 - 237

3۔

Moreland the Agrarian System of Muslem India, Allahabad ed PP. 248 - 49. 251 - 54. Moreland and Ali Akdar's Land Revenue System as describd in the Ain-Akbari, J. R. A. S., London, 1918 pp. 1 - 42.

اصل متن کے لیے دیکھیے:

Ain - Akbari British Museum. Add. 6552, Folio145 a, Mrs, Hamilton, Berlin, Folio 136; Akbar Nama, Br. M. Add. 26, 207, Fol. 1199' Ms. Br. M. O. R 27, 247,. Fol 304a

Marfat.com

4- Rajasthan Archives Jaipur [Now at Bikaner.

اورنگ زیب کے دور کے پرگنہ دستاویزات دیکھیے جن کا تعلق مال و جہت و سیر جہت اور یادداشت حقیقت اراضی و افتادہ سے ہے۔

تفصیلات کے لیے:

5- Nature of Land - Rights in Mughal India. The Indian Economica and Social History Review Vol. 1 July - Sept. 1963, pp. 1 - 23, F. No. 1 - 4.

6- مغل زمانے میں نظام تعلقہ داری کے ارتقا کی تفصیلات کے لیے میرا ذیل کا مقالہ دیکھیے:

Nature of Dehati Taaluqa (Zamidari Villages), The Indian Economics and Social History Review, Vol. II, No. 2, April, 1965, pp. 166 - 177 Nature of Land - Rights in Mughal India. The Indian Economic and Social History Review Vol. 1, II, July, 1965 pp. 269 - 288.

7- تفصیلات کے واسطے میرا ذیل کا مقالہ دیکھیے:

Nature of Land - Rights in Mughal India.

[vide F. No. 15]; pp. 10 - 14, F. Nos. 60 – 70.

8- مورلینڈ پر تنقید کے لیے دیکھیے:

Beni Porsad. Hgrarian System, The Modern Review, June 1921, Brij Naryan, Indian Ecnomic Life, Lahore, 1929, pp. 1 -- 54.

Marfat.com

ology of Father Jarome Xevier , S. J. a missionary
Mager , Review, tr. Rev. Hosten, S. J. J. A. S. B.,
w Series Vol. XXIII Letter From Agra dt 14th Sept.
609, pp. 121–122. Bernier Fromcois, Travel in the
ughal Empire, tr. Constable' London 1819 pp. 204–5
211–212 , 220–26 , 233–34

Nizami Book Agency
BUDAUN - 243601 (U.P.)

Marfat.com